خزاں ۱۹۹۴

آج

ترتیب: اجمل کمال

خصوصی شمارہ:

سرائیوو سرائیوو

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ضمیر نیازی

کی معروف اور اہم کتاب

The Press in Chains

کا اردو ترجمہ

صحافت پابندِ سلاسل

مجلد ۳۷۵ صفحات قیمت: سو روپے

محمد عمر میمن

گم شدہ خطوط

اور دیگر تراجم

میلان کنڈیرا، الیگزانڈر سولژے نتسن، امین مالوف،
لیلیٰ بعلبکی اور جولین بارنز کی افسانوی تحریروں کے ترجمے

مجلد ۱۷۶ صفحات قیمت: اسّی روپے

Scanned with CamScanner

ترجمے:

محمد خالد اختر	اسد محمد خاں	فہمیدہ ریاض
محمد سلیم الرحمٰن	عطا صدیقی	افضال احمد سید
تنویر انجم	عرفان احمد خاں	ذی شان ساحل
	زینت حسام	اجمل کمال

خصوصی شمارہ

سرائیوو سرائیوو

شمارہ ۱۷ خزاں ۱۹۹۴

آج

ترتیب: اجمل کمال

آج

شمارہ ۱۷: خزاں ۱۹۹۴

ستمبر - دسمبر ۱۹۹۴

مینیجنگ ایڈیٹر

زینت حسام

اہتمام

آج کی کتابیں

بی ۱۳۰، سیکٹر ۱۱ بی، نارتھ کراچی ٹاؤن شپ، کراچی ۷۵۸۵۰

فون: ۸۱۱۳۴۷۴

طباعت

ایجوکیشنل پریس

پاکستان چوک، کراچی

Scanned with CamScanner

ترتیب

اجمل کمال: تعارف ۸

۱

وی پی گاگنون جونیئر: سربیا جنگ کے راستے پر ۲۵
نوئل مالکم: بوسنیا کی تباہی ۴۵
بوسنیا میں تہذیبی قتلِ عام (ایک دستخطی محضر) ۷۷

۲

کمال کُرسپاہِک: امید کا روشن مینار ۸۳
کمال کُرسپاہِک: غمناک ترین شہر ۹۰
کمال کُرسپاہِک: "قیامِ امن" کی بند گلی ۹۳
زلاتکو وزدارے وِچ: سرائیوو یاد ہے؟ ۹۷
زلاتکو وزدارے وِچ: اقوامِ متحدہ ختم ہو چکی ہے ۱۰۱

Scanned with CamScanner

۳

زلاتا فلیپووِچ: ڈائری ۱۰۷

۴

ہانس مولمان: فوٹوگرافر ۱۴۱

جان مولین: خون میں لتھڑی سڑکیں ۱۴۴

لوئیز میک کورکنڈیل: سرائیوو کی محصور عورتیں ۱۴۶

مایا فِش: سرائیوو کا سفر ۱۵۰

ناٹکا بُوتورووِچ: پاتال سے ۱۵۸

مارک پونتھس: سرائیوو کا نوحہ ۱۶۳

اقبال احمد: اقوامِ متحدہ: ایک وفات نامہ ۱۶۹

رابرٹ فِسک: گویا مارکس ہی کی بات درست نکلی ۱۷۳

زوران فِلپووِچ: جہنّم کا ایک موسم ۱۷۸

مِلاو بنکا دراکولیچ: موت کا کلوزاَپ ۱۸۴

بورو تودوروِچ: میں تمھارے ساتھ نہیں ہوں! ۱۸۹

۵

۱۹۳ سوزن سونٹاگ: سرائیوو میں "گودو کا انتظار"

٦

نجاد ابرِیشیموِچ: دو برِنیا ۲۲۱

۷

۲۳۹ عرفان ہوروزووِچ: بوسنیا کا بِجار
۲۴۲ اے ایس بایٹ: اژدہے کا سانس
۲۵۰ جولین بارنز: ہملٹ وائلڈ ویسٹ میں
۲۵۴ کلادیو ماگرِیس: غلطی
۲۵۹ بورا کوشِیک: ہامسون کو پڑھنا

۸

سلوبودان بلاگویےوِچ: میں حاضر ہوں! ۲۶۵
دراگو یانچار: آگسبرگ ۲۸۰

۹

ژاں بیرنفیلد: وُوکوور کی تباہی ۲۹۱

۱۰

بوگدان بوگدانووِچ: شہر اور موت ۳۲۳

۱۱

جواد قراحسن: سرائیوو: ایک دروں بیں شہر کا مرقع ۳۶۱

۱۲

گوران استیفانووسکی: سرائیوو: ایک شہر کے قصے (کھیل) ۳۷۵

Scanned with CamScanner

۴۵۷ دُبراوکا اُگریشک: جھوٹ کا کلچر

۴۷۸ دُبراوکا اُگریشک: زگرب خزاں ۱۹۹۲

۴۸۵ دُبراوکا اُگریشک: کروشیائی ادیبو، شب بخیر!

۴۹۳ دُبراوکا اُگریشک: بلقان کے اُداس گیت

اختتامیہ

زلاتکو درزدارےوِچ: تنہائی کے ایک ہزار دن ۵۲۱

۵۲۴ ماخذات

تعارف

متفرق تحریروں کا یہ انتخاب کراچی کی جانب سے سرائیوو کے لیے خراجِ تحسین ہے۔

اِس وقت پوری دنیا ایک ملک کے صفحۂ ہستی سے مٹنے کا (لغوی معنوں میں) تماشا دیکھ رہی ہے۔ یہ بات روز بہ روز یقینی ہوتی جا رہی ہے کہ بوسنیا اور اس کے عوام کو، ان کے ماضی اور حال کو، سفاکی کے ساتھ نیست و نابود کر دیا جائے گا اور اس وحشیانہ عمل میں جو پچھلے ڈھائی برس سے زائد عرصے سے جاری ہے، اس ستم رسیدہ ملک کو اپنی مدافعت کرنے کا جائز حق ہرگز نہیں دیا جائے گا۔

***

سوال کیا جا سکتا ہے کہ کشت و خون میں ایسی کیا انوکھی بات ہے۔ اور پھر دنیا کے بہت سے خطے اور بھی تو ہیں جو آج کسی نہ کسی طرح کی خوں ریزی سے گزر رہے ہیں۔ خود کراچی اپنے پچھلے دس برس کے زخموں سے نڈھال ہے۔ ایسے میں اِس شہر کا ایک دور اُفتادہ اجنبی شہر کو خراجِ تحسین پیش کرنا کیا معنی رکھتا ہے جس کے وجود تک سے یہاں کے رہنے والے تین برس پہلے تک بے خبر تھے؟

اس سوال کا جواب دینا ضروری ہے تاکہ اس انتخاب کی اشاعت کا جواز پوری طرح واضح کیا جا سکے۔ بوسنیا کا مسئلہ ـــ بلکہ زیادہ درست یہ ہوگا کہ اس مسئلے کے بارے میں من حیث القوم ہمارا جذباتی ردِ عمل ـــ کب کا ہماری قومی اُمنگوں کی کانِ نمک میں جا کر نمک بن چکا ہے۔ اِن امنگوں کا عموماً حقائق سے کچھ سروکار نہیں ہوتا کیوں کہ حقائق میں یہ خرابی ہے کہ وہ ہماری خواہشات کا تابع ہونا پسند نہیں کرتے۔ مثلاً بوسنیا کی جنگ کی اس بنیادی حقیقت سے ہمارے ہاں اغماض برتا جاتا ہے کہ بوسنیا مسلم اکثریت کا ملک نہیں ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ علیا عزت بیگووچ کی قیادت میں بوسنیا کی مخلوط حکومت اپنے ملک کو اس کی اصل صورت میں باقی رکھنے کی جدوجہد کر رہی ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، جب کہ سربیائی جارحیت اور مغربی یوروپ، امریکا اور (غیر کمیونسٹ) روس کا سفارتی دباؤ، دونوں اسے اس منصوبے کو قبول کرنے پر مجبور کر رہے ہیں جس کی رو سے مذہبی بنیاد پر اس ملک کا بٹوارا کر دیا جائے گا۔ اس حقیقت کا علم ہمیں رک کر کچھ سوچنے کی دعوت دے گا، اور غور و فکر کا عمل جذباتیت کی عین ضد ہوتا ہے۔

اس لیے یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ اس انتخاب کی اشاعت کا مقصد بوسنیا کے مسئلے کو توڑ مروڑ کر پاکستان کی قومی جذباتیت کا چارا بنانا نہیں ہے۔ ہم، ایک پس ماندہ اور کم زور ملک کے

Scanned with CamScanner

بےدوست و پا باشندے، اگر ظلم کا شکار ہونے والوں کی مدد کرنے سے قاصر ہیں تو ہمیں ان کا جذباتی استحصال کرنے سے بھی باز رہنا چاہیے۔

***

جارحیت اور بربریت کا شکار ہونے والے اس ملک اور اس کے عوام کے احترام کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ ان کی صورتِ حال کو، اور اُن کے نقطۂ نظر کو، حقائق کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی جائے۔ اور یہ کوشش صرف احترام کے اظہار کے لیے نہیں بلکہ آج کی دنیا میں اپنی صورتِ حال جاننے کے لیے بھی ضروری ہے۔

سرد جنگ کے جاتے لے ساتھ ہی دو بلاکوں میں بٹی ہوئی دنیا بھی ختم ہو چکی ہے اور اُس کے بارے میں اپنے شعوری ردعمل کا تعین کرنے کے سارے پیمانے ازکاررفتہ ہو گئے ہیں۔ ہمارے ہاں جتنے نمایاں فکری رجحانات موجود ہیں وہ اس نئی صورتِ حال کو سمجھنے کے اعتبار سے بالکل فرسودہ ثابت ہوتے ہیں۔ سفید اور سیاہ، مشرق اور مغرب، اسلام اور کفر کی سادہ دلانہ درجہ بندی کی مدد سے اس پیچیدگی کو سمجھنا محال ہے جس نے آج "نیو ورلڈ آرڈر" کے نام پر دنیا بھر پر تسلط حاصل کرنے کی خوں ریز مہم شروع کر دی ہے۔

بوسنیا کی صورتِ حال شاید اس پیچیدہ نئی دنیا کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے میں ہماری مدد کر سکے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مغربی یوروپ، امریکا اور روس نے اس معاملے میں جو حکمتِ عملی اختیار کی اس میں ایک عنصر "اسلامی بنیاد پرستی" کے خودساختہ مظہر کا بھی رہا ہے۔ جیسا کہ ایک ہم عصر حقیقت نگار انگریزی ادیب کا کہنا ہے:

> یہ تصور کرنا خاصا کارآمد ثابت ہو سکتا ہے کہ اگر بوسنیا کے لوگ مسیحی ہوتے اور سربیا کے رہنے والے مسلمان ہوتے، "محض نام کے مسلمان" ہی ہوتے، تب حالات کیا صورت اختیار کرتے۔ کیا یوروپ "سربیائی مسلمانوں" کی جانب سے کالعدم ریاست کا ٹکڑے ٹکڑے کیا جانا برداشت کر لیتا؟ اندازہ ہی سہی، لیکن میرا اندازہ ہے کہ یوروپ اسے ہرگز برداشت نہ کرتا۔ اور اگر یہ اندازہ درست ہے تو پھر یہ بھی درست ہے کہ "مسلمان" کا لیبل سرائیوو کی تقدیر سے یوروپ کی بےگانگی کی ایک بڑی وجہ ہے۔

لیکن جہاں تک بوسنیا کی جنگ کا تعلق ہے، یہ عنصر اس میں بنیادی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس جنگ کو صلیب و ہلال کا معرکہ قرار دے دینا عین وہی نعرہ ہے جس سے سرب جارحیت پسندوں نے اپنے ہم قوموں کے جنگی جنون کو بھڑکایا ہے۔ اس مفروضے کو قبول کرنا ہمارے اپنے قومی جنگی جنون کو مہمیز

دینے میں کار آمد ثابت ہو تو ہو، اس کی بنیاد پر آج کی دنیا کا کوئی مبنی بر حقیقت تصور قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس تصور کی غیر موجودگی میں کوئی کار آمد نقطۂ نظر اور قابلِ عمل حکمتِ عملی مرتب کرنا بھی ناممکن ہے۔

***

حقیقت یہ ہے کہ بوسنیا کچھ قیمتی انسانی اقدار کی علانیہ نمائندگی کرتا ہے اور سربیا کی نسل پرست فوجیں، اور ان کی پشت پناہی کرنے والی حکومتیں، انھیں اقدار کو برملا تباہ کرنے کے لیے برسرِپیکار ہیں۔ یہ قدریں نام نہاد "مغرب" یا نام نہاد "مشرق" کی پیداوار نہیں بلکہ انسانی تہذیب نے انھیں اپنے طویل سفر کے دوران انسانی تجربات کا تجزیہ اور ان پر غور و فکر کر کے اخذ کیا ہے۔ یہ قدریں انسانوں کے مختلف نسلی، لسانی اور مذہبی گروہوں کے درمیان رواداری اور بقائے باہم کی قدریں ہیں۔ سرائیوو شہر کو خراجِ تحسین پیش کرنا دراصل اِنھیں قدروں پر دو ٹوک اصرار کرنا ہے۔

آج کراچی میں (اور پورے ملک میں) ان قدروں کو ان کے فقدان سے پہچانا جا سکتا ہے۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہے کہ یہ شہر کسی واحد (نسلی، لسانی، مذہبی یا فرقہ وارانہ) گروہ کا مسکن نہیں ہے، اور نہ یہاں کی آبادی میں مختلف گروہوں کے تناسب کو دائمی حیثیت حاصل ہے۔ ملک کے پس ماندہ معاشرے میں اس مخلوط آبادی کو آگے چل کر جدید شہری تہذیب کی آماج گاہ کی رہنمایانہ حیثیت حاصل ہو سکتی تھی، اور یہ قدریں شہری زندگی کے دباؤ سے رفتہ رفتہ جڑیں بھی پکڑ رہی تھیں۔ لیکن پھر پروپیگنڈے اور بندوق کے ذریعے اس شہری آبادی پر فرسودہ قبائلی منطق نافذ کر دی گئی۔ یہ فرسودہ اور تہذیب دشمن منطق کسی شخص کو اپنی ترجیحات اور شعور کی روشنی میں اپنا سیاسی یا معاشرتی نقطۂ نظر وضع کرنے کی آزادی نہیں دیتی۔ کسی مخصوص (نسلی، لسانی، مذہبی یا فرقہ وارانہ) قبیلے میں پیدا ہونے والے فرد کے سامنے صرف ایک وحشیانہ انتخاب باقی رہنے دیا گیا ہے: قبیلے کا وفادار یا غدار۔

سربیا کے پروپیگنڈے نے بھی یہی نفرت انگیز کام کیا ہے، اور اس میں جن عناصر کو استعمال کیا ہے وہ ہمارے لیے بھی اجنبی نہیں ہیں۔ تہذیبی سطح پر سربیا کو اصرار ہے کہ "مشرقی" (اور تھوڈوکس) مسیحیت اور بازنطینی تہذیب کو "مغربی" (رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ) مسیحیت اور یوروپی تہذیب سے خطرہ لاحق ہے۔ (یہ موقف کروشیا کے خلاف جنگی جنون بھڑکانے کے لیے اختیار کیا گیا تھا؛ سال بھر بعد جب بوسنیا کو اس جارحیت کا ہدف بنایا گیا تو "مشرقی" مذہب اور تہذیب کے دشمنوں میں "اسلامی بنیاد پرستی" کا نام بھی شامل ہو گیا۔) کسی گروہ میں جنگی جنون کو ہوا دینے کے لیے عموماً خطرے میں گھرے ہوئے ہونے کا خوف پیدا کیا جاتا ہے۔ یہ خوف کسی حد تک حقیقی بھی ہو سکتا ہے، لیکن معروضی تجزیے اور ہوش مندانہ سیاسی اقدام کے ذریعے اس کے حقیقی عوامل کو زائل کرنا نسل پرستی پر مبنی کسی تحریک کا

Scanned with CamScanner

مقصد نہیں ہوتا۔ وہ اپنے مفادات کے لیے اس خوف کو بھڑکانے اور قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ سربیائی تحریک نے بھی خطرے اور خوف کے اس احساس کو تاریخ کے غیر منطقی اور غیر معروضی تصور سے دائمی حیثیت دینے کی کوشش کی۔ تاریخ کے اس استعمال کا فائدہ یہ ہے کہ چہار طرفہ مظلومیت کے احساس کے ساتھ ساتھ (نسلی، قومی، مذہبی یا فرقہ وارانہ) عظمت کا تصوّر مفت میں ہاتھ آجاتا ہے۔ اور خود کو "ترکیب میں خاص" اور "منتخبِ روزگار" جاننے کی خوش فہمی انسانوں کے بیش تر گروہوں کے لیے ناقابلِ مزاحمت ترغیب ثابت ہوتی ہے۔ اس پروپیگنڈے میں ذرائع ابلاغ نے کلیدی کردار ادا کیا ہے، لیکن اس مہم میں قوم پرست ادیبوں، دانش وروں اور محققوں کا دانستہ یا غیر ارادی کردار بھی کم اہم نہیں رہا۔

***

بلقان کی تاریخ اپنی پیچیدگی اور بوقلمونی کی باعث اس مفاد پرستانہ استعمال کا اُسی سہولت کے ساتھ نشانہ بن جاتی ہے جیسے خود ہمارے برصغیر کی تاریخ۔ اردو کے ایک اہم معاصر نقاد کا قول ہے کہ ماضی کو نہ جاننے سے ماضی پرستی جنم لیتی ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے بشرطے کہ ماضی کو جاننے سے مراد تاریخی حقائق کو انتہائی احتیاط اور تمام تر ممکنہ معروضیت کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرنا ہو نہ کہ جذباتی اسطورہ سازی کا لذت آمیز مشغلہ۔ یہ کہنا تحصیلِ حاصل ہے کہ کسی بھی اور تہذیبی سرگرمی کی طرح ماضی کو جاننا ایک دشوار، پیچیدہ اور نازک عمل ہے۔

اس سلسلے میں یوگوسلاویا کے آئیوو آندرچ (Ivo Andric) کا معاملہ خاصا معنی خیز ہے۔ ۱۸۹۲ میں تراونک (بوسنیا) میں پیدا ہونے والے آندرچ کو ۱۹۶۱ میں ادب کا نوبیل انعام دیا گیا تھا۔ اس نے آسٹرو ہنگیرین سلطنت کے زمانے میں آنکھ کھولی اور سیاسی اور ادبی طور پر سرگرم رہتے ہوے پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے تجربات سے گزرا۔ بوسنیا کی پیچیدہ اور متنازعہ تاریخ آندرچ کی تخلیقی زندگی کا اہم ترین قضیہ تھی۔ یہ درست ہے کہ بعض مقامات پر وہ تاریخ کے معاملے میں اپنی معروضیت پوری طرح برقرار نہ رکھ سکا، لیکن تشدد اور دہشت کے عوامل اس کے لیے دنیا میں شر کے وجود کی علامت رہے۔ نوبیل انعام پیش کیے جانے کے موقعے پر اپنی تقریر میں آندرچ نے کہا تھا:

> ہر شخص (ادیب) اپنی داخلی ضروریات کے لحاظ سے، اپنے پیدائشی یا اکتسابی میلانات کے اعتبار سے، اپنے تصورات اور ذریعۂ اظہار پر اپنی قدرت کے مطابق، اپنی کہانی کی تعمیر کرتا ہے۔ ہر شخص اپنی کہانی کی اخلاقی ذمے داری خود اٹھاتا ہے اور اسے اپنے انداز میں اپنی کہانی سنانے کی آزادی ہے۔ لیکن، انجامِ کار، امید یہی کی جانی چاہیے کہ آج کا ادیب اپنے ہم عصروں کو جو کہانی سنائے گا وہ، ہیئت اور مواد سے قطعِ نظر، نہ تو نفرت سے آلودہ ہو گی اور نہ

Scanned with CamScanner

کشت و خون کے آلات کی آوازوں کو اپنی آواز پر غالب آنے دے گی، بلکہ محبت سے جنم لے گی اور ایک آزاد اور پُرسکون انسانی ذہن کی کشادگی سے قوت حاصل کرے گی۔ اس لیے کہ ادیب اور اس کی تحریر اس وقت تک کوئی مقصد پورا نہیں کرتے جب تک وہ، کسی نہ کسی طور، انسان اور انسانیت کی خدمت نہ کرتے ہوں۔ یہی بنیادی نکتہ ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران لکھے ہوئے اپنے تین سلسلہ وار ناولوں The Bridge on the Drina، The Bosnian Story اور The Woman from Sarajevo میں (جنھیں مجموعی طور پر Bosnian Trilogy کا نام دیا جاتا ہے) آندرچ نے بوسنیا کی تاریخ کے تین ادوار کا تخلیقی روپ پیش کیا۔

سربیائی پروپیگنڈے نے آندرچ کی تحریروں میں سے وہ حصے اٹھا لیے جن میں ماضی میں بوسنیائی سربوں کو پیش آنے والے مصائب کا تذکرہ تھا اور انھیں سربوں کی مظلومیت (لہذا عظمت) کی علامت بنا کر پیش کیا۔ آندرچ کی جن تحریروں میں سربوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو پیش آنے والے تشدد کی تصویر کشی کی گئی تھی انھیں نظرانداز کر دیا گیا۔ اس پروپیگنڈے کے زور میں (جس کی رُو سے سربوں کے سوا تمام لوگ جہنم رسید ہونے کے لائق تھے) یہ بات بھی فراموش کر دی گئی کہ آندرچ خود نسلی اعتبار سے سرب نہیں بلکہ کروٹ تھا!

***

تاریخ کے حقائق کو نظرانداز کر کے اسے کسی گروہ میں تعصب اور تشدد اُبھارنے کی غرض سے مسخ کرنا ایک ایسا دل دوز تماشا ہے جو ہم اس برصغیر میں بھی متواتر دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ منفی عمل اس لحاظ سے اور بھی زیادہ المناک ہے کہ دوسرے گروہوں میں بھی اسی قسم کا غیر معقول رویہ پیدا کرتا ہے۔

ہمارے ہاں اس رویے کی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ موئنجودڑو کے کھنڈر انسانی تہذیب کے ارتقائی مطالعے کا بہت اہم اور قیمتی ماخذ ہیں۔ انھیں دریافت کرنے والے ماہرین نے ان کے جغرافیائی محلِ وقوع کے پیشِ نظر انھیں "انڈس سولائزیشن" یا وادیِ سندھ کی تہذیب کا نام دیا۔ ۱۹۴۷ تک ان کھنڈروں کو برصغیر کی ماقبل تاریخ تہذیب کے آثار سمجھا جاتا رہا۔ پاکستان کے حصے میں آنے کے بعد انھیں "بُت پرستانہ" (گویا ہندو، گویا بھارتی) تہذیب کے آثار سمجھ کر نظرانداز کیا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ جب بعض معاصر (غیر تاریخی) عوامل کے تحت سندھی قوم پرستی کا احساس پیدا ہوا تو یہی قدیم کھنڈر "سندھی تہذیب" کا شان دار پانچ ہزار سالہ ماضی بن گئے۔ (آج کل یہ کھنڈر "دیہی سندھ" یا عام بول چال کی زبان میں "اندرونِ سندھ" کی تہذیبی علامت بن چکے ہیں، اور عجب نہیں کہ کچھ عرصے بعد انھیں ضلع

لاڑکانہ کی تہذیب کا ماضی قرار دیا جانے لگے۔) ان پانچ ہزار برسوں کی کوئی متواتر تاریخ موجود نہیں ہے، لیکن مقبولِ عام دیومالا نے اس کے رخنوں کو بخوبی پر کر لیا ہے۔ پانچ ہزار سال پہلے اس علاقے میں بولی جانے والی زبان کے جو نمونے ملے ہیں ان کی مدد سے اسے پڑھنا یا اس کی اصل کا حتمی سراغ لگانا اب تک ممکن نہیں ہوا ہے، مگر قوم پرستی کی دیومالا کی رو سے یہ عین بین وہی زبان تھی جسے آج سندھی کہا جاتا (اور عربی رسم الخط میں لکھا جاتا) ہے۔

دوسری طرف لاہور کے ایک ادیب نے ان کھنڈروں کی مدد سے غالباً "نظریۂ پاکستان" کی ازلی و ابدی حقیقت کی توثیق کی کوشش کی۔ ان کے ایک حالیہ ناول کے پانچ ہزار سال قدیم کردار جو زبان بولتے ہیں اس میں اردو اور پنجابی بقدر مساوی شامل ہیں۔

ابھی دو سال پہلے ہم نے ایک اور تاریخی علامت کے مفاد پرستانہ استعمال کو تعصب اور تشدد پر منتج ہوتے دیکھا۔ ہندو احیا پرست سیاست داں ایودھیا میں قائم بابری مسجد کی عمارت پر کئی سال سے یہ کہہ کر دعویٰ کر رہے تھے کہ اسے ایک مندر کو گرا کر تعمیر کیا گیا تھا جو رام کی جنم بھومی کی علامت تھا۔ یہ دعویٰ تاریخی اعتبار سے بے بنیاد تھا اس لیے کہ رام کے تخیلی کردار کے انسانی وجود کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ دوسری طرف بابری مسجد کا ذکر مغل دور کی اہم تاریخی عمارتوں میں کہیں نہیں آتا اور اس عمارت کو طویل عرصے سے مسجد کے طور پر استعمال بھی نہیں کیا گیا تھا، لیکن ہندوستانی مسلمانوں پر بھی اس منفی پروپیگنڈے کا اُتنا ہی منفی اثر ہوا۔ شدّت جذبات کے اس دھماکاخیز ماحول میں دو برس پہلے اس مسجد کو مسمار کر دیا گیا جس نے خوں ریز فسادات کے ایک تازہ سلسلے کو جنم دیا۔ سرحد کے اِس طرف اس تہذیب دشمن واقعے کے ردعمل میں چار مندر گرا دیے گئے اور ہندوؤں کی بستیوں پر حملے ہوئے۔ ملتان کے ایک مندر کو گرانے کے "کام" میں شہر کے ترقیاتی ادارے کے بُل ڈوزر اور وفاقی حکومت کے ایک وزیر نے حصّہ لیا۔

بابری مسجد کے مسمار کیے جانے پر ہمارے ملک کے ایک اعلیٰ ترین عہدے دار کا بیان اخباروں میں شائع ہوا جس میں اس عمل کو ہندوؤں کی جانب سے، پانی پت کی جنگ میں بابر کے ہاتھوں ہونے والی شکست کا انتقام لینے کی کوشش قرار دیا گیا۔ اس تاریخی حقیقت کا اعادہ بے سود ہو گا کہ مذکورہ جنگ میں بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دی تھی جسے ہندو قرار دینا، اب تک، قدرے دشوار ہے۔

اسی عمل کی مثال کراچی میں بھی دیکھنے میں آئی جہاں ایک نو تشکیل شدہ "قوم" کو ایک دیومالائی عظمت درکار تھی۔ شہر کے ایک معروف چوراہے پر ان تاریخی شخصیتوں کی اصل سے کئی گنا بڑی تصویریں لگائی گئیں جن کی مدد سے "مہاجر کلچر" کی تاریخ کو ترتیب دیا جانا تھا۔ تاریخی شخصیات کے لیے کسی بھی قسم کے سلوک پر احتجاج کرنا ممکن نہیں ہوتا، چناں چہ ٹیپو سلطان، بہادر شاہ ظفر، سر سید احمد خاں، مولانا محمد علی (جنھیں پاکستان میں خدا جانے کیوں مولانا محمد علی جوہر کہا جاتا ہے) وغیرہ کو جس آسانی سے ہاتھ پکڑ کر تحریکِ پاکستان میں شامل کر لیا گیا تھا اسی سہولت سے مہاجر کلچر کا علم بردار بنا دیا گیا۔

تعارف

تاریخ کا استحصال حقائق کے اس احترام کے بالکل متضاد ہے جس کے بغیر تاریخی واقعات کے مطالعے سے کوئی دانش اخذ نہیں کی جا سکتی۔ اس انتخاب کے کئی مضمون نگاروں نے اس نکتے پر زور دیا ہے کہ جارحیت کرنے والوں نے کس طرح تاریخ کی مرئی شہادتوں --- عمارتوں، کتب خانوں، عجائب گھروں اور دستاویز خانوں --- کو باقاعدہ منظم منصوبہ بندی کے تحت تباہ کیا۔

حقائق کے احترام کا تقاضا ہے کہ بوسنیا کی صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے اُن واقعات پر توجہ مرکوز کی جائے جو وہاں پیش آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس انتخاب کے مشمولات کا آغاز دو ایسے مضامین سے کیا گیا ہے جن میں ۱۹۸۹ سے اب تک کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ بلقان کے خطّے کی قدیم اور معاصر تاریخ سے واقفیت ہمارے یہاں زیادہ عام نہیں ہے، اور اس موضوع پر کتابیں حاصل کرنا بھی دشوار ہے، اس لیے ان مضامین میں بیان کردہ حقائق کی تصدیق یا تردید آئندہ سامنے آنے والی کسی تحریر کی مدد سے ممکن ہے۔ یہاں اس نکتے پر زور دینا مقصود ہے کہ پروپیگنڈے کا توڑ صرف حقائق کی محتاط، غیر جذباتی اور معروضی جستجو کے متواتر عمل کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔

***

سابق یوگوسلاویا میں گروہی نفرتیں پھیلانے، جنگ کا آغاز کرنے اور اس کی شدت بڑھانے میں ذرائع ابلاغ نے بہت بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ قتل و غارت کے لیے فضا بنانے اور ایک پوری آبادی کو بیک وقت دہشت اور اشتعال میں رکھنے کے لیے تشدد پسند گروہ لوگوں تک درست خبریں پہنچنے سے روکنا لازمی سمجھتے ہیں کیوں کہ اس قسم کی سیاست صرف مسخ کردہ حقائق کے زور پر کامیاب ہو سکتی ہے۔ خوف میں گھرے ہوئے لوگ رفتہ رفتہ اپنے خوف کو غذا فراہم کرتے رہنے کی مریضانہ ضرورت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ یہ غذا اُن کو افواہوں اور سازش کی تھیوریوں کی شکل میں فراہم کی جاتی ہے تاکہ انھیں انتہا پسندانہ سیاسی نقطۂ نظر اور تشدد کے افعال کا حامی بنایا جا سکے۔

یوں تو یہ بات پوری پاکستانی صحافت کے غالب رجحان پر درست بیٹھتی ہے، لیکن جس کسی نے کراچی میں پچھلے دس برس کے اخباروں کا مطالعہ کیا ہے اسے یہ عمل ذرا بھی اجنبی محسوس نہیں ہوگا۔ اپنے (نسلی، لسانی، مذہبی یا فرقہ وارانہ) گروہ سے باہر کے تمام انسانوں کو خبیث، شیطان اور سازشی باور کرانے کے اس عمل کو ہمارے ہاں صحافت کا نام دیا جاتا ہے۔ ایسے رسالے باقاعدگی سے شائع ہوتے ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ ملک کو اپنے قیام سے لے کر اب تک جن مصیبتوں کو سامنا کرنا پڑا ہے ان کی ذمے داری ایک ایسے گروہ پر ہے جس کے عقائد آبادی کی اکثریت کے عقائد سے مختلف ہیں۔ نسلی اور لسانی نفرتیں بھڑکانے کا مشغلہ بھی ہمارے اخباروں کو خاصا دلچسپ اور منفعت بخش محسوس ہوتا ہے۔ چند سال پہلے حیدرآباد شہر کے دو اخباروں کے ایک مالک کا نام سامنے آیا تھا جن میں سے ایک اخبار سندھی زبان

میں شائع ہوتا تھا اور دوسرا اردو میں، اور دونوں اپنے اپنے پڑھنے والوں میں خوف، نفرت اور تشدّد کے جذبات کو ہوا دینے کا کام یکساں دلجمعی کے ساتھ کرتے تھے۔ یہ کام رفتہ رفتہ ایک پوری صحافتی صنعت بن چکا ہے جس کے قبیح ترین نمونے کراچی کے بے شمار شام کے اخباروں میں دیکھے جا سکتے ہیں جو پڑھنے والوں کی جذباتی ضرورت، اور ان سے وابستہ "صحافیوں" کی معاشی ضرورت، کو پورا کرنے کی غرض سے اچانک پھوٹ پڑے ہیں۔

مختلف چھوٹے بڑے گروہوں کی نفسیات میں خوف، نفرت اور تشدّد کے ماؤف کر دینے والے احساس کی یہ پرورش انجام کار ہمارے قومی مزاج کا حصہ بنتی جاتی ہے جس کے باعث ہم حقائق کو بھڑکے ہوئے جذبات، آسیب خوف اور مقامی اور بین الاقوامی سازش کی بے سروپا تصویروں کے مسخ شدہ آئینوں میں دیکھنے پر مجبور کر دیے جاتے ہیں۔

اس بات پر اصرار کرنا ضروری ہے کہ صحافت کا ایک اَور تصوّر بھی ممکن، اور عملی طور پر موجود، ہے۔ بوسنیا کی صورتِ حال کے تعلق سے اس قسم کی صحافت کے کچھ نمونے موجودہ انتخاب کے دوسرے، چوتھے اور نویں حصے میں پیش کیے گئے ہیں۔ (اس کی ایک مثال سربیائی پریس فوٹوگرافر بویان استویانووچ ہے جس کی کھینچی ہوئی تصویروں سے دنیا کو پہلی بار معلوم ہوا کہ سربوں نے بوسنیا میں قتلِ عام کا آغاز کر دیا ہے۔ ایسی ایک تصویر موجودہ انتخاب کے سرورق کی پشت پر شائع کی گئی ہے۔)

ہمارے ہاں کے مروّجہ ادبی نظریوں میں صحافت کو بالعموم ادب کے متضاد کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اگر اس رویّے کا باعث ہماری صحافت کا عمومی گھٹیا معیار ہوتا تو یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی، لیکن ایسا نہیں ہے۔ ان عجیب و غریب نظریوں کی رُو سے معاصر حقائق کا تذکرہ، یا ان پر تبصرہ، بجائے خود ایک ادنیٰ درجے کا کام سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات کہنا ضروری ہے کہ ذات پات کے اس فرسودہ تصوّر سے "آج" کا کوئی تعلق نہیں۔ اس دنیا میں انسان کی زندگی ادب اور صحافت دونوں کے موضوعات کا ماخذ ہے، اور دونوں ان موضوعات کو اپنے اپنے اسلوب میں کھنگالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عمدہ ادبی تحریروں کے ساتھ ساتھ عمدہ صحافتی تحریریں "آج" کے صفحات پر اس سے پہلے بھی شائع ہوئی ہیں، موجودہ انتخاب میں بھی شامل ہیں اور آئندہ بھی جگہ پاتی رہیں گی۔

***

جس اندوہ ناک صورتِ حال سے آج بوسنیا دوچار ہے اس میں ادب (اور آرٹ) کیا کردار ادا کر سکتا ہے اور یہ کردار کس حد تک موثر ہو سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب پانے کی جستجو خود ہمارے لیے بھی مفید ثابت ہو سکتی ہے، کیوں کہ پچھلی نصف صدی میں ہماری ادبی بحث ادب برائے زندگی اور ادب

Scanned with CamScanner

برائے چناں کے یکانہ مشغلے سے آگے نہیں بڑھی ہے اور ہمارے ہاں ایسے لوگوں کو سنجیدہ ادبی نقاد سمجھا جاتا ہے جو فلاں، فلاں اور فلاں موضوعات کو ادب سے خارج گردانتے ہیں۔

پروپیگنڈے اور اسلحے کی دنیا میں آرٹ کی بے اثری بالکل واضح ہے، اور یہ بات صرف بوسنیا تک محدود نہیں۔ لیکن تلوار کا وار قلم پر روکنا، اس بات پر اصرار کرنا کہ "وہ چیز جسے سچ کہتے ہیں ابھی تک موجود ہے، خواہ جنگ اور دنیا کے سیاست دانوں نے اسے کتنا ہی تار تار کیوں نہ کر ڈالا ہو"، یہی کسی ادیب کے لیے واحد ادبی چارہ کار ہے۔ اس کا غیر ادبی متبادل ایک تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ، مثال کے طور پر، معاصر روسی ادیب ایدوارد لیمونوف کی طرح اپنی جنگجویانہ قوم پرستی کی خدمت میں لگ جائے، اور دوسرا یہ کہ لکھنا چھوڑ دے۔ اور، جیسا کہ کروشیائی ادیب دُبراوکا اُگریشک کہتی ہے، لکھنے کا مطلب ہے سوچنا۔ اُگریشک کے چار مضامین اس انتخاب کے آخری حصے میں شامل ہیں اور اس سلسلے میں بہت خیال انگیز ثابت ہو سکتے ہیں۔

بوسنیائی ادیب نجاد ابر شیموِچ کی اثر انگیز تحریر "دو برنیا" بھی، جس کا ترجمہ اس انتخاب کے پچھلے حصے میں پیش کیا گیا ہے، ایک اعتبار سے اسی موضوع سے متعلق ہے۔

سرائیوو کے رہنے والوں کے لیے ادب (اور آرٹ) کی کیا معنویت ہے؟ اس کا ایک ممکنہ جواب وہاں کے تھیٹر کے ایک ہدایت کار حارث پاشووِچ نے ان لفظوں میں دیا ہے:

> سرائیوو میں آرٹ زخموں کو مندمل کرنے والی ایک قوت کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے لیے یہ کوئی تعیش نہیں ہے، جس کی طرف ہم اپنا روزمرہ کا کام کرنے کے بعد متوجہ ہوتے ہوں۔ یہ ہماری ایک ایک دن کی بقا کا ایک بنیادی جُز ہے۔

پاشووِچ وہ شخص ہے جس نے ۱۹۹۳ میں، سرائیوو کو نشانہ بناتی ہوئی توپوں اور بندوقوں کی سرگرمی کے بیچوں بیچ، فلم اور تھیٹر کا بین الاقوامی فیسٹول منعقد کیا۔ یہ بات سمجھنا شاید ہمارے لیے دشوار ہو لیکن، جیسا کہ امریکی ادیب سوزن سونٹاگ نے لکھا ہے، سرائیوو کی موجودہ، یاس انگیز، صورتِ حال میں صرف وہی لوگ خود کو خوش قسمت سمجھ سکتے ہیں جو اپنے معمول کے کام میں مصروف ہیں۔ آپ چاہیں تو اسے فرار پسندی کہہ سکتے ہیں، لیکن اس حقیقت کا سامنا کسی نہ کسی طور کرنا ہی ہوگا کہ رفتہ رفتہ کراچی شہر بھی اپنے زمانۂ امن کے معمول سے محروم ہوتا چلا جا رہا ہے۔

جس وقت ارد گرد کے ماحول پر جنون کا غلبہ ہو تو معمول کی چیزوں پر زور دینا ہی ہوش مندی کو سلامت رکھنے کا طریقہ ہے۔ مجاہدانہ جوش سے سرشار مسلح سرب بوسنیائی شہروں اور قصبوں کی ناپسندیدہ عمارتوں کو مسمار کر کے باقی ماندہ دیواروں پر لکھ دیتے ہیں: "یہ سربیا ہے!" ایسے ایک دیواری نعرے کے نیچے لکھا ہوا پایا گیا: "نہیں، بےوقوف! یہ ڈاک خانہ ہے۔"

سوزن سونٹاگ نے جولائی اگست ۱۹۹۳ میں سرائیوو جا کر وہاں کے اداکاروں کی مدد سے سموئل بیکٹ کا کھیل "گودو کا انتظار" اسٹیج کیا۔ اس تجربے کی روداد اس انتخاب کے پانچویں حصے میں پیش کی گئی ہے۔ سونٹاگ نے اپنے اس احساس کو بیان کیا ہے کہ گویا بیکٹ نے یہ کھیل سرائیوو کے لیے اور سرائیوو ہی کے بارے میں لکھا تھا۔ تازہ صورتِ حال کس طرح ایک پُرانے متن میں نئے معنی پیدا کر دیتی ہے، اس کی مثال برطانوی ادیب جولین بارنز اور سربیائی ادیب بورا کوشِیک کی کہانیوں میں بھی ملتی ہے جو تین اور کہانیوں کے ساتھ اس انتخاب کے ساتویں حصے میں شامل ہیں۔

یہ پانچ کہانیاں اُس ادبی سرگرمی کا حصہ ہیں جسے "شہرزاد ۲۰۰۱" کا نام دیا گیا ہے۔ یہ بجائے خود ایک پُرانے متن "الف لیلہ و لیلہ" کی نئی، جرأت مندانہ، تعبیر کی ایک مثال ہے۔ اس تعبیر کی رو سے کہانیاں سنانے والی شہرزاد کا سفاک بادشاہ سے رشتہ دو ایسے فریقوں کے درمیان کش مکش پر مبنی ہے جن میں سے ایک کے پاس اقتدار (گویا اسلحے) کی طاقت ہے اور دوسرے کے پاس تخیل کی۔ کہانیوں کی اس سرگرمی میں بوسنیا کے علاوہ سربیا، کروشیا، فرانس، برطانیہ، ہالینڈ، اٹلی اور ٹرکی کے ادیب حصہ لے رہے ہیں اور اپنے اپنے زاویے سے سچ کو جاننے کی کوشش کر کے اُن قدروں پر اصرار کر رہے ہیں جو انسانوں کے انسانوں کی طرح جینے کے لیے لازم ہیں۔

انتخاب کے آٹھویں حصے میں شامل سربیائی ادیب سلوبودان بلاگویےوچ اور سلووینی ادیب دراگو یانچار کی تحریریں بھی اس فکشن کے نمونے ہیں جو انسانی اقدار سے وابستگی اور سچائی کی تلاش ترک کرنے کو ہرگز تیار نہیں، خواہ اسے کتنی ہی بے اثر یا شر انگیز سرگرمی کیوں نہ سمجھا جائے، کیوں کہ یہ جبر (یا اختیار) ادیب کی انفرادی تقدیر بھی ہے اور اس کے ادبی منصب کا تقاضا بھی۔ اطالوی فکشن نگار کلادیو ماگریس نے اپنی کہانی "غلطی" میں اپنے ہم وطن پیش رو اِتالو سویوو کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "عمدہ قصہ گوئی کے لیے آدمیوں اور چیزوں کی سچائی پر پوری توجہ دینا اور اس کا مکمل احترام کرنا پہلی شرط ہے"۔ ماگریس کا یہ بھی کہنا ہے کہ "زبان، گویا سچ، کا احترام کر کے آدمی اپنی زندگی کو زیادہ بامعنی بنا سکتا ہے"۔

***

لکھنے والوں کو اپنی اس سرگرمی کے نتیجے میں —جسے ایک معاصر اردو نقاد کے لفظوں میں "انسانی دلاوری کی آواز" بھی کہا جا سکتا ہے— بے اثری کا طعنہ اور شر انگیزی کا الزام، دونوں بیک وقت سننے پڑتے ہیں۔ اگر ایک طرف ان سے کہا جاتا ہے کہ "ادیبوں کو گانٹھتا ہی کون ہے!" تو دوسری طرف یہ بھی کہ وہ "قوم کی امنگوں سے بے اعتنائی کا ثبوت دے رہے ہیں۔" اس کے باوجود، یہ بھی حقیقت ہے کہ سابق یوگوسلاویا، مغربی یوروپ اور امریکا سے تعلق رکھنے والے بعض ادیبوں، فن کاروں، دانش وروں اور

Scanned with CamScanner

اخبار نویسوں نے اپنی قوم کی امنگ اور غالب رجحان کو سچائی اور انصاف کے خلاف صف آرا پایا تو، طعنوں اور ملامتوں سے بے نیاز ہو کر، احتجاج میں اپنی آواز بلند کی۔

آج، جب ہمارے ارد گرد اور دنیا کے بیشتر حصّوں میں تشدّد، استبداد اور زہریلے پروپیگنڈے کو غلبہ حاصل ہے، یہ ایمان کہ دنیا میں سچ کا وجود ہے، اور اس کی گواہی دینے والے چند لوگ بھی موجود ہیں، ایک کم یاب انسانی امید ہے۔ یہ بات ہمارے لیے تقویت کا باعث بھی ہو سکتی ہے اور خود ہمارے ادیبوں، فن کاروں، دانش وروں اور اخبار نویسوں کی رہنمائی بھی کر سکتی ہے۔

سرائیوو کے دکھی اور دلیر شہریوں سے اس کٹھن وقت میں یگانگت کا اظہار کرنا دراصل اسی کم زور امید کا جشن منانا ہے اور ان قیمتی اقدار سے اپنی وابستگی کا اعلان کرنا ہے جو اس دورافتادہ اور مصیبت زدہ شہر کا جوہر ہیں۔

***

شہر کا جوہر اور شہر کی تقدیر، اور ہر گروہ اور فرد کے اندر ہونے والی شہر دوستی اور شہر دشمنی کے رجحانات کی مسلسل کش مکش -- یہ وہ اصطلاحات ہیں جن کی مدد سے ماہرِ تعمیر اور علم شہریات کے بزرگ استاد بوگدان بوگدانووچ نے سرائیوو -- اور بلقان کے دوسرے شہروں -- کی ابتلا کا تجزیہ کیا ہے۔ علم اور احساس سے معمور اس تحریر میں، جس کا ترجمہ اس انتخاب کے دسویں حصّے میں پیش کیا گیا ہے، بوگدانووچ نے شہر کے تصوّر کو انسان کے تہذیبی ارتقا کی منفرد اور بیش بہا علامت کے طور پر جاننے کی کوشش کی ہے، اور شہر کی مدافعت کو آنے والے وقت کا اہم ترین، بلکہ واحد، اخلاقی قضیہ قرار دیا ہے۔

> میں شہر کو یادوں کے ایک بے مثل ذخیرے کے طور پر دیکھتا ہوں، جو کسی واحد قوم، نسل یا زبان کی مجموعی یادداشت سے کہیں بڑھ کر ہے -- اگر "بشریاتی یادداشت" کا یہ بے نظیر، بیش بہا مجموعہ منتشر ہو جائے تو اس انتشار کے نتائج کیا ہوں گے؟ کیا یہ حادثہ انسانی وجود کے ایک اہم پہلو، شاید سب سے زیادہ نفیس پہلو، کو تباہ نہیں کر ڈالے گا؟

فنِ تعمیر کی علامتوں سے زندگی بھر کی آشنائی کے بعد بوگدانووچ نے یہ غیر مبہم نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کسی خالص کلچر کا کوئی وجود نہیں۔ کلچر کی خالصیت کے دعوے کسی ایسے خطّے کے لیے خاص طور پر مہلک ثابت ہو سکتے ہیں جہاں ایک سے زائد تہذیبی گروہ موجود ہوں۔ اور یہ خطّہ بلقان ہی نہیں ہمارا برصغیر بھی ہو سکتا ہے۔

بوگدانووچ کا خیال ہے کہ کسی شہر سے محبّت کرنے کے لیے اسے سمجھنا ضروری ہے۔ سرائیوو شہر کو سمجھنے کی ایک کوشش اس شہر کے باشندے اور فنِ ڈراما کے استاد جواد قراحسن نے اپنے مضمون

"سرائیوو: ایک دروں بیں شہر کا مرقع" میں کی ہے، اور دوسری مقدونیائی ڈراما نگار گوران استیفانووسکی نے اپنے کھیل "سرائیوو: ایک شہر کے قصے" میں۔ یہ دونوں تحریریں بالترتیب گیارھویں اور بارھویں حصے میں پیش کی گئی ہیں۔ اس شہر کی ایک اَور، سادہ اور بےساختہ، تصویر گیارہ سالہ زلاتا فلیپووِچ کے روزنامچے میں دکھائی دیتی ہے جس کے کچھ اوراق اس انتخاب کے تیسرے حصے میں شامل ہیں۔

بوگدانووِچ کا کہنا ہے:

> جس شے کو مَیں "شہر کا پاکیزہ جوہر" کہتا ہوں، وہ انسانی فطرت کے بہترین گوشے سے، اس کے اخلاقی حسن سے پھُوٹتی ہے۔ کوئی بیس برس ہوئے، میں نے لکھا تھا: "ہم سب آج بھی اپنے لافانی شہروں کو اپنے وجود میں تھامے ہوئے ہیں۔" لیکن اس میں کیا شک ہے کہ کسی شہر کو اپنے وجود میں تھامے رکھنے کے لیے یہ بھی تو ضروری ہے کہ ہمارا کوئی شہر ہو اور ہمیں اس کی قدر بھی معلوم ہو۔

سرائیوو کو جارحیت کا نشانہ بنانے والے، اور اپنے عمل یا بےعملی سے، خودفریبی یا مردم فریبی سے، اُن کا ساتھ دینے والے تمام ("مغربی" اور "مشرقی") حکمراں، شہر کے اسی پاکیزہ جوہر کو فنا کر دینا چاہتے ہیں۔ لیکن شہر صرف بیرونی جارحیت ہی سے تباہ نہیں ہوتے، اندرونی بگاڑ اور تشدد کے ہاتھوں بھی ملیامیٹ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے شہروں کو، خصوصاً کراچی کو، آج یہی خطرہ لاحق ہے، اور سرائیوو کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے اس سوال کا واضح جواب دینا ضروری ہے: ہم شہر کو بچانا چاہتے ہیں یا نہیں؟

***

تحریروں کا یہ انتخاب کراچی کی طرف سے سرائیوو کو پیش کیا جانے والا پہلا خراجِ تحسین نہیں ہے۔ اس سال کے آغاز میں ضمیر نیازی نے اپنی کتاب The Web of Censorship کو سرائیوو کے روزنامہ Oslobodjenje ("آزادی") سے وابستہ جرأت مند اور صحیح الدماغ صحافیوں کے نام معنون کیا تھا جو ناقابلِ تصور حد تک دشوار حالات میں کام کرتے ہوئے بھی نسلی منافرت کے منکر ہیں اور جب کوئی ان سے ان کی قومیت پوچھتا ہے تو جواب میں "اخبار نویس" بتاتے ہیں۔

ضمیر نیازی ہی نے دُبراوکا اگریشک کے وقیع مضمون "جھوٹ کا کلچر" اور بعض دوسری تحریروں سے متعارف کرایا اور اِس سال ستمبر میں تجویز پیش کی کہ "آج" کا ایک شمارہ بوسنیا کے لیے مخصوص کیا جائے۔

اس انتخاب کی تیاری میں بہت سے دوستوں نے حصہ لیا ہے جن کے تعاون کے بغیر اسے شائع کرنا ناممکن ہوتا۔ رومانہ محمود، صابرہ بانو اور ڈاکٹر محمد عمر میمن نے بالترتیب لندن، ایمسٹرڈیم اور میڈیسن

Scanned with CamScanner

سے مطلوبہ تحریریں فراہم کیں۔ محمد خالد اختر، اسد محمد خاں، فہمیدہ ریاض، محمد سلیم الرحمن، عطا صدیقی، افضال احمد سید، تنویر انجم، عرفان احمد خاں اور ذی شان ساحل نے اپنی دیگر مصروفیتوں کے باوجود اس منصوبے میں پوری دل چسپی لی اور اس انتخاب میں شامل تحریروں کے ترجمے کیے۔ "آج" ان سب کے تعاون اور حوصلہ افزائی کا ممنونِ احسان ہے۔

ممنونیت کے اظہار کے ساتھ ساتھ یہ واضح کر دینا مناسب ہے کہ اس تعارف میں بیان کردہ خیالات اور اخذ کردہ نتائج کی ذمے داری ان تمام دوستوں میں سے کسی پر عائد نہیں ہوتی۔

اجمل کمال

۲۳ دسمبر ۱۹۹۴

Scanned with CamScanner

وی پی گاگنون جونیئر: سربیا جنگ کے راستے پر

نوئل مالکم: بوسنیا کی تباہی

بوسنیا میں تہذیبی قتلِ عام (ایک دستخطی محضر)

Scanned with CamScanner

وی پی گاگنون جونیئر (V P Gagnon, Jr.) میک آرتھر فاؤنڈیشن کے پوسٹ ڈاکٹرل فیلو کے طور پر "تغیرپذیر دنیا میں امن اور سلامتی" کے موضوع پر تحقیق کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کورنیل یونیورسٹی کے مطالعۂ امن کے پروگرام کے وزِٹنگ فیلو بھی ہیں اور سابق یوگوسلاویا کے بارے میں ایک کتاب کی تیاری میں مشغول ہیں۔

***

نوئل مالکم (Noel Malcolm)، برطانوی تاریخ داں اور اخبار نویس، ۱۹۵۶ میں پیدا ہوے اور ایٹن اور کیمبرج میں تعلیم حاصل کی۔ تاریخ کے مضمون میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد مالکم ۱۹۸۱ سے ۱۹۸۸ تک کیمبرج یونیورسٹی سے ملحق ایک کالج کا فیلو رہے۔ بعد میں انھوں نے فارن ایڈیٹر کے طور پر اخبار "اسپیکٹیٹر" کے عملے میں شمولیت اختیار کر لی۔ آج کل وہ سیاسی کالم نگار کی حیثیت سے روزنامہ "ٹیلیگراف"، لندن، سے وابستہ ہیں۔ ان کی کتاب *Bosnia: A Short History* ۱۹۹۴ میں میکملن (لندن) نے شائع کی ہے۔ اس کتاب کے پیش لفظ اور آخری دو ابواب کی تلخیص "بوسنیا کی تباہی" کے عنوان سے انتخاب کے اس حصے میں شامل ہے۔

***

انتخاب کے اس حصے میں پیش کی جانے والی تیسری تحریر دراصل ایک دستخطی بیان ہے جس پر یوروپ کے مختلف ملکوں سے تعلق رکھنے والے تقریباً ایک سو پچاس اسکالروں اور استادوں نے دستخط کیے۔

POST-1945 YUGOSLAVIA: REPUBLICS, AUTONOMOUS PROVINCES, HISTORIC REGIONS AND CITIES

Scanned with CamScanner

How Yugoslavia has fallen apart

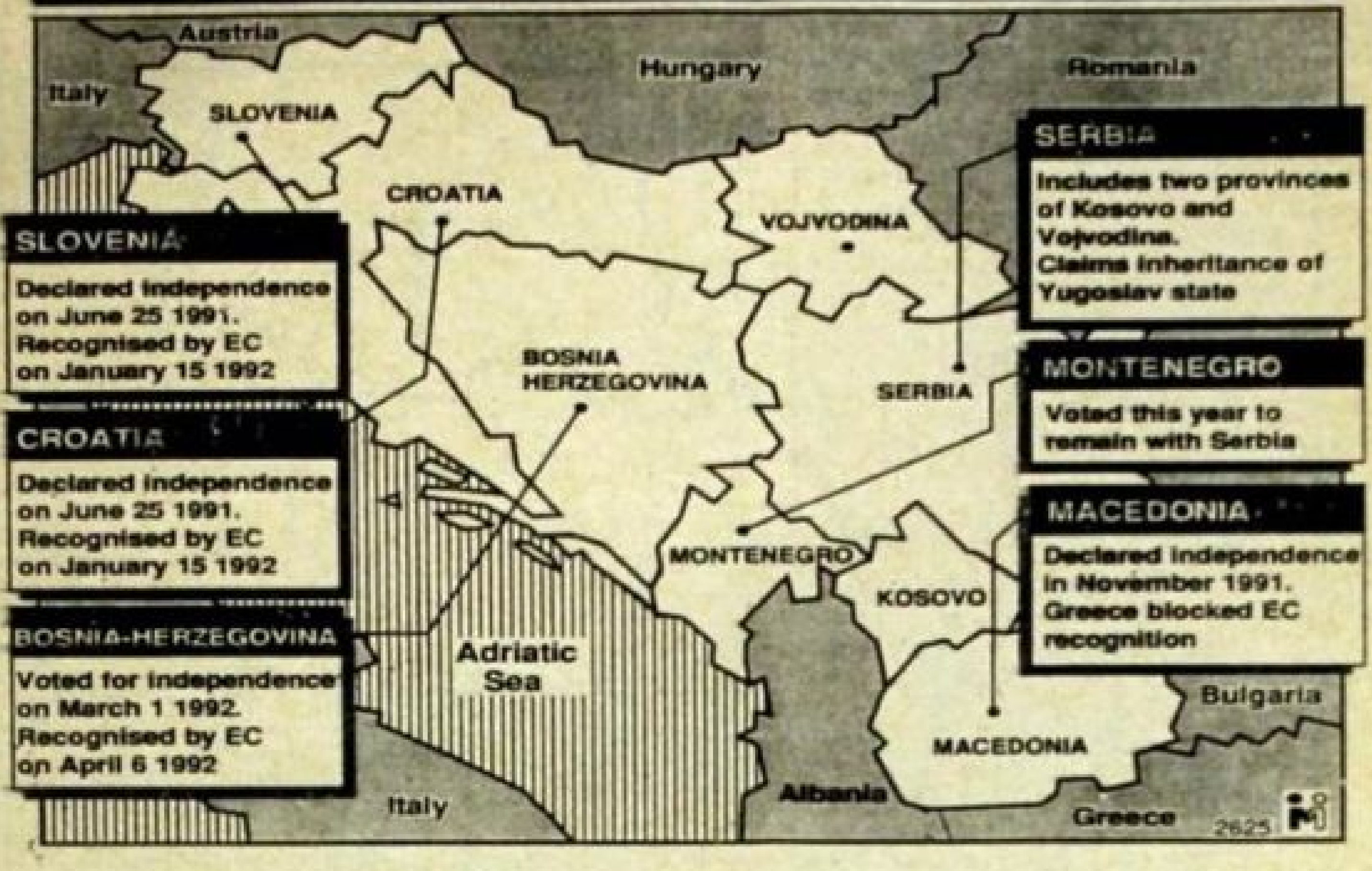

Breaking up Bosnia

وی پی گاگنون جونیئر

ترجمہ: اجمل کمال

سربیا جنگ کے راستے پر

کچھ عرصہ پہلے تک یوگوسلاویا کو مشرقی یوروپ کا درخشاں ستارہ کہا جاتا تھا۔ اگرچہ دوسرے سوشلسٹ ملکوں کی طرح اس کا ریاستی ڈھانچا بھی شدید مسائل کا شکار تھا، لیکن یہ ملک مغربی یوروپ کے لیے کھلا ہوا تھا، اس کے شہری باہر کا سفر کرسکتے تھے اور پورے یوروپ میں جا کر کام کیا کرتے تھے، دیگر سوشلسٹ ملکوں کی نسبت اس کے سیاسی طور پر ممتاز لوگ زیادہ کاسموپولیٹن اور مغربی افکار کی طرف مائل تھے، اور حکمراں کمیونسٹ پارٹی کے اندرونی حلقوں میں لبرل جمہوریت کے تصورات پر کھل کر بحث ہوتی تھی اور ان تصورات کی حمایت کرنے والا ایک گروہ موجود تھا۔ درحقیقت جس وقت میخائل گورباچوف سوویت یونین میں تبدیلی لانے کے لیے اولیں متذبذب اقدامات کر رہا تھا، یوگوسلاویا میں، نہ صرف کمیونسٹ پارٹی میں بلکہ سرکاری اہلکاروں کے نسبتاً وسیع حلقے میں بھی، خفیہ رائےدہی اور ایک سے زیادہ امیدواروں پر مبنی انتخابات منعقد کیے جا رہے تھے۔ خود حکمراں پارٹی کے اندر کثیرجماعتی جمہوریت کی ضرورت اور شخصی ملکیت کو "معیشت کا ستون" قرار دینے کے حق میں دلائل دیے جانے لگے تھے۔ اگرچہ یوگوسلاو فیڈریشن کو ریاست کی ساخت اور سیاست کے سلسلے میں واضح طور پر کچھ تنازعات کا سامنا تھا، لیکن وہ علاقے کے دوسرے سوشلسٹ ملکوں کی نسبت کہیں زیادہ آگے نکل چکی تھی۔

ان لبرل رجحانات کی قیادت سربیا کی کمیونسٹ پارٹی اور بلغراد میں مقیم دانشوروں کے ایک بڑے حصے کے ہاتھ میں تھی۔ جمہوریت پسند رجحانات سلووینیا میں بھی زور پکڑ چکے تھے اور کسی نہ کسی حد تک یوگوسلاو ریپبلک کی ہر ریاستی کمیونسٹ پارٹی میں موجود تھے۔ اس کے باوجود کچھ حقائق ایسے تھے جن کے باعث سربیا کے لبرل جمہوریت پسندوں کو ملک کے کثیرمشربی (pluralist) مستقبل کی جانب سفر میں قائدانہ حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ ایک تو یہ کہ سربیا وفاق کی سب سے بڑی ریاست تھی، دوسرے یہ کہ سرب یوگوسلاویا میں سب سے بڑی نسلی

Scanned with CamScanner

آبادی کی حیثیت رکھتے تھے؛ اور تیسرے یہ کہ بلغراد نہ صرف وفاق کا بلکہ ریاست سربیا کا بھی دارالحکومت تھا اور وہاں موجود جمہوریت پسند نسبتاً کہیں زیادہ بااثر ثابت ہوسکتے تھے۔

لیکن 1991 کے موسم بہار کے بعد سے یوگوسلاویا کئی فریقوں کے درمیان ایک سفاکانہ جنگ کی لپیٹ میں آگیا ہے جس کے نتیجے میں لاکھوں افراد مارے جاچکے ہیں، دسیوں لاکھ لوگ مہاجرین میں تبدیل ہوگئے ہیں اور اس جنگ نے پوری دنیا کو دہشت میں مبتلا کردیا ہے۔ اگرچہ تاریخی، ثقافتی اور نسلی تنازعات کو خطۂ بلقان کے رہنے والوں کا ورثہ قرار دے کر اس جنگ کا جواز پیش کیا جاتا رہا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جنگ سربیا کے سیاسی طاقت رکھنے والے چھوٹے سے گروہ کی دانستہ منصوبہ بندی اور سوچے سمجھے اقدامات کا ایک حصہ ہے۔ اس قلیل گروہ کو سربیا کی کمیونسٹ پارٹی میں پیدا ہونے والے جمہوری اور لبرل رجحانات سے سب سے زیادہ خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ یہ جنگ ہرگز ان "قدیم نسلی نفرتوں" کا بے ساختہ نتیجہ نہیں ہے جو کہا جاتا ہے کہ ثقافتی اور تاریخی تنازعات کے جمہوریت مخالف ماحول میں طویل عرصے سے اُبل رہی تھیں۔ اور نہ ہی یہ جنگ مختلف نسلی گروہوں کے درمیان مفادات کے ٹکراؤ کے باعث قدرتی طور پر شروع ہوئی ہے۔ یہ جنگ درحقیقت سیاسی کثیر مشربی اور لبرل جمہوری اقدار کی حمایت کے، خاص کر سربیا میں، زور پکڑ جانے کے خلاف دانستہ شروع کی گئی ہے۔

ان جمہوری رجحانات کو روکنے کی شدید خواہش نے سربیا میں پارٹی کی قیادت میں شامل قدامت پسند (کنزرویٹو) عناصر کو ایک مقصد پر اکٹھا کردیا۔ مقامی اور علاقائی پارٹی کے سرکردہ افراد (جن کی سیاسی حیثیت اور طاقت پرانے نظام کے قائم رہنے پر منحصر تھی)، پرانے خیال کے مارکسی دانشور، اور یوگوسلاو فوج کے لوگ (جن کی سیاسی طاقت اور مادی مراعات جمہوری قوتوں کا پہلا ہدف بنتی تھیں)، اس گروہ میں شامل ہوگئے۔ اس متحد گروہ نے نسلی برتری اور قوم پرستی کے خطیبانہ جوش و خروش کو نسلی بنیاد پر پُرتشدد تنازعات کی آگ بھڑکانے کے لیے استعمال کیا۔ انھوں نے سب سے پہلے سربیا کی کمیونسٹ پارٹی کے اصلاح پسند عناصر کے خلاف مزاحمت پیدا کی اور سربیا اور دوسری ریاستوں میں پارٹی کی قیادت پر قبضہ کرلیا۔ پھر انھوں نے غیر کمیونسٹ جمہوری قوتوں کی، جو حال ہی میں فعال ہوئی تھیں، لوگوں میں بڑھتی ہوئی حمایت اور موجودہ قیادت کی مخالفت کی راہ روکنے کی کوشش کی۔ جب ۹۰-۱۹۸۹ میں مشرقی یوروپ میں ہونے والے انقلابی واقعات کے اثر نے، اور دوسری یوگوسلاو ریاستوں میں سربیائی پالیسیوں کے خلاف پیدا ہونے والے ردعمل نے، ان مقاصد کے حصول کو ناممکن بنا دیا تو سربیا کے قدامت پسند ٹیٹو کے یوگوسلاویا کو تباہ کرنے اور اس کے ملبے پر "گریٹر سربیا" قائم کرنے پر تُل گئے جہاں وہ "سربیت

کو خطرہ" کے تصور کا سہارا لے کر پورے خطے میں پیدا ہونے والے جمہوریت پسند رجحانات کو روک سکیں یا کم سے کم ان کے پھیلنے کی رفتار کو سست کر سکیں۔ اس منصوبہ بند عمل نے نہ صرف سربیا کے اندر جمہوریت پسند اپوزیشن کی طاقت بہت کم کر دی بلکہ دوسری ریاستوں، خصوصاً کروشیا، میں جمہوریت مخالف قوتوں کو سہارا دیا۔ چناں چہ نسلی تنازعات کو اس سیاسی گروہ نے باقاعدہ طور پر پیدا کیا اور تقویت دی تاکہ جمہوریت پسند مقامی رجحانات کی حوصلہ شکنی ہو۔

یوگوسلاویا کے مسئلے کے بارے میں روایتی انداز فکر یہ ہے کہ وہاں جمہوریت کا فروغ ناممکن ہے کیوں کہ اس کی راہ میں وہ نام نہاد قدیم نسلی نفرتیں حائل ہیں جو کمیونزم کی حکمرانی کے ختم ہوتے ہی سطح پر آ گئیں اور جنھوں نے پورے خطے کو خوفناک تشدد کی لپیٹ میں لے لیا۔ اس انداز فکر کی رو سے نسلی تنازعہ ایک فطری اور ناگزیر عنصر قرار پاتا ہے اور تمام تر تجزیہ اسی تسلیم شدہ "حقیقت" کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔

دراصل قدیم نفرتوں کو تنازعے کی بنیاد ٹھہرانے کے حق میں دیے جانے والے دلائل بہت گمراہ کن ہیں۔ جیسا کہ نسلی تنازعے کا مطالعہ کرنے والے ماہرین نے نشان دہی کی ہے، "تاریخ کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جانا ممکن ہے"، اور روایات نسلی تنازعے کو بھڑکانے کا کام کر سکتی ہیں، لیکن کسی حالیہ تنازعے کی وضاحت محض کسی سابقہ تنازعے کے نئے جنم کے طور پر نہیں کی جا سکتی۔ (۱)۔ علاوہ ازیں یوگوسلاویا میں نسلی گروہوں کے باہمی تعلقات میں غیر معمولی تلخی موجود نہیں تھی۔ اس کی ایک بڑی واضح شہادت کروشیا اور بوسنیا کے نسلی طور پر نسبتاً زیادہ ملے جلے علاقے میں مختلف نسل کے لوگوں کے درمیان مخلوط شادیوں کی بڑی تعداد سے ملتی ہے (۲)۔ عمرانیات اور نسلیات (ethnicity) کے ماہرین مخلوط شادیوں کے عنصر کو سماجی ہم آہنگی اور نسلی گروہوں کے مابین مخاصمت کے فقدان کی ایک اہم علامت قرار دیتے ہیں۔ اس سے مراد بلاشبہ یہ نہیں ہے کہ یوگوسلاویا کی ریاستوں کے مابین، اور مختلف گروہوں کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے والوں کے مابین اختلافات یا متخالف دعوے سرے سے موجود ہی نہیں تھے۔ لیکن اتنی بات واضح ہے کہ اس تناؤ میں اس قدر شدت ہرگز نہیں تھی کہ وہ لازمی طور پر اس بھیانک قتل و خون پر منتج ہوتا جس کا مشاہدہ ہم آج کل کر رہے ہیں۔

اصلاح پسند بمقابلہ قدامت پسند

سربیا کی قدامت پسند قوتوں نے نسلی تنازعات اور دیگر نسلی گروہوں کی خوفناک شبیہوں کا استعمال پہلے پہل ۱۹۶۰ کی دہائی کے وسط میں شروع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جو یوگوسلاویا میں حقیقی لبرل

اقدامات کے پہلے دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ پارٹی کے لبرل عناصر نے گرتی ہوئی معاشی کارکردگی کے پیش نظر، اور اقتصادی ترقی کے ہمہ گیر اور مرکزی اصول کے بجائے علاقائی اور محدود تصور کی جانب رخ موڑنے کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے، ٹیٹو کو اس بات پر مائل کر لیا تھا کہ معیشت اور سیاسی نظام کی سخت گیر مرکزیت کی جگہ اقتدار کی علاقائی تقسیم نہایت ضروری ہو گئی ہے۔ ان رہنماؤں نے مارکسزم لینن ازم کے انتہائی بنیادی تصورات پر سوال اٹھائے اور، جیسا کہ ان میں ایک شخص نے کہا، "یوروپ کو یوگوسلاویا میں لانے" کی کوشش کی۔ ان پالیسیوں کو کمیونسٹ پارٹی کے اندر اور مجموعی طور پر عوام میں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ سربیا، کروشیا اور دوسری ریاستوں میں پارٹی کی قیادت کے نسبتاً کم عمر ارکان نے اپنے قدامت پسند مخالفین کا زور توڑنے کے لیے ان پالیسیوں کی عام مقبولیت کی حوصلہ افزائی کی جس سے قدامت پسندوں کو خطرہ محسوس ہونے لگا۔

سربیا کے چند قدامت پسند بیوروکریٹ اور دانش ور ان اصلاحات کو سرب مخالف قرار دے کر، اور سربیا کے خلاف "تاریخی دشمنی" کا نتیجہ کہہ کر، انھیں مشکوک ٹھہرانے لگے۔ اگرچہ ۱۹۶۸ میں برملا ایسی باتیں کرنے والے قدامت پسندوں کو پارٹی سے نکال دیا گیا تھا، اس کے باوجود ۱۹۷۱ تک آتے آتے، اصلاح پسندوں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور قدامت پرستی کے لیے بڑھتے ہوئے خطرے کے احساس کے باعث، سربیا کی پارٹی اور وفاقی فوج کے سخت گیر عناصر اصلاح پسندی کی تحریک کا دوسری جنگِ عظیم کے دنوں کی فسطائی کروشیائی پارٹی "اُستاشا" (Ustasa) سے موازنہ کرنے لگے تھے۔ اگرچہ اصلاحات کا ردِ انقلاب یا فاشزم کو ہوا دینے سے دور کا بھی تعلق نہ تھا، اس کے باوجود قدامت پسندوں کی طرف سے "کروشیائی قوم پرستی" کا بڑھتا ہوا خطرہ قرار دے کر ان اصلاحات کی بار بار مذمت نے یوگوسلاویا کی اصلاح پسند قوتوں میں پھوٹ ڈالنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ وفاقی فوج کے ٹینک (ریاست کروشیا کے دارالحکومت) زگرب کی سڑکوں پر نکل آئے، کروشیا کی کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کو ہٹا دیا گیا اور اصلاح پسند پارٹی سے نکال دیے گئے۔ سال بھر بعد دیگر یوگوسلاو ریاستوں کی طرح سربیا میں بھی پارٹی کے اصلاح پسند عناصر کو اسی انجام کا سامنا کرنا پڑا۔

قدامت پسندوں کی اس فتح کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ ۱۹۷۰ کے آخری برسوں تک اقتصادی بحران زیادہ شدید ہو گیا۔ اصلاح پسندی کی اُس جدوجہد کے مقابلے کے لیے خود کو تیار کرتے ہوئے، جو ٹیٹو کے مرنے کے بعد ناگزیر طور پر زور پکڑنے والی تھی، فوج میں موجود قدامت پسندوں نے اصلاح پسندی پر مائل افسروں کو چن چن کر نکال دیا۔ اس موقعے پر سلوبودان میلوشے وِچ

(Slobodan Milosevic)، جو توانائی کے ایک بڑے ادارے کا منتظم اور سترہ برس کی عمر میں پارٹی میں شمولیت کے وقت سے نظریاتی طور پر سخت گیر قدامت پسند رہا تھا، فوج کی پارٹی تنظیم کی ایک مرکزی کمیٹی کارکن منتخب ہوا۔ سربیا کو بیرونی دنیا کی جانب سے خطرے کا معصوم شکار قرار دینے کا پروپیگنڈا سرکاری حوصلہ افزائی کے ساتھ پورے علاقے میں زور پکڑنے لگا۔

مئی ۱۹۸۰ میں ٹیٹو کی موت یوگوسلاویا کے سیاسی اور اقتصادی نظام کے مستقبل کے سوال پر واقعی شدید اختلافِ رائے کا آغاز ثابت ہوئی۔ چوں کہ معاشی صورتِ حال پچھلے بیس برس کے عرصے میں مزید بدتر ہو چکی تھی، اس لیے اصلاحی تجاویز زیادہ وسعت اور شدت کی حامل تھیں اور ان کے حامی حلقوں کی تعداد بھی پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔ اصلاحات کی تحریک کے ہراول دستے میں سربیائی پارٹی کی قیادت کے لبرل عناصر شامل تھے جو مقامی فیصلوں پر پارٹی کی بیوروکریسی کے سخت کنٹرول کے خاتمے، پرائیویٹ انٹرپرائز اور انفرادی تجارت کے فروغ، ریاست اور پارٹی کے انتخابات میں ایک سے زیادہ امیدواروں کے حصہ لینے، پارٹی میں خفیہ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کرانے اور "بورژوا تہذیب کے تمام مثبت پہلوؤں"، یعنی لبرل اور جمہوری اقدار، کے اپنائے جانے کے مطالبات کر رہے تھے۔ ۱۹۸۵ تک اصلاح پسندوں کو سربیائی پارٹی کی اعلیٰ سطحوں میں غلبہ حاصل ہونے لگا تھا اور آزاد تجارت کو "معیشت کا ستون" قرار دینے، یہاں تک کہ ملک میں کثیر جماعتی نظام قائم کرنے کی اپیلیں کی جانے لگی تھیں۔

ظاہر ہے کہ ان اصلاحات سے پیدا ہونے والی ہمہ گیر تبدیلیوں سے اُس نظریاتی اور انتظامی ڈھانچے کی بنیادوں کو خطرہ لاحق تھا جس پر قدامت پسندوں کی طاقت کا دارومدار تھا۔ اس کے جواب میں، ۱۹۶۰ کی دہائی کی حکمتِ عملی کو دوبارہ کام میں لاتے ہوئے، سربیا کی قدامت پسند طاقتوں نے سربیائی عوام کو لاحق خطرے کا تذکرہ شروع کر دیا۔ اس بار انھوں نے پڑوسی ملک البانیا کی طرف سے درپیش خطرات کے ذکر سے آغاز کیا اور خاص طور پر اس "البانوی فساد" کی یاد تازہ کرنی شروع کی جس نے ازمنۂ وسطیٰ میں سربیائی سلطنت کے مرکز، یعنی جنوبی صوبہ کوسووو (Kosovo)، کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ ۱۹۸۱ تک اس صوبے کی (جسے ۱۹۷۴ میں ریاست سربیا میں شامل مگر کم و بیش خودمختار علاقے کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی) تقریباً تین چوتھائی آبادی البانوی نژاد لوگوں پر مشتمل تھی اور البانوی نژاد لوگ صوبائی پارٹی کے اُن سربیائی اہلکاروں کی جگہ لے چکے تھے جنھوں نے ۱۹۶۵ کی اصلاحات سے قبل کوسووو کے البانویوں کے خلاف سخت جابرانہ پالیسیاں اختیار کی تھیں۔ ۱۹۷۰ کی دہائی کے آخری برسوں میں سربیائی پارٹی کے قدامت پسند، کوسووو کے ان برطرف کردہ سرب ارکان کے ساتھ مل کر کوسووو کی خودمختاری کی مخالفت اور

ریاست سربیا کی مرکزیت بحال کرنے کی حمایت شدومد سے کرنے لگے۔ اس طرح یوگوسلاویا کے وفاق میں سربوں کا اثرورسوخ بڑھنے لگا۔ اگرچہ کوسووو کے سربوں کی بعض شکایات جائز تھیں، لیکن قدامت پسند ان شکایات کا ازالہ کرنے کے بجائے انھیں بھڑکانے اور اپنے مقصد کے استعمال کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس امکان کے پیش نظر کہ کہیں کوسووو اور سربیا کی پارٹی کی اعتدال پسند آپس میں اتحاد کر کے صوبے کی حیثیت کے معاملے کو پُرامن طور پر حل نہ کر ڈالیں، قدامت پسندوں نے اپنی اشتعال انگیز خطابت، "البانوی قوم پرستی" کی مذمت، اور کوسووو صوبے میں سربوں کے فرضی قتلِ عام کا جواب دینے کے مطالبے اور تیز کر دیے۔

۱۹۸۶ تک پہنچتے پہنچتے کوسووو کا مسئلہ سربیا میں روز بہ روز مقبول اور کامیاب ہوتے ہوئے اصلاح پسندوں کے خلاف قدامت پسندوں کے جوابی حملے کا بنیادی نکتہ بن گیا۔ پارٹی کے سربراہ میلوشے وچ کی قیادت میں قدامت پسندوں نے کوسووو کے سربوں کے بلغراد کی جانب بڑے بڑے جلوسوں کا اہتمام کیا تاکہ سربیا (اور وفاقی پارٹی) کے اصلاح پسندوں کو بدنام اور ان کی مقبولیت کو کم کیا جا سکے۔ اس قبولیت پسندانہ (populist) مہم کو بعض دانشوروں کے متواتر کام نے بھی سہارا ملا جنھوں نے سربیا کی اکیڈمی آف آرٹس اینڈ سائنسز کی جانب سے یوگوسلاویا کے مستقبل کے موضوع پر تیار کردہ ڈرافٹ میمورنڈم میں باربار "قتلِ عام" کے الزام کو دُہرایا۔ اگرچہ یہ دستاویز "جمہوری" خطابت میں ملفوف تھی، لیکن اس میں اُس مرکزیت پسند، ریاست کو اوّلیت دینے والے اور جابرانہ سوشلسٹ نظام کی وکالت کی گئی تھی جو ۱۹۶۵ کے پہلے کے دو عشروں میں قائم رہا تھا، اور سربیائی قوم کو اس طرح پیش کیا گیا تھا گویا وہ ۱۹۶۰ کی دہائی میں ہونے والی اصلاحات کے بعد سے اپنے وجود کے مٹ جانے کے خطرے میں زندگی بسر کرتی رہی ہو۔ اس طرح اس دستاویز میں آزاد تجارت کے اصول پر کی جانے والی اقتصادی اصلاحات اور آزاد سیاست کے اصول پر کی جانے والی سیاسی اصلاحات، دونوں کو "سرب مخالف" قرار دے کر مذموم ٹھہرایا گیا۔

قدامت پسندوں کی یہ جوابی کارروائی اقتصادی پالیسی پر سے توجہ ہٹا کر سربیا کی پارٹی میں اصلاح پسندوں کی بالادستی کا زور کم کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اب اصلاحات کی جگہ کوسووو میں سربوں کو درپیش خطرات نے پارٹی کی سرکاری لائن کے بنیادی نکتے کی حیثیت اختیار کر لی۔ قدامت پسندوں نے بڑی کامیابی سے پارٹی اور عام آبادی کے ان حلقوں کو متحد کر لیا جنھیں اصلاحات سے سب سے زیادہ نقصان پہنچنے کی توقع تھی۔ ان میں ناقص کارکردگی کی حامل سرکاری کمپنیوں کے ملازمین، پنشن یافتہ لوگ اور کم ترقی یافتہ علاقوں سے تعلق رکھنے والے سرب شامل تھے۔

Scanned with CamScanner

ستمبر ۱۹۸۷ میں میلوشے وچ نے پارٹی کی قیادت کے اصلاح پسند عناصر کو البانویوں کے مسئلے پر "نرم" رویہ اختیار کرنے کا الزام لگا کر پارٹی سے ہٹانے میں کامیابی حاصل کرلی۔ ان کا جرم یہ تھا کہ وہ جمہوری اصولوں کی بنیاد پر، مذاکرات کے ذریعے مسئلے کا اعتدال پسندانہ حل نکالنے کی وکالت کرتے تھے، تمام البانویوں کو شیاطین قرار دینے والے پروپیگنڈے کے خطرات سے متنبہ کرتے تھے اور شاونیت زدہ سرب قوم پرستی کی مذمت کرتے تھے جو قدامت پسندوں کا اہم ترین حربہ تھا۔ پارٹی کی قیادت کو اصلاح پسندوں سے پاک کرنے کے بعد پارٹی کے یک پارچہ (monolithic) اسٹالنسٹ تصور کے دوبارہ نفاذ، آزاد اور لبرل ہوجانے والے سربیائی پریس پر موثر کنٹرول، البانوی نژادوں کے خلاف نہایت پست اور شدید نسل پرستانہ مہم، اور کوسووو کے صوبے میں سخت جابرانہ اقدامات کے مرحلے آئے۔ درحقیقت، یہ مرحلے بعد میں یوگوسلاویا بھر میں سربیائی قدامت پسندوں کی اختیار کردہ حکمتِ عملی کا ابتدائیہ ثابت ہوئے۔

وفاقی پارٹی کا محاصرہ

سربیا کی پارٹی پر قبضہ قدامت پسندوں کے منصوبے میں محض پہلے قدم کی حیثیت رکھتا تھا۔ چوں کہ یوگوسلاویا کی چھ ریاستوں اور دو خود مختار صوبوں میں سے ہر ایک کا وفاقی پارٹی، اور اس کی ذیلی کمیٹیوں، میں ایک ایک ووٹ ہوتا تھا، اس لیے صرف سربیائی پارٹی پر کنٹرول کافی نہ تھا۔ سربیائی قدامت پسندوں کے لیے دوسری ریاستوں میں بھی اصلاح پسندوں کا زور توڑنا ضروری تھا تاکہ ایک تو وفاقی سطح پر قدامت پسند اکثریتی ووٹ حاصل کرسکیں اور دوسرے یہ کہ سربیائی اصلاح پسند دوسری ریاستی پارٹیوں میں موجود اپنے ہم خیال حلقوں کے ساتھ وفاقی سطح پر کوئی اتحاد قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ اس لیے میلوشے وچ نے دوسری ریاستی پارٹیوں کی قیادت پر قبضہ کرنے کے لیے تیزی سے کارروائی کی۔ ووئیوودینا (Vojvodina) اور مونٹے نیگرو (Montenegro) کی ریاستوں میں، جہاں سربوں کی خاصی بڑی آبادی موجود تھی، میلوشے وچ کو کامیابی ہوئی اور وہاں اس کے حامیوں نے جلسے جلوسوں اور "سربیت کو خطرہ" کے نعروں کا آزمودہ طریقِ کار موثر طور پر اختیار کیا۔ لیکن باقی ریاستوں میں اسے ناکامی اٹھانی پڑی۔ مئی ۱۹۸۸ میں ریاست سلووینیا (Slovinia) میں، جو جمہوری اصلاحات کی حمایت میں باقی سب ریاستوں سے پیش پیش تھی، سیکڑوں سیاسی اور ثقافتی شخصیات کی گرفتاری اور جابرانہ اقدامات کا منصوبہ منظرِ عام پر آیا جس کے ردِ عمل کے طور پر پارٹی اور عام لوگوں میں موجود اصلاح پسند اپنے موقف میں اور زیادہ سخت ہوگئے۔ ۱۹۸۸ کے وسط تک وہاں سلووینیا کی آزادی کے سوال پر ایک غیر سرکاری

Scanned with CamScanner

ریفرنڈم ہو چکا تھا اور سلووینیا کی کمیونسٹ پارٹی کثیر جماعتی نظام رائج کرنے کی وکالت کرنے لگی تھی۔ اسی سال میلوشےوچ اور یوگوسلاو فوج نے ریاست کروشیا (Croatia) کے نسبتاً پس ماندہ علاقے کرائینا (Crajina) میں رہنے والے سربوں کو منظم کرنا شروع کر دیا تھا تاکہ کروشیا کی کمیونسٹ پارٹی کی قیادت پر دباو ڈالا جا سکے۔ لیکن اس کا اُلٹا اثر ہوا: ریاستی پارٹی کے قدامت پسندوں کی حیثیت کو نقصان پہنچا اور اصلاح پسند اقلیت اور زیادہ دلیر ہو گئی۔ یہ ایک تعجب خیز بات تھی کیوں کہ ۱۹۷۱ کے بعد کے عرصے میں کروشیا کی کمیونسٹ پارٹی یوگوسلاویا بھر میں سب سے زیادہ قدامت پسند ریاستی پارٹیوں میں شمار ہوتی رہی تھی۔

وفاقی سطح پر بھی قدامت پسندوں کو اصلاح پسندوں کی جانب سے خاصے خطروں کا سامنا ہوا۔ ۱۹۸۸ کے موسم خزاں میں میلوشےوچ نے وفاقی پارٹی (League of Communists of Yugoslavia) کی صدارت حاصل کرنے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔ بلکہ لیگ کی مرکزی کمیٹی نے اکثریتی ووٹ سے اپنے ایک رکن کو، جو میلوشےوچ کا خاص آدمی سمجھا جاتا تھا، خارج کر دیا۔ مارچ ۱۹۸۹ سے پہلے اصلاح پسند قوتوں نے آنتے مارکووچ (Ante Markovic) کو وفاقی وزیرِاعظم کے عہدے پر پہنچانے میں کامیابی حاصل کر لی جس نے آزاد اقتصادی اور جمہوری اصلاحات کو آگے بڑھانے کی غرض سے وفاقی حکومت کو مضبوط کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ اس کی اقتصادی پالیسیوں کے مثبت اثرات جلد ہی سامنے آنے لگے: افراطِ زر کی شرح گھٹ گئی، بیرونی سرمایہ کاری شروع ہوئی اور اقتصادی ترقی کی شرح دوبارہ بہتر ہونے لگی۔ اسے ریاست سربیا میں بھی خاصی حمایت حاصل تھی۔ مئی ۱۹۹۰ میں اخبار "بوربا" (*Borba*) میں شائع ہونے والے رائے عامہ کے جائزے کے مطابق ۶۱ فیصد سرب مارکووچ کو پسند کرتے تھے (جب کہ میلوشےوچ کے لیے عام پسندیدگی کی شرح ۵۰ فیصد تھی)۔ مزید یہ کہ ۱۹۸۹ کے آخر آخر تک سلووینیا اور کروشیا کی کمیونسٹ پارٹیوں پر اصلاح پسندوں کا غلبہ ہو چکا تھا۔ انھوں نے مقامی قدامت پسندوں کے میلوشےوچ کی جارحانہ پالیسیوں سے تعلق پر زور دے کر کامیابی حاصل کی تھی۔ ان دونوں ریاستوں میں ۱۹۹۰ کے موسم بہار میں کثیر جماعتی انتخابات کرانے کے پروگرام کا اعلان ہو چکا تھا۔ سربیائی قدامت پسندوں نے جنوری ۱۹۹۰ میں لیگ کے غیر معمولی اجتماع میں ان انتخابات کی راہ روکنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے کیوں کہ سلووینیا کے مندوبین نے ریاستی پارٹیوں کی باضابطہ خودمختاری، کثیر جماعتی نظام کے قیام اور انسانی حقوق کی ضمانتوں کے مطالبات کے مسترد کیے جانے پر احتجاجاً واک آوٹ کر دیا۔ بعدازاں کروشیا، بوسنیا (Bosnia) اور مقدونیا (Macedonia) کی پارٹیوں کے نمائندوں نے اجتماع کی کارروائی کو جاری رکھنے سے

انکار کر دیا اور یوں لیگ آف کمیونسٹس کا عملاً خاتمہ ہو گیا۔

شمال مغربی ریاستوں میں جمہوری عمل کی جانب پیش رفت کے اس عرصے کے دوران سربیائی قدامت پسندوں نے سلووینیا اور کروشیا کے باشندوں کو شیاطین بنا کر پیش کرنے والے پروپیگنڈے کا آغاز کر دیا تاکہ ان ریاستوں میں رہنے والے سرب اصلاح پسند اور جمہوری عناصر کروشیائی اور سلووینی نسلوں کے اپنے ہم خیال عناصر کے ساتھ متحد نہ ہو سکیں۔ سربیائی قیادت نے سلووینیا کے مکمل اقتصادی اور ثقافتی بائیکاٹ کی زوردار مہم چلائی اور سلووینیوں کو "وائٹ گارڈ" اور "سرب دشمن" قرار دے کر ان کی من حیث النسل مذمت شروع کر دی۔ یہ اُن باہمی رشتوں کو تلف کرنے کے عمل کا پہلا موثر قدم تھا جنھوں نے یوگوسلاویا کو متحد رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ قوم پرستی کا میلان رکھنے والے دانشوروں نے دوسری جنگ عظیم میں کروشیا سے تعلق رکھنے والے فسطائیوں کی شبیہیں اُبھارنی شروع کیں اور یاد دلایا کہ کس طرح وہ سرب بچوں اور شہریوں کو قتلِ عام اور تشدد کا نشانہ بنایا کرتے تھے اور اس سے صاف صاف یہ نتیجہ اخذ کرنے لگے کہ قتل و غارت دراصل کروٹ نژاد لوگوں کا نسلی شغف ہے۔ اس مہم کا مقصد نہ صرف کروشیائی عوام اور پارٹی کو شیاطین ظاہر کرنا تھا بلکہ سربیائی پارٹی کے ان حلقوں کو بدنام کرنا بھی تھا جو (کروٹ نژاد) وزیر اعظم مارکووچ کی پالیسیوں کے حامی تھے۔

اس مہم کے عجیب و غریب اور باہم متضاد نتائج ظاہر ہوئے۔ ایک طرف تو اس سے ۱۹۹۰ کے موسم بہار میں سلووینیا اور کروشیا میں ہونے والے انتخابات میں کمیونسٹ مخالف اور قوم پرست پارٹیوں کی فتح یقینی ہو گئی جو (کم از کم ظاہری طور پر) تجارتی معیشت اور جمہوری اصولوں کی بنیاد پر قائم کنفیڈرل یوگوسلاویا کی حامی تھیں۔ درحقیقت کروشیا میں، خاص طور پر ریاست کے انتہائی مخلوط النسل علاقوں میں، سربوں کی اکثریت نے میلوشےوچ کی حامی سربین ڈیموکریٹک پارٹی کی انتہاپسند قوم پرستی کو مسترد کر دیا اور کمیونسٹ اصلاح پسندوں کے حق میں فیصلہ دیا جو کنفیڈرل یوگوسلاویا کے حامی اور میلوشےوچ کی مرکزیت پسندی کو فروغ دینے کی پالیسیوں کے مخالف تھے۔ انتخابات کے نتائج سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ کروشیا میں مقیم سرب سب سے زیادہ نسلی ہم آہنگی کو قائم رکھنے اور خوشحالی کو مستحکم کرنے کی خواہش رکھتے ہیں، اور ان مقاصد کے حصول کے لیے انھیں بلغراد کی حاکمیت کی بہ نسبت کروشیائی کمیونسٹ اصلاح پسندوں کا آزاد جمہوری اور معاشی نظام قائم کرنے کا پروگرام زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

اس عرصے میں، یوگوسلاویا کی شمال مغربی ریاستوں میں جمہوری نظام کی جانب پیش رفت کے علاوہ مشرقی یوروپ کے دیگر ملکوں میں ہونے والے واقعات (خصوصاً رومانیا میں دسمبر انقلاب

Scanned with CamScanner

اور وہاں کے آمر چاؤشسکو کے قتل) کے زیر اثر، خود سربیا میں بھی کثیر جماعتی انتخابات کا مطالبہ زور پکڑنے لگا۔ ۱۹۹۰ کے موسم گرما کے اختتام تک میلوشے وچ نے خود کو یہ مطالبہ قبول کرنے پر مجبور پایا۔

میلوشے وچ کی حکمت عملی

اس نئی صورت حال میں پارٹی کے ارکان واحد گروہ نہیں تھے جس کی حمایت حاصل کرنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا۔ غیروں کے آسیبی خوف (xenophobia) اور آمرانہ نظام پر مبنی سربیائی قوم پرستی کی آزمودہ حکمت عملی یوگوسلاویا پر گرفت قائم رکھنے کے لیے ناکافی تھی جہاں آبادی میں سربوں کا تناسب ۳۹ فیصد سے زیادہ نہ تھا، بلکہ اس حکمت عملی سے عام انتخابات میں شکست یقینی تھی۔ اگرچہ یہ بات قابل تصور تھی کہ میلوشے وچ بوسنیا اور کروشیا میں پارٹی کی قیادت پر قبضہ کر لے (ان دونوں ریاستوں کی پارٹی میں سرب ارکان کی تعداد بالترتیب ۷۴ اور ۵۰ فیصد تھی)، لیکن ان دونوں ریاستوں میں آبادی کی اکثریت کی حمایت حاصل کرنا ممکن نظر نہیں آتا تھا (آبادی کے اعتبار سے بوسنیا میں سرب ۳۳ فیصد اور کروشیا میں ۱۲ فیصد تھے)۔ سلووینیا، کروشیا، بوسنیا اور مقدونیا کے انتخابات میں غیر کمیونسٹوں کی فتح کا صاف مطلب یہ تھا کہ سربیا وفاقی اداروں کے ذریعے حکومت کو اپنے قبضے میں نہیں رکھ سکے گا جہاں میلوشے وچ کے پاس آٹھ میں سے صرف چار ووٹ تھے یعنی سربیا، کوسووو، ووئیوودینا اور مونٹے نیگرو۔

اپنے اقتدار کو لاحق خطرات کے چیلنج کا سامنا کرتے ہوئے سربیائی قدامت پسندوں اور یوگوسلاو فوج میں ان کے حامیوں کے پاس صرف دو متبادل راستے تھے: اسلحے کے زور پر یا تو ملک کو دوبارہ پہلے کی طرح متحد کر دیا جائے، یا پھر یوگوسلاویا کو تباہ کر کے اس کے ملبے پر ایک وسیع تر سربیائی ریاست تعمیر کی جائے۔ انھوں نے آخر کار جو حکمت عملی اختیار کی اس میں ان دونوں کے اجزا شامل تھے، اور خود سربیا کے اندر اور دوسری ریاستوں میں مقیم سربوں کے درمیان جمہوریت پسند اپوزیشن کے بڑھتے ہوئے اثر سے قدامت پسندوں کی اس حکمت عملی میں اور زیادہ سختی پیدا ہوتی گئی۔

زور پکڑتے ہوئے مطالبات کے پیش نظر آخر کار سربیا میں کثیر جماعتی انتخابات کے لیے دسمبر ۱۹۹۰ کی تاریخ مقرر کی گئی۔ غیر کمیونسٹ قوم پرست اپوزیشن کا مقابلہ کرنے کے لیے میلوشے وچ نے سوشلزم کی حاصل کردہ اقتصادی کامیابیوں کی مدافعت کی اور ساتھ ہی ساتھ کوسووو کے مسئلے پر البانویوں کے خلاف نسل پرستانہ پروپیگنڈا بھی جاری رکھا۔ حکمراں پارٹی نے "سربیت

Scanned with CamScanner

کے محافظ"، اور ٹیٹو کی جانب سے قوم پرستی کی تمام شکلوں پر پابندی کی پالیسیوں کے مخالف، کی حیثیت تو پہلے ہی حاصل کرلی تھی۔ سربیائی قدامت پسندوں نے اصلاح پسند سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے اثرات کا بھی مقابلہ کیا جو عوام کے مادی مفادات پر زور دے کر کامیابی حاصل کر سکتی تھی، اور اپنی پارٹی کا نام بدل کر سوشلسٹ پارٹی آف سربیا رکھ لیا۔

انتخابی مہم میں اس سوشلسٹ پارٹی نے سوشلسٹ نظام کو جاری رکھنے کی وکالت کی جو سماجی تحفظ اور معاشی ترقی فراہم کرتا تھا، اور تمام اقتصادی مسائل کی ذمے داری وفاقی وزیراعظم مارکووچ کی "سرب دشمن" پالیسیوں پر عائد کردی۔ اس کے ساتھ ساتھ حکمراں پارٹی کی حیثیت سے اس نے ٹیلی وژن تک اپوزیشن پارٹیوں کی رسائی کو نہایت محدود رکھا، اور اس مقصد سے بے شمار چھوٹی چھوٹی پارٹیوں کے قیام کی حوصلہ افزائی کی تاکہ ذرائع ابلاغ پر اصل اپوزیشن پارٹیوں کی کوریج کم سے کم رہے۔ حکمراں پارٹی نے غیر کمیونسٹ قوم پرست پارٹی پر الزام لگایا کہ وہ سربیا کو جنگ میں دھکیلنا چاہتی ہے۔ اپنے البانوی مخالف نسل پرستانہ پروپیگنڈے کے باوجود، حکمراں پارٹی نے نسلی تعلقات کے مسئلے پر خود کو اعتدال پسند قرار دیا۔ ان سب اقدامات کے علاوہ حکمراں پارٹی نے، انتخابات سے ٹھیک پہلے، مزدوروں کی رکی ہوئی تنخواہ دینے کے لیے سرکاری پرنٹنگ پریس کو استعمال کرتے ہوئے دو ارب ڈالر کے مساوی مالیت کے نئے دینار چھاپے۔ انتخابات کے پہلے مرحلے میں سوشلسٹ پارٹی آف سربیا کو، ۴۷ فیصد رائے دہندگان کی حمایت سے، پارلیمنٹ کی اکثریتی نشستوں پر زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔

اسی دوران بلغراد کے قدامت پسند کروشیا میں مقیم سربوں کی قوم پرست پارٹی پر قبضہ کر کے کم ترقی یافتہ کرائینا کے انتہاپسند سربوں کو قیادت پر فائز کر چکے تھے۔ اس علاقے میں اگرچہ سربوں کی آبادی ۶۲ فیصد تھی لیکن وہ پوری ریاست کروشیا کی کل سرب نژاد آبادی کا صرف ۳۰ فیصد حصہ بنتے تھے۔ چوں کہ ریاستی انتخابات کے نتائج میں کروشیا میں رہنے والے سربوں کی اکثریت محاذ آرائی پر مبنی قوم پرستانہ متبادل کے مقابلے میں اعتدال پسندانہ اصلاحی متبادل کے حق میں اپنی ترجیح ظاہر کر چکی تھی، اس لیے کرائینا کی سرب قوم پرست پارٹی نے کروشیائی حکومت کے ساتھ محاذ آرائی کا آغاز کیا تاکہ کروشیا کے سرب نژاد باشندوں کے دل میں خوف پیدا کیا جا سکے۔ سربیائی سوشلسٹ پارٹی نے کروشیا کی فاتح پارٹی (کروشین ڈیموکریٹک یونین) کی جانب سے انتخابی مہم کے دوران سرب دشمن پروپیگنڈے کی یاد دلا دلا کر خدشہ ظاہر کیا کہ کروشیا میں اس پارٹی کی فتح کا مطلب یقیناً اُستاشوں کی جانب سے سربوں کے قتلِ عام کا اعادہ ہوگا۔ سربیائی قدامت پسندوں نے جائز شکایات اور مسائل کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا جیسا کہ وہ اس سے

پہلے کوسووو میں کامیابی کے ساتھ کر چکے تھے۔ اگرچہ کروشیا میں رہنے والے سربوں کو ڈیموکریٹک یونین کی بعض پالیسیوں کی بابت واقعی تشویش تھی، لیکن بلغراد نے بڑے کلبی انداز میں اس تشویش کو باقاعدہ خوف کے طور پر ہوا دی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کروشیائی سرب مستقبل کی صورت حال واضح کرنے کی غرض سے زگرب میں برسر اقتدار افراد یا ریاست کی اپوزیشن پارٹیوں سے مذاکرات کر کے سرب آبادی کو لاحق خوف کی شدت کو کم کرنا چاہتے تھے، انھیں میلوشے وچ کے اتحادیوں نے ڈرا دھمکا کر خاموش کر دیا۔ اگست ۱۹۹۰ تک کروشیائی سربوں کی قوم پرست پارٹی باقاعدہ مسلح مورچے قائم کرنے لگی تھی، سرب اکثریت کے گاؤوں کو "کرائینا" میں شامل ہونے پر مجبور کر رہی تھی اور اعتدال پسند سربوں کو دبانے کی مہم اَور زیادہ شدید کر چکی تھی۔

جب میلوشے وچ کی پارٹی کو سربیا کے انتخابات میں فتح حاصل ہو گئی تو کروشیائی سربوں کی قوم پرست پارٹی نے، یوگوسلاو فوج کے فراہم کردہ اسلحے کے زور پر، کروشیائی پولیس سے مسلح محاذ آرائی اور کرائینا سے ملحق دیہات پر باقاعدہ حملوں کا آغاز کر دیا۔ یہ حملے رفتہ رفتہ سرب اکثریتی علاقوں سے اُن علاقوں میں بھی پھیل گئے جہاں سرب اقلیت میں تھے۔ دونوں فریقوں کو "چھڑانے" کی غرض سے یوگوسلاو فوج کو طلب کیا گیا۔ تب سرب اکثریتی علاقوں میں مقیم غیر سرب پوری طرح محصور ہو گئے اور اپنے گھروں سے نکالے جانے لگے۔ یوں سربیائی قدامت پسندوں کی وفادار قوتیں اپنے مقبوضہ علاقے کا رقبہ بڑھانے اور انھیں غیر سربوں سے "پاک" کر کے نسلی طور پر خالص کرنے لگیں۔ بلغراد نے اس تنازعے کو "نسلی فساد" کا نام دیا اور اسی نام کو مغربی ذرائع ابلاغ کسی اعتراض کے بغیر دُہرانے لگے۔

سربیائی اپوزیشن

قدامت پسندوں کی اس حکمتِ عملی میں خود سربیا کے اندر جمہوریت پسند قوتوں کے اُبھرنے کی وجہ سے کئی بار رخنے پڑے۔ مارچ ۱۹۹۱ کے اوائل میں جمہوریت پسند اپوزیشن نے بلغراد میں بڑے بڑے مظاہرے کیے اور سڑکوں کی طاقت سے حکمراں پارٹی کا تختہ الٹنے کی دھمکیاں دینے لگی۔ یہ مظاہرے ذرائع ابلاغ پر حکومت کی سخت گرفت کی مخالفت میں کیے گئے تھے لیکن ان میں میلوشے وچ کی اقتصادی پالیسیوں اور یوگوسلاویا کے مستقبل کی بابت ہونے والے مذاکرات میں دوسری ریاستوں سے تنازعہ چھیڑنے کی دانستہ کوششوں کی بھی مذمت کی گئی۔ یہ مذاکرات جنوری میں شروع ہوئے تھے اور ان میں سربیا کے صدر نے سخت مرکزیت کی حامل فیڈریشن کے موقف سے ذرہ بھر ہٹنے سے سختی کے ساتھ انکار کر دیا تھا۔ ان مظاہروں کو منتشر کرنے کے لیے

Scanned with CamScanner

میلوشے وچ نے پولیس اور فوج کی مدد لی- اگرچہ اس عمل میں کسی حد تک تشدد روا رکھا گیا لیکن فوجی جنرلوں نے پوری طاقت استعمال کرنے سے انکار کر دیا جس سے میلوشے وچ کو مذاکرات دوبارہ شروع ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔

مارچ ۱۹۹۱ کے ان مظاہروں نے جمہوریت پسند اپوزیشن پارٹیوں کی مقبولیت میں اضافے کا اشارہ دیا اور حکمراں سوشلسٹ پارٹی اندر سے بھی جمہوریت مائل اصلاح پسند قوتوں کے دباو کا سامنا کرنے لگی- اس بے حد سنگین چیلنج سے گھبرا کر میلوشے وچ نے اپوزیشن کے کچھ مطالبات منظور کر لیے: محدود اقتصادی اصلاحات کی اجازت دی، اور ایک کثیر جماعتی "سربیئن نیشنل کاؤنسل" کے قیام کی بابت مذاکرات کا آغاز کیا- حکومت نے مزدوروں کو تنخواہ دینے اور بڑھتی ہوئی ہڑتالوں پر قابو پانے کے لیے مزید نوٹ چھاپے- دیگر یوگوسلاو ریاستوں کے ساتھ لین دین میں بھی میلوشے وچ قدرے اعتدال کی راہ اختیار کرنے لگا: اپریل ۱۹۹۱ میں اس نے کنفیڈرل بندوبست کا اصول تسلیم کر لیا اور جون میں باہمی مفاہمت پر مبنی اس کنفیڈریشن کے بنیادی خطوط کو منظور کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی- اس نے اپنے کروشیائی اتحادیوں پر بھی زور ڈالا کہ وہ کروشیا کی حکومت سے مذاکرات کریں۔

لیکن اس کے باوجود اسی عرصے کے دوران سربیائی حکومت نے اپنے قوم پرستانہ پروپیگنڈے میں اور زیادہ شدت پیدا کی اور کروشیائی علاقے میں نسلی تنازعے کو ہوا دی- خود میلوشے وچ نے سربیا میں ہونے والے حکومت مخالف مظاہروں کے شرکا کو "سربیا کے دشمن" قرار دیا اور ان پر البانویوں، کروشیائیوں اور سلووینیوں کے ساتھ سازباز کا الزام لگایا- ذرائع ابلاغ نے کروشیا کی حکومت کو فسطائیوں کے گروہ کے طور پر پیش کیا جو تمام سربوں کو مار ڈالنے پر تلا بیٹھا ہو، اور جرمنی اور آسٹریا پر الزام لگایا کہ وہ "کروشیائی فسطائیت" کی مدد کر رہے ہیں تاکہ اپنی سابقہ سلطنتوں کو دوبارہ قائم کر سکیں- کروشیائی سربوں کی قوم پرست پارٹی نے نوفسطائی سربیئن ریڈیکل پارٹی سے اتحاد کر لیا جس سے موخرالذکر پارٹی کے قائد وویسلاو شیشیلی (Vojislav Seselj) کی طاقت اور حیثیت میں اضافہ ہو گیا- شیشیلی ریاست سربیا میں "نسلی خالصیت" (ethnic cleansing) کا مطالبہ کرتا تھا اور کھلم کھلا دعویٰ کرتا تھا کہ کروشیا میں نسلی تنازعے کو بھڑکانے میں اُس کے گریلا گروپوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

ریاست کروشیا کی حدوں میں واقع مخلوط النسل سلوونی علاقے میں (جس کی سرحد سربیا سے ملتی تھی لیکن آبادی میں سربوں کی اکثریت نہیں تھی) بلغراد نے اعتدال پسند سرب لیڈروں پر دباو بڑھانا شروع کر دیا تاکہ وہ محاذ آرائی کی پالیسی قبول کر لیں- مئی تک آتے آتے کرائینا میں

Scanned with CamScanner

یوگوسلاو فوج کی جانب سے اسلحے کی آمد ڈرامائی طور پر بڑھ چکی تھی اور شیشلی کے گریلا گروپ کروشیا کی سرحد میں داخل ہو کر سلووہ نی علاقے کی سرب اور غیر سرب آبادی کو دہشت زدہ کرنے اور اپنے مقبوضہ علاقوں سے غیر سربوں کو جبراً نکالنے کے عمل کی ابتدا کر چکے تھے۔

جزوی طور پر اس قسم کی اشتعال انگیزیوں کے رد عمل میں کروشیائی پارلیمنٹ نے جون ۱۹۹۱ میں یوگوسلاویا سے علیحدگی کا اعلان کر دیا تاکہ اس نئے کنفیڈرل نظام کے لیے تیاری کی جا سکے جس پر اسی مہینے کے شروع میں مفاہمت ہوئی تھی۔ اس اعلان میں وفاقی اداروں، بشمول فوج، کی حاکمیت کے جاری رہنے کی ضمانت دی گئی تھی اور صاف لفظوں میں کہا گیا تھا کہ یہ اقدام یک طرفہ علیحدگی کے مترادف نہیں ہے۔ اس کے باوجود سربیائی طاقتوں نے جنگ کی شدت اور وسعت بڑھانے کا عمل جاری رکھا، کرائینا اور سلووہ نی علاقے میں نسلی تنازعے کی آگ کو اور تیز کیا، شہریوں کو دہشت زدہ کیا، غیر سرب دیہات کو تباہ کیا، اور سرب آبادی کو مجبور کیا کہ یا تو وہ اُن کے ساتھ شامل ہو جائے یا مرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ یہ پورے علاقے میں نسلی ہم آہنگی کو پُر تشدد طریقے سے تباہ و برباد کرنے کی دانستہ پالیسی تھی۔ بلغراد کی جانب سے دعویٰ کیا گیا کہ یہ جنگ کروشیائی سربوں کے تحفظ کے مقصد سے شروع کی گئی ہے جنھیں "قتلِ عام" کا خطرہ لاحق ہے۔ سربیائی ذرائع ابلاغ صاف لفظوں میں کروشیائی صدر فرانیو تجمان (Franjo Tudjman) کا موازنہ دوسری جنگِ عظیم کے فسطائی اُستاشوں سے کرنے لگے۔ لیکن بیرونی مبصروں، مثلاً ہیلسنکی واچ (Helsinki Watch) نے اس بات کو نوٹ کیا کہ اگست تک، جس وقت کروٹوں نے جوابی کارروائی شروع کی، انسانی حقوق کی ہولناک ترین کارروائیاں سرب بے قاعدہ سپاہیوں اور یوگوسلاو فوج کے ہاتھوں ہوئی تھیں۔ ان کارروائیوں میں پورے پورے شہروں کو بمباری سے تباہ کرنا، اور سربوں کو اپنے ساتھ شامل کرنے اور غیر سربوں کو جبراً باہر نکالنے کی غرض سے اندھادھند تشدد کا استعمال شامل تھا (۳)۔ اس پالیسی نے کروٹ انتہاپسندوں میں بھی اشتعال پیدا کیا اور ان کی جانب سے سربوں پر کیے گئے تشدد کو میلوشے وِچ نے سربیا کے پُرانے موقف کے درست ہونے کے ثبوت کے طور پر پیش کیا۔

اس پالیسی کے اصل مقاصد کا تعلق غالباً کروشیا سے زیادہ سربیا کی اندرونی سیاست سے تھا۔ اپریل ۱۹۹۱ میں سربیا کی جمہوریت پسند اپوزیشن کو خاصا نمایاں مقام حاصل ہو گیا تھا: حکمراں پارٹی دولخت ہونے کے خطرے سے دوچار تھی اور مبصرین سوشلسٹ پارٹی کی حکومت کے جلد خاتمے کی پیش گوئیاں کرنے لگے تھے۔ لیکن حکمراں پارٹی نے، ذرائع ابلاغ پر اپنے سخت کنٹرول کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، کروشیا میں سربوں کے قتلِ عام کے الزامات اور بعد میں چھڑ جانے والی جنگ کو

پارٹی کی اندرونی بغاوت کچلنے کے بہانے کے طور پر استعمال کیا، اصلاحات وغیرہ کے مسئلوں کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے جنگ کو اصل مسئلہ بنایا اور جنگ کی مخالفت کرنے والے تمام لوگوں کو غدار قرار دے کر جمہوریت پسند اپوزیشن کی مقبولیت کم کرنے کی کوشش کی۔

حکومت نے جنگ کو اس غرض سے بھی استعمال کیا کہ اپوزیشن کو جسمانی طور پر کچل دیا جائے۔ محاذ پر بھیجے جانے والے ریزرو فوجیوں کی جبری بھرتی اُن علاقوں سے شروع کی گئی جنھوں نے انتخابات میں اپوزیشن کے حق میں فیصلہ دیا تھا، اور اپوزیشن کے لیڈروں اور جنگ کی کھلم کھلا مخالفت کرنے والے کارکنوں کو جنگ زدہ علاقوں میں جبراً بھیج دیا۔ جنگ پر کسی بھی قسم کی تنقید کرنے والوں کو نوفسطائی ٹولیوں کی جسمانی تشدد کی دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بہت سے جنگ مخالف سربوں (خصوصاً نوجوانوں) کو ملک سے باہر بھاگنا یا روپوش ہونا پڑا۔ حکومت نے صوبہ ووئیوودینا میں مقیم ہنگیرین اقلیت کو بھی (جو اس صوبے کے سات ضلعوں میں اکثریت رکھتی ہے) جبری بھرتی کا خاص نشانہ بنایا۔ اگرچہ ہنگیرین نژاد باشندے سربیا کی آبادی کا صرف تین فیصد حصہ ہیں لیکن جبراً محاذ پر بھیجے گئے ریزرو فوجیوں میں ان کا تناسب سات سے آٹھ فیصد تک، اور ہلاک یا زخمی ہونے والوں میں بیس فیصد تک ہے۔ اس طرح سوشلسٹ پارٹی نے اپنے حامیوں کو جنگ کے خطرات اور دشواریوں سے ممکنہ حد تک محفوظ رکھا۔

نومبر ۱۹۹۱ تک اپوزیشن تتر بتر ہو چکی تھی لیکن فوجی منصوبے کے داخلی نقصانات بڑھتے جا رہے تھے کیوں کہ ہلاک یا زخمی ہونے والوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اور آلات کی کمی اور یوگوسلاو فوج کے افسروں کی ناقص کارکردگی کے باعث محاذ سے بھاگنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ کروٹ فوجی پیش قدمی کر رہے تھے اور یورپی برادری آزاد کروشیا کو تسلیم کرنے، یعنی بین الاقوامی فوجی مداخلت کے امکان کا دروازہ کھولنے، کی تیاریاں کر رہی تھی۔ اس بیرونی مداخلت کے امکانات یوں بھی زیادہ معلوم ہوتے تھے کہ ماسکو میں میلوشے وچ کے قریبی اتحادی —— یعنی روسی فوج اور کمیونسٹ پارٹی کے انتہاپسند —— اگست ۱۹۹۱ میں اقتدار پر قبضہ کرنے میں ناکام ہو چکے تھے۔ دسمبر ۱۹۹۱ کے آنے تک میلوشے وچ اقوامِ متحدہ کی امن فوج کی آمد کی بابت اپنی پرانی مخالفانہ پالیسی سے دست بردار ہو گیا اور کروشیا میں سربوں کے مقبوضہ علاقوں میں امن فوج کی تعیناتی پر رضامندی ظاہر کر دی۔ لیکن اقوامِ متحدہ کی موجودگی میں بھی ان علاقوں میں سربوں اور غیر سربوں کو دہشت زدہ کرنے کا عمل پہلے کی طرح جاری رہا (۴)۔

Scanned with CamScanner

بوسنیا کی جنگ

بوسنیا میں شروع ہونے والی جنگ نسلی تنازعے کو سیاسی مقاصد کے تحت ہوا دینے کی اسی مجموعی حکمتِ عملی کا تسلسل ہے اور اس میں بھی بعینہٖ اُنہیں خطوط پر پیش قدمی کی گئی جن پر اس سے پہلے کوسووو اور کروشیا میں عمل کیا جاچکا تھا۔ یہ درست ہے کہ کروشیا کی جنگ کی مدد سے سربیا میں ۱۹۹۱ کے موسم بہار میں زور پکڑنے والی اپوزیشن کا عملاً صفایا کیا جا چکا تھا، لیکن اس جنگ کے نتیجے میں اقتصادی صورتِ حال اَور خراب ہو گئی تھی اور میلوشووچ حکومت کی نسبت مجموعی بے اطمینانی میں اضافہ ہورہا تھا۔ چناں چہ ۱۹۹۲ کے اوائل میں اپوزیشن پھر سر اٹھاتی محسوس ہوئی اور اس سال کے موسم بہار تک لاکھوں سربیائی شہری میلوشووچ کے استعفے کا مطالبہ کرنے والے محضروں پر دستخط کر چکے تھے۔

اس لیے یہ محض اتفاق نہیں کہ جنوری ۱۹۹۲ کے آس پاس بوسنیا کی صورتِ حال ایک سال پہلے کے کروشیا کی صورتِ حال کا اعادہ کرنے لگی۔ بوسنیائی سربوں کی قوم پرست پارٹی کی قیادت، ۱۹۹۰ میں پارٹی کے قیام کے وقت سے، بلغراد سے نہایت قریبی طور پر وابستہ رہ کر کام کر رہی تھی اور اس نے بوسنیا میں جنگ شروع ہونے سے سال بھر پہلے ہی اس جنگ کا تفصیلی منصوبہ تیار کرلیا تھا۔ بوسنیا کی مخلوط حکومت کے ایک عضو کے طور پر یہ پارٹی بوسنیا کے مستقبل کے مسئلے کے ہر حل کی راہ روکتی رہی؛ جب کروشیا میں جنگ تیز ہوئی تو بوسنیائی سربوں نے بھی اپنے مسلم مخالف پروپیگنڈے کی شدت بڑھا دی۔ جوں ہی کروشیا کی جنگ تھمی، بوسنیائی سربوں کی قوم پرست پارٹی نے جنوری ۱۹۹۲ میں "بوسنیا ہرزگووینا کی آزاد سربیائی ریاست" کے قیام کا اعلان کر دیا جو اُن سرب اکثریتی علاقوں پر مشتمل تھی جن پر اس پارٹی نے ۱۹۹۱ کے موسم گرما کے دوران قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے ساتھ قوم پرست پارٹی نے اختلاف رکھنے والے تمام سربوں کو بربریت اور تشدد کے ذریعے خاموش کر دیا۔

جب بوسنیائی صدر علیا عزت بیگووچ (Alija Izetbegovic) نے بوسنیا کے مستقبل کے مسئلے پر سرب قوم پرست پارٹی کی متواتر رخنہ اندازی کے جواب میں، اور کروشیا کے آزاد ملک کے بین الاقوامی طور پر تسلیم کیے جانے کی حقیقت کے پیشِ نظر، بوسنیا کی آزادی کے سوال پر ریفرنڈم کرانے کا اعلان کیا تو قوم پرست پارٹی نے اپنی محاذ آرائی کی پالیسی اَور شدید کر دی۔ سرب قوم پرستوں نے سرائیوو اور دوسرے شہروں کے گرد سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر دیں، اور اختلاف کرنے والے سربوں اور غیر سرب نژاد باشندوں کے خلاف "نسلی خالصیت" کے وہی طریقے استعمال کرنے شروع کر دیے جنھیں کروشیا میں آزمایا جا چکا تھا۔ جنگ "سرکاری طور پر

اُس دن شروع ہوئی جس دن سرب انتہا پسندوں نے سرائیوو کے مرکزی حصے میں امن کے حق میں ہونے والے مخلوط النسل مظاہرے پر فائرنگ کی۔ شہر کا یہ حصہ کروشیا کی جنگ کے دوران یوگوسلاویا کی امن تحریک کی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا تھا۔ ۱۹۹۲ کے موسم خزاں تک سربیائی فوجی بوسنیا کے ۷۰ فیصد علاقے پر اپنا قبضہ مستحکم کر چکے تھے، اور اس علاقے سے غیر سرب آبادی کی اکثریت کو جبراً باہر نکال چکے تھے۔

جنگ چھیڑنے اور "سربیت کو خطرہ" کے تصورات کا پروپیگنڈا کرنے کی اس پالیسی نے خود سربیا میں، اور دوسری ریاستوں میں رہنے والے سربوں کے درمیان، جمہوریت پسند اپوزیشن کو زور پکڑنے سے روکنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ سربیائی سوشلسٹ پارٹی نے دائیں بازو کی انتہا پسند پارٹیوں کی حوصلہ افزائی کرنے (اور ان کے مقابلے میں خود کو اعتدال پسند متبادل ظاہر کرنے)، اور اپنے گھر کی حفاظت کرنے والے معصوم سربوں کے خلاف کی جانے والی بین الاقوامی سازش کے الزامات لگانے کے حربے استعمال کر کے اقتدار پر اپنی گرفت برقرار رکھی ہے۔ لیکن اس پالیسی کی انتہائی شکل انتخابات کے دنوں میں دیکھنے میں آئی۔ دسمبر ۱۹۹۲ کے انتخابات میں حکمراں پارٹی اور اس کی اتحادی الٹرا نیشنلسٹ ریڈیکل پارٹی نے ٹیلی وژن پر اپنے سخت کنٹرول کے ذریعے، وسطی اور جنوبی سربیا کے علاقوں میں (جہاں حکمراں پارٹی کا زور زیادہ ہے) انتخابی حلقوں کی تشکیل اپنے مفاد کے مطابق کر کے اور انتخابات میں بڑے پیمانے پر دھاندلی کر کے اکثریت حاصل کی ہے۔ یہ دھاندلی خاص طور پر بلغراد میں کی گئی (جہاں جمہوریت پسند اپوزیشن کو سب سے زیادہ حمایت حاصل ہے)۔ اس کے علاوہ بوسنیا سے آئے ہوئے سرب پناہ گزینوں کو بھی ووٹ کا حق دے دیا گیا جنھوں نے ریڈیکل پارٹی کی حمایت میں ووٹ دیے۔ (اس پارٹی کو پارلیمنٹ میں ۲۹ فیصد نشستیں حاصل ہوئیں جبکہ حکمراں سوشلسٹ پارٹی کو ۴۰ فیصد نشستیں ملیں۔) ایک اور فیصلہ کن عنصر جمہوریت پسند اپوزیشن کے حامی نوجوانوں کی (محاذ پر بھیج دیے جانے یا جبری بھرتی سے بچ کر فرار یا روپوش ہو جانے کے باعث) انتخابات کے عمل میں غیر موجودگی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سربیا کے موجودہ رائے دہندگان کی پوری ایک تہائی تعداد پنشن یافتہ افراد پر مشتمل ہے جو میلوشےوچ کے کٹر حامی ہیں۔ تاہم سوشلسٹ پارٹی کی کامیابی کا شاید اہم ترین عنصر اپوزیشن کا متحد نہ ہو پانا رہا ہے جس کی وجہ، بلغراد کے آزاد ہفتہ وار Vreme کے مطابق، "قومی سوال پر اُن کا ـــ غیر واضح، ڈھلمل نقطۂ نظر ہے۔" درحقیقت سیاسی مکالے کی بنیادی شرائط طے کرنے پر حکومت کی اجارہ داری کے باعث جمہوریت پسند اپوزیشن کے کچھ لوگ سربیائی قومی مفادات کی سرکاری تعریف کو قبول کرنے لگے اور انھوں نے اُن جمہوریت پسندوں سے اتحاد

Scanned with CamScanner

کرنے سے انکار کر دیا جو جنگ کی مذمت کرتے اور مسلح قوم پرستی کو لبرل جمہوری اقدار کے منافی سمجھتے ہیں۔

سربیا کے جمہوریت پسندوں کے اس عدم اتفاق، اور مادی اور اطلاعاتی وسائل پر حکمراں پارٹی کے موثر کنٹرول نے دسمبر ۱۹۹۳ کے انتخابات میں موخرالذکر کی ایک بار پھر کامیابی کی راہ ہموار کی جبکہ بین الاقوامی اقتصادی پابندیوں کے باعث معیار زندگی پہلے سے کہیں بد تر ہو چکا تھا۔ ماسکو میں اکتوبر ۱۹۹۳ کے اوائل میں اپنے انتہا پسند اتحادیوں کی شکست سے متاثر ہو کر، اور ریڈیکل پارٹی کے بڑھتے ہوئے اثر اور طلبِ اقتدار سے گھبرا کر، سوشلسٹ پارٹی نے حیلہ سازی سے اپنے موقف میں ایک بار پھر ترمیم کی اور خود کو معتدل اور امن پسند ظاہر کرنا شروع کیا۔ حکومت نے ریڈیکل پارٹی سے تعلق رکھنے والے کئی ارکانِ پارلیمنٹ کو مجرمانہ سرگرمیوں کے الزام میں گرفتار کر لیا، اور حتیٰ کہ جمہوریت پسند اپوزیشن سے تعاون پر آمادگی کا بھی اظہار کیا۔ ریاست گیر ٹی وی پر اپنی آہنی گرفت اور اپوزیشن کے زیرانتظام اکا دکا علاقوں کو ایندھن اور خوراک کی رسائی روکنے کی صلاحیت کی بدولت (جبکہ خود اس کے زیرانتظام علاقوں میں ایندھن، خوراک اور دیگر سامان کی بے تحاشا افراط تھی)، حکمراں پارٹی ایک اور انتخابی چیلنج کا مقابلہ کرنے میں کامیاب رہی۔ بلکہ اس کے حاصل کردہ ووٹوں کی تعداد میں اضافہ ہوا (اگرچہ ان کا تناسب اب بھی مجموعی ووٹوں کے ۳۵ فیصد سے زیادہ نہیں) اور پارلیمنٹ میں اس کی ۲۲ نشستیں بڑھ گئیں۔ اس طرح سادہ اکثریت حاصل کرنے کے لیے اس کے پاس صرف تین نشستوں کی کمی ہے۔

انتہا پسندوں کا استحکام

سربیا میں اپنے اقتدار کو مستحکم کر لینے کے بعد، میلوشےوچ کی حکومت بین الاقوامی برادری کی جانب سے بوسنیا کے مقبوضہ علاقوں کو سربیا میں شامل کرنے کی اجازت ملنے کے نتیجے میں اور زیادہ مضبوط ہو جائے گی۔ اس "گریٹر سربیا" میں میلوشےوچ کے انتہا پسند سرب اتحادی بھی شامل ہوں گے جنھوں نے سربیا میں جمہوریت کے خلاف اس کی جنگ میں فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے، اور اس وسیع تر سربیا کی آبادی میں ۷۵ فیصد سے زیادہ سرب نژاد ہوں گے (جنگ اور "نسلی خالصیت" کے عمل سے پہلے اسی علاقے کی اصل آبادی میں سربوں کا تناسب ۶۵ فیصد تھا)۔ اس سرب نژاد آبادی میں ایک چوتھائی لوگ وہ ہیں جو معاشی طور پر پس ماندہ علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور جنگ کی براہِ راست دشواریاں جھیلنے کے باعث انتہا پسندانہ موقف کے حامی بن چکے ہیں۔ ان کی موجودگی اس بات کو تقریباً یقینی بنا دے گی کہ جارحانہ قوم پرستی کا نظریہ برقرار، اور جائز سیاسی

مکالمے کا دائرہ نہایت محدود، رہے۔ درحقیقت کئی اپوزیشن پارٹیاں بھی اب "سربیت کو خطرہ" والی زبان استعمال کرنے لگی ہیں اور جنگ کی حمایت کرتی ہیں، جس سے سربیا کے سیاسی ماحول کے مستقل طور پر مسخ ہوجانے کا اشارہ ملتا ہے اور گمان ہوتا ہے کہ جمہوریت پسند اپوزیشن (جس کا مرکز بلغراد اور دوسرے بڑے شہروں میں ہے) مستقل طور پر مفلوج ہو کر رہ جائے گی۔

اتنی ہی مضطرب کن۔۔ گو سوشلسٹ پارٹی کے نقطۂ نظر سے نہایت پسندیدہ۔۔ بات یہ ہے کہ نسلی تنازعے کی اس حکمت عملی نے دوسری ریاستوں (خصوصاً کروشیا) میں غیر سرب قوم پرست قوتوں کو بھی طاقت بخشی ہے۔ کروشیا میں برسراقتدار پارٹی میں موجود سابق سخت گیر کمیونسٹ (جنھوں نے کمیونسٹ پارٹی پر اصلاح پسندوں کے غلبے کے بعد اس پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی تھی) اور انتہا پسند آمرانہ خیالات رکھنے والے قوم پرست ایک گروہ کی شکل میں اکٹھے ہو چکے ہیں اور برسراقتدار پارٹی کے اعتدال پسند حلقوں اور تیزی سے مقبول ہوتی ہوئی جمہوریت پسند اپوزیشن سوشل لبرل پارٹی کے لیے سخت خطرات پیدا کر رہے ہیں۔ کروشیا میں قدامت پسندوں کے اس اتحاد کا ایک کلیدی حصہ ہرزگووینا سے تعلق رکھنے والے سابق سخت گیر کمیونسٹوں پر مشتمل ہے جنھوں نے کروٹوں کی قوم پرست پارٹی کی بوسنیائی شاخ کی قیادت پر قبضہ کرلیا ہے اور جو بوسنیا میں نسلی تنازعے کو سیاسی غرض سے استعمال کر کے ہرزگووینا کے علاقے کی انتہاپسندانہ موقف رکھنے والی کروٹ آبادی کو کروشیائی ووٹروں میں شامل کرنے کی وکالت کر رہے ہیں۔ جبکہ اس کے برعکس ان تمام بوسنیائی کروٹوں کو جنھوں نے اس پارٹی کے اعتدال پسند حصے کی حمایت کی تھی (جو اب کالعدم ہوچکا ہے)، کروٹوں کے مقبوضہ بوسنیائی علاقوں سے جبراً نکالا جا چکا ہے۔ اپنے سربیائی ہم خیالوں کی طرح یہ انتہا پسند کروٹ بھی جنگ کے مصائب کا براہ راست سامنا کرنے اور اپنے ہم نسل بے قصور افراد کا دفاع کرنے کے باعث خود کو دوسروں سے زیادہ قوم پرست سمجھتے ہیں اور یوں جمہوری عمل کی بیخ کنی پر آمادہ ہیں۔

عالمی برادری مذاکرات کے ذریعے کسی ایسے سمجھوتے پر پہنچنے کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے جو بوسنیا کا بٹوارا کر کے ایسی چھوٹی چھوٹی نسلی طور پر خالص، اور نسل پرست، ریاستوں کو وجود میں لے آئے گا جنھیں اپنی اپنی "مادری" ریاستوں سے الحاق کرنے کا حق حاصل ہو گا۔ اس عمل کے ذریعے عالمی برادری نہ صرف لبرل جمہوریت کے تصورات سے غداری کی مرتکب ہو رہی ہے اور تمام فریقوں سے تعلق رکھنے والے حملہ آوروں کو اُن کی جارحیت کا انعام بانٹ رہی ہے، بلکہ وہ بوسنیا ہرزگووینا، کروشیا اور سربیا میں جمہوریت مخالف قوتوں کو طاقتور بنا رہی ہے۔ تنازعے کی اصل بنیاد تک پہنچنے کے بجائے مغرب نے شروع سے ان جنگوں کو "قدیم نسلی تنازعات" کا نام

دے کر اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہے: درحقیقت یہ جنگیں سربیا، کروشیا اور، سب سے المناک اور ہولناک طور پر، بوسنیا میں جمہوری عمل کے خلاف چھیڑی گئی جنگیں ہیں۔

**

نوٹس

(۱) ڈونلڈ ہورووٹز (Donald Horowitz)، Ethnic Groups in Conflict، (برکلے: یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس، ۱۹۸۵)، صفحہ ۹۹۔ درحقیقت کروشیا میں رہنے والے کروٹوں اور سربوں کے باہمی تعلقات موجودہ صدی سے پہلے کبھی پُرتشدد تنازعے پر مبنی نہیں رہے اور اس صدی کے دوران بھی یہ تنازعہ مسلسل برقرار نہیں رہا۔

(۲) مثال کے طور پر کروشیائی سربوں میں (جو ریاست کی کل آبادی کا ۱۲ فیصد تھے) کروشیائی نژادوں سے شادی کی شرح ۱۹۸۰ کے پورے عشرے میں خاصی اونچی رہی ہے (۲۹ فیصد سربوں نے کروٹوں سے شادی کی)۔ کروشیا کے زیادہ مخلوط النسل علاقوں میں یہ شرح اور بھی زیادہ تھی اور ۵۰ فیصد تک پہنچتی تھی۔

(۳) سربیائی فوجیوں کے اختیار کردہ حربوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے ہیلسنکی واچ کی رپورٹ :Yugoslavia Human Rights Abuses in the Croatian Conflict، ستمبر ۱۹۹۱۔ سربیا کی سب سے بڑی جمہوری قوم پرست پارٹی کے سربراہ ووک دراشکووچ (Vuk Draskovic) نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ حکومت کے ان دعووں کے باوجود کہ سربوں کا "قتلِ عام" ہوا ہے، "سلوونی علاقے میں جنگ شروع کرنا قطعی غیر ضروری تھا"۔ (روزنامہ Danas، ۱۸ فروری ۱۹۹۲ اور ہفتہ وار Vreme، ۴ نومبر ۱۹۹۱۔)

(۴) مثال کے طور پر دیکھیے ہیلسنکی واچ، War Crimes in Bosnia-Herzegovina، صفحہ ۷۵ تا ۸۱، میں سلوونیا میں جاری نسلی خالصیت کی تفصیل۔ اعتدال پسند سربین ڈیموکریٹک فورم نے اس بات کو نوٹ کیا کہ "کرائینا کے علاقے میں آمرانہ رجحانات کی سطح روز بہ روز اونچی ہوتی جا رہی ہے، اور انسانی حقوق کی پامالی روز کا معمول بن گئی ہے۔۔۔ اب مختلف خیالات رکھنے والے سربوں کو بھی جبراً جلاوطن کیا جا رہا ہے بلکہ قتل بھی کیا جا رہا ہے۔" (ایضاً، صفحہ ۸۱)۔

نوئل مالکم

تلخیص اور ترجمہ: اجمل کمال

بوسنیا کی تباہی

۱۹۹۲ اور ۱۹۹۳ کو ایسے برسوں کے طور پر یاد رکھا جائے گا جب یورپ کا ایک پورا ملک برباد ہو گیا۔ اس خطے کی سیاسی اور تہذیبی تاریخ تمام دوسرے یورپی ملکوں سے مختلف تھی۔ یورپی تاریخ کی عظیم قوتیں اور دنیا کے عظیم مذاہب یہاں یک جا اور باہم آمیخت ہو گئے تھے: رومی، شارلیمانی، عثمانی اور آسٹرو ہنگیرین سلطنتیں، اور مغربی مسیحیت، مشرقی مسیحیت، یہودیت اور اسلام کے عقائد۔ یہ منفرد حقائق بوسنیا کی تاریخ کو بجائے خود ایسی انفرادیت عطا کرتے ہیں کہ اس تاریخ کا مطالعہ خاص دل چسپی کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔ لیکن ۱۹۹۲ میں یہ ملک جس جنگ کی لپیٹ میں آگیا اس نے اس تاریخ کو غور سے پڑھنے کی دو اضافی، دردناک وجوہ فراہم کر دی ہیں: پہلی وجہ یہ ہے کہ اس جنگ کے اسباب کو سمجھنے کی کوشش کی جائے، اور دوسری یہ کہ کج فہمی، دانستہ اسطورہ سازی (myth-making) اور مکمل لاعلمی کی اس دھند کو صاف کیا جائے جو بوسنیا اور اس کی تاریخ کی بابت بحث پر چھائی ہوئی ہے۔

یہ دوسری وجہ فی الوقت زیادہ اہم ہے۔ عجیب بات ہے کہ بوسنیا کی تاریخ پر نظر ڈالنے کا اہم ترین جواز یہ ہے کہ اس کے بغیر یہ نکتہ سمجھنا ناممکن ہے کہ حالیہ جنگ کے اسباب اس کی تاریخ سے برآمد نہیں ہوتے۔ یہ درست ہے کہ اگر بوسنیا کا پس منظر وہ نہ ہوتا جو کہ ہے، اور جس کے باعث یہ ملک مخصوص عزائم اور مفادات کا ہدف بن گیا ہے، تو یہ جنگ پیش نہ آتی۔ لیکن یہ عزائم بوسنیا کی اپنی سرحدوں کے باہر سے حملہ آور ہوئے ہیں۔ اس تنازعے کو ٹھیک طرح سمجھ پانے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ مفروضہ ہے کہ پچھلے دو برسوں میں اس ملک میں جو واقعات پیش آئے وہ بوسنیا کی اپنی تاریخ کے فطری، بے ساختہ اور لازمی نتائج ہیں۔ یہ وہ اسطورہ ہے جسے اس جنگ کا آغاز کرنے والوں نے بڑی احتیاط کے ساتھ پھیلایا ہے جو دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ جو کچھ وہ اور ان کے مسلح سپاہی کر رہے ہیں دراصل اس کی ذمے داری اُن پر نہیں بلکہ تاریخ کی

Scanned with CamScanner

غیر شخصی اور ناگزیر قوتوں پر ہے جن پر کسی کا زور نہیں چلتا۔

اور دنیا نے یہی باور کیا ہے۔ یہ بات تو بعد میں آنے والے مورخ طے کریں گے کہ یوروپ اور امریکا کے سیاست دانوں کے ذہنوں پر دراصل کن دلائل کا غلبہ تھا جن کے باعث انھوں نے بوسنیا کی جنگ کے ردعمل میں ایسی پالیسیاں اختیار کیں جن سے نہ صرف بحران کا کوئی حل نہ نکلا بلکہ وہ اَور زیادہ سنگین ہو گیا۔ جو بات اِس وقت واضح طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان مغربی سیاست دانوں کے ذہنوں پر پہلے سے تاریخ سے لاعلمی کی دھند چھائی ہوئی تھی جس نے انھیں اس جنگ کو درست تناظر میں دیکھنے سے روک دیا۔ مثال کے طور پر برطانوی وزیرِاعظم جان میجر کا یہ بیان ملاحظہ کیجیے جو اُس نے، جنگ چھڑنے کے ایک سال بعد، ہاوس آف کامنز میں دیا:

> "بوسنیا میں جو کچھ ہوا اس کی پُشت پر کارفرما اہم ترین عنصر سوویت یونین کا خاتمہ ہے جس کے ساتھ ہی اُس نظم وضبط کا بھی خاتمہ ہو گیا جس نے سابق یوگوسلاویا میں موجود قدیم نفرتوں کو شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ اس شکنجے کے ٹوٹنے پر یہ قدیم نفرتیں دوبارہ نمودار ہو گئیں اور ہم ان کے نتائج خوں ریز لڑائی کی صورت میں دیکھنے لگے۔ اس کے بعض ضمنی اسباب بھی تھے لیکن (سوویت یونین کا) خاتمہ بلاشبہ اہم ترین سبب تھا۔" (۲۳ جون ۱۹۹۳-)

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قسم کے بیان پر تبصرہ کس نکتے سے شروع کیا جائے۔ سوویت یونین نے یوگوسلاویا پر جو "نظم وضبط" عائد کیا تھا وہ ۱۹۴۸ میں اچانک، اور خاصی تشہیر کے ساتھ، اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔ یہ وہ موقع تھا جب اسٹالن نے ٹیٹو کو کومنفورم (Cominform) کی تنظیم سے خارج کیا تھا۔ ممکن ہے میجر کا اشارہ بعض کمیونسٹ سیاست دانوں (مثلاً سربیائی لیڈر سلوبودان میلوشےوچ) کی طرف ہو جنھوں نے قوم پرستی کے جذبات کو اپنی سیاسی اغراض کے لیے استعمال کیا؛ لیکن یہ عمل بھی ۱۹۸۹ کے موسمِ گرما میں، یعنی "سوویت یونین کے خاتمے" سے دو برس پہلے، پورے زورشور سے شروع ہو چکا تھا، اور بہرحال قوم پرستی کے استحصال کی اُن مثالوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا جو خود کمیونسٹ نظام کے اندر اس سے پہلے کے رہنما (مثلاً رومانیا کا نکولائی چاؤشسکو) قائم کر چکے تھے۔ یہ خیال کہ کمیونزم نے عموماً قوم پرستی کو کسی طرح کے قابلِ تعریف "نظم وضبط" کی گرفت میں رکھا، دو اعتبار سے غلط ہے۔ کمیونسٹ حکومتوں نے یا تو قوم پرستی کو اپنے مفادات کے تحت بھڑکایا اور ہوا دی یا کسی ملک کی آبادی کو سیاسی طور پر محرومی کا شکار اور برگشتہ کر کے اس قسم کے جذبات کو پنپنے کا موقع فراہم کیا۔ بیشتر صورتوں میں ان

حکومتوں نے بیک وقت یہ دونوں کام کیے۔ اس کا دوہرا نتیجہ آج مشرقی یوروپ کے زیادہ تر ملکوں میں ہمارے سامنے ہے جہاں "انتہا پسند دائیں بازو" کی پارٹیاں کمیونزم سے قبل کے دور کی مذہبی یا تاریخی علامتوں کے ذریعے سے عام ووٹروں کے جذبات بھڑکا کر ان کی حمایت حاصل کر رہی ہیں۔ اور بعض ایسے سیاست داں بھی ان پارٹیوں کے ساتھ مل گئے ہیں جنھوں نے اپنی عملی زندگی اب تک کمیونسٹ پارٹی یا ریاستی سکیورٹی سروس میں گزاری تھی۔ کم و بیش یہی عمل سربیا میں بھی پیش آیا ہے۔

جان میجر کے مندرجہ بالا بیان میں کج فہمی کا ایک اور اہم نکتہ، جسے بیشتر مغربی رہنما بوسنیا کی جنگ پر گفتگو کرتے ہوئے دُہراتے رہتے ہیں، یہ دعویٰ ہے کہ ۱۹۹۲ کے موسم بہار سے اب تک بوسنیا میں جو واقعات پیش آئے ہیں وہ اُن "قدیم نفرتوں" کا اظہار ہیں جو اندر ہی اندر خود بخود پک رہی تھیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بوسنیا کے ماضی میں ان نفرتوں اور رقابتوں کا وجود رہا ہے؛ پچھلے دو برسوں میں جن لکھنے والوں نے بوسنیا کو دائمی بین المذہبی ہم آہنگی کا گہوارہ بنا کر پیش کیا ہے انھوں نے مبالغے سے کام لیا ہے۔ لیکن بوسنیا کی تاریخ پر ذرا سا غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ دشمنیاں، جو ایک وقت میں یقیناً موجود تھیں، مطلق اور غیر مبدل ہرگز نہیں تھیں۔ اور یہ رقابتیں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے گروہوں کے باہم آمیخت ہونے کا ناگزیر نتیجہ بھی نہیں تھیں۔ ان رقابتوں کی اصل بنیاد نسلی یا مذہبی نہیں بلکہ معاشی تھی: یعنی وہ معاندت جو کسان طبقہ (جس میں اکثریت مسیحیوں کی تھی لیکن تمام لوگ مسیحی نہیں تھے) اپنے مسلمان جاگیرداروں کے خلاف محسوس کرتا تھا۔ یہ معاندت بھی کوئی مطلق یا اٹل چیز نہیں تھی: معاشی حالات میں تبدیلی کے ساتھ اس میں بھی تبدیلی آئی، اور انیسویں صدی کے نصف اول میں سیاسی دباؤ کے زیرِ اثر جب جاگیردار طبقے کا رویہ بدلا تو اس معاندت کی شدت میں بھی کمی آ گئی۔ اسی طرح کیتھولک اور اور تھوڈوکس مسیحیوں کے مابین رقابت بھی کئی عوامل کا نتیجہ تھی، مثلاً دونوں کلیساؤں کے رہنماؤں کی باہمی چپقلش، ہمسایہ ملکوں کا سیاسی دباؤ وغیرہ۔

یہ دشمنیاں اور رقابتیں بوسنیا کے باشندوں کی نفسیات کا دائمی جز نہیں تھیں؛ یہ تاریخی عوامل کے زیرِ اثر پیدا ہوئی تھیں اور تاریخ کے ارتقا کے ساتھ ساتھ زائل بھی ہوتی رہی تھیں۔ نفرتوں کے معاشی اسباب کا کم و بیش مکمل ازالہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کی تبدیلیوں اور اصلاحوں کے ذریعے ہو چکا تھا۔ جہاں تک مذہبی منافرتوں کا سوال ہے ان کا زور بیسویں صدی کے نصف آخر میں معاشرے کو سکیولر بنانے والے (کچھ فطری، کچھ غیر فطری) عوامل کے نتیجے میں ٹوٹ گیا تھا۔ ۱۸۷۸ کے بعد کے بیشتر عرصے میں بوسنیا کی تمام مذہبی یا نسلی

Scanned with CamScanner

برادریاں ایک دوسرے کے ساتھ پُرامن طور پر رہیں۔ اس عرصے میں سنگین تشدد کے صرف دو وقفے آئے: پہلی جنگِ عظیم کے دوران اور فوراً بعد کا وقفہ، اور دوسری جنگِ عظیم کے چار سال۔ ان دونوں وقفوں میں ہونے والا تشدد مستثنیات کی ذیل میں آتا ہے، اور اس تشدد کو ابھارنے اور بھڑکانے والی قوتیں بوسنیا کی سرحدوں کے باہر سے کام کر رہی تھیں۔ موخرالذکر پُرتشدد وقفے کے بعد سے دو پوری نسلیں جوان ہو چکی ہیں، اور بوسنیا کی آبادی کی اکثریت انہیں دو نسلوں پر مشتمل ہے، جن کے پاس نہ تو اُس تشدد کی ذاتی یادیں ہیں اور نہ اُسے ازسرِ نو زندہ کرنے کی کوئی خاص خواہش۔

بوسنیا جیسے کسی ملک کی تاریخ سے علاقائی تقسیم، تشدد اور بدنظمی کی مثالیں چُن لینا بےحد آسان ہے۔ اس قسم کی مثالیں یقیناً موجود ہیں، لیکن بیسویں صدی کے آخر کے بوسنیا کی تاریخ اُن واقعات نے نہیں متعیّن کی ہے جو تیرھویں یا اٹھارویں صدی میں پیش آئے تھے۔ جو تبصرہ نگار اپنی تحریروں کو ایک جاجلانہ تاریخی استناد بخشنا چاہتے ہیں وہ بوسنیا کے ماضی سے چند خوں ریز واقعات چُن کر یہ فیصلہ صادر کر دیتے ہیں کہ "اس خطّے میں ہمیشہ سے یہی کچھ ہو رہا ہے۔" یہی عمل، مثال کے طور پر، فرانس کی تاریخ کے ساتھ بھی کیا جا سکتا ہے: سولھویں صدی کی مذہبی جنگیں، سینٹ بارتھولومیو کے دن پیش آنے والا بہیمانہ قتلِ عام، بارہا پیش آنے والی علاقائی بغاوتیں، (لوئی چہاردہم کے زمانے کی) فروند جھڑپیں، ۱۶۸۵ میں ہیوگناٹس کے ساتھ کیا جانے والا سفاکانہ برتاو، انقلابِ فرانس کے فوراً بعد پیش آنے والا تشدد اور قتلِ عام، انیسویں صدی کا سیاسی عدم استحکام، بلکہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران فرانسیسی آبادی کا نازیوں کا ساتھ دینے والوں اور ان کے خلاف مزاحمت کرنے والوں میں تقسیم ہو جانا —— ایسی مثالیں فرانس کی تاریخ سے بھی چُنی جا سکتی ہیں۔ لیکن اگر آج غیر ملکوں سے شہ پا کر چند سیاست دان اور فوجی کمانڈر پیرس کو بھاری توپوں کی گولاباری کا نشانہ بنا لیں تو ہم یہ کہہ کر آرام سے نہیں بیٹھ جائیں گے کہ یہ محض "قدیم فرانسیسی نفرتوں" کا ناگزیر نتیجہ ہے۔ ہم اس مخصوص بحران کی اصل نوعیت اور اس کے اسباب پر غور کر کے اس کو سمجھنا چاہیں گے۔

بوسنیا کے مقابلے میں فرانس کی تاریخ کی مُثبت بات یہ ہے کہ یہ خاصی مشہور ہے اور عمیق تفصیلی مطالعے کا موضوع رہی ہے۔ بوسنیا کی تاریخ کی بابت درست معلومات عموماً اتنی کم ہیں کہ پچھلے دو برسوں میں لاعلمی کی دھند اور پروپیگنڈے کے پھیلائے ہوئے دھوئیں کے درمیان فرق کرنا نہایت دشوار رہا ہے۔ بعض لکھنے والوں نے تو بوسنیا کے تاریخی وجود ہی سے انکار کر کے یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ "بوسنیا کبھی ایک ریاست نہیں رہا۔" جب لارڈ اوون کو یورپی برادری کی جانب

سے بوسنیا کے سلسلے میں ثالث مقرر کیا گیا تو ایک برطانوی کالم نگار نے بڑی سنجیدگی سے انھیں بتایا کہ یوگوسلاویا کی اندرونی سرحدیں دراصل محض انتظامی حد بندیاں تھیں اور اُسی قدر مصنوعی تھیں جیسے افریقا پر نو آبادیاتی حاکموں کی مسلط کی ہوئی تقسیم۔ بعض لکھنے والے یہ بھی دعویٰ کرتے رہے ہیں کہ بوسنیا کی سرحدیں ٹیٹو نے ایجاد کی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ٹیٹو نے محض بوسنیا کی اُن تاریخی سرحدوں کو بحال کیا تھا جو عثمانی اور آسٹرو ہنگیرین سلطنتوں کے زمانے میں قائم رہ چکی تھیں۔ یہ سرحدیں بعض مقامات پر اٹھارویں صدی کے معاہدوں کے نتیجے میں طے ہوئی تھیں اور بعض مقامات پر اس سے بہت پہلے کے تاریخی ادوار سے چلی آرہی تھیں، مثلاً بوسنیا اور سربیا کو الگ کرنے والا دریائے درینا جس کا ذکر بارھویں صدی کے اواخر کے واقعہ نویس کناموس (Kinnamos) نے بھی کیا ہے۔

تاریخی کج فہمیوں کے یہ اجزا جو پچھلے دو برس کے عرصے میں مغربی ذرائع ابلاغ میں مسلسل پیش کیے جاتے رہے ہیں، پرانے یوگوسلاویا میں قومی اور سیاسی اسطورہ سازی کے عمل میں اُبھر کر سامنے آئے ہیں۔ گزشتہ ایک صدی سے زائد عرصے میں کروٹوں نے ایسی کتابیں لکھی ہیں جن میں ثابت کیا گیا ہے کہ بوسنیا کے باشندے "دراصل" کروٹ ہیں؛ دوسری جانب سربوں نے مسلسل اس بات کی تکرار کی ہے کہ بوسنیا کے باشندے "دراصل" سرب ہیں۔ نسبتاً حال میں کروشیائی پروپیگنڈے نے تمام سربیائی قوم پرستوں کو "چیتنک" (Cetnik) قرار دیا ہے اور دوسری جنگِ عظیم میں چیتنکوں کے لیڈر دراژا میحائیلووچ کو قتلِ عام کے عادی شیطان کے طور پر پیش کیا۔ دوسری طرف سرب پروپیگنڈے نے تمام کروٹ قوم پرستوں کو "اُستاشا" (Ustasa) کا لقب دے دیا، اور نازی فوج کے ایک مسلم ڈویژن کی کہانی تراش لی تاکہ یہ تاثر دیا جا سکے کہ بوسنیائی مسلمان نازی یا بنیاد پرست، یا بیک وقت دونوں، ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اس تنازعے کے ٹھیک مرکز میں ہیں -- یعنی مسلمان، یا کثیر مشرب بوسنیا پر یقین رکھنے والے، یا دونوں -- ان کے حصے میں باقی ماندہ اساطیر آئے جو انھیں تسکین دے سکتے تھے: یعنی بوگومِل (ازمنۂ وسطیٰ کے بوسنیا میں دو مذہبوں کو بیک وقت ماننے والوں) کا اسطورہ، دائمی امن اور ہم آہنگی کے گہوارے کا اسطورہ، ٹیٹو کا اسطورہ۔ کسی تجزیہ نگار یا مورخ کے پاس ان اساطیر کے درمیان سے اپنا راستا نکالنے کا کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے جس سے تمام فریقوں کے نظریاتی عقائد کو کم یا بیش صدمہ نہ پہنچے۔ علاوہ ازیں اگر متضاد دعوے اور دلیلیں ایک دوسرے سے برسرِپیکار نظر آتی ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان تمام دعووں کا اوسط نکال کر کسی درست نتیجے تک پہنچا جا سکتا ہے۔ مجھے اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ بوسنیا کی تباہی کی ذمے داری بہت نمایاں طور پر تنازعے کے

ایک فریق پر عائد ہوتی ہے، اور آگے چل کر میں نے اپنے اسی خیال کے اسباب کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔

بوسنیا میں تشدد کی آگ بھڑکانے والوں کے تاریخی دعووں کو پرکھنے کا ایک سادہ سا طریقہ تو یہی ہے کہ انھوں نے خود تاریخ کی مرئی شہادتوں کا جو حشر کیا ہے اُس پر نگاہ ڈال لی جائے۔ وہ صرف اپنے ملک کے مستقبل ہی کو خاک میں نہیں ملا رہے بلکہ اس کے ماضی کو مٹا ڈالنے کی بھی دانستہ کوشش کر رہے ہیں۔ سرائیوو کی سرکاری لائبریری اور یونیورسٹی کی لائبریری کو آتش گیر گولے پھینک کر جلا ڈالا گیا۔ اورینٹل انسٹیٹیوٹ بھی، جہاں بوسنیا کی عثمانی دور کی تاریخ سے متعلق مخطوطوں اور دوسرے مواد کا بے مثل ذخیرہ محفوظ تھا، نشانہ باندھ کر کی گئی گولاباری سے تباہ ہوا۔ پورے ملک میں مسجدوں اور میناروں کو مسمار کیا گیا جن میں مغربی بلقان کے سولھویں صدی کے عثمانی طرزِ تعمیر کے نفیس ترین نمونے بھی شامل تھے۔ یہ عمارتیں محض فوجی جھڑپوں کے دوران اتفاقیہ زد میں نہیں آ گئیں؛ بیے لینا (Bijeljina) اور بنالوقا (Banja Luka) جیسے شہروں میں عمارتوں کی تباہی کا لڑائی سے قطعاً کوئی تعلق نہیں تھا۔ مسجدوں کو رات کے وقت بم پھینک کر تباہ کیا جاتا اور صبح کے وقت بلڈوزر کے ذریعے ملبہ صاف کر دیا جاتا تھا۔ جن لوگوں نے ایسے اقدامات کی باقاعدہ منصوبہ بندی کی اور ان پر عمل درآمد کروایا، وہی یہ کہتے ہیں تاریخ اُن کے ساتھ ہے۔ اُن کے اعمال سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے ملک کی تاریخ ہی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔

یوگوسلاویا کا اختتام اور بوسنیا

۲۸ جون ۱۹۸۹ کو کئی لاکھ سرب کوسووو کے دارالحکومت پرشتینا (Pristina) سے کچھ باہر گازیمستان کے قدیم جنگی میدان میں جنگِ کوسووو کی چھ سو سالہ یاد منانے کے لیے جمع ہوئے۔ پچھلے کئی ہفتوں سے سربیا میں قومی جذبات کو باقاعدہ اُبھارا جاتا رہا تھا۔ اس جنگ میں مارے جانے والے شہزادہ لزار کی ہڈیوں کو نکال کر سارے ملک میں گھمایا گیا اور ہر مقام پر لوگوں نے مذہبی عقیدت کے ساتھ ان کی زیارت کی۔ جب یہ ہڈیاں کوسووو کے دارالحکومت کے قریب واقع خانقاہ میں نمائش کے لیے پہنچیں تو باہر یسوع مسیح، شہزادہ لزار اور سلوبودان میلوشےوچ کی مذہبی انداز کی بڑی بڑی تصویریں ساتھ ساتھ بک رہی تھیں۔ جنگی میدان میں ہونے والی تقریب میں میلوشےوچ کے ساتھ کالی عبائیں پہنے اور تھوڈوکس چرچ کے علما، روایتی سربیائی پوشاکیں پہنے گلوکار اور سیاہ سوٹوں میں ملبوس اور دھوپ کے چشمے لگائے سکیورٹی پولیس کے لوگ بھی موجود تھے۔ "چھ سو سال

بعد، "میلوشے وچ نے ہجوم سے مخاطب ہو کر کہا، "آج ایک بار پھر ہمیں جنگوں اور لڑائیوں کا سامنا ہے۔ یہ مسلح جنگیں نہیں ہیں، لیکن مسلح جنگوں کا بھی امکان موجود ہے۔" ہجوم نے تعریفی شور و غل برپا کیا۔

یہ واقعہ یوگوسلاو سرزمین کی تاریخ کا ایک علامتی موڑ تھا۔ اس وقت تک میلوشے وچ وہ سب کچھ حاصل کر چکا تھا جو اس نے چاہا تھا۔ اس نے کمیونسٹ طریقوں اور قوم پرستانہ خطابت کی مدد سے سربیا میں انتہائی طاقت ور حیثیت حاصل کر لی تھی۔ وفاقی حکومت میں اس کے پاس آٹھ میں سے چار ووٹ تھے۔ صرف مقدونیا کو جھکا کر وہ وفاقی سطح پر کچھ بھی کرنے کے قابل ہو سکتا تھا، اور تب نیا وفاقی آئین تیار کیا جا سکتا تھا جو سربوں کی بالادستی کو دوام بخش دیتا۔

تاہم جس عمل کے ذریعے وہ اس مقام تک پہنچا تھا اس کو دیکھتے ہوئے یہ غیر اغلب معلوم ہوتا تھا کہ یوگوسلاویا کے جو علاقے اس کے کنٹرول سے باہر ہیں وہ ملک کی اس نئی تشکیل پر رضامند ہو جائیں گے۔ میلوشے وچ کے سرکاری ذرائع ابلاغ مسلسل اشتعال انگیز کروٹ مخالف پروپیگنڈے میں مشغول تھے جس کے رد عمل میں کروٹوں کی بھی پرانی عداوتیں تازہ ہو گئی تھیں۔ لیکن اس رد عمل میں دوسری جنگ عظیم میں فسطائی اُستاشوں کے طرزِ عمل کا جواز پیش کرنا شامل نہیں تھا (گو بعد میں ایسا بھی ہوا) بلکہ اس کے نتیجے میں، سابق پارٹیزن اور فوجی جنرل، فرانیو تجمان جیسے قوم پرست سامنے آئے جو کروشیا کے قومی احساسات کو اُستاشوں کی تاریخ سے الگ کر کے دیکھتے تھے۔ اس کے علاوہ کروشیا کے کچھ علاقوں کو سربیا میں شامل کرنے کی باتیں بھی خطرے کے احساس کو جنم دے رہی تھیں۔

اس دوران میلوشے وچ کے آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے آئینی انقلاب کی زد سے محفوظ رہنے کے لیے یوگوسلاویا کی سب سے زیادہ مغرب نواز اور آزاد خیال ریاست سلووینیا نے ستمبر اکتوبر ۱۹۸۹ میں قانون سازی کی آزادی اور وفاق سے الگ ہونے کے حق کا اعلان کر دیا۔ اسی عرصے میں مشرقی یوروپ میں کمیونسٹ نظام شکست و ریخت کا شکار ہو رہا تھا۔ یوگوسلاویا میں ان گنت آزاد سیاسی پارٹیاں قائم ہو گئیں۔ جنوری ۱۹۹۰ میں سلووینیا کی کمیونسٹ پارٹی نے وفاقی لیگ کے اجلاس سے واک آوٹ کیا اور دو ہفتے بعد اپنا نام بدل کر جمہوری احیا کی پارٹی رکھ لیا۔ ۱۹۹۰ کے موسم بہار میں سلووینیا اور کروشیا میں کثیر جماعتی انتخابات ہوئے۔ سلووینیا میں ایک لبرل قوم پرست مخلوط حکومت قائم ہوئی اور کروشیا میں تجمان کی پارٹی کروشین ڈیموکریٹک یونین کو فتح حاصل ہوئی۔

میلوشے وچ نے بھی اپنی پارٹی کا نام بدل کر سوشلسٹ پارٹی رکھ لیا اور کثیر جماعتی انتخابات

پر رضامند ہو گیا۔ لیکن یہ انتخابات سال کے آخر تک کے لیے ملتوی کیے گئے کیوں کہ اُسے اپنی مقبولیت میں کمی کے وقفوں پر تشویش تھی اور وہ کسی قومی بحران کی سی صورت حال کے انتظار میں تھا تاکہ سربیا کے نجات دہندہ کا پیکر اختیار کر سکے۔ چوں کہ سربیا ریڈیو اور ٹی وی اس کی مضبوط گرفت میں تھا اس لیے محتاط منصوبہ بندی کے تحت کرائے گئے انتخابات میں اس کے ہارنے کا کم ہی امکان تھا۔ اس کو یوگوسلاویا کے وفاق کو قائم رکھتے ہوئے تمام ریاستوں پر تصرّف کی حکمتِ عملی پر نظرثانی کی ضرورت محسوس ہوئی کیوں کہ کمیونسٹ پارٹی منتشر ہو چکی تھی۔ اس کے پاس اب ایک ہی راستا تھا: اگر یوگوسلاویا کو قائم نہیں رکھا جا سکتا تو اس میں سے ایک بڑا سا حصہ تراش لیا جائے جو "گریٹر سربیا" ہو گا۔ ۱۹۹۰ کے بیشتر حصے میں کروشیا اور سلووینیا کے سیاست داں باہمی مذاکرات کے ذریعے یوگوسلاویا کے وفاق کو پُرامن طور پر کنفیڈریشن میں منقلب کرنے کی وکالت کرتے رہے، لیکن میلوشےوِچ نے اس اسکیم میں دلچسپی نہ لی۔

میلوشےوِچ کی نئی حکمتِ عملی کا پہلا اظہار کروشیا کے علاقے کرائینا کے شہر کنین (Knin) میں ہوا۔ اپریل ۱۹۹۰ میں اس علاقے کے سربوں نے، جنھیں نئی ریاست کروشیا میں اپنی تہذیبی شناخت کھو بیٹھنے کا خدشہ تھا، خود کو سربین ڈیموکریٹک پارٹی میں منظم کر لیا تھا۔ میلوشےوِچ کو اس مقامی طور پر بنائی گئی پارٹی سے شروع سے دل چسپی تھی۔ پارٹی کے کچھ انتہاپسند عناصر بلغراد کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر "اُستاشا ریاست" میں اپنے دفاع کی باتیں بھی کرنے لگے تھے۔ انتخابات میں برسرِاقتدار آنے والی پارٹی کی پالیسیوں سے اُنھیں کچھ جائز شکایات بھی پیدا ہوئی تھیں۔ ۱۹۹۰ کے موسمِ گرما میں پارٹی کی قیادت ایک انتہاپسند لیڈر کے ہاتھ میں آ گئی جو میلوشےوِچ کے قریب سمجھا جاتا تھا۔ اگست ۱۹۹۰ میں کروشیائی حکومت کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سربوں کی خودمختاری کے سوال پر ایک مقامی ریفرنڈم کرایا گیا جس میں ہنگامے ہوئے اور چند کروشیائی پولیس والے مارے گئے۔ جنوری ۱۹۹۱ میں مقامی سرب لیڈر اس علاقے کو "کرائینا کا خودمختار سرب علاقہ" کہنے لگے اور انھوں نے اپنی "پارلیمنٹ" بھی قائم کر لی۔ مزید ہنگامے ہوئے جن کے بعد وفاقی ایوانِ صدر نے، کروشیائی حکومت کی مخالفت کے باوجود، یوگوسلاو فوج کو "امن بحال کرنے" کے لیے علاقے میں بھیج دیا۔

بوسنیا کے شمال مغربی سرحد کے اُس پار ہونے والے یہ واقعات بہت اہم ہیں کیوں کہ انھیں میں وہ خاکہ ملتا ہے جس پر بعد میں بوسنیا میں بھی عمل کیا گیا۔ اس خاکے کے مطابق تین تکنیکیں برتی گئیں: ایک عمومی اور دو خصوصی۔ عمومی تکنیک یہ تھی کہ متواتر منفی پروپیگنڈے کے ذریعے مقامی سرب آبادی میں اشتعال پیدا کیا جاتا۔ خصوصی تکنیکوں میں سے ایک وہ تھی جسے

"گاؤں کو اپنے ساتھ ملانا" کہا جاتا ہے۔ کسی گاؤں کے قریب کروشیائی پولیس والوں سے بھری گاڑی پر فائرنگ کر دی جاتی، اور پھر جوابی کارروائی کا خوف دلا کر گاؤں کے باشندوں میں اسلحہ تقسیم کیا جاتا۔ جب پولیس لیس ہو کر پہنچتی تو تصادم بہ آسانی شروع ہو جاتا جس کے نتیجے میں ایک گاؤں، جو اب تک غیر جانبدار تھا، اب حملہ آوروں کے ساتھ مل جاتا۔ دوسری خصوصی تکنیک یہ تھی کہ تشدد کے ذریعے ہولناک صورتِ حال پیدا کی جاتی اور پھر یوگوسلاو فوج کو انتظام سنبھالنے کے لیے بلا لیا جاتا۔

کروشیا کے علاقے میں سے ٹکڑے تراشنے کا یہ عمل، جو کروشیا کے اعلانِ آزادی (جولائی ۱۹۹۱) سے ایک سال پہلے شروع ہوا تھا، اُس مفروضہ خطرے پر بنیاد رکھتا تھا جو اُستاشوں کی جانب سے سربوں کو درپیش ہو سکتا تھا۔ بوسنیا کے سلسلے میں اس قسم کا دعویٰ ہرگز قابلِ یقین نہیں ہو سکتا تھا، لہذا سربوں کے لیے کوئی نیا خطرہ فرض کرنا ضروری تھا، چناں چہ بوسنیائی سربوں کو یہ بتایا گیا کہ اُنھیں اسلامی بنیاد پرستی کی طرف سے خطرہ لاحق ہے۔

دوسری اکثر ریاستوں کی طرح بوسنیا میں بھی ۱۹۹۰ کے آغاز میں کمیونسٹ پارٹی منتشر ہو گئی تھی اور قوم پرست یا قومی پارٹیاں قائم ہو گئی تھیں۔ ۱۹۸۹ کے بعد سے بوسنیا کو اپنے دونوں پڑوسیوں، سربیا اور کروشیا، کی طرف سے دھمکیاں مل رہی تھیں۔ میلوشےوچ "سربیت" کا کھلم کھلا حامی تھا، اور تجمان کا یہ خیال بھی ریکارڈ پر تھا کہ بوسنیا کے مسلمان دراصل نسلی طور پر کروٹ ہیں اور یہ کہ بوسنیا اور کروشیا مل کر ایک "ناقابلِ تقسیم جغرافیائی اور اقتصادی اکائی" بناتے ہیں۔ مارچ ۱۹۹۰ میں بوسنیا کی اسمبلی کے ایوانوں نے بوسنیا کی سرحدوں میں کسی بھی قسم کے ردوبدل کے خلاف قرارداد منظور کی۔ لیکن اگر ایک طرف میلوشےوچ عملی طور پر پیش قدمی کر رہا تھا، تو دوسری طرف تجمان کی سرکاری پالیسی سرحدوں میں ردوبدل کے خلاف تھی کیوں کہ اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جاتا تو سب سے پہلے کروشیا کی اپنی سرحدیں سکڑ جاتیں۔ بوسنیا میں سربوں کے "خطرے" میں ہونے کا جو پروپیگنڈا ۱۹۸۹ کے موسمِ گرما کے بعد بلغراد سے متواتر کیا جا رہا تھا اس نے بوسنیا کے مسلمان اور کروٹ باشندوں کو عملاً ایک طرف اکٹھا کر دیا تھا اور سربوں کو دوسری طرف۔ ۱۹۹۰ کے اوائل میں جب بوسنیائی کروٹوں نے اپنی پارٹی قائم کی تو وہ تجمان کے زیرِ اثر اس خیال کے حق میں تھی کہ بوسنیا کی سرحدوں کو جوں کا توں قائم رکھا جائے۔ لیکن اسی سال جولائی میں سربوں نے اپنی پارٹی قائم کی تو اس کا نام وہی رکھا جو کروشیائی سربوں کی قوم پرست پارٹی کا تھا جس نے کروشیا کے علاقے کرائینا میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا تھا۔

بوسنیا کے مسلمانوں کی سب سے بڑی جماعت خود کو "پارٹی فار ڈیموکریٹک ایکشن" کا نام

دستی تھی اور مئی ۱۹۹۰ میں قائم ہوئی تھی۔ اس پارٹی کی قیادت علیا عزت بیگووچ کے ہاتھ میں تھی جو ۱۹۸۸ میں جیل سے رہا ہوا تھا۔ اسے اس عشرے کے سب سے معروف مقدمے کے بڑے ملزم کی حیثیت سے سزا ہوئی تھی اور اس لحاظ سے وہ کمیونسٹ دور کے بعد قائم ہونے والی مسلمانوں کی غیر کمیونسٹ پارٹی کے لیے فطری انتخاب تھا۔ (صدر بننے کے بعد عزت بیگووچ کو تمام سابق یوگوسلاو ریاستوں کے سربراہوں میں واحد صدر ہونے کا امتیاز حاصل ہوا جو ماضی میں کمیونسٹ پارٹی کا عہدے دار نہیں رہا تھا۔) سربیائی اور کروشیائی قوم پرستی کے ردِ عمل میں بوسنیائی مسلمانوں نے دو قسم کے رویے اختیار کیے: ایک تو اپنی شناخت کے سب سے منفرد عنصر، یعنی مذہب، پر زور دے کر اپنی قوم پرستی کو مستحکم کرنے کا رویہ، اور دوسرے بوسنیا کی انفرادیت، یعنی اس کے کثیر نسلی اور کثیر مذہبی ریاست کی حیثیت، پر زور دے کر اسے برقرار رکھنے کا رویہ۔ اوّل الذکر رویہ پارٹی کی عوامی علامتوں، مثلاً سبز جھنڈوں، کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا، اور آخر الذکر رویے کا اظہار پارٹی کے پروگرام سے ہوتا تھا۔ جیسا کہ خود عزت بیگووچ نے ایک صحافی کو بتایا:

> "کمیونسٹوں نے اپنے جبر کے ذریعے لوگوں میں اپنی مذہبی یا نسلی شناخت کے اظہار کی آرزو پیدا کی۔ شاید چار پانچ سال میں ہم بارودی سرنگوں سے بھرے اس میدان سے نکل کر مہذب معاشرے کی سرحد میں داخل ہو جائیں گے۔ لیکن موجودہ صورتِ حال میں ہماری پارٹی یقیناً ایک فرقے کی نمائندہ ہے۔ یہاں خانہ جنگی کے شروع ہونے کا شدید خطرہ ہے اور ہمارا بنیادی مقصد بوسنیا ہرزگووینا کو متحد رکھنا ہے۔"

لیکن ذاتی طور پر عزت بیگووچ مذہبی شناخت ہی سے وابستہ تھا۔ اس کی لکھی ہوئی وہ دستاویز، یعنی "اعلانِ اسلامی"، جسے ۱۹۸۳ کے مقدمے میں الزامات کی بنیاد کے طور پر استعمال کیا گیا تھا، ۱۹۹۰ میں سرائیوو سے دوبارہ شائع ہوئی۔ سرب پروپیگنڈے میں اسے اکثر بوسنیا کو بنیاد پرست اسلامی ریاست بنانے کے منصوبے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، لیکن ایسا کوئی منصوبہ نہ تو اس اعلان میں موجود ہے اور نہ پارٹی کے منشور میں۔

۱۹۶۰ میں تحریر کی گئی یہ دستاویز دراصل سیاست اور اسلام کے موضوع پر عمومی خیالات کا مجموعہ ہے جس کی مخاطب پوری اسلامی دنیا ہے۔ یہ بوسنیا کے بارے میں نہیں ہے، یہاں تک کہ اس میں لفظ "بوسنیا" ایک بار بھی استعمال نہیں کیا گیا۔ عزت بیگووچ نے اپنی بات کا آغاز دو بنیادی عناصر سے کیا ہے: اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت۔ اس کا کہنا ہے کہ اسلامی حکومت اُس وقت تک قائم نہیں کی جا سکتی جب تک اسلامی معاشرہ موجود نہ ہو، اور اسلامی معاشرہ صرف تب

قائم ہو سکتا ہے جب لوگوں کی اکثریت راسخ العقیدہ اور باعمل مسلمانوں پر مشتمل ہو۔ وہ لکھتا ہے: "اس اکثریت کی غیر موجودگی میں جو بھی اسلامی نظام قائم ہوگا اس کی حیثیت صرف اقتدار کی ہو گی (کیوں کہ اسلامی معاشرہ مفقود ہو گا)، اور یہ اقتدار استبداد میں بھی تبدیل ہو سکتا ہے۔" اس اصول کے مطابق بوسنیا میں اسلامی حکومت کے قائم ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا جہاں مسلمان ---راسخ العقیدہ اور باعمل مسلمانوں کا تو ذکر ہی جانے دیجیے، محض نام کے مسلمان بھی--- اقلیت میں ہیں۔ اس پوری دستاویز میں صرف ایک اقتباس ایسا ہے جس کا اطلاق بوسنیا پر ہو سکتا ہے:

> "غیر مسلم اکثریت والی برادریوں میں، جہاں مذہبی آزادی اور عام زندگی اور ترقی کی ضمانت موجود ہو، مسلمان اقلیت اس برادری کی وفادار رہنے اور اس کی بابت تمام ذمے داریاں پوری کرنے کی پابند ہے، سوائے ان ذمے داریوں کے جن سے اسلام یا مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہو۔"

اس دستاویز میں شامل کئی نکات، جنھیں بنیاد پرستانہ قرار دیا جاتا ہے، دراصل اسلامی عقیدے کے بیان پر مشتمل ہیں۔ بنیاد پرستی بجائے خود ایک مبہم اور محوساتی اصطلاح ہے اور اسلامی اسکالر عموماً اسے استعمال نہیں کرتے۔

عزت بیگووچ پر مغرب سے سیاسی اور تہذیبی مخاصمت رکھنے کا بھی الزام لگایا جاتا ہے۔ اس نے یقیناً ترکی میں اتاترک کے ہاتھوں معاشرے کو تیز رفتاری سے اور جبراً سیکولر بنانے پر تنقید کی ہے کیوں کہ یہ عمل، عزت بیگووچ کے خیال میں، اس مفروضے پر مبنی تھا کہ اسلام سے تعلق رکھنے والی ہر چیز تہذیبی طور پر پس ماندہ اور رجعت پسندانہ ہے۔ لیکن اس دستاویز میں مغرب کا مکمل استرداد کہیں نہیں پایا جاتا۔ وہ لکھتا ہے:

> "اپنی بنیاد پڑنے کے وقت سے لے کر ہمیشہ اسلام نے کسی تعصب کے بغیر پچھلی تہذیبوں کے ورثے کا مطالعہ کرنے اور ان کے علم کو جمع کرنے کا عمل جاری رکھا ہے۔ ہمیں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ آج کا اسلام یورپی امریکی تہذیب کے حاصلات کے سلسلے میں مختلف رویہ کیوں اختیار کرے گا جب کہ اس تہذیب سے اس کے روابط بھی اس قدر وسیع ہیں۔"

بوسنیا کی بابت بنیاد پرستی کا الزام اس لیے بھی غیر موزوں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے مسلمان دنیا بھر میں سب سے زیادہ سیکولر مسلمانوں میں سے ہیں۔ ۱۹۸۵ میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق بوسنیا بھر میں مذہبی عقائد رکھنے والوں کی تعداد صرف ۱۷ فی صد ہے۔ کئی عشروں پر محیط جدید سیکولر تعلیم اور کمیونسٹ سیاسی کلچر کے علاوہ مغربی طرزِ زندگی کی جانب معاشرے کے

Scanned with CamScanner

بڑھتے ہوئے میلان نے اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ بوسنیا میں شہری زندگی کا پھیلاو بھی ایک اہم عنصر رہا ہے: ۱۹۸۰ کی دہائی کے آخری برسوں تک شہری علاقوں میں مخلوط شادیوں کی شرح تقریباً ۳۰ فیصد ہو چکی تھی۔

دسمبر ۱۹۹۰ کے عام انتخابات میں عزت بیگووچ کی پارٹی کو اسمبلی کی ۲۴۰ میں ۸۶ نشستیں حاصل ہوئیں، ذوالفقار پاشووچ کی مسلم پارٹی (MBO) کو ۱۳، رادووان کراجک (Radovan Kradjic) کی سرب قوم پرست پارٹی کو ۷۲ اور بوسنیائی کروٹوں کی پارٹی کو ۴۴ نشستیں حاصل ہوئیں۔ اس طرح اسمبلی میں ۹۹ مسلم، ۸۵ سرب، ۴۹ کروٹ اور سات ایسے ارکان شامل تھے جو خود کو "یوگوسلاو" کہلانا پسند کرتے تھے۔ مختلف نسلی گروہوں کا یہ تناسب کم و بیش ویسا ہی تھا جیسا بوسنیا کی آبادی میں پایا جاتا ہے۔ عزت بیگووچ کے لیے مسلمانوں اور کروٹوں کی مخلوط حکومت قائم کرنا بھی ممکن تھا لیکن اس نے تینوں بڑی پارٹیوں کو ملا کر ایک طرح کی قومی حکومت قائم کرنے کو ترجیح دی۔ تاہم جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ کراجک کی سرب قوم پرست پارٹی کے عزائم کچھ اور ہیں۔

جب عزت بیگووچ کی حکومت نے اقتدار سنبھالا، اس وقت یوگوسلاو سیاست کی عمومی صورت حال خاصی کشیدہ ہو چکی تھی۔ میلوشے وچ نے سلووینیا اور کروشیا سے سربیا میں درآمد ہونے والی اشیا پر بھاری محصول لگا دیے تھے۔ وفاقی بجٹ، جسے استعمال کر کے وفاقی وزیراعظم آنتے مارکووچ یوگوسلاویا میں بڑھتے ہوئے افراطِ زر پر قابو پانا چاہتا تھا، بیش تر میلوشے وچ کے قبضے میں تھا اور صرف سربیا کے علاقے پر خرچ کیا جا رہا تھا۔ سربیا کے اس معاندانہ رویے سے تنگ آ کر سلووینیا میں علیحدگی کے سوال پر ریفرنڈم ہوا جس میں بھاری اکثریت نے علیحدگی کے حق میں رائے دی۔

۱۹۹۱ کے اوائل میں میلوشے وچ نے برملا کہنا شروع کر دیا تھا کہ اگر یوگوسلاویا کے وفاق کی جگہ کنفیڈریشن کی سی کوئی ڈھیلی ڈھالی صورت اختیار کرنے کی کوشش کی گئی تو بوسنیا اور کروشیا کے بڑے بڑے رقبوں کو سربیا میں شامل کر لیا جائے گا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے اقدامات وفاقی دستور کو محفوظ رکھنے کے بجائے اسے ریزہ ریزہ کرنے کی کوشش میں تھے۔ جون ۱۹۹۰ میں اس نے سربیا کے خود مختار صوبے کوسووو کی اسمبلی کو توڑ کر اس کی دستوری حیثیت کو ملیامیٹ کر دیا تھا۔

وفاق کی اس بگڑتی ہوئی صورت حال میں بوسنیا کی حکومت کا موقف منطقی طور پر درست لیکن عملی اعتبار سے عجیب تھا۔ وفاق کو ڈھیلی ڈھالی کنفیڈریشن میں تبدیل کرنے کی بحث میں بوسنیا کا وزن کروشیا اور سلووینیا کے حق میں پڑتا تھا کیوں کہ وفاق پر بلغراد کی اجارہ داری ختم کرنا

Scanned with CamScanner

بوسنیا کے لیے بھی مفید تھا۔ لیکن دوسری جانب یہ خیال کہ کروشیا اور سلووینیا یوگوسلاو وفاق سے علیحدہ ہونے کی دھمکی کو سچ کر دکھائیں گے، بوسنیا کے لیے روح فرسا تھا، کیوں کہ اس صورت میں بوسنیا اور ایک اور کم زور ریاست مقدونیا، سربیا کے رحم و کرم پر رہ جاتے تھے۔ ۱۹۹۱ کے نصفِ اوّل میں، جب عزت بیگووچ حکومت اس دشوار توازن کو قائم رکھنے میں مصروف تھی، کروشیا اور بوسنیا کا مستقبل سربیا کی جانب سے کھلی دھمکیوں کی زد میں تھا۔ کروشیا کے علاقے کرائینا میں سربوں نے جو "خود مختار خطہ" قائم کر لیا تھا اس کے مطالبات روز بہ روز جارحانہ ہوتے جا رہے تھے۔ مئی میں سرب قوم پرست پارٹی نے شمالی اور مغربی بوسنیا کے بھی بڑے بڑے علاقوں کی خود مختاری کا مطالبہ کر دیا تاکہ یہ علاقے کروشیا کے "خود مختار" سرب علاقے کے ساتھ مل کر ایک نئی ریاست قائم کر سکیں۔ سرب قوم پرستوں نے، اسی طریقے کو کام میں لا کر جسے پہلے کروشیا میں آزمایا جا چکا تھا، بوسنیا کے ان سرب اکثریتی علاقوں کو خود مختار سرب خطہ قرار دے دیا۔ انھیں دنوں کروشیا کی ایک انتہا پسند اقلیتی پارٹی نے پورے بوسنیا کو کروشیائی ریاست میں شامل کر لینے کا مطالبہ کر دیا۔ جولائی ۱۹۹۱ تک اس بات کی واضح شہادت سامنے آ چکی تھی کہ بوسنیائی سربوں کو میلوشےوِچ کی جانب سے اسلحہ فراہم کیا جا رہا ہے۔ اب اس بات پر مشکل ہی سے شبہ کیا جا سکتا تھا کہ رادووان کراجک کو قدم قدم پر بلغراد کی رہنمائی حاصل ہے۔

تب تک یوگوسلاویا میں بڑے پیمانے پر جنگ چھڑ چکی تھی۔ سربیا نے اگلے وفاقی صدر کے طور پر ایک کروٹ کی نامزدگی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور یوں وفاق پوری طرح مفلوج ہو گیا تھا۔ ۱۹ مئی ۱۹۹۱ کو کروشیا میں ریفرنڈم کرایا گیا جس میں ۹۲ فیصد ووٹروں نے وفاق سے مکمل علیحدگی اور آزادی کے حق میں رائے دی۔ ۲۵ مئی کو کروشیا اور سلووینیا نے آزادی کا اعلان کر دیا۔ اگلی صبح وفاقی فوج کے ٹینک سلووینیا میں داخل ہو گئے۔ وفاقی فوج کی قیادت میں سربوں کی اکثریت تھی اور فوجی جنرل میلوشےوِچ کے عزائم کے حامی تھے۔ لیکن سلووینیا کی جانب سے سخت اور منصوبہ بند مزاحمت کی گئی جس کے باعث میلوشےوِچ اور جنرلوں نے اسے اپنے منصوبے سے خارج کر دیا۔ کروشیا میں دورُخی حکمتِ عملی اپنائی گئی: مکمل فوجی قبضے کے بجائے (کم سے کم ابتدا میں) فوجی کارروائی کی صرف دھمکیاں دینا، اور دوسری جانب مسلح کروشیائی سربوں کے مقبوضہ علاقوں کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کرنا۔ ان کارروائیوں نے اگست کے آخر تک کھلی جنگ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ سلووینیا کے شہروں پر حملے کیے جا رہے تھے اور ستمبر میں کروشیا کے شہر دُبراونک (Dubrovnik) پر بمباری شروع کر دی گئی۔

اس جنگ کا ایک خاص اور اہم عنصر سربیائی نیم فوجی دستوں کا استعمال تھا جو اس اصول

Scanned with CamScanner

پر کام کر رہے تھے کہ سرب مقبوضہ علاقوں سے غیر سرب آبادی کو دہشت گردی کے زور پر نکال دیا جائے اور ان مقبوضہ علاقوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا جائے۔ ان نیم فوجی دستوں کو ابتدا میں وفاقی وزارت داخلہ کی مالی امداد حاصل تھی، بعد میں وہ لوٹ مار کے ذریعے خود کفیل ہو گئے۔

اسی قسم کی ایک بے قاعدہ فوج سربیا کی انتہا پسند ریڈیکل پارٹی کے سربراہ وو تسلاو شِشلی کی قیادت میں سرگرم تھی جس نے ۱۹۸۵ میں مطالبہ کیا تھا کہ یوگوسلاویا کو دو ریاستوں، سربیا اور کروشیا، میں تقسیم کر دیا جائے اور بوسنیا کو یہ دونوں ریاستیں آپس میں بانٹ لیں۔ اگست ۱۹۹۱ میں اس نے اپنے ترمیم شدہ منصوبے کا اعلان کیا جو یہ تھا کہ پورے بوسنیا، مقدونیا، مونٹے نیگرو اور بیش تر کروشیا کو سربیا کا حصہ بنا دیا جائے اور کروشیا کے پاس بس اتنا علاقہ باقی رہنے دیا جائے جو "زگرب کے کلیسا پر چڑھ کر نظر کے دائرے میں آسکتا ہو"۔ شِشلی کے خیال میں نہ صرف بوسنیائی مسلمان نسلی اعتبار سے سرب ہیں، بلکہ بہت سے کروٹ بھی دراصل سرب ہی ہیں جنھوں نے کیتھولک مذہب اختیار کر لیا تھا۔

جب اسی طرح کے جنونی خیالات بوسنیائی سربوں کی جانب سے بھی ظاہر کیے جانے لگے تو بوسنیا کی سرحدوں کو قائم رکھتے ہوئے کسی سیاسی حل کا امکان مدھم پڑنے لگا۔ ستمبر ۱۹۹۱ میں سرب قوم پرست پارٹی کی قیادت نے بوسنیا کے سرب مقبوضہ "خود مختار" علاقوں میں امن قائم کرنے کے لیے وفاقی فوج کی مداخلت کا مطالبہ کر دیا۔ اگرچہ خود بوسنیائی سرب بھی وفاقی فوج اور وزارتِ داخلہ کی عنایت سے پوری طرح مسلح ہو چکے تھے، لیکن ستمبر کے آخر میں فوج نے مقبوضہ علاقوں میں داخل ہو کر ان "خود مختار" علاقوں کی سرحدوں کو حتمی طور پر مضبوط کر دیا۔ علاوہ ازیں ہرزگووینا اور بنالوقا کے فوجی اڈوں اور اسلحہ خانوں کو کروشیا کے خلاف حملوں میں بھی استعمال کیا گیا۔

اس ناقابلِ برداشت صورتِ حال میں عزت بیگووچ کی حکومت نے اعلان کیا کہ وہ سربیا اور کروشیا کے اس تنازعے میں غیر جانبدار رہے گی۔ کراجک نے اسے "سرب دشمن" اقدام قرار دیا، کیوں کہ ایک تو اس کے مطابق سرب فوجیں کروشیا میں "فاشسٹ شیطانوں" سے لڑ رہی تھیں اور دوسرے اس بنیاد پر کہ غیر جانبداری کا اعلان کرنے کا حق صرف آزاد اور خود مختار حکومت کو حاصل ہوتا ہے۔ آخر الذکر نکتے کو رد کرنا اصولی طور پر ناممکن تھا کیوں کہ آئینی طور پر بوسنیا ہنوز وفاق کا حصہ تھا۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۱ کو بوسنیائی اسمبلی سے کراجک کی قوم پرست پارٹی نے واک آؤٹ کر دیا اور اسی دن اسمبلی نے بوسنیا کی خود مختاری کی قرارداد منظور کر لی۔ اس خود مختاری کا مطلب وفاق سے علیحدگی نہیں بلکہ قانون سازی کے معاملے میں وفاق پر ریاستی مقننہ کی فوقیت تھا۔

Scanned with CamScanner

بوسنیا کے سرب مقبوضہ علاقوں میں کراجک کی قوم پرست پارٹی کے تمام اقدامات اُسی سلسلے کی تکرار تھے جو سال بھر پہلے کروشیا میں پیش آچکا تھا۔ اس منصوبے کے ایک ہونے کی بابت اگر کوئی شبہ تھا تو سربیا کی حکمراں پارٹی کے نائب صدر اور فلسفی میحائیلو مارکووچ کے ۹ اکتوبر ۱۹۹۱ کے اس اعلان نے اسے دور کر دیا جس میں کہا گیا تھا کہ نیا یوگوسلاو وفاق تین وفاقی یونٹوں پر مشتمل ہو گا: (۱) سربیا، (۲) مونٹے نیگرو اور (۳) بوسنیا اور کروشیا کے سرب اکثریتی علاقے۔ مارکووچ نے کہا: "اگر بوسنیائی مسلمان اس وفاق میں شامل ہونا چاہیں تو انھیں اس کی اجازت دی جائے گی۔ لیکن اگر انھوں نے اس سے علیحدہ ہونے کا ارادہ کیا تو انھیں سمجھ لینا چاہیے کہ وہ چاروں طرف سے سربیائی علاقوں کے گھیرے میں ہوں گے۔" ظاہر ہے، یہ یوگوسلاو وفاق نہیں بلکہ گریٹر سربیا قائم کرنے کا منصوبہ تھا۔

مغربی سیاسی قائدین، اور یوروپی یونین کا مقرر کردہ ثالث لارڈ کیرنگٹن، ان واضح اعلانات کو نظرانداز کر کے یہی سمجھتے رہے کہ متحد یوگوسلاویا کے کسی طرح کے ڈھیلے ڈھالے بندوبست کا قائم رہنا ممکن ہے۔ ستمبر ۱۹۹۱ میں اقوامِ متحدہ نے پورے یوگوسلاویا کو اسلحے کی فراہمی پر پابندی لگا دی۔ اس پابندی نے وفاقی فوج کو ذرا بھی متاثر نہ کیا، لیکن اس سے کروشیائی فوجیں یقینی طور پر کمزور پڑ گئیں جنھوں نے مغربی اور شمال مشرقی کروشیا میں وفاقی فوج کو برابر کے مقابلے میں الجھا رکھا تھا۔ اگر وہ مناسب طور پر مسلح ہوتیں تو وُوکوور (Vukovar) اور دوسرے کروشیائی شہروں پر حملے کی مزاحمت کر سکتی تھیں۔ وُوکوور شہر کو اتنے مکمل طور پر تباہ کیا گیا کہ اس کی ایک بھی عمارت سلامت نہ رہی۔ بعد میں سرب نیم فوجی دستوں نے شہر میں داخل ہو کر سیکڑوں شہریوں کو قتل کر کے شہر کو پوری طرح "صاف" کر دیا۔ البتہ کروشیائی فوج، سابق معاہدۂ وارسا کے رکن ملکوں اور مشرقِ وسطیٰ کے راستے، تھوڑا بہت اسلحہ چوری چھپے حاصل کرتی رہی جس نے سربیائی منصوبے کی تکمیل میں رکاوٹ ڈال دی۔

دسمبر ۱۹۹۱ اور جنوری ۱۹۹۲ میں عالمی برادری، بشمول یوروپی یونین، کی جانب سے کروشیا اور سلووینیا کو آزاد ملکوں کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا جس سے سربیا کے منصوبے کو اور زک پہنچی۔ اس سے کروشیا کی جنگ تو تقریباً رک گئی لیکن بوسنیا کے سامنے وفاق سے علیحدگی کا نازک سوال آ کھڑا ہوا۔ وفاق سے جُڑے رہنے کا مطلب بوسنیا کو سربیا کے رحم و کرم پر ڈال دینا تھا۔ لیکن علیحدگی کی جانب پہلا قدم اٹھاتے ہی میلوشےوِچ اور کراجِک کو بوسنیا کے ٹکڑے کرنے کی باقاعدہ فوجی کارروائی کا بہانہ مل گیا۔

اس کارروائی کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ بوسنیا بھر میں مواصلات کے کلیدی مراکز

Scanned with CamScanner

سربوں کے قبضے میں تھے۔ سرائیوو سمیت تمام بڑے شہروں کے گرد بھاری توپ خانے سے مسلح مورچے تعمیر کیے جا چکے تھے۔ دسمبر اور جنوری کے عرصے میں، جب کروشیا میں جنگ کی سرگرمی کم ہوئی تو "فوجوں کی واپسی" کے نام پر، اقوامِ متحدہ کی پوری تائید کے ساتھ، وفاقی فوج بوسنیا کے علاقوں میں داخل ہونے لگی۔ عزت بیگووچ نے اقوام متحدہ پر اعتماد کرتے ہوئے، اور اپنی نیک نیتی اور پُرامن عزائم کا یقین دلانے کے لیے، وفاقی فوج کو یہاں تک اجازت دے دی کہ وہ مقامی مزاحمتی یونٹوں کے ہتھیار ضبط کرلے۔ لیکن ۲۹ فروری اور یکم مارچ کو جب بوسنیا میں ریفرنڈم ہوا تو وفاقی فوج کی جانبداری اور سیاسی رویہ ظاہر ہوگیا۔ کراجک نے اپنے مقبوضہ علاقے میں ریفرنڈم نہیں ہونے دیا۔ ریفرنڈم اس سوال پر کرایا گیا تھا: "کیا آپ تمام شہریوں کی مساوی حیثیت اور مسلم، سرب، کروٹ اور دیگر قوموں کی برابری کی بنیاد پر بوسنیا ہرزگووینا کی آزاد اور خودمختار ریاست کے حق میں ہیں؟" لگ بھگ ۶۴ فیصد رائے دہندگان نے ریفرنڈم میں حصہ لیا اور تقریباً یک رائے ہوکر اثبات میں فیصلہ دیا۔ ان میں شہری علاقوں میں رہنے والے سرب نژاد باشندے بھی شامل تھے۔

۲ مارچ ۱۹۹۲ کی صبح سرب نیم فوجی دستوں نے سرائیوو میں پارلیمنٹ کی عمارت کو گھیرے میں لے لیا اور رکاوٹیں اور اسنائپروں کے مورچے قائم کر دیے۔ پہلے چوبیس گھنٹوں کے دوران ایسا محسوس ہوتا رہا کہ بوسنیا پر فوجی قبضے کی کارروائی شروع ہو گئی ہے۔ لیکن سرائیوو کے ہزاروں شہری اسنائپروں کی پروا کیے بغیر سڑکوں پر نکل کر مظاہرے کرنے لگے اور کسی نہ کسی وجہ سے یہ کارروائی رک گئی۔ سرب قوم پرست سیاست دانوں کے پاس اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے دو متبادل راستے موجود تھے: ایک یہ کہ بھاری فوجی کارروائی کر کے بوسنیا کے بڑے بڑے علاقوں پر قبضہ کرلیا جائے، اور دوسرا یہ کہ فوجی حملے کا خوف دلا کر سیاسی ذرائع سے یہ علاقے حاصل کر لیے جائیں۔ آخرالذکر متبادل ایک حقیقی امکان کے طور پر مارچ کے آخری ہفتے تک موجود رہا اور اس کا انحصار بڑی حد تک بوسنیائی کروٹوں کے رویے پر تھا۔ اس معاملے میں سربیا اور کروشیا کے موقفوں میں مماثلت کافی عرصے سے موجود تھی۔ مارچ ۱۹۹۱ میں میلوشےوچ اور کروشیائی صدر تجمان نے یوگوسلاویا کی تقسیم کے امکانات پر جو مذاکرات کیے تھے ان کے ایجنڈے میں بوسنیا کی تقسیم بھی شامل تھی۔ لیکن یہ مماثلت صرف جزوی تھی: سربیا نے اپنی کارروائی تیزی سے اور بہت پہلے شروع کر دی تھی؛ بوسنیا کے سرب مقبوضہ علاقوں کو مئی ۱۹۹۱ میں "خودمختار" قرار دے دیا گیا تھا (۲۷ مارچ ۱۹۹۲ کے دن ان علاقوں کو بوسنیائی "سرب ریپبلک" کا نام دے دیا گیا)۔ دوسری طرف کروٹوں نے اپنا اسی طرح کا علاقہ بوسنیا پر سربوں کے باقاعدہ فوجی حملے کے تین ماہ بعد، یعنی

جولائی ۱۹۹۲ میں، قائم کیا۔ بوسنیائی کروٹوں کی پارٹی بوسنیا کی سرحدوں کو قائم رکھنے کی حامی تھی اور اس نے ریفرنڈم میں آزاد بوسنیا کے حق میں رائے بھی دی تھی۔ کروشیا کی حکمراں پارٹی بھی بوسنیا کی نسلی خطوں میں تقسیم کی حامی نہیں تھی کیوں کہ سرب مقبوضہ علاقوں میں کروٹ نژاد باشندوں کی خاصی تعداد موجود تھی اور بوسنیا کی تقسیم کا مقصد بڑے پیمانے پر خوں ریزی کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا تھا۔

لیکن ہرزگووینا کے کروٹوں میں انتہاپسند قوم پرست عناصر رفتہ رفتہ غلبہ پاتے جارہے تھے۔ ان کے اس سخت موقف کا جواز بھی موجود تھا کیوں کہ وہ اپنے اردگرد سربوں کی بھاری فوجی تیاریاں دیکھ رہے تھے۔ عسکری اور سیاسی واقعات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ ایک طرف بوسنیائی کروٹ، سربوں کے جارحانہ رویئے کے خلاف ردعمل کر رہے تھے اور دوسری طرف اس ردعمل کے اظہار میں خود بھی ویسا ہی جارحانہ رویّہ اپناتے جارہے تھے۔ لہذا جب دسمبر ۱۹۹۱ میں سرب قوم پرست پارٹی نے منقسم بوسنیا کا نقشہ جاری کیا (اور ۷۰ فیصد علاقے کو سربوں کی تحویل میں دکھایا) تو جواب میں کروشیا کی حکمراں پارٹی نے بھی ایک نقشہ جاری کردیا (جس میں ۳۰ فیصد علاقے پر کروٹوں کا حق ظاہر کیا گیا تھا)۔ اگرچہ یہ مجوزہ تقسیم سوئٹزرلینڈ کی طرز کی کنفیڈریشن کی صورت میں ہونی تھی، لیکن یہ بات ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ یہ ان علاقوں کی مکمل علیحدگی سے بس ایک ہی قدم پیچھے ہے۔ چناں چہ فروری ۱۹۹۲ میں جب کراجک بوسنیا کے مستقبل کے مسئلے پر میلوشے وچ اور تجمان سے مذاکرات کرنے آسٹریا پہنچا تو حتمی تقسیم ہی کے امکان پر بات چیت ہوئی۔ لیکن یوروپی اقتصادی برادری اور لارڈ کیرنگٹن مارچ کے مہینے میں سوئس انداز کی کنفیڈریشن کے حل پر بوسنیا کے تینوں نسلی گروہوں کے درمیان مذاکرات کراتے رہے۔

۹ مارچ ۱۹۹۲ کو اسی قسم کے ایک اجلاس میں جب تین یونٹوں پر مشتمل بوسنیا کی اسکیم پیش کی گئی جس میں ہر بڑے سیاسی یا اقتصادی مسئلے پر تینوں گروہوں کو وِیٹو کا حق حاصل ہونا تھا، تو اسے تسلیم کرنے سے انکار سربوں کے وفد نے کیا۔ اسی مہینے کے آخر میں یوروپی برادری نے تقسیم کا ایک اور منصوبہ پیش کیا جو بظاہر سربوں کے جاری کردہ نقشے ہی کا ایک قدرے بدلا ہوا روپ تھا۔ تینوں فریقوں نے اسے مزید مذاکرات کی بنیاد کے طور پر قبول کرلیا، لیکن ۲۴ مارچ کو کروشیائی پارٹی نے اسے مسترد کردیا اور اس کے اگلے دن عزت بیگووچ نے بھی۔ کروشیا کی طرف سے اس کا رد کیا جانا قابلِ فہم تھا کیوں کہ اس میں کروٹوں کو صرف ۱۷ فیصد علاقہ دیا گیا تھا اور بوسنیائی کروٹوں کی ۵۹ فیصد آبادی اس علاقے سے باہر رہ گئی تھی۔

ان تمام اسکیموں اور منصوبوں سے ایک بات پوری طرح واضح ہوگئی کہ بوسنیا کی تقسیم کا

Scanned with CamScanner

کوئی ایسا فارمولا وضع کرنا ناممکن ہے جس کے نتیجے میں لاکھوں باشندے غیر مطمئن نہ رہ جائیں۔ بوسنیائی شہریوں کی اکثریت آزاد اور متحد بوسنیا کے حق میں پہلے ہی رائے دے چکی تھی۔ سرب پروپیگنڈے کے اس سیلاب سے قطعِ نظر، جس کی رو سے بوسنیا "فاشسٹ اُستاشوں اور مسلمان بنیاد پرستوں کے اتحاد" کی گرفت میں تھا، غیر جانبدار مبصروں کو ایسی کوئی شہادت دستیاب نہیں ہوئی کہ کسی خاص نسلی گروہ کے خلاف امتیازی قوانین بنائے جا رہے ہوں۔ لیکن سرب سیاست دانوں اور ذرائع ابلاغ کے متواتر شور و شغب نے ایسی جنونی کیفیت پیدا کر دی جس میں بوسنیائی سربوں کے "حقوق کے تحفظ" کا سوال اُبھر کر سب سے زیادہ نمایاں ہو گیا اور لوگوں نے یہ سوچنا تک چھوڑ دیا کہ آیا انہیں کوئی حقیقی خطرہ لاحق بھی ہے یا نہیں۔ اس جنونی کیفیت کے چھا جانے کے بعد فوجی کارروائی محض اگلے قدم کی حیثیت رکھتی تھی۔

بوسنیا کی تباہی (۱۹۹۲-۹۳)

۶ اپریل ۱۹۹۲ کو یوروپی برادری نے بوسنیا کو ایک آزاد ریاست کے طور پر تسلیم کر لیا۔ اگرچہ اس خطّے میں جزوی خود مختاری کی صورت حال ۱۸۳۱ اور ۱۸۷۸ میں مختصر وقفوں کے لیے قائم رہ چکی تھی، لیکن حقیقی معنوں میں ۱۴۶۳ کے بعد سے بوسنیا کی آزاد ریاست کا یہ پہلا ظہور تھا۔ تبصرہ نگاروں نے فوراً یہ رائے ظاہر کی کہ بیچ کے ۵۲۹ سال بوسنیا نے دو بڑی سلطنتوں، ایک بادشاہت اور دوسری کمیونسٹ وفاق، کا حصّہ بن کر گزارے ہیں، اور، چوں کہ یہ خطہ تین نسلوں کا آمیزہ ہے اس لیے کسی بڑے کُل کا حصّہ بنے بغیر اپنی سالمیت قائم نہیں رکھ سکتا۔ اگر اس استدلال کو درست تسلیم کر لیا جائے تو اقوامِ متحدہ کے ۱۷۰ کے قریب ارکان میں سے اکثر کو غیر حقیقی ریاستیں قرار دینا پڑے گا۔ جہاں تک کسی وسیع تر حاکمیت کا تعلق ہے جو بوسنیا کو اندر سے ٹوٹ پھوٹ جانے سے باز رکھ سکے، معاملہ اس کے بالکل متضاد معلوم ہوتا ہے: بوسنیا کو اندرونی شکست و ریخت سے نہیں بلکہ بیرونی جارحانہ عزائم سے خطرہ لاحق رہا ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر سے بوسنیا کی اندرونی سیاست کی پیچیدگی دراصل سربیا اور کروشیا کی طویل قوم پرستانہ کشمکش کی مرہونِ منت رہی ہے۔ اسی کشمکش کے زیرِ اثر بوسنیا کے اور تھوڈوکس اور کیتھولک باشندوں کو رفتہ رفتہ یہ باور کرایا گیا کہ وہ درحقیقت سرب اور کروٹ ہیں۔ جب موجودہ صدی میں بوسنیا کا علاقہ سربیا اور کروشیا کے ساتھ کمیونسٹ وفاق کا حصّہ بنا تو یہ سرب اور کروٹ باشندے فطری طور پر اپنی شناخت کو (اپنے اپنے "اصلی وطن") سربیا اور کروشیا کے ساتھ جوڑنے لگے۔

Scanned with CamScanner

لیکن کمیونسٹ یوگوسلاویا کے خاتمے کے ساتھ ہی، جس عنصر (یعنی مخلوط النسل آبادی) نے بوسنیا کے تحفظ کو دشوار بنا دیا اسی کی رو سے بوسنیا کا تحفظ لازمی امر بھی ٹھہرا۔ یہ دونوں نسلی گروہ (تیسرے گروہ یعنی مسلمانوں سمیت جن کے پاس کوئی اور "اصلی وطن" نہیں تھا) پورے علاقے میں باہم یوں گتھے ہوئے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ایک ہولناک خوں ریزی ہی کی قیمت پر ممکن ہے۔ دوسری جانب اکٹھے رہنے کے لیے بوسنیا کے ان تینوں گروہوں کو باہمی رواداری اور نیک نیتی کی معمولی قیمت ادا کرنی تھی، اور آبادی کی اکثریت مہذب زندگی کی یہ لازمی قیمت خوشی خوشی ادا کرنے کو تیار تھی۔ لیکن ایک اقلیت، جسے ہم سایہ ملکوں کی پُشت پناہی حاصل تھی، اس پر آمادہ نہ تھی؛ اور یہ اقلیت مسلح بھی تھی۔

جس دن بوسنیا کو عالمی طور پر تسلیم کیا گیا، اس دن سرب نیم فوجی دستوں نے اپنا وہی عمل دُہرایا جو انھوں نے آزادی کی قرارداد کی منظوری کے اگلے دن کیا تھا۔ اس دن سرائیوو کے ہر نسل کے باشندے، جن کی تعداد پچاس ہزار سے ایک لاکھ تک تھی، سڑکوں پر نکل آئے اور انھوں نے متحد اور آزاد بوسنیا کے حق میں مظاہرہ کیا۔ اس مظاہرے پر بار بار خودکار ہتھیاروں سے گولیاں چلائی گئیں۔ لیکن یہ جنگ کی پہلی فائرنگ نہیں تھی۔ کئی دوسرے بوسنیائی شہروں، مثلاً بنالوقا، بوسانسکی برود (Bosanski Brod) اور موستار (Mostar)، میں فائرنگ اور بمباری ہفتہ بھر پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔

اپریل کے شروع کے دنوں میں سرب بے قاعدہ فوج کے دستے شمال مشرقی شہر بیے لینا میں داخل ہو گئے۔ ان دستوں کے سپاہی بوسنیائی سرب نہیں بلکہ سربیا کے باشندے تھے اور کروشیا کے شہر وُوکوور کا "صفایا" کرنے کا تجربہ رکھتے تھے۔ ایسے ہی کچھ دستوں نے مارچ کے آخر میں بنالوقا کے شہر میں داخل ہو کر رکاوٹیں اور مورچے قائم کر لیے تھے (۱)۔ بیے لینا کے مسلم اکثریت کے شہر میں داخل ہو کر انھوں نے اس کے مختلف حصّوں کو "آزاد کرانا" شروع کر دیا۔ ۴ اپریل کو شہر میں پانی اور بجلی کی رسانی روک دی گئی۔ اس کارروائی کا واضح مقصد ایک تو یہ تھا کہ مسلمان آبادی کو دہشت زدہ کر کے بھگا دیا جائے، اور دوسرا یہ کہ سربوں کو دباو ڈال کر اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔ اس کے لیے کسی بڑے قتلِ عام کی نہیں بلکہ صرف چُن چُن کر قتل کرنے کی کارروائی کافی تھی۔ بعد کی ایک رپورٹ سے پتا چلا کہ تقریباً سو مسلمان ہلاک ہوئے۔ فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے یہ شہر بہت اہم تھا، کیوں کہ ایک تو یہ سربیا کی سرحد کے پاس واقع تھا، دوسرے بوسنیا اور کروشیا میں سرب مقبوضہ علاقوں کو جانے والی بڑی سڑکیں اس کے قریب سے گزرتی تھیں اور یوں سربیا سے بوسنیا میں داخلے کے تمام راستے، اور تمام سپلائی لائنیں، سربوں کے کنٹرول میں

Scanned with CamScanner

آجاتی تھیں۔

اگلے چند دنوں میں مشرقی بوسنیا میں کئی اَور مسلم اکثریتی شہروں اور قصبوں پر اسی طرح قبضہ کیا گیا۔ ان کارروائیوں میں سرب بے قاعدہ فوج اور متعدد نیم فوجی دستوں نے حصہ لیا۔ اپریل کے دوسرے ہفتے کے دوران زوورنک (Zvornik) شہر پر حملے میں پہلے وفاقی فوج کے توپ خانے نے شہر پر کئی دن تک بھاری گولاباری کی، جب شہر کی کمر ٹوٹ گئی تو نیم فوجی دستے شہریوں سے نمٹنے کے لیے اندر گھس آئے۔ ان کارروائیوں کے نتیجے میں ۹۵ فیصد مسلمان آبادی زوورنک، ویشے گراد (Visegrad) اور فوچا (Foca) کے شہروں کو چھوڑ کر فرار ہو چکی تھی۔ دوسری طرف مقامی سربوں کو اس بات پر قائل کیا گیا کہ انھیں ان کے پڑوسی مسلمانوں سے خطرہ ہے جس سے انھیں اپنی مدافعت کرنی ہے۔ اس کے لیے زمین بلغراد کے ذرائع ابلاغ نے فاشسٹ قتلِ عام اور اسلامی جہاد کے ہوّے کھڑے کر کے پہلے ہی ہموار کر رکھی تھی۔ اور پچھلے نو مہینوں کے دوران کروشیا میں لاشوں کے ڈھیر اور جلے ہوئے گاؤوں کی تصویریں دیکھ کر عام سرب دہقانوں اور قصباتیوں کا ذہن اس خطرے کو حقیقی سمجھنے پر آمادہ ہو چکا تھا۔ خطرے کی اس تصویر کو مکمل کرنے کے لیے یہاں وہاں چھوٹی موٹی مقامی تفصیل کا اضافہ کرنا کافی تھا۔

ایک ممتاز تجزیہ نگار کے لفظوں میں، یہ کارروائیاں "جس تیز رفتاری کے ساتھ کی گئیں، اور ان کے مابین جس طرح کا ربط واضح ہوا، اسے دیکھتے ہوئے یہ کہا ہی نہیں جا سکتا کہ یہ اپنے آپ پھوٹ پڑنے والے فسادات تھے۔" اپنی واضح برتری اور اچانک اقدام کی حکمت عملی سے فائدہ اٹھا کر پہلے پانچ چھ ہفتوں میں سرب فوجوں اور نیم فوجی دستوں نے بوسنیا کے ۶۰ فیصد رقبے پر قبضہ کر لیا۔ ملک کے کئی علاقوں میں مسلح بوسنیائی سرب بھی ان حملہ آوروں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ لیکن یہ بات صاف ہے کہ قبضے کی اصل کارروائی وفاقی فوج ہی کے ہاتھوں انجام پائی جس کا ہیڈ کوارٹر بلغراد میں تھا۔ حملے کے ابتدائی ہفتوں کے دوران میلوشےوِچ حکومت کی جانب سے دو متضاد دعوے کیے جاتے رہے جو یکساں طور پر غلط تھے: ایک یہ کہ وفاقی فوجیں بوسنیا کے علاقوں میں امن قائم کرنے کے لیے داخل ہوئی ہیں، اور دوسرا یہ کہ مسلح سربیائی فوجی اور نیم فوجی یونٹ سرحد پار کر کے بوسنیا میں داخل ہی نہیں ہو رہے ہیں۔

۲۷ اپریل کو سربیا اور مونٹی نیگرو کی حکومتوں نے یوگوسلاویا کے نئے وفاق کے قیام کا اعلان کیا جس میں صرف یہی دو ریاستیں شامل تھیں۔ اس اعلان کے بعد بوسنیا میں موجود وفاقی فوج کی پوزیشن عجیب و غریب ہو گئی۔ وہ اب یہ دعویٰ نہیں کر سکتی تھی کہ یوگوسلاویا کی زمین پر امن قائم کرنے میں مصروف ہے۔ مئی کے شروع میں میلوشےوِچ نے اعلان کیا کہ وفاقی فوج کے

سربیا اور مونٹے نیگرو سے تعلق رکھنے والے سپاہیوں کو واپس بلا لیا جائے گا اور فوج کے بوسنیائی سربوں کو جنرل راتکو ملاڈک (Ratko Mladik) کی کمان میں دے دیا جائے گا۔ جنرل ملاڈک خود میلوشے وچ کا مقرر کردہ تھا اور اس ساری کارروائی کی حیثیت دکھاوے سے زیادہ نہ تھی۔ ۲۰ مئی تک یہ دعویٰ کیا جانے لگا کہ چودہ ہزار سرب اور مونٹے نیگرن فوجی واپس بلائے جا چکے ہیں۔ لیکن اسی ہزار فوجی اب بھی باقی تھے، ان کے پاس وفاقی فوج کا تمام تر اسلحہ موجود تھا اور گولا بارود، خوراک اور ایندھن کی سپلائی بھی سربیا کی جانب سے باقاعدہ جاری تھی۔

اس دکھاوے کا خاطر خواہ اثر ہوا اور نمایاں مغربی سیاست داں، مثلاً برطانوی وزیرِ خارجہ ڈگلس ہرڈ، بہت جلد بوسنیا کی جنگ کا ذکر "خانہ جنگی" کے نام سے کرنے لگے۔ بی بی سی نے تنازعے کے تمام گروپوں کو، بوسنیائی حکومت سمیت، "خانہ جنگی کے فریق"، اور جنگ کو "امن و امان کی بگڑی ہوئی صورتِ حال"، کہنا شروع کر دیا۔ برطانیہ میں اس جنگ کو ٹھیک طرح سمجھ نہ پانے کا ایک اضافی جواز بھی موجود تھا، اور وہ یہ کہ اپریل ۱۹۹۲ میں برطانیہ پر اپنے عام انتخابات کا بخار طاری تھا اور اخبار نویسوں اور سیاست دانوں کے پاس صورتِ حال پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔ جب آخرکار ان کی توجہ اس طرف ہوئی تو انھیں ایک جیسے کرخت چہروں والے گروہ یکساں طور پر ناقابلِ فہم مقاصد کے تحت ایک دوسرے سے برسرِپیکار دکھائی دیے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا میں انتخابات ابھی سات ماہ دور تھے، لیکن صدر بُش کی انتظامیہ بوسنیا کے مسئلے پر کوئی واضح موقف اختیار کر کے اپنے انتخابی امکانات کو داؤ پر لگانا نہیں چاہتی تھی، اس لیے اس نے یوروپی اقتصادی برادری کے اس عجیب دعوے پر صاد کرنے ہی میں عافیت سمجھی کہ سابق یوگوسلاویا میں ہونے والی جنگ ابتدا ہی سے "ایک یوروپی معاملہ" ہے۔

جنگ کی اچانک افتاد پڑنے پر حکومتِ بوسنیا کی دفاعی فوج نے، جس کی نفری صرف ساڑھے تین ہزار تھی، اپریل کے آخر میں تھوڑی بہت مزاحمت شروع کی۔ لیکن جنگ کے ابتدائی عرصے میں سرب حملہ آوروں کو جس مزاحمتی قوت کا سامنا ہوا وہ کروٹوں کی قوت تھی۔ مغربی ہرزگووینا میں مقامی کروٹ کچھ تیاریاں کرتے رہے تھے۔ بعد میں ان کے ساتھ کروٹ بےقاعدہ فوج کے وہ سپاہی بھی آ ملے جو کروشیا کی جنگ کے دوران کروشیائی فوج کے ساتھ شامل ہو گئے تھے اور جنگ ختم ہونے پر ہرزگووینا لوٹ آئے تھے۔ اپریل ۱۹۹۲ میں کروٹوں کی پندرہ ہزار کی نفری میں ان سپاہیوں کا تناسب ایک تہائی کے لگ بھگ تھا۔ مئی کے آخر میں اس فوج نے جوابی حملہ شروع کیا اور مہینے بھر کی سخت لڑائی کے بعد سرب فوجوں کو موستار کے علاقے سے باہر دھکیل دیا۔ اس حملے میں کروشیائی فوج کے پندرہ ہزار سپاہی بھی ان کے ساتھ شریک تھے جو کروشیا سے

Scanned with CamScanner

اپنے ساتھ چند توپیں اور ٹینک بھی لائے تھے۔ ۱۶ جون کو عزت بیگووچ اور کروشیائی صدر کے درمیان فوجی تعاون کے معاہدے پر دستخط ہوئے جس سے کروشیائی فوج اور کروٹ نیم فوجی دستوں کے جنگ میں حصہ لینے کا جواز فراہم ہو گیا۔

لیکن کروشیائی لیڈروں اور بوسنیائی کروٹوں کی مقامی قیادت کے سیاسی عزائم پر شک کا جواز بھی موجود تھا۔ پچھلے کئی ہفتوں سے وہ عزت بیگووچ پر زور دے رہے تھے کہ بوسنیا اور کروشیا کی کنفیڈریشن کے قیام کا اعلان کر دیا جائے۔ عزت بیگووچ نے ہمیشہ اس سے انکار کیا تھا، یا تو اس ڈر سے کہ کہیں اس طرح بوسنیا آخر کار گریٹر کروشیا کا حصہ نہ بن جائے، یا پھر اس باعث کہ اس سے سربوں کے موقف کو ایک طرح کی توثیق حاصل ہو جاتی تھی۔ اُس کی فکر کی بنیاد غالباً یہ تھی کہ اس کی حکومت کو بوسنیائی مسلمانوں اور کروٹوں کے ساتھ ساتھ سرب باشندوں کی بھی نمائندگی کرنی چاہیے، اور اس نے سرب وزیروں کو جنگ کے پورے عرصے میں اپنی کابینہ میں شامل رکھا۔ توازن قائم رکھنے کی اس کوشش پر کروٹوں کو جھنجلاہٹ ہوئی کیوں کہ اُن کی عسکری فکر اس موقعے پر عزت بیگووچ کی بہ نسبت زیادہ واضح تھی۔ ایک اور بات جس نے کروٹوں کے دل میں رنجش پیدا کی یہ تھی کہ عزت بیگووچ نے دفاعی جنگ کی کمان اُن چند مسلمان جنرلوں کو سونپ دی جو یوگوسلاو فوج میں اعلیٰ عہدوں پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ جون اور جولائی کے مہینوں میں بوسنیائی کروٹ قوم پرست کنفیڈریشن قائم کرنے کے لیے دباؤ ڈالتے رہے، اور اس میں ناکام رہ کر جولائی کے آخر میں انھوں نے "ہرزگ بوسنیا کی کروٹ برادری" قائم کرنے کا اعلان کر دیا جو سرب خود مختار علاقوں کی طرز پر تھی اور جہاں کروشیا کا سکہ چلنے اور کروشیائی جھنڈا لہرانے لگا۔ مقامی پارٹی کے ایک ترجمان نے بعد میں اسے ایک عارضی بندوبست قرار دیا۔ پارٹی کی قیادت ممکن ہے اس علاقے کا کروشیا سے الحاق چاہتی ہو، لیکن کروشیا کے صدر تجمان کے سرکاری اعلانات میں بوسنیا کی سرحدوں کے تحفظ کی تائید کی جاتی رہی۔ تجمان کے بعض وزیر بوسنیا میں سے کروٹ اکثریت کے علاقے حاصل کرنے کے حامی تھے لیکن باقی وزیر اور بیشتر اپوزیشن پارٹیاں اس کے خلاف تھیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ تجمان کا موقف عقلی موقع پرستی پر مبنی تھا۔ اگر بیرونی دنیا کے اقدامات نے واضح یقین دلا دیا ہوتا کہ بوسنیا کے بٹوارے کی اجازت نہیں دی جائے گی تو وہ بھی اس فیصلے کا احترام کرتا۔ لیکن اگر دنیا نے سربیا کو بوسنیا کے علاقوں پر قبضہ کرنے اور انھیں اپنے قبضے میں رکھنے کی کھلی اجازت دے رکھی تھی تو وہ بھی اس کیک میں سے اپنا ٹکڑا مانگنے پر آمادہ تھا۔ اس کے علاوہ عالمی طاقتوں نے کروشیا کے اُن علاقوں کے بارے میں کسی واضح پالیسی کا اظہار نہیں کیا جو سربوں کے قبضے میں تھے۔ اس سے تجمان کو ایک اور جواز مل گیا کہ وہ بوسنیا کے کچھ علاقے اپنے

Scanned with CamScanner

قبضے میں کر کے اپنی سودے بازی کی پوزیشن کو مضبوط کرے۔

عالمی برادری کا رد عمل عموماً الجھا ہوا یا منفی رہا۔ جس وقت بوسنیا میں جنگ شروع ہوئی، اقوامِ متحدہ سرائیوو میں اپنا ہیڈکوارٹر اور شمالی بوسنیا کے شہروں میں اپنی چوکیاں قائم کرنے کے عمل میں تھی تاکہ وہاں سے کروشیا میں امن قائم کرنے کے اقدامات کر سکے۔ مئی کے اوائل میں سیکرٹری جنرل بطروس غالی نے بوسنیا میں اقوامِ متحدہ کے قیامِ امن کے اقدامات کو خارج از امکان قرار دیا اور سرائیوو میں موجود فوجیں ہٹالیں۔ دو ہفتے بعد اس نے ایک رپورٹ جاری کی جس میں سربیا کے پروپیگنڈے کی گونج سنائی دیتی تھی، یعنی یہ کہ بوسنیا میں موجود سرب فوج اور نیم فوجی دستوں کا بلغراد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس رپورٹ کا مقصد یہ تھا کہ سربیا پر سے پابندیاں ہٹالی جائیں۔ ان پابندیوں کا سربیا کے جنگی اقدامات پر یوں بھی کوئی اثر نہیں پڑا تھا اور پھر یونان سے خشکی کے راستے اور روس اور یوکرین سے دریائے ڈینیوب پار کر کے تیل اور دوسری چیزیں برابر سربیا پہنچ رہی تھیں۔

اس معاملے میں درست موقف اختیار کرنے میں مغربی سیاست دانوں کی ناکامی کا بنیادی سبب یہ تھا کہ انھوں نے صرف جنگ کی علامات پر غور کیا، اس کے اسباب پر نہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ میلوشے وِچ کے منصوبے کی نوعیت کو سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ وہ جنگ کی سیاسی نوعیت کے بجائے عسکری نوعیت پر اصرار کرتے رہے اور بندوق اٹھانے والے ہر ہاتھ کو مساوی طور پر قصوروار گردانتے رہے۔ "بوسنیا ہرزگووینا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے لیے تمام فریق ذمے دار ہیں،" لارڈ کیرنگٹن نے اپنے ایک انتہائی ناسمجھی کے بیان میں کہا، "اور جب جنگ بندی ہو جائے گی تو کوئی بھی ذمے دار نہیں رہے گا۔" جنگ بندی کرانے کا یہ ذوق و شوق (اس طرح کی سیکڑوں جنگ بندیاں سال کے بقیہ حصے میں ہوتی اور ٹوٹتی جاتی تھیں) سیاسی فہم کے فقدان کی واضح ترین علامت تھا۔

چوں کہ اس جنگ کو ایک عسکری مسئلہ سمجھا گیا، جس کا سبب "تشدد" نامی ایک عنصر تھا جو "دونوں جانب" اچانک "پھوٹ پڑا" تھا، اس لیے مغرب کی تمام تر کوششیں اس شے پر مرکوز ہو گئیں جسے "جنگ کی شدت میں کمی" کا نام دیا گیا۔ اس طرح مغرب نے بوسنیا کی تباہی میں اپنی جانب سے اہم ترین کردار ادا کیا، یعنی بوسنیا پر عائد اسلحے کی درآمد پر پابندی اٹھانے سے انکار کر دیا۔ یہ پابندی اقوامِ متحدہ کی طرف سے ستمبر ۱۹۹۱ میں پورے یوگوسلاویا پر لگائی گئی تھی جو اُس وقت، کم سے کم رسمی طور پر، ایک ہی ملک تھا۔ اگرچہ بوسنیا نے ۲۲ مئی ۱۹۹۲ کو یوگوسلاویا سے الگ، ایک آزاد اور خود مختار ملک کے طور پر اقوامِ متحدہ کی رکنیت حاصل کر لی تھی، لیکن یہ پابندی

Scanned with CamScanner

بدستور برقرار رکھی گئی۔ یہ پابندی یوں تو سربیا پر بھی عائد ہوتی تھی لیکن اس کے پاس سابق یوگوسلاو فوج کے اسلحے کے بیشتر ذخائر بھی موجود تھے اور اسلحہ سازی کی وسیع صنعت بھی اس کے پاس تھی۔ (بوسنیا میں واقع اسلحے کی فیکٹریاں بھی بیشتر اُنھیں علاقوں میں تھیں جن پر سرب قابض تھے۔) اس کے علاوہ پابندی لگنے سے ذرا پہلے سربیا نے مشرقِ وسطیٰ سے چودہ ہزار ٹن ہتھیار حاصل کر لیے تھے۔ سرب کمانڈر دعویٰ کرتے تھے کہ ان کے پاس اتنا اسلحہ موجود ہے جو بوسنیا کی جنگ کو چھ یا سات سال تک جاری رکھنے کے لیے کافی ہے۔ دوسری طرف بوسنیا کے لیے اس پابندی کا مطلب ایک سست رفتار سزائے موت سے کم نہ تھا۔

یوں چوری چھپے تھوڑے بہت ہتھیار اقوامِ متحدہ کی نگرانی کے باوجود کروشیا کے راستے بوسنیا پہنچ جاتے تھے۔ اکادکا اسلحہ ساز کارخانے بھی بوسنیائی حکومت کے زیرِ انتظام علاقے میں تھے جنھیں پُرزوں وغیرہ کی سپلائی رک جانے کے باوجود کسی نہ کسی طرح چلایا جاتا رہا۔ پھر کبھی کبھی بوسنیائی فوجوں کو سربوں سے چھوٹی موٹی لڑائی جیتنے پر بھی کچھ ہتھیار مل جاتے تھے۔ لیکن بوسنیائی فوجوں کی اصل کمزوری یہ تھی کہ ان کے پاس ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں، بھاری توپ خانہ اور ٹینک شکن توپیں تقریباً بالکل نہیں تھیں۔ ستمبر ۱۹۹۲ کے تخمینے کے مطابق ان کے پاس فقط دو ٹینک اور دو بکتر بند گاڑیاں تھیں، جب کہ سرب فوجوں کے پاس تین سو ٹینک، دو سو بکتر بند گاڑیاں، آٹھ سو توپیں اور چالیس لڑاکا طیارے تھے۔

اس شدید عدم توازن، اور سرب فوجوں کو ایندھن اور دوسری چیزوں کی متواتر رسائی، کے باوجود مئی ۱۹۹۲ سے لے کر، جب بوسنیا اور کروشیا نے متحد ہو کر باقاعدہ مزاحمت شروع کی، اگلے نو مہینوں تک بوسنیا کی جنگ اس لحاظ سے برابر رہی کہ سرب فوجوں کو بیشتر موقعوں پر آگے بڑھنے سے روک دیا گیا اور کہیں کہیں انھیں پیچھے بھی دھکیلا گیا۔ اس کی بڑی وجہ جنگی حکمتِ عملی کا فرق تھا جس سے دونوں فریقوں کی نفسیات اور جذبے کے فرق کا بھی اظہار ہوتا تھا۔ سربوں کی حکمتِ عملی وہی تھی جو اس سے پہلے کروشیا میں بروئے کار لائی گئی تھی، یعنی یہ کہ کسی رقبے کو منتخب کر کے حملہ کرنے سے پہلے ہفتوں بلکہ مہینوں تک متواتر بمباری اور گولاباری کے ذریعے اسے "نرم" کیا جائے۔ سابق یوگوسلاو فوج کے جو لوگ جبری بھرتی میں آئے تھے ان میں حملے کا ویسا جوش و خروش نہیں تھا جیسا مسلمان یا کروٹ اپنے گھروں کے دفاع میں دکھاتے تھے۔ اگر بوسنیا کی حکومت کو دنیا کی کسی بھی حکومت کی طرح اپنے علاقے کا دفاع کرنے کا بنیادی حق حاصل ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ بوسنیا کے کئی علاقوں پر سے سربوں کا قبضہ ختم کرا لیا جاتا۔ اس طرح اگر سربوں کو باقاعدہ شکست نہ بھی ہوتی تو انھیں یہ احساس یقیناً ہو جاتا کہ وہ اپنے مطلوبہ علاقے کو بہ زور

Scanned with CamScanner

حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اس صورت میں یہ جنگ چار سے چھ مہینے کے عرصے میں ختم ہو چکی ہوتی۔ ایسا نہیں ہوا، کیوں کہ ڈگلس ہرڈ جیسے عالمی مدبروں نے حکومت بوسنیا پر عائد پابندی کو زور شور سے قائم رکھا اور دلیل یہ دی کہ پابندی ختم کرنے سے "جنگ طویل ہو جائے گی۔"

مغرب کی اس پالیسی میں ممکنہ تبدیلی کا پہلا اشارہ اگست ۱۹۹۲ میں ملا، جب متعدد صحافیوں اور ٹی وی رپورٹروں نے شمالی بوسنیا کے سرب مقبوضہ علاقے میں قائم قیدی کیمپوں کا پردہ چاک کیا۔ پہلی بار مغربی شہریوں -- اور لیڈروں -- نے ان ہولناک واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جو اس علاقے کی بیشتر مسلم آبادی کے ساتھ پیش آ رہے تھے۔ اقوام متحدہ اور مغربی حکومتیں اس سے پہلے بھی ان حقائق سے لاعلم نہیں رہی ہوں گی (یا انہیں لاعلم نہیں رہنا چاہیے تھا) کیوں کہ پچھلے دو ماہ سے اقوام متحدہ کے اہلکار اور انسانی حقوق کی تنظیمیں اپنی رپورٹوں میں ان کیمپوں کا تذکرہ کر رہی تھیں اور اطلاع دے رہی تھیں کہ ان کیمپوں میں لوگوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ جون میں حکومت بوسنیا نے اس قسم کے چورانوے معروف کیمپوں کی فہرست جاری کی تھی اور بتایا تھا کہ اس وقت تک ان میں قتل کیے جانے والوں کی تعداد نو ہزار تین سو تک پہنچ چکی ہے۔ اور یہ جنگ میں تب تک مارے جانے والے شہریوں کی کل تعداد ہرگز نہیں تھی؛ بمباری میں ہلاک ہونے والوں کے علاوہ بے شمار لوگوں کو بوسنیا کے شہروں اور گاؤوں میں پکڑ پکڑ کر قتل کیا گیا تھا۔ ایسے ایک واقعے کی دستاویزی شہادت زاکلوپاچا کے گاؤں میں ملی جہاں ۱۶ مئی ۱۹۹۲ کو سرب نیم فوجی دستوں نے کم از کم تراسی باشندوں کو، یعنی گاؤں کی تقریباً پوری مرد آبادی کو، "سرسری سزائے موت" دی تھی۔ بعض مقامات پر تعلیم یافتہ مسلمانوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا۔ ۱۹۹۲ کے آخر تک آنے والی رپورٹوں سے معلوم ہوا کہ قیدی کیمپوں کو منصوبہ بند قتلِ عام کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ دستاویزی شہادتوں کے ساتھ ایسی رپورٹیں بھی موصول ہوئیں کہ عورتوں کو منصوبہ بند جبری زنا کا ہدف بنانے کے لیے خاص عمارتوں میں قید رکھا جا رہا ہے(۲)۔

مغربی سیاست دانوں نے کیمپوں میں قید خستہ حال انسانوں کو اشتعال اور تشویش کے ساتھ دیکھا۔ لارڈ اوون نے، ایک آزاد مبصر کے طور پر لکھتے ہوئے، سربوں پر ہوائی حملوں کی سفارش کی۔ مگر ڈگلس ہرڈ نے اس کارروائی کے جواز کو تسلیم کرتے ہوئے بھی بوسنیا پر عائد پابندی ہٹانے سے انکار کیا۔ اور چوں کہ دوسرے مغربی سیاست دانوں کی طرح وہ بھی اس جنگ کو خانہ جنگی کے طور پر دیکھتا تھا، اس لیے وہ برطانوی فوجیوں کے اس میں دخل دینے کا مخالف تھا۔ بوسنیا کی حکومت نے کبھی اس قسم کا مطالبہ کیا بھی نہیں تھا۔

Scanned with CamScanner

اگست ۱۹۹۲ میں سابق یوگوسلاویا کی صورت حال پر غور کرنے کے لیے یوروپی اقتصادی برادری اور اقوام متحدہ کا ایک مشترکہ اجلاس برطانیہ کی صدارت میں لندن میں ہوا۔ اس اجلاس سے مغرب کی بے عملی اور زیادہ کھل کر سامنے آ گئی۔ وزیر اعظم جان میجر نے سرب لیڈروں سے وہ شے حاصل کی جو اُس کے خیال میں بوسنیائی شہروں کا محاصرہ ختم کرنے اور اپنا بھاری اسلحہ اقوامِ متحدہ کی نگرانی میں دینے کی "ضمانت" تھی۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ "نگرانی" کا لفظ اپنے بنیادی، لغوی معنی میں استعمال کیا گیا تھا، یعنی اقوامِ متحدہ کے اہلکار ہر روز ان توپوں کو سرائیوو کے ارد گرد کی پہاڑیوں پر فائرنگ کرتے بخوشی دیکھ سکتے تھے۔ کانفرنس میں جن دوسرے اقدامات کی منظوری دی گئی ان میں سربیا پر عائد پابندیوں کو دریائے ڈینیوب کی جانب سے سخت کرنا (جس کا کوئی طریقہ نہ تھا)، بوسنیا کے علاقے کو "نوفلائی زون" قرار دینا (جسے نافذ کرنے کی کوئی صورت نہ تھی)، اور لارڈ کیرنگٹن کی جگہ لارڈ اوون کو یوروپی برادری کی طرف سے ثالث مقرر کرنا شامل تھے (لارڈ اوون نے ثالث بنتے ہی سربوں کے خلاف فوجی کارروائی کی حمایت ترک کر دی اور مذاکرات میں ان کے ساتھ دوسرے فریقوں کے مساوی سلوک کرنے لگا)۔

عالمی برادری اس بار بھی تنازعے کے اصل اسباب دریافت کرنے سے قاصر رہی۔ اس کا زور اب دو نکتوں پر تھا: فوجی مسائل کا فوجی حل، اور انسانی مسائل کا انسانی حل۔ اگرچہ "نسلی خالصیت" کی اصطلاح تب تک خاصی عام ہو چکی تھی، لیکن مسئلے کو بنیادی طور پر فوجی مسئلہ، اور جبر اور دہشت گردی کی شکار شہری آبادی کو محض اس فوجی مسئلے کا ضمنی نتیجہ سمجھنے کا رجحان برقرار رہا۔ آخرالذکر کو "انسانی" مسئلہ قرار دیتے ہوئے اس کا حل یہ نکالا گیا کہ ہجرت پر مجبور کیے جانے والوں کو بوسنیا سے باہر پناہ گزینوں کے کیمپوں میں بھیج دیا گیا۔ جس بات کو پوری طرح نہیں سمجھا گیا وہ یہ تھی کہ "نسلی خالصیت" کے اقدامات جنگ کا ضمنی نتیجہ نہیں بلکہ ایک پورے سیاسی منصوبے کا مرکزی حصہ تھے اور جنگ اس منصوبے کو کامیاب بنانے کا ذریعہ تھی۔ اصل منصوبہ ہی یہ تھا کہ مقبوضہ علاقوں سے غیر سرب آبادی کو جبراً نکال دیا جائے تاکہ ان علاقوں کو سربیا سے ملحق کر کے گریٹر سربیا تخلیق کیا جا سکے۔

بیرونی دنیا کی جانب سے انسانی امداد کی کارروائیوں نے بلاشبہ کچھ جانیں بچائیں۔ لیکن ان کے کچھ ناخوشگوار نتائج بھی ہوئے جن کی پیش گوئی کرنا کچھ ایسا دشوار نہ تھا: مقامی نیم فوجی دستوں نے ان امدادی کارروائیوں کو اپنے لیے سپلائی کے ذریعوں کے طور پر برتا اور اپنی چیک پوسٹوں سے گزرنے والے سامان کا ایک چوتھائی حصہ تک وصول کرنے لگے اور گزرنے کی اجازت دینے کے عوض نقد رشوتیں بھی لینے لگے۔ اگرچہ ۱۹۹۲ کے آخر تک پرائیویٹ اور سرکاری امدادی

ایجنسیاں بوسنیا میں دوائیں اور خوراک پہنچانے کی سر توڑ کوشش کرتی رہیں، لیکن ان کے ساتھ ساتھ اقوامِ متحدہ کی فوج کے سپاہی بھی بوسنیا میں داخل ہوتے گئے (سال کے آخر تک ان کی تعداد آٹھ ہزار ہو چکی تھی)۔ ان سپاہیوں کا کردار اس کے سوا غیر واضح تھا کہ وہ راستے میں امدادی قافلوں کی حفاظت کے لیے آئے ہیں۔ ہلکے ہتھیاروں والی اس مختصر فوج کی بوسنیا میں تعیناتی کا سیاسی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ان کی حیثیت یرغمالیوں کی سی ہو گئی، اور ان کے باعث مغربی حکومتیں سربوں کے خلاف کوئی ایسی پالیسی اختیار کرنے کے معاملے میں انتہائی متذبذب ہو گئیں جس سے مشتعل ہو کر سرب فوجی اقوامِ متحدہ کے ان سپاہیوں کے خلاف کوئی اقدام کر دیں۔ لہذا برطانیہ، جس نے بوسنیا کو "نوفلائی زون" بنانے کی تجویز خود پیش کی تھی، دسمبر کے آتے آتے اقوامِ متحدہ کے اجلاسوں میں اس کو نافذ کرنے کی مخالفت کرنے لگا۔

اکتوبر ۱۹۹۲ کے آخری دنوں میں یوروپی برادری کے ثالث لارڈ اوون اور اقوامِ متحدہ کے مقرر کردہ ثالث سائرس وانس نے سیاسی تصفیے کا پہلا تفصیلی منصوبہ پیش کیا۔ یہ "حل" سربوں، کروٹوں اور مسلمانوں کے مطالبات کو سامنے رکھ کر ان کا کوئی وسطی جغرافیائی نقطہ تلاش کرنے کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ اس حل میں سربوں کو بوسنیا کا اتنا علاقہ دے دیا گیا تھا کہ مسلمانوں کو محسوس ہونے لگے کہ سربوں کو اُن کی جارحیت کا انعام دیا جا رہا ہے اور سربوں کو یہ یقین ہو جائے کہ اگر وہ اپنی کارروائیاں جاری رکھیں تو مزید علاقہ بھی اسی طرح حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ منصوبہ، جسے بعد میں "وانس اوون پلان" کا نام دیا گیا، بوسنیا کو متعدد "خود مختار صوبوں" میں تقسیم کرنے پر مبنی تھا اور اس میں مرکزی حکومت کے پاس صرف قومی دفاع اور امورِ خارجہ کے محکمے رہنے دیے گئے تھے۔ سربوں نے مزید زور لگایا، اور جنوری ۱۹۹۳ میں جب اس منصوبے کو "حتمی" شکل میں جاری کیا گیا تو مرکز کے ہاتھ سے دفاع کا محکمہ بھی نکل چکا تھا۔

وانس اوون منصوبے کے مثبت نکات یہ تھے کہ پورے بوسنیا میں مہاجرین کو اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے کی اجازت دی جائے گی، اور سرب مقبوضہ علاقوں پر مشتمل صوبوں کو نقشے پر اس طرح ایک دوسرے سے جوڑا نہیں جائے گا کہ وہ واحد بلاک کی صورت میں سربیا سے الحاق کر سکیں۔ بدقسمتی یہ تھی کہ منصوبے کے باقی نکات، اور معروضی حقائق، ان دونوں مثبت نکتوں کی نفی کر دیتے تھے۔ صوبوں کو (پولیس سمیت) تمام اختیارات دینے کا مطلب یہ تھا کہ مہاجرین اپنے گھروں کو ہرگز نہیں لوٹ سکیں گے۔ اور معروضی حقائق یہ تھے کہ سربوں کے مقبوضہ علاقے نقشے پر ایک دوسرے کے ساتھ پہلے ہی جوڑے جا چکے تھے۔

لیکن ان سب نقائص سے بڑھ کر وانس اوون منصوبے کا انتہائی نقصان دہ پہلو یہ تھا کہ

Scanned with CamScanner

صوبوں کو نسلی نام دے دیے گئے اور یہ بھی جتا دیا گیا کہ صوبوں کی حدیں ابھی حتمی طور پر طے نہیں ہوئی ہیں۔ اس سے فوری طور پر مزید علاقے ہتھیانے کی دوڑ نئے سرے سے شروع ہو گئی جس کی پیش گوئی بہ آسانی کی جا سکتی تھی۔ بدترین بات یہ تھی کہ اس کے نتیجے میں وسطی بوسنیا کے مخلوط مسلم کروٹ علاقے میں مسلمانوں اور کروٹوں کے درمیان بھی یہ تنازعہ پھوٹ پڑا۔ اسلحے کی در آمد پر پابندی کے بعد، اس اقدام کے ذریعے مغرب نے بوسنیا کی تباہی میں ایک اور اہم کردار ادا کیا۔ اس سے بوسنیا میں واقعی خانہ جنگی شروع ہو گئی اور وہ مسلم کروٹ اتحاد ٹوٹ گیا جو سربوں کے راستے میں واحد موثر رکاوٹ تھا۔

بوسنیائی مسلم اور کروٹ قیادت کے درمیان، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، تناؤ پہلے سے موجود تھا۔ ستمبر ۱۹۹۲ میں خبر آئی تھی کہ کروٹ قوم پرستوں کے قائد ماتے بوبان نے اپنے سپاہیوں کو ہدایت کی ہے کہ سرائیوو کا محاصرہ توڑنے میں بوسنیائی دفاعی فوج کی مدد نہ کریں۔ اکتوبر میں بعض مقامات پر کروٹوں اور مسلمانوں کے درمیان چھوٹی موٹی جھڑپیں بھی ہوئی تھیں۔ لیکن ان سب کے باوجود بڑے پیمانے پر لڑائی شروع نہیں ہوئی تھی اور دفاعی اتحاد کم و بیش قائم تھا۔ ۱۹۹۳ کے اوائل میں وانس اوون منصوبے کے سامنے آنے کے بعد صورت حال رفتہ رفتہ تبدیل ہو گئی۔ اپریل کے آغاز میں وسطی بوسنیا میں مسلمانوں اور کروٹوں کے درمیان سخت جنگ چھڑ گئی۔ مئی میں اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے ایک مبصر نے اپنی رپورٹ میں انتباہ کیا کہ وانس اوون منصوبہ نسلی خالصیت کی کارروائیوں کو ہوا دے رہا ہے، مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

اسلحے پر پابندی اور وانس اوون منصوبے کے مجموعی اثرات نے سربوں کے خلاف مزاحمت کو مہلک حد تک کمزور کر دیا تھا۔ جنوری ۱۹۹۳ تک بعض علاقوں میں سربوں کی پسپائی کی خبریں آ رہی تھیں، مگر گولا بارود کی کمی بوسنیائی دفاع کو ناکارہ بنا رہی تھی۔ ۱۹۹۳ کے ابتدائی مہینوں میں سربوں نے اپنے مقبوضہ علاقوں میں مسلمان اکثریت کی چھوٹی چھوٹی آبادیوں کے خلاف اپنی مہم اور تیز کر دی۔ اقوام متحدہ اور امریکی ایر فورس کے ان اقدامات کی بہت تشہیر کی گئی کہ وہ ہوائی جہازوں سے ان آبادیوں پر خوراک کے تھیلے گرا رہے ہیں، یہ علاقے سربوں کے ہاتھ سے بچ نہ سکے۔ سریبرنیکا (Srebrenica)، جو کسی زمانے میں پورے مغربی بلقان کا سب سے خوشحال قصبہ تھا، ایک بڑے سے مہاجر کیمپ میں تبدیل ہو گیا جس میں سے انسانی فضلے کا تعفن اٹھ رہا تھا۔ ایک اور قصبے ژیپا (Zepa) میں بیرونی مبصر داخل ہوے تو انھیں معلوم ہوا کہ جب قصبے کا دفاع کرنے والوں کے پاس بارود ختم ہو گیا تو قصبے والوں نے بھاگ کر آس پاس کی پہاڑیوں پر پناہ لی اور اب غاروں میں رہتے اور ہوائی جہازوں سے پھینکی جانے والی امریکی خوراک پر گزر بسر کرتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

اس عسکری قوت کے آگے مجبور ہو کر حکومت بوسنیا نے مارچ اپریل ۱۹۹۳ میں وانس اوون منصوبے پر رضامند ہونے کی جانب قدم بڑھایا۔ تب تک اس بات کی امید تقریباً ختم ہو چکی تھی کہ مغرب بوسنیا کی فوج کی بنیادی کمزوری، یعنی اسلحے پر پابندی، دور کرنے کی اجازت دے گا: امریکا اور جرمنی نے پابندی اٹھانے کا اشارہ دیا تھا لیکن ڈگلس ہرڈ نے انھیں جلد ہی اپنے ارادے سے دست بردار ہونے پر قائل کر لیا۔ وسط اپریل میں برطانوی اور امریکی ٹی وی پر دکھائی جانے والی مارگریٹ تھیچر کی صاف گویانہ تنقید بھی ان دونوں حکومتوں کو اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنے پر آمادہ نہ کر سکی۔ خاص طور پر برطانوی حکومت وانس اوون منصوبے سے قائم ہونے والے "امن" کی امید سے مسرور تھی اور کسی ایسے اقدام پر غور کرنے کو تیار نہ تھی جو اس منصوبے کو نقصان پہنچا دے، حالاں کہ، ایک مبصر کے لفظوں میں، اندھا بھی دیکھ سکتا تھا کہ یہ منصوبہ کبھی عملی شکل اختیار نہیں کر سکے گا۔

سربوں کے لیے یہ منصوبہ صرف اس واضح مفروضے کی بنیاد پر قابلِ قبول ہو سکتا تھا کہ یہ مقبوضہ علاقوں کے سربیا سے مکمل الحاق سے پہلے کی ایک عارضی صورت ہے۔ اسی بنیاد پر میلوشےوچ نے ۲ مئی ۱۹۹۳ کو ایتھنز میں ہونے والے ایک اجلاس میں رادووان کراجک کو یہ منصوبہ قبول کرنے پر قائل کر لیا۔ سربیا کے وفد کے ایک رکن نے کہا: "یہ صرف پہلا مرحلہ ہے۔ یہ زیادہ دن نہیں چلے گا۔ خود لارڈ اوون کو بھی ایسی کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔" اس نے مزید کہا کہ آخر میں مسلمانوں کے پاس بلقان کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا باقی بچے گا اور سربوں کو وہ سب کچھ مل جائے گا جو وہ چاہتے ہیں۔ لیکن بوسنیائی سربوں کے کئی لیڈروں اور فوجی کمانڈروں کا خیال تھا کہ اپنا حتمی مقصد حاصل کرنے کے لیے سربوں کو وانس اوون منصوبے کی طرف سے گھوم کر جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بعض ایسے سرب سیاست دانوں کی طرف سے اس منصوبے کی سب سے زیادہ مخالفت ہوئی جنھوں نے بڑے بڑے علاقے ذاتی جاگیروں کے طور پر ہتھیا رکھے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ کسی انتظامی مداخلت سے ان کے مطلق اقتدار میں کوئی رخنہ پڑے۔ ان سیاست دانوں نے ۱۵ مئی کو مقبوضہ علاقوں میں ریفرنڈم کرایا جس میں یہ منصوبہ مسترد کر دیا گیا جس پر کراجک نے ایتھنز میں دستخط کیے تھے۔ اس بات پر بوسنیائی سربوں کے کمانڈر ملادک اور سربیائی حکومت کے درمیان بظاہر کچھ اختلاف بھی ہوا اور کمانڈر نے سربیا اور بوسنیا کی سرحد بند کرنے کی دھمکی بھی دی۔ لیکن اس نے بین الاقوامی مبصروں کو سرحد کی نگرانی کرنے کی اجازت نہیں دی، اور چند ہفتوں کے اندر اندر اسلحے اور دیگر چیزوں کی سپلائی پھر بحال ہو گئی۔

بوسنیا کے خلاف موت کا آخری وارنٹ ۲۲ مئی ۱۹۹۳ کو واشنگٹن میں برطانوی، فرانسیسی،

Scanned with CamScanner

روسی اور امریکی وزرائے خارجہ کے ایک اجلاس میں جاری کیا گیا۔ سربوں پر ہوائی حملوں کی باتیں یکسر ترک کر دی گئیں۔ حتیٰ کہ وانس اوون منصوبے کو نافذ کرانے کا معاملہ بھی چھوڑ دیا گیا۔ طے یہ ہوا کہ بوسنیا کے بیس لاکھ مسلمانوں میں سے جتنے لوگ زندہ بچے ہیں انھیں چند "محفوظ علاقوں" میں جمع کر دیا جائے۔ ان علاقوں میں بھی اُن کے محفوظ رہنے کی کوئی ضمانت نہ تھی؛ کیوں کہ ان پر پہرا دینے والے اقوامِ متحدہ کے فوجیوں کو صرف اسی صورت میں گولی چلانے کی اجازت تھی جب خود اُن پر فائرنگ کی جائے، پناہ گزینوں پر فائرنگ کی صورت میں وہ کوئی جوابی کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔

جب عزت بیگووچ کو اس تصفیے کی اطلاع ملی (وزرائے خارجہ نے اُس کی رائے معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی تھی) تو اس نے مندرجہ ذیل بیان جاری کیا:

> "اگر عالمی برادری اُن اصولوں کا تحفظ کرنے کو تیار نہیں ہے جنھیں اپنے بنیادی اصول قرار دیتی ہے، تو اسے یہ بات واضح لفظوں میں بوسنیا کے عوام سے اور پوری دنیا کے عوام سے کہہ دینی چاہیے۔ اسے طرزِ عمل کے نئے ضابطے کا صاف صاف اعلان کر دینا چاہیے جس کی رو سے طاقت کو پہلی اور آخری دلیل کی حیثیت حاصل ہو گی۔"

طاقت کی یہ دلیل جن افراد کے پاس تھی -- سلوبودان میلوشے وچ، فرانیو تجمان اور تابعدار لارڈ اوون -- ان سب نے موسمِ گرما کے باقی مہینوں میں بوسنیا کے تین حصوں میں بٹوارے کے یکے بعد دیگرے کئی منصوبے پیش کیے جن میں سے ہر ایک پچھلے منصوبے سے زیادہ سفاکانہ اور زیادہ عریاں تھا۔ اس بات کی کسی کو کچھ پروا نہ رہی کہ بوسنیا کی "کنفیڈریشن" کا انجیر کا پتا اپنی جگہ پر رہتا ہے یا نہیں۔ اس قسم کے ہر منصوبے کا نتیجہ ایک کمزور اور مخدوش مسلم ریاست کی صورت میں نکلتا ہے جو مسلمان سپاہیوں کو، انتہائی شکستگی کی حالت میں ہوتے ہوئے بھی، ہرگز قبول نہیں ہے۔ بوسنیا کے اس بٹوارے کو، جس سے پورے خطے میں طویل عرصے کے لیے عدم استحکام جڑ پکڑ لے گا، لارڈ اوون نے یہ کہہ کر پیش کیا ہے کہ یہ مسئلے کا "آئیڈیل حل نہیں ہے۔" زیادہ درست بات یہ ہو گی کہ یہ کوئی حل ہے ہی نہیں۔

***

اس جنگ کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ بوسنیا کی تباہی کے اصل اسباب

Scanned with CamScanner

اس کی سرحدوں کے باہر سے درآمد کیے گئے تھے: اوّل سربیا کی قیادت کے سیاسی منصوبے کی شکل میں، اور دوم مغربی لیڈروں کی جانب سے ہلاکت خیز مداخلت کی صورت میں۔ اس کے باوجود جو بھی مبصر ان ناقابلِ تصور ہولناک مظالم کی جھلک دیکھ چکا ہے (یہ مظالم پہلے بے پناہ زور کے ساتھ مسلمانوں اور کروٹوں کے ساتھ کیے گئے تھے، بعد میں سرب بھی ان کا نشانہ بنے)، اس نے کبھی نہ کبھی یہ ضرور سوچا ہوگا کہ یہ ضرور بوسنیا کی پوری آبادی میں چھپی ہوئی دیوانگی ہے جو آخرکار سطح پر نمودار ہو گئی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ لاشوں کا مثلہ اور ایسے چند ظالمانہ افعال اس خطّے کی سابقہ جنگوں میں بھی پیش آئے ہیں اور ان کی یاد اجتماعی حافظے میں منتقل بھی ہوتی چلی آئی ہے۔ بوسنیا میں بہت سے بوڑھے لوگ تھے جنھوں نے دوسری جنگِ عظیم کے دنوں میں بھی ایسے مظالم ہوتے دیکھے تھے۔ لیکن یہ سوچنا کہ بوسنیا کی حالیہ جنگ دوسری جنگِ عظیم کے وقت سے چلی آنے والی نسلی منافرت کا بے ساختہ اظہار ہے، کراجک اور میلوشےوِچ کے رٹائے ہوئے سبق کو دُہرانا ہے۔

۱۹۹۲ کے بوسنیا میں ہونے والے مظالم اُن بوڑھے یا جوان بوسنیائی باشندوں نے نہیں کیے جن کے ذہنوں میں دوسری جنگِ عظیم کے دنوں کی یاد محفوظ تھی۔ یہ نمونہ سربیا سے آنے والے اُن نوجوان دہشت گردوں نے پیش کیا جو قیمتی سیاہ چشمے لگائے ہوئے تھے اور جو باضابطہ تربیت یافتہ سرب نیم فوجی دستوں کے رکن تھے۔ جن افراد نے یہ ظالمانہ افعال سرانجام دیے انھوں نے یقیناً ان سے کسی قسم کی مریضانہ لذّت بھی اخذ کی ہوگی، لیکن دراصل وہ اپنے سیاسی رہنماؤں کی نہایت شعوری طور پر کی گئی منصوبہ بندی کو عمل کا روپ دے رہے تھے۔ اور اس شعوری منصوبہ بندی کا واضح طور پر طے شدہ ہدف یہ تھا کہ دو نسلی آبادیوں کو علاقے سے باہر نکال پھینکا جائے اور تیسری آبادی کے نسل پرستانہ جذبات بھڑکا کر اسے اشتعال میں لایا جائے۔ پندرہ برس تک بوسنیا کے طول و عرض کے سفر میں رہنے اور مسلم، کروٹ اور سرب گاؤوں میں ٹھہرنے کے بعد، مَیں اس دعوے پر یقین کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہوں کہ اس ملک میں ہمیشہ سے نسلی منافرتیں سلگ رہی تھیں۔ لیکن ۹۲-۱۹۹۱ کے دوران بلغراد کے ریڈیو اور ٹی وی سے جو کچھ نشر کیا گیا اس کے پیشِ نظر مَیں یہ بات سمجھ سکتا ہوں کہ بوسنیا کے سادہ دل سرب نژاد دیہاتی کیوں کر اس خطرے کو باور کرنے پر آمادہ ہو گئے جو اس پروپیگنڈے کے مطابق انھیں اُستاشا ٹولوں، بنیاد پرستانہ یلغار وغیرہ وغیرہ سے لاحق تھا۔ جیسا کہ بلغراد کے ایک آزاد خیال صحافی میلوش واشیک نے امریکی ناظرین سے مخاطب ہو کر کہا، یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے تمام امریکی ٹی وی اسٹیشن کُو کلکس کلان (Ku Klux Klan) کے قبضے میں آجائیں۔ واشیک نے کہا: "آپ کو اس مفروضے پر غور کرنا چاہیے کہ اگر امریکا بھر کے تمام ٹی وی ایک ہی ادارتی پالیسی اپنا لیں، جو ڈیوڈ

ڈیوک کی سکھائی ہوئی ہو، تو پانچ سال کے اندر اندر پورا امریکا جنگ کے شعلوں کی لپیٹ میں ہوگا۔"
لیکن میلوشے وچ اور کراجک کے افعال پر، اور بوسنیا میں اُن کے حاصل کردہ نتائج (ڈیڑھ لاکھ انسانوں کی ہلاکت، بیس لاکھ سے زیادہ لوگوں کی بے گھری، شہروں اور گاؤوں کی تباہی، سیکڑوں مسجدوں اور گرجا گھروں کی مسماری) پر موزوں ترین تبصرہ ایک اَور مورّخ (رچرڈ ہیپس) کے ان الفاظ میں ملتا ہے جو اُس نے ایک اَور ملک کی خوں ریزی کے بارے میں لکھے تھے:

> "دستوئفسکی کے ناول Possessed کے کرداروں کی طرح بالشویکوں کے لیے بھی، اپنے متذبذب ساتھیوں کو اجتماعی گناہ کے رشتے میں باندھنے کی غرض سے، خون بہانا ضروری تھا۔ پارٹی کے ضمیر پر بے گناہوں کے خون کا بوجھ جتنا بڑھتا جاتا، اس کے کارکنوں کا یہ احساس بھی اُتنا ہی پختہ ہوتا جاتا کہ واپسی کا کوئی راستا نہیں ہے، تذبذب کی، مزاحمت کی کوئی گنجائش نہیں ہے، کہ وہ اپنے لیڈروں کے ساتھ ایک اٹوٹ رشتے میں بندھ چکے ہیں، اور اب مکمل "فتح" تک ان کے پیچھے پیچھے مارچ کرنے پر مجبور ہیں خواہ اس کی قیمت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔"

**

نوٹس

(۱) ہیلسنکی واچ کی ٹیم کے جن ارکان نے سرب سپاہیوں کو ان کارروائیوں میں مشغول دیکھا تھا انھوں نے اقوامِ متحدہ کی امن فوج کے مقامی کمانڈر سے، جو بنالوقا کے ایک ہوٹل میں مقیم تھا، اس بارے میں استفسار کیا۔ کمانڈر نے جواب دیا کہ اسے رکاوٹیں کھڑی کی کے سڑکوں کے بند کیے جانے کی بابت کچھ علم نہیں ہے، اور یہ کہ اس بات سے اسے کوئی سروکار بھی نہیں ہے۔

(۲) برطانوی اخبار نویس وکٹوریا کلارک نے "آبزرور" (۲۱ فروری ۱۹۹۳) میں فوچا میں قائم کیے گئے جبری زنا کے کیمپ میں محبوس رہنے والی ایک عورت کا تفصیلی اور دردانگیز بیان شائع کیا۔ بعض تبصرہ نگار منصوبہ بند جبری زنا کے مسئلے کو محض تخیل کی پیداوار قرار دیتے ہیں۔ حکومتِ بوسنیا نے اس منصوبہ بند بدسلوکی کا نشانہ بننے والی تیرہ ہزار عورتوں کے کوائف جمع کیے؛ یوروپی اقتصادی برادری کے مشن نے جنوری ۱۹۹۳ میں ایسی عورتوں کی تعداد کا بہت سادہ تخمینہ بیس ہزار لگایا۔ ان شہادتوں کی موجودگی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ متعدد علاقوں میں سرب فوجی منصوبہ بند جبری زنا کو شہری آبادی کو کچلنے کے ایک باقاعدہ حربے کے طور پر استعمال کر رہے تھے، اور یہ محض بعض سپاہیوں کے بے راہ رو ہو کر کیے ہوئے انفرادی اقدامات کا معاملہ ہرگز نہیں تھا۔

Scanned with CamScanner

ترجمہ: اجمل کمال

بوسنیا میں تہذیبی قتلِ عام

جس خطے میں بوسنیا کا المیہ وقوع پذیر ہو رہا ہے اُس سے اسکالروں اور مدرّسوں کے طور پر پیشہ ورانہ سروکار رکھتے ہوئے، ہم سخت رنج کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ اس المیے کے ایک انتہائی اہم اور دردانگیز پہلو کی جانب دنیا کی توجہ مناسب طور پر مبذول نہیں ہوئی ہے۔ المیے کے اس پہلو کا تعلق بوسنیا کے تہذیبی ورثے کی دانستہ، منصوبہ بند تباہی سے ہے۔

بلاشبہ انسانی جانوں اور انسانی وقار کا اتلاف ہمارے لیے بھی سب سے بڑھ کر تشویش ناک پہلو ہے، اور اسے روکنے کے لیے اُن حکومتوں اور عالمی تنظیموں کو فوری کارروائی کرنی چاہیے جو اب تک کوئی موثر اقدام کرنے سے قاصر رہی ہیں۔ ہم اپنی حکومتوں اور اقوامِ متحدہ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ انسانی ہلاکت اور ابتلا کو روکنے کے لیے تیز رفتار اور فیصلہ کن کارروائی کی جائے۔

ہم ان سے یہ بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ "نسلی خالصیت" کی مہم کے ذریعے اب تک حاصل کی جانے والی فتوحات کو ہرگز جائز قرار نہ دیا جائے، اور توقع رکھتے ہیں کہ ان مظالم کے ذمے داروں کو کسی صورت میں انعام کا حق دار نہیں ٹھہرایا جائے گا اور ان کی سفاکیوں کو فراموش نہیں کیا جائے گا۔

ہم بوسنیا کے عوام سے اپنی یک جہتی کا اظہار کرتے ہیں، اور سربیا اور دوسری جگہوں سے اٹھنے والی اُن اختلافی آوازوں سے بھی جو قتلِ عام پر مبنی اس جنگ کے ذمے داروں کے خلاف مسلسل بلند ہو رہی ہیں۔

اس تنازعے کو بوسنیائی مسلمانوں اور اور تھوڈوکس مسیحی سربوں کی جنگ قرار دینے کا مطلب حکومت سربیا کے پروپیگنڈے کو تسلیم کر لینا ہے جو اس طرح مغربی اور روسی رائے عامہ کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ جنگ، اور آخرکار دنیا کے ضمیر میں ہونے والی کش مکش، اسلام اور مسیحیت کے مابین نہیں ہے۔ اس جنگ کا ایک فریق وہ سیاسی تصوّر ہے جو بوسنیا

Scanned with CamScanner

کے کثیر مشرب ورثے کی بنیاد پر ایک بوسنیائی ریاست قائم کرنا چاہتا ہے، اور دوسری جانب انتہاپسند سرب قوم پرستی ہے جو مذہب کو استعمال کرتے ہوئے ایسی قوتوں کو حرکت میں لارہی ہے جو بوسنیا کے اس کثیر مشرب ورثے کو تباہ کرڈالیں۔

اپریل ۱۹۹۲ میں بوسنیا کے شہروں اور قصبوں پر شروع ہونے والے حملے میں دانستہ اور موثر طور پر قومی لائبریریوں، عجائب گھروں اور دستاویزخانوں کو نشانہ بنایا گیا ہے تاکہ بوسنیا کی تاریخ کے تمام تر تحریری ریکارڈ کو مکمل طور پر مٹا ڈالا جائے۔ اس عمل کے ذریعے سرائیوو کی نیشنل لائبریری بھی تباہ کردی گئی ہے جس کے احاطے میں یونیورسٹی کی عمارتیں اور ملک کا سب سے بڑا اخباروں اور جریدوں کا ذخیرہ شامل تھا۔ تباہ ہونے سے پہلے اس لائبریری میں کتابوں کی پندرہ لاکھ سے زائد جلدیں موجود تھیں جن میں ایک لاکھ پچپن ہزار مخطوطات اور نایاب کتابیں تھیں۔ ۲۵ سے ۲۷ اگست ۱۹۹۲ تک مسلسل آتش گیر بموں کا نشانہ بنا کر اس لائبریری کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کردیا گیا۔ دیگر نقصانات میں نہ صرف لائبریریوں اور عجائب گھروں کی، بلکہ بوسنیا بھر کی سیکڑوں تاریخی عمارتوں، مسجدوں، گرجاگھروں اور یہودی عبادت خانوں کی بھی تباہی شامل ہے۔ ان میں سے چند کی تفصیل یہ ہے:

*پچھلے موسم گرما میں سرب فوجوں نے موستار کے شہر میں واقع فرانسسکن موناسٹری کو حملہ کرکے تباہ کیا جو ہرزگووینا کی تاریخی دستاویزات کا بنیادی ذخیرہ تھا۔ اس کے علاوہ موستار کا کلیسا، تیرہ مسجدیں، قدیم شہر کے تمام بحال شدہ مکانات، اور شہر کے سات میں سے چھ تاریخی پُل تباہ کر دیے گئے۔

*سرائیوو کا اورینٹل انسٹیٹیوٹ، جو اپنی نوع کا اہم ترین ادارہ تھا، ۱۷ مئی ۱۹۹۲ کو سربوں کی گولاباری سے تباہ ہو گیا۔ اس انسٹیٹیوٹ میں مخطوطوں، دستاویزوں، کتابوں اور مائیکروفلموں کا بیش قیمت ذخیرہ محفوظ تھا۔

*سرائیوو کی غازی خسرو بیگ لائبریری کو، جو ۱۵۳۷ میں قائم ہوئی تھی اور جس میں بارھویں صدی سے تعلق رکھنے والے اسلامی اور یہودی مخطوطوں کا خزانہ موجود تھا، ۵ مئی ۱۹۹۲ کو شدید گولاباری کرکے تباہ کردیا گیا۔ سولھویں صدی کی غازی خسرو بیگ مسجد بھی، جو لائبریری سے متصل واقع تھی، اسی گولاباری سے تباہ کی گئی۔

*سربیا کی جانب سے چلائی جانے والی نسلی خالصیت کی مہم کے دوران سیکڑوں مسجدیں مسمار کی گئیں جن میں تریبینیے (Trebinje) شہر کی پرانی مسجد بھی شامل تھی جسے ۲۷ جنوری ۱۹۹۳ کی رات کو جلا کر راکھ کردیا گیا۔ اس واقعے کے ایک عینی شاہد کی رپورٹ سے اس تہذیبی قتلِ عام

کے سنگین اثرات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے: "مسجد تمام رات جلتی رہی اور نیم فوجی وردیاں پہنے، نشے میں وحشت افراد ہوا میں متواتر گولیاں چلاتے رہے۔ صبح ہونے تک ٹریبینیے کی پانچ سو برس پرانی مسجد جل کر راکھ ہو چکی تھی اور سیاہ آنکھوں والا ۲۹ سالہ نوجوان کمال بوبک مشرق کی سمت جانے والے قافلے میں شامل ہو چکا تھا۔ اُس نے کہا: میرے پاس جو کچھ تھا سب جل چکا ہے۔ میرے گھر کے لوگ نہیں جلے، لیکن میرے گھر کی بنیاد تباہ ہو گئی۔ میں برباد ہو چکا ہوں۔" (بحوالہ "بوسٹن گلوب"، ۱۳ فروری ۱۹۹۳۔)

ہم اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ یہ یادگاریں اور عمارتیں جھڑپوں کے دوران تباہ نہیں ہوئیں بلکہ ان کو دانستہ اور منظم طریقے سے تباہ کیا گیا ہے۔ یہ عمل واضح طور پر نسلی خالصیت کی اُسی مہم کا حصہ ہے جو ایک مخصوص تہذیبی ورثہ رکھنے کی پاداش میں ایک پوری انسانی آبادی کے زندہ رہنے کے حق سے انکار کرتی ہے۔ یہ بھی اُسی شر انگیز منطق کا حصہ ہے جس کے مطابق بوسنیا کے دانش وروں اور سر بر آوردہ افراد کو چُن چُن کر ہلاک کیا گیا ہے۔

بوسنیا کے لوگوں کو قتل اور ان کے تہذیبی ورثے کو نیست و نابود کر کے ان کے کثیر مشرب، سیکولر اور متحمل معاشرے کے تصور کو برباد کر دینے کے عمل کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر ہم ہر گز خاموش نہیں رہ سکتے۔ لہذا ہم یہ حقائق اپنی حکومتوں اور عام لوگوں کے علم میں لا رہے ہیں۔ ہم پیشہ ورانہ تنظیموں اور دیگر قومی اور بین الاقوامی اداروں میں موجود اپنے ساتھیوں سے درخواست کرتے ہیں کہ اس اپیل میں ہمارا ساتھ دیں۔

شر کا سامنا ہونے پر بولنا شہادت دینا ہے، اور خاموش رہنا شر پھیلانے والوں کا ساتھ دینا ہے۔

Scanned with CamScanner

ضمیر نیازی

کی معروف اور اہم کتاب

The Press in Chains

کا اردو ترجمہ

صحافت پابندِ سلاسل

مجلد ۳۷۵ صفحات   قیمت: سو روپے

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

۳

کمال کُرسپاہِک: امید کا روشن مینار

کمال کُرسپاہِک: غمناک ترین شہر

کمال کُرسپاہِک: "قیامِ امن" کی بند گلی

زلاٹکو ورزدارےوِچ: سرائیوو یاد ہے؟

زلاٹکو ورزدارےوِچ: اقوامِ متحدہ ختم ہو چکی ہے

کمال کرُسپاہک (Kemal Kurspahic) ۱۹۸۸ سے سرائیوو سے نکلنے والے اخبار Oslobodjenje ("آزادی") کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ ان کی تمام تر صحافتی زندگی اسی اخبار سے وابستگی میں گزری ہے۔ وہ بلغراد اور نیویارک میں اس اخبار کی نامہ نگاری کے علاوہ اسپورٹس ایڈیٹر، نیوزروم ایڈیٹر اور ڈپٹی چیف ایڈیٹر کے طور پر کام کر چکے ہیں۔ اخبار "آزادی" کو کئی بین الاقوامی اعزازات حاصل ہوئے ہیں جن میں بی بی سی اور گرناڈا ٹی وی کی جانب سے "نیوزپیپر آف دی ایئر ایوارڈ" (۱۹۹۲) اور یوروپی پارلیمنٹ کا "سخاروف ایوارڈ" (۱۹۹۳) بھی شامل ہیں۔ خود کرُسپاہک کو ۱۹۹۲ میں انٹرنیشنل میڈیا فاؤنڈیشن کا "صحافتی جرأت کا ایوارڈ" (Courage in Journalism Award) اور ۱۹۹۳ میں ویانا کا "برُونو کریسکی ایوارڈ برائے انسانی حقوق" پیش کیا گیا۔

***

زلاتکو وزدارےوچ (Zlatko Dizdarevic) بھی سرائیوو کے اخبار روزنامہ "آزادی" سے وابستہ ہیں۔ ان کے مضامین مختلف زبانوں میں ترجمہ کر کے شائع کیے جاتے ہیں اور ان مضامین نے بیرونی دنیا کے سامنے بوسنیا کی سنگین صورتِ حال پیش کرنے میں خاصا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی کتاب Sarajevo: A War Journal حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔

Scanned with CamScanner

کمال کرسپاہک

ترجمہ: اجمل کمال

امید کا روشن مینار

اگست ۱۹۹۳ میں سرائیوو کے آزاد روزنامے Oslobodjenje ("آزادی") نے اپنی اشاعت کے پچاس برس پورے کیے۔ اس سالگرہ کی ایک زبردست علامتی اہمیت تھی، کیوں کہ "آزادی" کو دوسری عالمی جنگ کے دنوں میں ایک فسطائیت مخالف اخبار کے طور پر نکالا گیا تھا، اور اب، پچاس برس بعد، وہ ایک نئی شکل کی فسطائیت کا سامنا کر رہا تھا۔ اپریل ۱۹۹۲ میں سرائیوو کے محاصرے کے آغاز سے لے کر اس وقت تک ہمارے اخبار کی کانچ اور المونیم سے بنی دس منزلہ عمارت (جو کبھی بہت حسین تعمیر تھی) سربیائی بارود کا متواتر نشانہ رہی تھی۔ جب پہلی بار گولیاں ہمارے دفتر کی دیوار پر لگیں تو میں نے اخبار میں کام کرنے والے تمام لوگوں کو جمع کیا اور پیش کش کی کہ جن افراد کو اپنی یا اپنے کنبے کی سلامتی کے بارے میں تشویش ہو وہ اخبار چھوڑ کر جا سکتے ہیں۔ "ہم میں سے جو لوگ یہاں باقی رہ جائیں گے وہ ہر صبح اخبار ضرور نکالیں گے، خواہ حالات کسی بھی قسم کے کیوں نہ ہوں اور خواہ ہم میں سے کتنے ہی لوگ جان بچانے میں کامیاب ہو سکیں،" میں نے کہا۔ ہمارے ساتھیوں میں سے صرف چند افراد نے چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کیا، اور ان میں بیش تر ایسی عورتیں تھیں جن کے بچے چھوٹے تھے۔ ہم نے سرائیوو سے بلغراد یا زگرب جانے والی آخری بسوں یا پروازوں پر سوار ہونے میں ان کی مدد کی۔ باقی تمام لوگوں نے وہیں ٹھہرنے اور اخبار کو زندہ رکھنے کا عزم کیا۔ اس انتخاب کے پیچھے احساسِ ذمہ داری کے تین پہلو تھے۔ اول، اس اخبار کی روایت سے ہماری وابستگی: اخبار کا نام "آزادی" تھا اور ہمیں احساس تھا کہ فسطائیت مخالف روایت کو ایک ایسے لمحے میں ترک نہیں کیا جا سکتا جب سرائیوو اور بوسنیا اسی عفریت کے تازہ ظہور کا سامنا کر رہے ہیں۔ دوم، اپنے پیشے کی ذمے داری: اگر سیکڑوں غیر ملکی صحافی جنگ کے واقعات کی خبر رسانی کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈال سکتے ہیں تو ہمارے لیے، جن کا شہر اور ملک حملے کی زد میں ہے، کام چھوڑ دینے کے بارے میں سوچنے کا بھی سوال کہاں اٹھتا ہے۔ تیسری اور اتنی ہی اہم بات اپنے پڑھنے والوں کی جانب سے ہم پر عائد ہونے والی ذمے داری تھی: ایسے وقت

Scanned with CamScanner

میں جب وہ باقی ہر شے سے محروم ہو چکے ہیں، ہم انھیں خبروں سے بھی محروم کرنے پر کس طرح تیار ہو سکتے ہیں۔

"آزادی" کو باقی رکھنے کی جدوجہد اس طرح شروع ہوئی۔ ہم سب کے لیے یہ ایک نہایت منفرد پیشہ ورانہ تجربہ تھا۔ ہم سب ایسی حالت میں کام کرنے پر مجبور تھے کہ ہماری جانیں مسلسل خطرے میں تھیں۔ کوئی سو میٹر کے فاصلے پر، نجاریچی (Nedzarici) کے علاقے میں واقع اپنے مورچوں سے سرب فوجی اخبار کی عمارت کو ہر قسم کے مہلک حملوں کا نشانہ بنا رہے تھے: اسنائپروں کی طاقتور رائفلیں، مشین گنیں، مورٹر توپیں، حتیٰ کہ ٹینک بھی۔ ایک بار جب انھوں نے ایک ٹینک کو پوزیشن پر لا کر ہم پر گولاباری شروع کی تو میں اتفاق سے دفتر ہی میں موجود تھا۔ ٹینک کی نال سے نکل کر، ہوا میں قوس بناتے ہوئے آ کر ٹکرانے والے گولوں کا نشانہ بنتی ہوئی کانچ اور المونیم کی عمارت کا ردِ عمل کسی جاندار کا سا تھا۔ زوردار دھماکوں کے بعد عمارت سے نکلنے والی آوازیں انسانی چیخوں سے مشابہ محسوس ہوئیں۔ اس ایک موقعے پر حملہ آوروں نے عمارت کو سات بار نشانہ بنایا۔

چوں کہ عمارت کی طرف بڑھنا اور اندر داخل ہونا سخت خطرناک عمل تھا، اس لیے ہم نے سات سات دن کی شفٹوں میں کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ دس ادارتی کارکنوں پر مشتمل ایک ٹیم ہر سوموار کو عمارت میں داخل ہوتی اور پورا ہفتہ ایٹمی حملے سے مدافعت کے لیے بنائی گئی زیرِ زمین پناہ گاہ میں اخبار تیار کرنے میں گزارتی۔ وہ سب وہیں سوتے، اور وہیں جو کچھ ہمارا اخبار انھیں پیش کر سکتا (جس کی مقدار بے شک بہت قلیل ہوتی تھی) کھا لیتے۔ جب ہمارے اخبار کی عمارت انیس سو اسی کی دہائی میں تعمیر ہوئی تھی تو ہم اپنی حسین عمارت میں بنائی جانے والی اِس زیرِ زمین پناہ گاہ کے بارے میں ایک دوسرے سے مذاق کرتے تھے۔ ہم اس پابندی کو کہ ہر بڑی عمارت میں ایٹمی حملے سے بچاؤ کی پناہ گاہ ضرور بنائی جائے، کمیونسٹوں کی مضحکہ خیز خوف زدگی پر محمول کرتے تھے۔ اب یہ جگہ ایک غیر مترقبہ نعمت تھی کیوں کہ عمارت کا یہ واحد حصہ تھا جہاں ہمارے ادارتی عملے کے لوگ محفوظ رہ کر کام کر سکتے تھے۔ ہم نے سرائیوو کے مرکزی علاقے میں کچھ دفتری کمرے بھی کرائے پر حاصل کر لیے تاکہ ہمارے خبر نگار محاذ پر ہونے والی جھڑپوں، شہریوں کی ہلاکتوں، اسپتالوں اور عوامی خدمت کے اداروں، حکومت اور اقوام متحدہ کے افسروں کی سرگرمیوں، سفارتی اور ثقافتی واقعات اور محاصرے اور متواتر حملوں کی زد میں آئے ہوئے شہر کی روزمرہ بدنصیبیوں کی خبریں حاصل کر کے ہمیں بھیج سکیں۔

کام کے دوران ہماری زندگیوں کو درپیش خطروں کے علاوہ، جنگ زدہ سرائیوو میں روزانہ

اخبار نکالنے کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں موجود تھیں۔ پہلی مشکل تو یہی تھی کہ اخبار کی تقسیم اور فروخت کا پورا نظام، جو درجنوں گاڑیوں اور سڑک کنارے واقع سیکڑوں اسٹالوں پر مشتمل تھا، مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا۔ تمام ڈرائیوروں اور ہاکروں نے کام پر آنا چھوڑ دیا تھا، اس لیے یہ کام بھی صحافیوں نے خود سنبھالا۔ ان میں سے چند لوگ ہر صبح اپنی کاروں میں دفتر پہنچتے اور، بندوقوں اور توپوں کی زد میں سفر کرتے ہوئے، سرائیوو کے مختلف محلوں میں اخبار پہنچاتے جہاں ان کے دوسرے ساتھی گلیوں میں فروخت کرنے کے لیے اخبار کی کاپیاں وصول کرنے کے منتظر کھڑے ہوتے تھے۔

پھر ہمیں ایک اَور مسئلے کا بھی سامنا تھا: محاصرے کے مہینوں کے دوران نیوز پرنٹ کا ایک بھی رول شہر میں داخل نہیں ہو سکا تھا۔ اخبار کی زندگی کو طویل کرنے کی غرض سے ہمیں اس کی تعداد اشاعت، جو جنگ سے پہلے اوسطاً ساٹھ ہزار تھی، گھٹا کر چھ ہزار پر لانی پڑی اور صفحات کی تقطیع چھوٹی اور تعداد چوبیس سے کم کر کے آٹھ کرنی پڑی۔ بد ترین موقعے پر، جب ہمارا کاغذ کا ذخیرہ ختم ہونے کو تھا، ہم صرف ساڑھے تین ہزار کی تعداد میں، اور کسی بھی قسم کے کاغذ پر، اخبار چھاپنے لگے۔ اس میں وہ کاغذ بھی شامل تھا جسے کبھی درسی کتابیں اور دیواری پوسٹر چھاپنے کے لیے خریدا گیا تھا۔ محاصرے کے پہلے سال کے دوران ہمیں اخبار کی ظاہری ہیئت میں تیرہ مرتبہ تبدیلی کرنی پڑی، اور کئی بار تو مختلف رنگوں کا کاغذ استعمال کرنا پڑا —— کبھی نیلا، کبھی پیلا، کبھی گلابی، اور چند دن تو ہمارا اخبار سبز رنگ کے کاغذ پر بھی چھپا۔ (اس موقعے پر سربیائی پروپیگنڈا کرنے والے ذرائع ابلاغ نے فاتحانہ انداز میں تبصرے کیے کہ "اس اخبار نے آخر اپنا اصل رنگ دکھا ہی دیا، یعنی اسلامی بنیاد پرستی کا رنگ!") جب "آزادی" کی بقا کی جدوجہد کی طرف دنیا کی توجہ مبذول ہونی شروع ہوئی تو کچھ عالمی پیشہ ورانہ تنظیموں —— مثلاً فرانس میں قائم Reporteur sans Frrontieres —— نے نیوز پرنٹ مہیا کرنے میں ہماری مدد کی اور اقوام متحدہ کے ادارے اسے محصور شہر میں لانے میں تعاون کرنے لگے۔

ہمیں درپیش ایک اَور رکاوٹ اطلاعات کی ترسیل کی دشواریاں تھیں۔ ۱۹۹۲ کے موسم گرما کے بعد سے سرائیوو کی تمام ٹیلیفون لائنیں ایک ایک کر کے ٹوٹ چکی تھیں اور ہم فیکس اور ٹیلیکس کے آلات استعمال کرنے سے قاصر تھے۔ اس لیے تمام مراسلات قدیم ترین روایتی طریقے سے —— یعنی خود آ کر —— اخبار کے دفتر میں پہنچائے جاتے تھے۔ رپورٹر اور فوٹوگرافر اپنی تحریریں اور تصویریں ہمارے کرائے کے دفتروں میں لے کر آتے، اور وہاں موجود صحافیوں میں سے کوئی (اکثر اوقات ولادو مرکیچ یا راتیکو زوکوچ) یہ سب کچھ اپنی گاڑی میں رکھ کر فائرنگ میں سے گزرتا ہوا

ہماری بچی کھچی عمارت میں موجود ایڈیٹروں تک پہنچاتا۔ اسی طرح بوسنیا کے دوسرے شہروں میں یا ملک سے باہر مقیم ہمارے نامہ نگار اپنی چیزیں زگرب، کروشیا، میں واقع ہمارے دفتر کو بھیجتے اور وہاں سے وہ ہیم ریڈیو (ham-radio) کے ذریعے ہمیں ارسال کی جاتیں۔ پھر ایٹم بم کی پناہ گاہ میں موجود ہمارے ادارتی کارکن مختلف ریڈیو اسٹیشنوں اور ٹیلی وژن کی خبری نشریات سے اطلاعات حاصل کرتے۔

لیکن ان سب سے زیادہ بے دست و پا کرنے والی دشواری، خصوصاً ۱۹۹۳ کے موسم گرما کے دنوں میں، ایندھن کی قلت تھی۔ سرائیوو کئی ہفتوں سے بجلی سے محروم تھا اور اخبار کی ٹائپ سیٹنگ اور چھپائی کے لیے ہمیں اپنا جنریٹر چلانا پڑتا تھا۔ اس کے لیے ہمیں ہر روز سو لٹر تیل درکار ہوتا تھا، اور سرائیوو میں تیل نایاب تھا اور صرف چور بازار سے حاصل کیا جا سکتا تھا جہاں اس کے دام پچیس جرمن مارک فی لٹر تک پہنچ گئے تھے۔ ہمیں اخبار کے ایوارڈ کے ساتھ ملنے والی رقم کا کچھ حصّہ تیل خریدنے پر صرف کرنا پڑتا تاکہ اخبار کو جاری رکھا جا سکے۔

ان تمام رکاوٹوں کے باوجود "آزادی" کی اشاعت جاری رہی، ایسے موقعوں پر بھی جب کسی کو اس کی توقع نہ رہی تھی۔ مجھے ۲۰ جون ۱۹۹۲ کی رات ہمیشہ یاد رہے گی جب ہمارے اخبار کی پوری عمارت میں آگ لگ گئی تھی اور سرائیوو کے شہریوں نے اس جلتی ہوئی عمارت کو ٹیلی وژن کی خبروں میں دیکھا تھا۔ اُس ہفتے کام کرنے والی ادارتی ٹیم کا سربراہ، فیستور راموویچ، آگ بجھانے کی کوشش میں مصروف تھا، لیکن ساتھ ہی اگلے دن کا اخبار تیار کرنے میں بھی مشغول تھا۔ "آگ ابھی ابھی بجھی ہے،" اس نے صبح چھ بجے مجھے فون پر اطلاع دی۔ پانچ منٹ بعد پھر اس کا فون آیا: "پریس چل رہا ہے!" اُس صبح سرائیوو کی گلیوں میں اخبار کے پہنچنے کو بہت سے شہریوں نے فتح کے جشن کے طور پر منایا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر اخبار ایسے حالات میں بھی نکل سکتا ہے تو پھر سب کچھ ممکن ہے اور امید ختم نہیں ہوئی۔ "سرائیوو کا محاصرہ کرنے والے حملہ آوروں کو آج صبح بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا جب *Oslobodjenje* معمول کے مطابق شائع ہوا،" شام کے وقت بوسنیا کے ٹی وی نے اپنے ناظرین کو اطلاع دی۔

حملے اور محاصرے کے دوران "آزادی" کا جاری رہنا اس بات کی زندہ مثال ہے کہ اظہار کی آزادی کو ٹینکوں اور توپوں کے ذریعے خاموش نہیں کیا جا سکتا۔ سربیائی حملہ آور ہمارے چند کارکنوں کو ضرور ہلاک کر سکتے ہیں، اور انھوں نے کیا بھی ہے۔ بوسنیا ہرزگووینا کی جنگ میں کام آنے والا پہلا صحافی ہمارے ہی اخبار کا نامہ نگار کاشف اسماعیلوویچ تھا۔ وہ زوورنک میں ہمارے ذیلی دفتر میں اپنی میز پر کام کرتے ہوئے مارا گیا، اور کئی عینی شاہدوں نے اس کی لاش ٹانگوں سے

گھسیٹ کر باہر لائی جاتی اور پھر اس شہر کی ایک اجتماعی قبر میں ڈال کر جلائی جاتی ہوئی دیکھی۔ ہمارا سینیئر فوٹو گرافر سالکو ہوندو سرائیوو کے وسطی علاقے میں پانی بھرنے کے لیے قطار بناتے ہوئے شہریوں کی تصویر کھینچتے ہوئے ہلاک ہوا، اور اخبار کے مالیاتی شعبے کی کلرک زُہرا بیشچ عمارت سے باہر نکلتی ہوئی بس کی سیٹ پر گولی لگنے سے مری۔ مقبوضہ علاقوں میں ہمارے کئی نامہ نگار گم شدہ ہیں، اور ادارتی اسٹاف کے بیس سے زیادہ کارکن شدید زخمی ہو چکے ہیں۔ لیکن ہمارے اخبار پر ہونے والے ان وحشیانہ حملوں نے ہمیں خاموش کرنے کے بجائے اخبار کو پہلے سے کہیں زیادہ معروف کر دیا ہے۔ ہماری آواز اور ہمارا پیغام اب تمام براعظموں تک پھیل گیا ہے۔ صحافیانہ اتحاد کے ایک بے حد متاثر کن مظاہرے کے طور پر دنیا بھر کے اخباروں نے ہمارے اخبار سے منتخب کیے ہوئے مضامین پر مشتمل دو صفحوں کے ضمیمے شائع کیے۔ یہ ضمیمے دو موقعوں پر شائع ہوئے: سرائیوو کے محاصرے کا ایک سال مکمل ہونے پر ۵ اپریل ۱۹۹۳ کو تیس سے زیادہ بڑے اخباروں نے مجموعی طور پر اس ضمیمے کی ایک کروڑ پچاس لاکھ کاپیاں، اور ۱۵ ستمبر ۱۹۹۳ کو اخبار کی پچاسویں سالگرہ کے موقعے پر ۲۷ نمایاں روزناموں نے دو کروڑ بیس لاکھ کاپیاں شائع کیں۔

"آزادی" کی اشاعت جاری رکھنے کے تجربے سے ایک اور پیغام بھی ملا ہے: اس تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ سرائیوو میں باہمی رواداری سے رہنے والے مختلف نسلوں اور مذہبوں کے حامل لوگوں کی صدیوں پرانی روایتوں اور ان کے کلچر کو دہشت کے زور پر ختم نہیں کیا جا سکتا۔

"آزادی" کے ادارتی اسٹاف میں مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے افراد کم و بیش اُسی تناسب میں شامل ہیں جو جنگ سے پہلے بوسنیا ہرزگووینا کی پوری آبادی میں موجود تھا۔ اخبار کے کارکنوں کو —— جن میں مسلمان، سرب اور کروٹ تینوں شامل ہیں —— اتنے ظالمانہ طور پر نشانہ بنائے جانے کی وجہ نسلی ہم آہنگی اور باہمی رواداری کی یہی علامت ہے جسے حملہ آور ختم کرنے کے درپے ہیں۔ جس چیز نے ہم سب کو مخالف وحشیانہ قوتوں کا سامنا کرتے ہوئے متحد رکھا وہ میرے خیال میں ہمارا صحافت کا پیشہ ہے۔ جب تک آپ چیزوں کو اس طرح بیان کرنے کے لیے آزاد ہیں جیسا آپ انھیں دیکھتے ہیں، جیسا ان کے بارے میں سوچتے ہیں، محسوس کرتے ہیں، اس وقت تک آپ کو اپنے مختلف نسلوں اور مذہبوں سے تعلق رکھنے والے ساتھیوں کے ساتھ کام کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ اور پھر سرائیوو میں رہ کر سربیائی دہشت سے گزرنا ہم سب کا مشترک تجربہ ہے۔

جنگ کے دنوں کے اخباری عملے میں شامل چند عمدہ ترین صحافی سرب ہیں۔ کالم نگار گوئیکو بیرچ نے، جسے بوسنیا ہرزگووینا کے صحافیوں کی انجمن نے "سال کا بہترین اخبار نویس" قرار دیا،

اعزاز وصول کرتے ہوئے کہا:

"یہ حقیقت کہ مجھے سرب ہوتے ہوئے سرائیوو کے اس اعلیٰ اعزاز کا مستحق قرار دیا گیا ہے، اس بات کا ثبوت ہے کہ اس شہر میں رواداری کی روح اب تک موجود ہے۔ آپ سربیا کے مقبوضہ شہر بنالوقا میں کسی مسلمان صحافی کے یا کروشیا کے مقبوضہ شہر گرووے میں کسی سرب اخبار نویس کے ایسا اعزاز وصول کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔"

اخبار کے کارکنوں کے طور پر ہمارے درمیان جو ہم آہنگی ہے اس کی ایک اور مثال دیتے ہوئے میں لکھوں گا کہ میری نائب مدیر گوردانہ کنیزے وچ، جو ہمارے عملے کی ایک اور سرب رکن ہے، میری غیر موجودگی میں اخبار کی ادارت کے فرائض سنبھالتی رہی ہے (۱۹۹۲ کے موسم گرما میں مجھے جنگی صورتِ حال کے نتیجے میں پیش آنے والے ایک حادثے میں زخمی ہو کر دو مہینے اسپتال میں گزارنے پڑے، اور چند دوسرے موقعوں پر "آزادی" کو دیے جانے والے مختلف اعزاز وصول کرنے کے لیے ملک سے باہر کا سفر کرنا پڑا۔) گوردانہ بھی کئی بار ملک سے باہر گئی لیکن ہر بار سرائیوو واپس آگئی۔

سادہ ذہنی پر مبنی اس توضیح کے برعکس جس کی رو سے بوسنیا کی الم ناک صورتِ حال "صدیوں پرانی نفرتوں" یا مقامی "نسلی اور مذہبی تنازعوں" کا نتیجہ ہے، سرائیوو کی مثال سے ثابت ہوتا ہے کہ بوسنیا پر ٹوٹنے والی قیامت بڑی حد تک درآمد شدہ ہے۔ اس کے اسباب میں سب سے پہلا "گریٹر سربیا" کا منصوبہ ہے جسے سرائیوو میں نہیں، بلغراد میں تیار کیا گیا اور جو دراصل طاقت کے بل پر علاقوں کو فتح کرنے کا منصوبہ ہے۔ اس المیے کی دوسری وجہ بوسنیا کی سرزمین پر یوگوسلاو فوج کی موجودگی ہے جس کا ہیڈ کوارٹر سرائیوو میں نہیں، بلغراد میں واقع ہے، اور اس فوج کی موجودگی نے عسکری اعتبار سے صورتِ حال کو ایک فیصلہ کن رخ دے دیا ہے جسے بوسنیا کی جنگ کا غلط نام دیا جاتا ہے۔ (یہ دراصل شہریوں کے خلاف چلائی جانے والی دہشت انگیزی کی ایک مہم ہے؛ جنگ کا مطلب دو حریف افواج کا ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہونا ہوتا ہے، لیکن جس دن بوسنیا پر حملہ ہوا اس ملک کے پاس کوئی فوج نہیں تھی، اور اب تک ہلاک ہونے والے بوسنیائی باشندوں میں نوے فی صد تعداد شہریوں کی ہے۔) تیسرا فیصلہ کن عنصر سربیا سے تعلق رکھنے والی نیم فوجی مسلح تنظیموں کا ادا کیا ہوا کردار ہے جنھوں نے بوسنیا ہرزگووینا میں "نسلی خالصیت" کے بدترین ہتھکنڈے اختیار کیے ہیں۔ آخری بات یہ ہے کہ بوسنیائی سربوں کے قائد رادووان کراجک اور اس کے قریبی ساتھیوں نے سرائیوو کے کلچر اور

ایک کثیر النسل معاشرے میں تحمل اور رواداری کی روایتوں کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اس بات کی ایک چونکا دینے والی مثال کے طور پر کراجک کے نام نہاد وزیر خارجہ الیک بوبا کے اس بیان کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو اس نے ٹیلی وژن کے کیمروں کے سامنے دیا تھا: "ہم سربوں کے نزدیک غیروں کے ساتھ مل کر رہنے کی نسبت اجتماعی خود کشی کر لینا زیادہ بہتر ہے۔"

کیا اس قدر دہشت اور ابتلا سے گزرنے کے بعد سرائیوو اور بوسنیا کے کثیر نسلی، کثیر مذہبی، اور کثیر تہذیبی معاشرے کا کوئی مستقبل موجود ہے؟ ہمارے ملک کو دو لالچی ہم سایہ ملکوں، پہلے سربیا اور پھر کروشیا، نے کچلا اور دہشت زدہ کیا ہے۔ نام نہاد عالمی برادری نے ہمیں ترک کر دیا اور قتل عام، جبری زنا اور جبری مہاجرت -- گویا نسل کشی کی واضح ترین مثالوں -- کو رکوانے کے لیے کچھ نہیں کیا اور اب بھی کچھ نہیں کر رہی ہے۔ دوسری طرف بین الاقوامی ثالث ہم پر نسلی امتیاز کی ایک شکل کو "حقیقت پسندانہ" حل کے طور پر قبول کرنے کے لیے متواتر دباو ڈال رہے ہیں۔ بوسنیا ہرزگووینا کو بلیک میل کے ذریعے مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ طاقت کے ذریعے خلق کی گئی "نئی حقیقتوں" کو تسلیم کر لے، اور اپنے خلاف کیے گئے جرائم کو قانونی حیثیت عطا کر دے۔ عالمی برادری، جو ہمارے ملک کے تین نسلی ریاستوں میں بٹوارے پر مصر ہے، دراصل باقی ماندہ نسلی رواداری کو تباہ کرنے کے لیے زور ڈال رہی ہے۔

اس کے باوجود سرائیوو میں تحمل اور رواداری کی روح اب تک زندہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ محاصرے کے ڈیڑھ سال سے زیادہ عرصے کی اس ہولناک آزمائش نے شہر کے رہنے والے مسلمانوں، سربوں، کروٹوں اور یہودیوں کے درمیان ہم آہنگی کے احساس کو مزید تقویت دی ہے جنھوں نے اس دہشت کا مل کر سامنا کیا ہے۔ "آزادی" کے لیے کام کرنے والے ہم سب لوگوں نے ادارتی عملے کے ایک سے زیادہ اجلاسوں میں بوسنیا کی نام نہاد "نئی حقیقتوں" کے پیش نظر اپنے اخبار کے کردار کے سوال پر بحث کی ہے۔ ہمارا متفقہ فیصلہ تھا -- اور اسے اخبار کے اداریے میں شائع بھی کیا گیا -- کہ بوسنیا پر خواہ کسی قسم کا علاقائی بٹوارا یا آئینی بندوبست کیوں نہ نافذ کر دیا جائے، معروضیت اور صاف گوئی کے کچھ پیشہ ورانہ معیارات، اور رواداری اور بقائے باہم کی چند ایسی اقدار، موجود ہیں جن کی حفاظت کے لیے جدوجہد کرنا ہمارا منصب ہے۔

اس لیے نہ صرف "آزادی" کے صفحات پر ان معیاروں اور قدروں کی وکالت جاری رہے گی بلکہ اس کے ادارتی عملے میں مختلف نسلوں اور مذہبوں کے تعلق رکھنے والے افراد کی شراکت سے بھی ان قدروں کی اہمیت کا اظہار ہوتا رہے گا۔ مسلمان، سرب، کروٹ، یہودی یا کچھ بھی ہونے کی آزادی کے ساتھ ساتھ ہماری سب سے پہلی اور سب سے اہم شناخت اخبار نویس ہونا ہے۔

Scanned with CamScanner

کمال کرسپاہک

ترجمہ: اجمل کمال

غمناک ترین شہر

میرے سرائیوو میں جو لوگ ایک وحشیانہ ظلم کا شکار ہوئے ان کو عقیدت کا خراج پیش کرنے کا کون سا طریقہ مناسب ہے: لکھنا یا خاموش رہنا؟ پچھلے سنیچر کو پرانے سرائیوو کے قلب میں واقع کلیسا کے پاس بازار میں ہونے والے دھماکے نے ۶۸ افراد کو ہلاک اور دو سو سے زیادہ کو شدید زخمی کر دیا۔

سنگ دل قاتلوں نے اپنی ۱۲۰ ملی میٹر قطر کی توپوں کا رخ دنیا بھر کے غمناک ترین شہر کے افسردہ ترین مقام کی طرف کر دیا: اُس بازار کی طرف جہاں بکنے کے لیے کوئی سامان اور لوگوں کے پاس کچھ بھی خریدنے کے لیے رقم موجود نہیں تھی اور جہاں دل شکستہ بوڑھے لوگ، بچوں والی عورتیں، نہتے شہری، ایسی چیزوں کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتے پھر رہے تھے جنھیں انھوں نے تقریباً دو سال سے نہیں دیکھا تھا۔ یہ بوسنیا کے دارالحکومت کا محاصرہ کیے ہوئے سربیائی فوجیوں کے ہاتھوں شہریوں پر ٹوٹنے والی بلاکتوں میں سب سے زیادہ مہلک تھی۔

جرم کے مقام پر سی این این کے کیمروں نے غصے سے چلّاتے ہوئے لوگوں کے پیغام ریکارڈ کیے: "شکریہ مسٹر بطرس غالی! شکریہ صدر کلنٹن!"

ظاہر ہے یہ لوگ ان دونوں حضرات کو قتلِ عام کا مجرم نہیں ٹھہرا رہے تھے۔ سرائیوو میں بچوں کو بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ انھیں کون قتل کر رہا ہے۔ ذرائع ابلاغ بدحواس ہو کر متواتر اس طرح کی اطلاعات فراہم کرتے ہیں: "مسلمانوں نے سربوں پر الزام عائد کیا ہے اور سرب مسلمانوں کو قصوروار ٹھہراتے ہیں"، جب کہ اس مکروہ خیال کی تائید کرنے کے لیے کوئی ادنیٰ سی واقعاتی شہادت بھی موجود نہیں ہے کہ مسلمان خود اپنے بچوں کو ہلاک کر رہے ہیں۔ لوگوں کی ناراض آوازیں درحقیقت اس بات پر سرائیوو کے شہریوں کے صدمے اور بےیقینی کا اظہار کرتی ہیں کہ جو لوگ ان جرائم کو روکنے کی طاقت رکھتے ہیں وہ ساکت کھڑے تماشا دیکھ رہے ہیں۔ ابھی تین ہفتے بھی نہیں ہوئے، برسلز میں ناٹو کے سربراہی اجلاس میں انتباہ کیا گیا تھا کہ اگر سربوں نے

Scanned with CamScanner

سرائیو کا محاصرہ نہ اٹھایا، یا ٹزلا (Tuzla) کے ہوائی اڈے کو کھولنے کی اجازت نہ دی یا محصور سربرنیکا میں کینیڈین امن فوجیوں کو داخل نہ ہونے دیا تو ان پر فضائی حملے کیے جائیں گے۔

مجھے صدر کلنٹن کے اس انتباہ سے اتفاق ہے کہ ناٹو کے قائدین کو ایسی صورت میں فضائی حملوں کی دھمکی دینے سے گریز کرنا چاہیے جب ان کا اس پر عمل کرنے کا ارادہ نہ ہو۔ لیکن اگر وہ یہ متفقہ بیان جاری کرنے میں سنجیدہ تھے تو انھیں اجلاس ختم ہونے کے اگلے ہی دن عملی اقدام کرنا چاہیے تھا۔ اُس دن سربوں نے شہر پر ایک بار پھر شیل برسائے اور نو شہریوں کو ہلاک کر دیا۔

اس کے علاوہ ذمے دار عالمی قیادت کے سامنے تین اور بھی چیلنج تھے۔

دو ہفتے پہلے سربوں کی جانب سے آنے والے ایک شیل نے مزدور طبقے کے محلّے علی پاشینو پولیے میں فلیٹوں کے ایک بلاک کے پاس کھیلتے چھ بچوں کو ہلاک کر دیا تھا۔

پچھلے جمعے کو سربوں کا ایک اور شیل دوبرینیا (Dobrinja) کے محلّے میں پھٹا، جسے دس برس پہلے موسم سرما کے اولمپک کھیلوں کے سلسلے میں اولمپک ویلج کے طور پر بسایا گیا تھا، اور اس سے آٹھ افراد ہلاک ہوئے جن میں زیادہ تر وہ عورتیں تھیں جو قطار باندھے امدادی سامان حاصل کرنے کی منتظر کھڑی تھیں۔

اور سنیچر کو تو آپ نے دیکھ ہی لیا کہ کیا ہوا۔

محصور سرائیو میں آج کل پیش آنے والی بدترین بات صرف ناٹو کی جانب سے جاری کیا جانے والا بیان یا وہ خط نہیں ہے جو امریکی سیکرٹری آف اسٹیٹ وارن کرسٹوفر نے پچھلے اکتوبر میں سربیائی صدر سلوبودان میلوشےوِچ کے نام بھیجا تھا جس میں محاصرہ جاری رہنے کی صورت میں فضائی حملوں کی دھمکی دی گئی تھی۔ اصل بات اس سے زیادہ بھیانک ہے۔

میرا شہر تین طرفہ سزائے موت کا سامنا کرتے ہوئے زندہ ہے، اور مر رہا ہے۔ پہلی سزا سربیائی بندوق بازوں کی جانب سے عائد کی گئی ہے جو شہری محلوں، بازاروں، اسپتالوں اور بے بس شہریوں کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ دوسری سزائے موت انسانی سطح پر پیش آنے والے مصائب ہیں: دہشت ناک جاڑوں کا دوسرا موسم آ پہنچا ہے اور سرائیو کھڑکیوں کے شیشوں سے محروم، حرارت، غذا، پانی، بجلی اور گیس سے محروم ہے۔ تیسری سزا دنیا والوں کی بے خبری ہے، اس مہذب دنیا کی بے خبری جو صرف ہمارے ختم کیے جانے کا تماشا دیکھنے میں مشغول ہے، ہمارے تحفظ کے لیے کوئی قدم اٹھانے کو تیار نہیں ہے، بلکہ اس کی جانب سے عائد کردہ ہتھیاروں کی ترسیل پر پابندی نے ہمیں خود حفاظتی کے حق سے محروم کر رکھا ہے۔ یہ پابندی، جو جارحیت کا شکار بننے والوں کو اپنی حفاظت کرنے سے روکتی ہے، عالمی برادری کا وہ واحد فیصلہ ہے

جسے بوسنیا میں واقعی نافذ کیا گیا ہے۔

اس شہر اور اس ملک کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ خانہ جنگی نہیں ہے، بلکہ تہذیب کے خلاف، رواداری کے حامل ایک کثیر نسلی، کثیر مذہبی اور کثیر تہذیبی معاشرے کے خلاف جنگ ہے۔ سرائیوو کا محاصرہ اور قتلِ عام کر کے رادووان کراجک اور اس کے سرب ساتھی دراصل اسی تہذیب کو قتل کر رہے ہیں۔ اس وقت جب میں ریاست ہائے متحدہ کے دورے پر ہوں، میرے اخبار "آزادی" کی نائب مدیر نے، جو سرب ہے، میری جگہ سنبھال رکھی ہے۔ ہمارے سرب رپورٹروں اور کالم نگاروں کو بھی یہ اندازہ لگانے میں ذرا دقت نہیں ہوتی کہ اچھے لوگ کون ہیں اور بُرے کون۔

وقت آ گیا ہے کہ مہذب دنیا بوسنیا اور وہاں کے رہنے والوں کا قتلِ عام بند کرائے۔ بے عملی کا مطلب مجرم کی اعانت ہوگا۔ اس رویے سے فسطائیت کی حوصلہ افزائی ہوگی اور اس کے اثرات پورے بلقان اور پورے یوروپ میں پھیل جائیں گے اور "قومی دفاعی مفادات" کی حفاظت آج کے مقابلے میں کہیں زیادہ دشوار ہو جائے گی۔

کیا کیا جا سکتا ہے؟ صرف تین چیزیں، تین لفظوں میں: اٹھانا، مسلح کرنا، حملہ کرنا۔ جارحیت کا شکار ہونے والے ملک پر سے ہتھیار حاصل کرنے پر عائد پابندی اٹھالی جائے تاکہ وہ اپنی حفاظت کرنے کا منصفانہ موقع حاصل کر سکے۔ بوسنیا کے عوام کو مسلح کیا جائے جو یوگوسلاو افواج کے بھاری اسلحے کے وسیع ذخیروں کے ہاتھوں دہشت میں مبتلا ہیں۔ اور اُن مورچوں پر فضائی حملے کیے جائیں جہاں سے سرائیوو اور دوسرے بوسنیائی شہروں پر تقریباً دو سال سے حملے کیے جا رہے ہیں۔ ان اقدامات سے طاقت کا توازن اور امن کے حقیقی مذاکرات کے لیے سازگار ماحول پیدا ہو سکتا ہے۔

بوسنیا کو بلیک میل کر کے طاقت کے ذریعے پیدا کی گئی حقیقتوں کو قبول کرانے سے اس کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا کہ یہ ملک نسل کے اعتبار سے تین ٹکڑوں میں بٹ جائے گا اور نسلی تناؤ، تشدد اور "خالصیت" کے اعمال آنے والے برسوں میں بھی جاری رہیں گے۔

**

Scanned with CamScanner

کمال کرسپاہک

ترجمہ: اجمل کمال

"قیامِ امن" کی بند گلی

سربیا کے دارالحکومت بلغراد پر -- جہاں بوسنیا کی خوں ریزی کا منصوبہ پہلے پہل تیار کیا گیا تھا -- سکون کا احساس طاری ہے: یوگوسلاویا کی باقیات پر عائد بین الاقوامی پابندیاں نرم کردی گئی ہیں۔ بلغراد کی سڑک پر کھڑا ایک نوعمر لڑکا سی این این کو بتاتا ہے: "یہ ہمارے لیے اچھے دنوں کا آغاز ہے۔"

دریں اثنا، بوسنیا کا دارالحکومت سرائیوو -- جو پچھلے ڈھائی برس سے ایک غیرانسانی محاصرے کے شکنجے میں ہے، جس کے دوران دس ہزار افراد (جن میں ۸۵ فیصد غیر فوجی تھے) قتل کیے جا چکے ہیں -- شدید مصائب کے دوران اپنے تیسرے موسم سرما کی طرف بڑھ رہا ہے: سربیائی فوج بجلی، پانی، گیس اور خوراک تک کی رسائی بار بار کاٹ دیتی ہے، جب جی چاہتا ہے شہر کی طرف آنے والی تمام سڑکیں بند کر دیتی ہے۔ اقوامِ متحدہ کی "حفاظت" میں واقع سرائیوو ایرپورٹ کی طرف جانے والی سڑک بھی بہت خطرناک ہے۔

"یہ ہمارے بدترین دنوں کا آغاز ہے،" میرے اخبار کے ایک ساتھی کارکن نے مجھے سرائیوو سے، کبھی کبھار خوش قسمتی سے مل جانے والی سٹیلائٹ ٹیلی فون لائن پر بات کرتے ہوے، بتایا۔ بوسنیا کے دارالحکومت کا ٹیلی فون پر باقی دنیا سے رابطہ ختم ہوے دو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ منقسم خاندانوں کے افراد فون پر ایک دوسرے کی آواز سن لینے کی تسکین سے بھی محروم ہیں۔

جارحیت کے دارالحکومت میں تسکین کا احساس اور مظلومیت کے دارالحکومت میں یاس کا احساس، یہ دونوں "بوسنیا میں قیامِ امن" کے اس عمل کا براہِ راست نتیجہ ہیں جو پچھلے موسم گرما میں نیپلز میں ہونے والی سربراہی کانفرنس میں بڑی تشہیر کے ساتھ شروع کیا گیا تھا۔ "گروپ آف سیون" سے تعلق رکھنے والے دنیا کے چھ سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملکوں (اور روس) پر مشتمل رابطہ گروپ کے اس اجلاس میں "بہترین پیشکش" تیار کی گئی اور کہا گیا کہ جی چاہے تو قبول کر لو، ورنہ

چھوڑ دو۔

حکومت بوسنیا، اور حال ہی میں قائم ہونے والی بوسنیا اور کروشیا کی فیڈریشن، نے اس آخری تجویزِ امن کو قبول کر لیا۔ انھوں نے یہ فیصلہ خاصے تذبذب کے ساتھ کیا کیوں کہ اس تجویز میں بوسنیا کا ۵۱ فیصد علاقہ فیڈریشن کے لیے چھوڑ کر باقی حصہ سربیائی یونٹ کو دے دیا گیا تھا اور یوں سربوں کو قتلِ عام، نسلی خالصیت کے افعال، اور علاقے پر بزور قبضہ کر لینے کے عمل کا انعام عطا کیا گیا تھا۔ لیکن بوسنیائی سربوں نے اس تجویز کو اب تک قبول نہیں کیا۔

اور اس نکتے پر آ کر بوسنیا کے معاملات سلجھانے والوں کی تمام قائدانہ صلاحیت اور عزم ہوا میں غائب ہو گیا۔ سلامتی کاؤنسل نے سربیا پر عائد پابندیاں نرم کرنے کے حق میں فیصلہ کیا کیوں کہ سلوبودان میلوشیوچ نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ بوسنیائی سربوں کی دی جانے والی فوجی امداد منقطع کر رہا ہے، جب کہ اقوامِ متحدہ کے مبصرین بوسنیا کے سرب مقبوضہ علاقے اور سربیا کے درمیان ہر رات چکر لگانے والے سیکڑوں ہیلی کاپٹروں کی رپورٹیں متواتر بھیج رہے تھے اور امریکی انٹیلی جنس بھی سربیا کی جانب سے "سامان" کی فراہمی کی اطلاعات دے رہی تھی۔ سربیا پر پابندیاں نرم ہونے کے بعد بوسنیا میں موجود سرب فوجوں نے سرائیوو کے گرد اپنا پھندا اور سخت کر دیا۔ حملہ آور کو انعام دیا گیا اور حملے کا شکار ہونے والے کو مزید سزا دی گئی۔

خاتمے کی طرف بڑھتی ہوئی صدی میں قائم "نیو ورلڈ آرڈر" کی یہ ایک مایوس کن تصویر ہے۔ سرائیوو میں محاصرے کے دوران گزرنے والے دو جاڑے جہنم سے کم نہ تھے۔ اس بار، تیسرے جاڑوں میں، صورتِ حال پہلے سے بھی زیادہ اذیت ناک ہو گی۔

جاڑوں کے وہ دو موسم میں نے اُسی سرائیوو میں گزارے تھے جو کبھی سرمائی اولمپک کھیلوں کا حسین شہر تھا اور اب سربیائی شیلنگ اور اسنائپر فائرنگ کا مستقل نشانہ بنا ہوا تھا۔ میرا فلیٹ کھڑکیوں سے، بجلی اور پانی سے، جما دینے والی ٹھنڈ میں حدّت پیدا کرنے والی ہر چیز سے محروم تھا۔ لیکن امید باقی تھی کہ باہر کی دنیا سے کوئی -- یورپ، امریکا، ناٹو -- آ کر اس خوں ریزی اور تکلیف کو ختم کر دے گا۔

اس بار شیلنگ رکی ہوئی ہے، کیوں کہ فروری میں ناٹو نے سربوں کو الٹی میٹم دے دیا تھا کہ سرائیوو کے ارد گرد سے اپنا بھاری توپ خانہ ہٹا لیں۔ لیکن شہر کا گلا پہلے سے زیادہ منظم طریقے سے گھونٹا جا رہا ہے۔ اور بد ترین بات یہ ہے کہ اب امید ختم ہو چکی ہے۔ یہاں تک کہ "قیامِ امن" کا غیر منصفانہ عمل بھی، جس کا مقصد ملک کا بٹوارا کر کے حملہ آوروں کو ٹھنڈا کرنا تھا، اندھی گلی میں جا پھنسا ہے۔ بیرونی دنیا کی جانب سے کوئی نیا اقدام سامنے نہیں آ رہا۔ صرف ایک بین

الاقوامی حد بوسنیا پر اب تک نافذ ہے: کہ ہتھیاروں کی رسد پر پابندی نہیں اٹھائی جائے گی، جارحیت کا شکار ہونے والے ملک کو اپنی مدافعت کا حق ہر گز نہیں دیا جائے گا۔

عالمی برادری جس نے بوسنیا کو آزاد ملک کی حیثیت سے اپریل ۱۹۹۲ میں تسلیم کر لیا تھا، اس نے تباہی کو بے روک ٹوک جاری رکھنے کی اجازت بخوشی دے دی ہے: قتل، شہریوں کے ساتھ دہشت گردی، لوٹ مار اور پورے پورے شہروں کی تاراجی، پورے پورے شہر کی عورتوں کے ساتھ جبری زنا، پورے پورے علاقوں میں نسلی خالصیت کے حربوں کا استعمال، سرب مقبوضہ شہروں، مثلاً بنالوقا اور بیےلینا، میں سربوں کے ہاتھوں مسلمانوں پر عائد کیا جانے والا "آخری حل" - اس تباہی کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا جاتا کیوں کہ اقوامِ متحدہ کی مسخ شدہ منطق کہتی ہے کہ حملہ کرنے والوں اور حملے کا شکار ہونے والوں کے درمیان "غیر جانبداری" برقرار رکھی جائے۔

لیکن یہ محض غیر جانبداری نہیں ہے۔ اسلحے کی رسد پر پابندی برقرار رکھ کے، بوسنیا کو اپنا دفاع کرنے کے حق سے محروم کر کے، دنیا نے بربریت اور دہشت گردی کا شکار ہونے والے کے ہاتھ پشت پر باندھ رکھے ہیں۔

ابھی کچھ دن پہلے تک بوسنیا کے باشندوں کو تھوڑی بہت امید تھی کہ اسلحے پر سے پابندی ہٹا لی جائے گی اور انہیں اپنے ملک کا دفاع کرنے اور شاید مقبوضہ علاقوں کو آزاد کرانے کی اجازت مل جائے گی۔ اس امید کا منبع واشنگٹن میں تھا: امریکی کانگریس کے دونوں ایوانوں نے ۱۹۹۴ کے موسمِ گرما میں صدر کلنٹن سے مطالبہ کیا تھا کہ اسلحے پر سے پابندی ختم کرائی جائے اور ضرورت ہو تو یک طرفہ طور پر اسے خود ختم کر دیا جائے۔ اس پر کلنٹن نے اعلان کیا تھا کہ اگر سربوں نے "قیامِ امن کی تجویز" ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۴ تک قبول نہ کی تو سلامتی کاؤنسل میں پابندی ہٹانے کی قرارداد پیش کی جائے گی۔ اب امید کی یہ رمق بھی دم توڑ چکی ہے۔ برطانیہ اور فرانس نے دھمکی دی کہ اگر پابندی ہٹائی گئی تو دونوں ملک اپنے فوجی بوسنیا سے واپس بلا لیں گے اور اس دباؤ سے مجبور ہو کر حکومتِ بوسنیا نے اس قرارداد کو چھ مہینے کے لیے ملتوی کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔

"میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ امریکا یک طرفہ طور پر کوئی اقدام کرے گا،" کلنٹن نے ابھی پچھلے ہفتے بیان دیا ہے۔ ظاہر ہے اُسے اس بات پر خاصی تسکین محسوس ہوئی ہو گی کہ بلیک میلنگ کا شکار ہونے والی حکومت بوسنیا نے پابندی فوراً اٹھا لینے پر اصرار نہیں کیا۔

بوسنیا کا مسئلہ حل کرنے کے لیے دنیا کے پاس اب کوئی اقدام باقی نہیں رہا، نہ "قیامِ امن" کا کوئی نیا منصوبہ ہے، اور نہ کوئی امید باقی بچی ہے۔ اور یوں اگلے کئی برسوں کے کشت و خون کے لیے اسٹیج پوری طرح تیار ہے۔ سرب اپنے مقبوضہ علاقے اپنے پاس رکھ کر "گریٹر

Scanned with CamScanner

سربیا" تخلیق کرنا چاہتے ہیں اور بوسنیا کے باشندوں کے پاس آخری آدمی تک اپنے گھروں اور شہروں کے دفاع کے لیے لڑنے کے سوا کوئی راستا نہیں ہے۔ اقوام متحدہ کی فوج کے برطانوی کمانڈر جنرل مائیکل روز کی یہ بدنما دھمکی بھی کہ اگر بوسنیا کے لوگوں نے سرائیوو شہر کا محاصرہ توڑنے کی کوشش کی تو وہ ناٹو سے حملہ کران پر بمباری کرائے گا، سرائیوو والوں کو اپنے بقا کی ناگزیر جنگ لڑنے سے نہیں روک سکے گی۔

یقیناً عالمی برادری کے پاس اس سے بہتر متبادل اقدامات بھی موجود ہیں۔ حملہ آوروں کو راضی رکھنے کی کوششوں کے بجائے دنیا اس ابتدائی کامیابی کو اپنے اگلے اقدامات کی بنیاد بنا سکتی ہے کہ بوسنیا اور کروشیا کی فیڈریشن قائم ہو گئی ہے جس کے نتیجے میں بوسنیائیوں اور کروٹوں کے درمیان لڑائی رک گئی ہے۔ وہ سربوں کو واضح الٹی میٹم دے سکتی ہے: اس فیڈریشن کو تسلیم کرو جس پر بوسنیا اور کروشیا کے لوگ متفق ہو گئے ہیں، ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

یہ نتائج کئی قسم کے ہو سکتے ہیں۔ اقتصادی نتائج: کہ سربیا پر عائد پابندیاں نرم نہ کی جائیں۔ سفارتی نتائج: کہ طاقت کے ذریعے ہتھیائے گئے علاقوں اور تبدیل کی گئی سرحدوں کو ہرگز ہرگز کبھی تسلیم نہ کیا جائے۔ فوجی نتائج: کہ بوسنیا کے "محفوظ علاقوں" کو ایئر فورس کا تحفظ فراہم کیا جائے اور اسلحے کی فراہمی پر عائد پابندی، جس نے بوسنیا کی فوج کو مسلح ہونے سے روک رکھا ہے، ہٹالی جائے۔

لیکن ان متبادل اقدامات پر عمل کرنے کے لیے قائدانہ صلاحیت کی ضرورت ہو گی۔ اور ہم بوسنیا کے رہنے والوں کو "سرد جنگ کے بعد کی دنیا" میں یہ صلاحیت کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ دنیا کی موجودہ قیادت کی ہلکی سی جھلک صرف تب دکھائی دیتی ہے جب رابطہ گروپ کے ارکان جمع ہو کر تصویر کھنچوانے کے موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم سے مخاطب ہو کر اپنے عزم کا اظہار کرتے ہیں: "جی چاہے تو قبول کر لو، ورنہ چھوڑ دو!" تصویر کھینچی جا چکی ہے۔ اور یہ ایک مایوس کن تصویر ہے۔

**

ترجمہ: اجمل کمال

سرائیوو یاد ہے؟

پچھلی جمعرات کی شب ہم نے ریڈیو پر سنا کہ ناٹو کے طیاروں نے سرائیوو کے آس پاس کسی جگہ ایک اَور ہوائی حملہ کیا ہے۔ باتو جوینک نے کسی غیر ملکی ریڈیو اسٹیشن پر یہ خبر سنی اور ہمیں تفصیل بتائی۔ باتو Silent Gunpowder نامی فلم کا ڈائرکٹر ہے جو جنگ شروع ہونے سے ذرا پہلے بنی تھی اور جس میں بڑی درستی کے ساتھ وہ سب کچھ دکھایا گیا تھا جو اُس وقت تک پیش آچکا تھا، اور وہ بھی جو آگے چل کر ہونے والا تھا۔

ہمیں یہ خبر آشاز میں ملی جو اصل میں انڈمی کیفے کہلاتا ہے۔ وہیں ہم نے یہ بھی سنا تھا کہ اقوامِ متحدہ کی حفاظتی فوج اور رادووان کراجک کی ملیشیا کے سپاہیوں میں جھڑپ ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے ایک فریق نے دوسرے پر حملہ کر دیا تھا۔ سرائیوو یا یہاں کے رہنے والوں پر حملہ اس جھڑپ کا سبب نہیں تھا: ان کے لیے کون میدان میں اُترتا ہے!

ہمارا ایک بےمثال آرٹسٹ عفان رامک تلخی سے، منھ ہی منھ میں، بڑبڑاتا ہے: "یہ لوگ کہیں اَور جا کر مَردوں کی طرح کیوں نہیں لڑتے؟ ہمارے سر پر کیوں سوار ہیں؟ ہمارا جینا حرام کر دیا ہے!" اجنبیوں کے درمیان ان جھڑپوں پر سرائیوو ذرا دھیان نہیں دیتا، کیوں کہ اس سے ہماری حالت میں کچھ بھی فرق نہیں آتا، جیسے ان اجنبیوں کی موجودگی سے کافی دنوں سے کچھ فرق نہیں پڑا۔ ہم نے مدت ہوئی اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ یہاں موجود کسی چیز کا، ماسوا ہماری اپنی ابتلا کے کسی چیز کا، ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ مہینوں سے ناٹو کے پائلٹوں نے فقط اتنا کیا ہے کہ سرائیوو کے اوپر طیارے اُڑا اُڑا کر انجنوں کی تیز آواز سے سارے کبوتروں کو بھگا دیا ہے جو ہمارے قلیل مگر مل جل کر کھائے جانے والے کھانے کا ایک آدھ ٹکڑا پانے کی امید میں آ بیٹھتے تھے۔

کچھ بھی ہو، ناٹو کے اِس طرح کبھی کبھار یہاں وہاں ایک آدھ بم گرا دینے سے کچھ بھی فرق

Scanned with CamScanner

نہیں پڑا ہے۔ ابھی دو ایک دن پہلے کوئی شخص ناٹو کے ہوائی حملوں سے ہونے والے مجموعی نقصان کا اندازہ لگا رہا تھا: گورازدے کے قریب ایک چھوٹا سا مورچہ اور دو پُرانے فوجی ٹرک، دوسری جنگ عظیم کے زمانے کا ایک ہاف ٹریک (جو یوں بھی میوزیم میں رکھنے کے لائق تھا) اور فقط ایک ٹی ۵۵ ٹینک۔ بس۔ گورازدے کے نواح میں گرائے گئے تین بم پھٹے تک نہیں۔ ہم سرائیوو کے باشندے جنگی حکمت عملی کے ماہر حساب داں نہ بھی ہوں، مگر اتنے تھوڑے سے نقصان کی یہ قیمت ہمیں بہت زیادہ لگتی ہے۔

شاید ریڈیو پر ہم سرائیوو والوں کے بارے میں کوئی اہم بات کہی گئی ہو۔ شاید باہر، اتنی بڑی دنیا میں، کسی نے کسی دوسرے سے ہماری مدد کے لیے کچھ کرنے کا ایک بار پھر وعدہ کیا ہو۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں، کیوں کہ ہمیں دوسری چیزوں کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ سورج ابھی تک تھوڑی بہت کمزور سی شعاعیں پھینکتا ہے، لیکن شہر کے اوپر کوہ اگمان پر پہلی برف پڑ چکی ہے۔

شہر کا کوئی شخص اس کے بارے میں زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکالتا، مگر کسی کے ذہن میں اس کے سوا کوئی بات نہیں ہے۔ اور برف باری ہو گی اور کہر اچھانے لگے گا، اور ہم سرد موسم میں اپنی بے چارگی جھیلنے کے لیے تنہا ہوں گے۔ ہمیں آنے والی ابر آلود صبحوں کی راہ دیکھنے، زبردستی آنکھیں کھول کر ایک نئے، ٹھٹھرتے ہوئے دن کا سامنا کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا گیا ہے۔ میرے نو سال کے بیٹے نے اس ہفتے، سرائیوو کی چند بچی کھچی، کھڑکھڑاتی ٹیلیفون لائنوں میں سے ایک پر مجھ سے بات کرتے ہوئے کہا: "یہ تیسری سالگرہ ہے جو آپ کے بغیر منا رہا ہوں۔ ہر بار آپ وعدہ کرتے ہیں کہ آجاؤں گا۔" میرا بڑا بیٹا، جو اب نوجوانی کی حدود میں داخل ہو رہا ہے، کہتا ہے: "فکر مت کیجیے بابا، میں سمجھتا ہوں۔" میری بیوی کچھ نہیں بولتی۔ وہ طیش میں ہے۔

کیا مجھے اس بات پر خوش ہونا چاہیے کہ میرا بڑا بیٹا سمجھتا ہے؟ کہ یہ چودہ برس کا لڑکا بہت اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اس کا مطلب ہے، اسے معلوم ہے کہ وہ اب سرائیوو کا شہری نہیں رہا، کہ وہ معاف کر دینے کے معنی بھولتا جا رہا ہے، کہ بہت جلد وہ نفرت سے بھی واقف ہو جائے گا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ اُس مکروہ دنیا کا حصّہ بنتا جا رہا ہے جو سرائیوو کے باہر واقع ہے، اُس دنیا کا جس سے سرائیوو کا اب کوئی رشتہ نہیں رہا اور جس پر بھروسا کرنا اب اِس شہر نے ترک کر دیا ہے۔

سرائیوو کو ٹھیک اسی وجہ سے تنہا چھوڑ دیا گیا ہے کہ یہ شہر نفرت سے ناواقف ہے: اسی لیے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ پوپ کو یہاں کا دورہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ ہمیں اپنے اعمال پر توبہ کرنے اور بخشش کی التجا کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ خدمت انجام دینے کے

لیے پوپ کو نیویارک، جنیوا، برسلز، پیرس، لندن اور ماسکو کا دورہ کرنا چاہیے۔ وہاں کی روحوں کو نجات دلوانے کی ضرورت ہے۔ مگر بد قسمتی سے ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ ہمارے بچوں کو، جو سمجھنے لگے ہیں، ایک دن اپنے اعمال کی بخشش کی ضرورت پڑے گی۔

ہمیں دعائیں نہیں چاہییں۔ ہم صرف اُس لمحے کے منتظر ہیں جب اقوام متحدہ کی فوج کے کمانڈر لیفٹننٹ جنرل سر مائیکل روز سرائیوو شہر پر بمباری شروع کریں گے۔ آخر ان کے پاس اس امر کے لیے ہدایات موجود ہیں۔ ان ہدایات کی رو سے حکومتِ بوسنیا کی ناقص طور پر مسلح فوجیوں کی جانب سے جنگ بندی کی خلاف ورزی کی کوشش اُتنی ہی نامناسب بات ہے جتنی کراجک کے بھاری توپوں کا، جنھوں نے شہر کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، اس جنگ بندی کے چیتھڑے اُڑا دینا۔ ہمیں پہاڑیوں پر تاک میں بیٹھے اُن درندوں کے مساوی قرار دینے کی ہر طرح سے کوشش کی جا رہی ہیں۔ جس سے مراد یہ ہے کہ قتلِ عام، جُرم اور جارحیت کے پورے قضیے کو کسی طرح بھُلا دیا جائے، اور ہمیں کھینچ کر ہمارے بے پناہ طاقتور جارح دشمن کے سامنے کھڑا کر کے اعلان کر دیا جائے کہ "تنازعے کے دونوں فریق یکساں طور پر مسلح ہیں،" خواہ ہمارے فوجی عملاً بالکل نہتے ہوں۔ اور جب یہ کام پورا ہو جائے تو ناٹو کے طیارے ہم پر بمباری کرنے کے لیے آ پہنچیں۔

بے چارہ جنرل روز! لگتا ہے اُسے اب تک ہدایتوں کے اصل منشا کا اندازہ نہیں ہوا۔ بہتر ہوتا کہ وہ بھی آشاز میں ہمارے ساتھ آ بیٹھتا، جہاں ہم بیٹھے اپنے اگلے دن کا پروگرام بنایا کرتے ہیں: پہلے پانی کی تلاش میں نکلیں یا سرائیوو کے مشہورِ عالم تخیلی مصوّر براکو دمتریےوِچ کی نئی نمائش دیکھنے جائیں؟ آیا اُس تصویر سے دل بہلائیں جس میں بائیسکل اور آلو کی علامتیں استعمال کی گئی ہیں، یا فرینچ بک اسٹور پر جا کر، جہاں نیویارک، میڈرڈ اور پیرس سے نئی کتابیں آئی ہیں، مشروب پییں؟

سچّی بات یہ ہے کہ آج کل کسی کتاب پر ہماری نظر پڑتی ہے تو پہلا خیال یہ آتا ہے کہ ایک روز اسے جلا کر کھانا پکانے کے لیے استعمال کرنا پڑے گا، اور دوسرا یہ کہ جب ریڈیو کی نشریات سنائی دینا بند ہو جائیں گی تو یہ کتاب ساتھ دے گی۔ اور جب کتابیں نایاب ہو جاتی ہیں، ہم دور سے پانی لا کر فارغ ہو جاتے ہیں اور اندھیرا چھا جاتا ہے تو ہم سرائیوو کی نواحی پہاڑیوں پر کراجک کے مسلح جوانوں اور اقوامِ متحدہ کے فوجیوں کی ایک دوسرے پر بے معنی گولاباری کی آوازیں سنا کرتے ہیں۔ اور ان خبروں سے دل بہلاتے ہیں کہ جنرل روز اپنے بمبار طیاروں کا رخ ہماری جانب موڑنے پر غور کر رہے ہیں، کیوں کہ آخر ہم اور ہمارا اقوی دشمن مساوی حیثیت رکھتے ہیں!

Scanned with CamScanner

یہ بات، کہ ہم پر بمباری کی جانے والی ہے، ہمیں ذاتی طور پر آزردہ نہیں کرتی۔ جو بات ہماری جلد کو پھاڑ کر ہمیں زخمی کر دیتی ہے وہ یہ ہے کہ جنرل روز ہمیں ہمارے دشمن کے مساوی سمجھتا ہے۔ ہم اُس کے بمباری کے مشن کی کوئی خاص مزاحمت بھی نہیں کریں گے؛ ہم اُسے بھی اسی طرح سہہ لیں گے جیسے اب تک ہر ہولناک چیز کو جھیلتے چلے آئے ہیں۔ لیکن یہ بات واضح کرنے کی ہمیں بہت بے تابی ہے کہ ہم اُن جیسے نہیں ہیں جو پہاڑیوں پر گھیرا ڈالے بیٹھے ہیں، جن کے مشغلوں میں عورتوں اور بچّوں کو ہلاک کرنا، اور جب جی چاہے پانی، بجلی اور گیس بند کر دینا شامل ہے۔

ہم اور وہ ایک جیسے نہیں ہیں۔ ہم اُن جیسے کبھی نہیں تھے، اور نہ کبھی ہوں گے۔ ہم کافی کی میز پر، یا نمائش میں، جنرل روز کو سامنے بٹھا کر یہ بات سمجھانا چاہتے ہیں، میدانِ جنگ میں اُتر کر نہیں۔ لیکن اگر اُسے یہی جگہ موزوں معلوم ہوتی ہے تو ہم اس کے لیے بھی تیار ہیں۔ مگر اس سے پہلے ہمیں اُس کی طرف سے اتنی اجازت تو ملنی چاہیے کہ پیدل چل کر دور پانی حاصل کرنے کی جگہ تک پہنچ سکیں اور وہاں لمبی قطاروں میں کھڑے ہو کر اپنی بوتلوں میں پینے کا پانی بھر لیں، کیوں کہ کراجک اور اس کے دوست چاہتے ہیں کہ ہمیں پانی اسی طرح ملے۔ پھر ہمیں اُس کی طرف سے جنگل سے کچھ لکڑیاں چننے کی بھی اجازت ملنی چاہیے تاکہ ہمیں اپنی بچی کھچی کتابوں کو نہ جلانا پڑے۔

جب وہ ہمارے ان کاموں سے فارغ ہونے کا انتظار کر رہا ہو تو کیا بُرا ہے کہ وہ اس وقفے کے دوران نمائش میں جا کر بائیسکل، آکو اور کافکا والی تصویریں دیکھ ڈالے۔ ہم بڑی خوشی سے اسے سمجھائیں گے کہ یہ بائیسکل اور آکو ہمارے لیے کیا معنویت رکھتے ہیں اور کافکا وہاں کیا کر رہا ہے۔ درحقیقت اُسے نمائش تک جانے کی بھی ضرورت نہیں۔ ہم اُسے ابھی، اِسی وقت سمجھا سکتے ہیں کہ ان سب چیزوں کا کیا مطلب ہے، کیوں کہ یہ سب کچھ جو ہمارے اردگرد ہو رہا ہے، ہمارے اپنے تخیل پر مبنی ایک جیتی جاگتی نمائش ہی تو ہے۔ آخر ہم سب سرائیوو کے باشندے تخیلی مصوّر ہی تو ہیں۔ جن لوگوں کو اس بات پر یقین نہیں آتا وہ خود آ کر ہمیں دیکھ سکتے ہیں، بشرطے کہ اُن کے ذہن سے یہ بات محو نہ ہو چکی ہو کہ سرائیوو شہر کہاں واقع ہے۔

**

Scanned with CamScanner

زلاتکو دِزدارے وِچ

ترجمہ: اجمل کمال

اقوامِ متحدہ ختم ہو چکی ہے

یہ بات ظاہر ہے کہ بڑی بڑی خوش فہمیوں کا وقت گزر چکا ہے۔ جیسا کہ کوئی شخص کہہ سکتا ہے: کوئی شے ویسی نہیں رہی جیسی پہلے ہوا کرتی تھی اور کوئی شے اب کبھی پہلے جیسی نہیں ہو گی۔

بہت سی کتابیں، ہم جن کی ورق گردانی یا مطالعہ کیا کرتے تھے، اب ازکاررفتہ ہو گئی ہیں۔ آج ہم جن تصوّرات کے تحت زندہ ہیں وہ کچھ اَور ہیں، ہماری قدریں بدل گئی ہیں، اور ہمارا تجربہ بالکل نیا ہے۔

وہ سب کچھ ہم جس کی تحسین کرتے تھے، جس پر ایمان رکھتے تھے، جس سے امیدیں باندھتے تھے، اب کسی نہ کسی طور مضحکہ خیز بن کر رہ گیا ہے۔ آج کی زندگی میں چیزوں کی نئی ترتیب کچھ ایسی ہے کہ ہمیں اپنی اُس معصومیت پر حیرت ہونے لگی ہے جس کے ساتھ ہم نام نہاد عظیم خیالوں، اونچے اصولوں، وسیع اداروں، لوگوں اور تنظیموں پر یقین کیا کرتے تھے۔

اُن دنوں ہم سوچا کرتے تھے کہ دنیا کا نظام اس بنیاد پر وجود رکھتا ہے کہ انصاف قائم کیا جائے اور ناانصافی کے خلاف جدوجہد کی جائے۔ اس نظام میں نیویارک کے ایسٹ ریوَر کے کنارے قائم وہ شیشے کی عمارت گویا زمین پر چیزوں کی مستحکم ترتیب، یا کم سے کم ایسی ترتیب کو وجود میں لانے کی سچی خواہش، کا ثبوت تھی۔ یہ اَور بات ہے کہ کبھی کبھار "وہ شے" اغراض کی پرچھائیوں میں چھپ جایا کرتی تھی۔

"وہ شے" اقدار کے ایک نظام کا حصہ تھی جس کی بنیاد "فطری انصاف" کے اصولوں پر تھی جنھیں فطری ہی سمجھا جاتا تھا اور ساری دنیا انھیں تسلیم کرتی تھی۔ اس لحاظ سے ہمارا خود کو بعض معاملات میں محفوظ تصوّر کرنا خاصی منطقی بات لگتی تھی کیوں کہ ہمیں معلوم تھا کہ اُس عمارت میں "وہ شے" موجود ہے۔

بچپن میں اپنے ساتھیوں کے درمیان میں نے خود کو سب سے زیادہ اونچا اور "اہم" اُس وقت

Scanned with CamScanner

سمجھا تھا جب میرے والد اقوامِ متحدہ کے ایک فوجی مشن میں شامل ہو کر سینائی گئے تھے۔ یہ واقعی بڑی زبردست بات تھی۔

بعد میں، جب میں پہلی بار نیویارک گیا تو میں نے اپنے سفر کا ایک پورا دن اس محترم عمارت کی سیر کے لیے وقف کیا جو ایسٹ ریور کے کنارے قائم تھی۔ میں اپنی زندگی کے اہم ترین دن کا بے تابی اور شوق سے انتظار کر رہا تھا جب میں اُس ہال میں داخل ہوں گا جہاں جنرل اسمبلی کا اجلاس ہو رہا ہو گا۔

آج اقوامِ متحدہ کے بارے میں ہمارے تمام تصورات ملبے کا ڈھیر بن چکے ہیں۔ بلکہ ملبہ بھی نہیں، کچھ نہیں۔ بس ایک خلا ہے اور بے اعتنائی۔ غصہ تک نہیں۔

اس کے بجائے ہمیں اس پر تھوڑا سا رحم آتا ہے اور ذرا سی حقارت محسوس ہوتی ہے۔۔ اتنی بے مقدار اور ہیچ، پھر بھی اسے یقین ہے کہ وہ کسی کو اپنے اثر یا رعب میں لا سکتی ہے!

ہم سرائیوو کے باشندوں کے لیے ایسٹ ریور کے کنارے پر بنی ہوئی عمارت در حقیقت معدوم ہو چکی ہے۔ اس کی باقیات غم ناک اور قابلِ رحم ہیں۔ صرف چند افراد ہیں جو نہ کوئی نقطۂ نظر رکھتے ہیں اور نہ ریڑھ کی ہڈی، ان کے پاس نہ وقار ہے اور نہ کسی بات پر افتخار، نہ سیاسی بصیرت ہے اور نہ بنیادی انسانی جرأت۔ ان کے پاس اگر کچھ ہے تو بیورو کریسی کے طور طریقوں میں ملفوف اپنے چھوٹے چھوٹے، شرم ناک مفاد ہیں اور ایک اذیت پسندانہ فلسفہ ہے جس کی رو سے لازم آتا ہے کہ دنیا میں کبھی کسی جگہ کوئی ٹھوس قدم نہ اٹھایا جائے۔

ہمارے لیے یہ کسی دوسرے سیارے پر بسنے والی بے حقیقت مخلوق ہے جو بے حقیقتی پر بنی اپنے وجود کو قائم رکھے ہوئے ہے کیوں کہ بے حقیقتی ہی وہ درجہ ہے جہاں یہ مخلوق سبزیوں کی طرح زندہ رہ سکتی ہے۔ سرائیوو کے رہنے والوں کے لیے واحد قابلِ فہم توضیح یہی ہے۔ اور اس میں تعجب کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

ہم اپنا سب کچھ کھو چکے ہیں لیکن وہ چیز ہم نے بچا رکھی ہے جس کے بغیر کوئی خوددار شخص زندہ نہیں رہ سکتا: ریڑھ کی ہڈی، وقار، اور انتخاب کی آزادی۔ ان لوگوں نے، اقوامِ متحدہ کی باقیات نے، اسی چیز کو ایک حقیر مفاد، ذرا سے منافعے اور ایک جھوٹے داخلی امن کے بدلے میں فروخت کر دیا۔ سرائیوو میں بچے یہ بات جان چکے ہیں اور اب نیلی وردی والے سپاہیوں کے پیچھے یوں نہیں دوڑتے جیسے پہلے دوڑا کرتے تھے، اُس وقت جب نیلی وردی والوں کو باعزت اور بہادر لوگ سمجھا جاتا تھا۔

میں نہیں مان سکتا کہ آج سرائیوو میں کوئی واحد شخص ایسا ہے جو ایسٹ ریور کے کنارے

Scanned with CamScanner

واقع اُس عمارت کی سیر کرنا چاہے گا۔ اس لیے نہیں کہ وہاں کچھ ڈرپوک لوگ بیٹھے ہیں جو کچھ نہیں کر رہے۔ بلکہ محض اس لیے کہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے "وہ شے" ہی معدوم ہو چکی ہے۔ "وہ شے" اُس ماضی کا حصّہ ہے جہاں سفید اور سیاہ کو یوں ڈھٹائی کے ساتھ گڈمڈ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یا کم سے کم ہمیں ایسا ہی لگتا تھا۔

اقوامِ متحدہ کو بنیادی انسانی انصاف اور پست منافع اندوزی کے درمیان انتخاب درپیش ہوا اور اس نے موخرالذکر کا انتخاب کیا، اور یوں خودکشی کر لی۔ اِس طرف یا اُس طرف کے گروہی مفادات کسی دوسری طرح بھی اس کا قصّہ پاک کر سکتے تھے، مگر اب ہمیں اس سے کچھ سروکار نہیں رہا۔ ہمیں صرف "اس شے" کے مٹ جانے کا رنج ہے۔ اور تھوڑا بہت رنج ہمیں اس بات کا بھی ہے کہ ہم نے اس سے اتنی امیدیں اور اتنی نیک خواہشات وابستہ کر رکھی تھیں۔ یہ قوموں کی تنظیم نہیں رہی، یہ گھٹیا سیاسی جیب کتروں کی تنظیم ہے۔

سرائیوو میں کوئی بچّہ اب اس بات پر فخر نہیں کرے گا کہ اس کے باپ نے اقوامِ متحدہ کے کسی مشن میں حصّہ لیا تھا۔ اس کے لیے اپنے ساتھیوں کے سامنے نظریں اٹھانا مشکل ہو جائے گا۔

اور یہ خاتمہ ہے۔ اور ذرا سا افسوس۔ پُرانے دن کتنے اچھے تھے جب ہمیں یہ خوش فہمی تھی کہ دنیا میں ایک طاقت ایسی موجود ہے جو زمین پر سچ کو فتح مند کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ تب محسوس ہوتا تھا کہ ہم دنیا میں اکیلے نہیں ہیں۔

**

Scanned with CamScanner

ایرینا اور چڑیوں کا شور کے بعد

ذی شان ساحل

کی نظموں کا تیسرا مجموعہ

کُہر آلود آسمان کے ستارے

شائع ہو گیا ہے

قیمت : ساٹھ روپے

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

۳

زلاتا فلپووِچ : ڈائری

دوسری جنگ عظیم کے بعد شاید دنیا کا سب سے ہولناک ہون بوسنیا ہرزگووینا میں ہوا -- ایک ایسا عالم گیر قتلِ عام جس کی رودادیں پڑھ کر دل دہل جاتے ہیں۔ اس آفت میں لاکھوں لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے، لاکھوں بے گھر ہوئے اور یہ سفاکانہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ سرائیوو جیسا حسین شہر مسلسل گولاباری سے تباہ ہو گیا لیکن اس کے بہادر شہریوں کے حوصلے نہیں ٹوٹے۔ دوسری جنگِ عظیم نے دنیا کو ایک یہودی بچی این فرینک کی ڈائری دی تھی جو این اور اس کے کنبے کے نازی بربریت کا شکار ہونے کے بعد چھپی اور جسے بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ سرائیوو کی بپتا نے ایک اور این فرینک پیدا کی، زلاتا فلیپووچ، اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی، جو ان کے ساتھ سرائیوو میں رہتی تھی۔ اس کی قسمت این فرینک سے اچھی رہی کہ وہ اور اس کے ماں باپ اس ہلاکت خیزی سے بچ نکلے۔ زلاتا کی ڈائری سب سے پہلے ۱۹۹۳ میں فرانس میں چھپی، اور اس کے چند روز بعد اسے اور اس کے والدین کو فرانس جانے کی اجازت مل گئی۔

زلاتا نے اپنی گیارہویں سالگرہ سے کچھ پہلے یہ ڈائری لکھنی شروع کی تھی۔ اس میں وہ اپنی زندگی، اپنے دوستوں اور اپنے کنبے کے بارے میں لکھا کرتی تھی۔ اس کے مشاغل وہی تھے جو بیشتر چھوٹی لڑکیوں کے ہوتے ہیں۔ اپنی سہیلیوں کی برتھ ڈے پارٹیوں میں جانا، ناچنا، پیانو سیکھنا۔ وہ ایسی باتیں سوچا کرتی کہ مائیکل جیکسن سے آٹوگراف کیسے لیا جائے، کپڑوں کے نئے فیشن کیا ہیں، پیانو بجانے میں مہارت کس طرح پیدا کی جائے۔

جب سرائیوو میں قتل و غارت گری شروع ہوئی تو اس کے دوست شہر چھوڑ چھوڑ کر جانے لگے۔ سرائیوو میں نہ بجلی ہے نہ پانی نہ گیس نہ کچھ کھانے کو۔ زلاتا کے بچپن پر اداسی کے بادل چھا جاتے ہیں، اس کی معصوم خوشیاں گھٹ کر رہ جاتی ہیں۔ زلاتا کی واحد ہمراز، اصل سہیلی اب "میمی" ہے، یعنی اس کی ڈائری۔ (این فرینک نے اپنی ڈائری کا نام "کِٹی" رکھا تھا اور شاید ڈائری کا نام رکھنے کا خیال زلاتا کو این کی ڈائری سے سوجھا۔)

زلاتا کی ڈائری جنگ زدہ سرائیوو کا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے لے آتی ہے۔ یہ ہمارے دل کو اس طرح چھوتی ہے کہ یہ اثر جرنلزم کے بس کی بات نہیں۔ ایک شوخ، کھلنڈری، ذہین لڑکی آہستہ آہستہ سرائیوو کے مرکزی محلّے میں اپنے اپارٹمنٹ میں قید ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کے کنبے کو اپنا زیادہ تر وقت اپنے ہم سایوں کے ساتھ گزارنا پڑتا ہے۔ اس کا باپ جو وکیل ہے اب اپنا وکالت کا کام نہیں کر سکتا۔ اس کی ماں جو کیمسٹ ہے، غم اور مایوسی سے وہ پہلے کی سی ہنس مکھ عورت نہیں رہتی۔ باہر کا خطرہ ان کی مصروف، پُرمسرت زندگی کا ستیاناس کر دیتا ہے۔ جنگ ان جگہوں کو جن سے زلاتا محبت کرتی ہے، مسمار کر دیتی ہے۔ اس کے دوست زخمی یا ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اس کی پالتو نغمہ ریز مینا (canary) چکو، اور بلی چیچی بھی نہیں بچ پاتے۔ پھر بھی زلاتا ہمت اور بہادری سے اپنے پہلے کے شوق اور مشاغل قائم رکھنے کے جتن کرتی ہے۔ وہ پیانو کے سبق لینا ترک نہیں کرتی، نہ ہی کتابیں پڑھنا، نہ ہم جولیوں کی سالگرہیں منانا۔ اس کی مزاح کی حس بھی اُس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ اور وہ اپنی ڈائری میمی کو روز کے ہونے والے واقعات، اپنے دل کے احساسات لکھتی ہے۔

محمد خالد اختر

زلاتا فلِپووِچ

انتخاب اور ترجمہ: محمد خالد اختر

ڈائری

سوموار ۲ ستمبر ۱۹۹۱

میرے پیچھے گزرتی ہوئی طویل گرمیاں اور موسمِ گرما کی چھٹیاں۔ اور اب چھٹیوں کے بعد میرا اگلا اسکول کا سال شروع ہو رہا ہے۔ اب میں پانچویں گریڈ میں آ گئی ہوں۔ میں اس وقت کا بے تابی سے انتظار کرتی ہوں جب اسکول میں اپنے دوستوں سے ملوں گی اور ہم سب پھر اکٹھے ہوں گے۔ ان میں سے چند ایک کو میں نے تب سے نہیں دیکھا جب اسکول کا گھنٹا ٹرم ختم ہونے کے اعلان پر بجا تھا۔ میں کتنی خوش ہوں کہ ہم پھر ایک ساتھ ہوں گے، اور اسکول میں پڑھنے کی ساری فکروں اور خوشیوں میں ایک دوسرے کے شریک ہوں گے۔

مِیرنا، بویانا، ماریانا، ایوانا، ماشا، عذرا، مینیلا، ناتڑہ —۔ ہم سب ایک بار پھر اکٹھے ہو گئے ہیں!

سوموار ۲۳ ستمبر ۱۹۹۱

پتا نہیں میں نے پہلے اپنی ورکشاپ کلاس کا ذکر کیا ہے یا نہیں (یہ ایک نیا مضمون ہے) جو پانچویں گریڈ سے شروع ہو گی۔ ہماری استاد یاسمینا تورا ایلچ ہے اور وہ مجھے بڑی اچھی لگتی ہے۔ ہم لکڑی کے بارے میں سیکھتے ہیں کہ کیا ہوتی ہے اور اس کے کیا کیا استعمال ہوتے ہیں، اور یہ مزے کا مضمون ہے۔ جلد ہی ہمیں پریکٹیکل بھی شروع کرا دیے جائیں گے، جس کا مطلب ہے لکڑی وغیرہ سے مختلف چیزوں کا بنانا۔ خوب مزہ آئے گا۔

استادوں نے ہمیں ابھی سے مشقیں دینی شروع کر دی ہیں۔ اتنے سارے مضمون ہیں: تاریخ، جغرافیا، حیاتیات۔ مجھے دل لگا کر پڑھنا ہو گا۔

Scanned with CamScanner

اتوار ۶ اکتوبر ۱۹۹۱

میں MTV پر امریکن ٹاپ کے بیس ہِٹ گانے دیکھ رہی ہوں۔ مگر مجھے کچھ یاد نہیں کہ کون سا کس نمبر پر آیا ہے۔

میں بڑی شاندار محسوس کر رہی ہوں۔ وہ یوں کہ ابھی ابھی میں نے ایک فور سیزنز پیتزا کھایا ہے، مٹن، پنیر، کیچپ اور کھمبیوں کا بنا ہوا۔ بڑا چٹ پٹا تھا۔ ابا میرے لیے پڑوس کے "گالیپا" ہوٹل سے لائے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے کچھ پتا نہیں کون سا گانا کس نمبر پر آیا۔ میں اپنا پیتزا مزے لے لے کر چٹ کرنے میں اتنی مگن تھی۔ ننھی چٹوری لڑکی!

میں نے اپنی آج کی پڑھائی ختم کرلی ہے اور کل صبح میں بے فکری اور بہادری سے اسکول جا سکتی ہوں، اس ڈر کے بغیر کہ مجھے اچھا گریڈ نہیں ملے گا۔ اچھا گریڈ تو مجھے ملنا ہی چاہیے کیوں کہ میں سارا ہفتہ پڑھتی رہی ہوں اور اپنے دوستوں کے ساتھ باغ میں کھیلنے بھی نہیں گئی۔ موسم سہانا ہے اور ہم اکثر "بیچ والے بندر" کا کھیل کھیلا کرتے ہیں۔ چٹر چٹر باتیں اور سیر سپاٹا کرتے ہیں۔ واہ! کتنا لطف آتا ہے!

اتوار ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۱

اس ویک اینڈ پر کرنوتینا جا کر بڑا مزہ آیا۔ وہاں ہمارا دیہاتی گھر کتنا اچھا ہے (واقعی انوکھا سا) اور اس کے ارد گرد کے دیہی مناظر، کتنے خوب صورت! جب جاتی ہوں پہلے سے زیادہ حسین لگتا ہے یہ سب کچھ۔ ہم نے باغیچے میں ناشپاتیاں، سیب، اخروٹ توڑے۔ ہم نے ایک سیانی چھوٹی سی گلہری کی تصویریں اتاریں جو اخروٹوں کی چوری کرتی تھی! شام کو ہم نے باربی کیو کا سامان کیا۔ میں قیمے کے سموسے بنانے کی ماہر ہوں (سچ مچ!)۔ دادی اماں نے سیب کا بھُرتا بنایا۔ میں نے بُوٹی گھر کے لیے مختلف پتے جمع کیے اور آتی کے ساتھ کھیلتی رہی۔

ابھی سے خزاں کی رُت نے گرمیوں کے موسم کی جگہ لے لی ہے۔ دھیرے دھیرے، لیکن یقین کے ساتھ، خزاں اپنے برش سے قدرت کی تصویر میں رنگ بھر رہی ہے۔ پتے زرد، سنہری اور سُرخ ہو چلے ہیں، اور جھڑتے جاتے ہیں۔ اور سردی بڑھ رہی ہے۔ خزاں کی رُت واقعی اچھی ہوتی ہے۔ اصل میں ہر رُت اپنے لحاظ سے اچھی ہوتی ہے، اپنی خوبیاں رکھتی ہے۔ ایک طرح سے میں فطرت کے حُسن کو شہر میں اتنی شدّت سے محسوس نہیں کرتی۔ کرنوتینا کی تو بات ہی اَور ہے! کرنوتینا میں طرح طرح کی خوشبوئیں فضا میں پھیلی ہوتی ہیں۔ کرنوتینا کی بستی مجھے گویا تھپکیاں دیتی ہے، سکون پہنچاتی ہے اور مجھے اپنے بازوؤں میں آ جانے کو کہتی ہے۔ مجھے فطرت کے حسن کو

Scanned with CamScanner

محسوس کر کے، اس سے لطف اندوز ہو کر، دلی آرام ملا ہے۔

سنیچر ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۱

کل کا دن واقعی خوفناک تھا۔ ہم اس ویک اینڈ پر یا ہورینا (دنیا کے سب سے خوب صورت پہاڑ) پر جانے والے تھے۔ لیکن جب میں اسکول سے گھر لوٹی تو کیا دیکھتی ہوں کہ امی بیٹھی رو رہی ہیں اور ابا وردی پہنے کھڑے ہیں۔ جب ابا نے بتایا کہ انھیں پولیس ریزرو میں حاضر ہونے کا حکم آیا ہے تو میری جیسے جان ہی نکل گئی۔ میں اُن کے گلے لگ گئی، روتے ہوئے منتیں کرنے لگی کہ وہ نہ جائیں اور گھر پر رہیں۔ انھوں نے کہا کہ انھیں جانا ہی ہوگا۔ آخر وہ چلے گئے۔ امی اور میں اکیلے رہ گئے۔ امی نے رو رو کر بُرا حال کر لیا اور باری باری سب دوستوں رشتے داروں کو فون کیے۔ ہر کوئی فوراً پہنچ گیا (سلوبو، دودا، کیکا، ماموں براکو، خالہ میلیچا -- اتنے سارے لوگ کہ مجھے اب یاد نہیں۔) وہ سب ہمیں دلاسا دینے اور ہماری مصیبت میں سہارا بننے آئے تھے۔ کیکا مجھے اپنے گھر مارتینا اور مارتیا کے ساتھ رات گزارنے کے لیے لے گئیں۔ جب میں صبح کو اٹھی تو کیکا کہنے لگیں کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے اور ابا دو دن میں گھر آجائیں گے۔

اب میں گھر آگئی ہوں۔ خالہ میلیچا ہمارے ہاں رہیں گی۔ اور لگتا ہے سب ٹھیک ہو جائے گا اور ابا واقعی پرسوں گھر آجائیں گے۔ تیرا شکر، میرے خدا!

منگل ۲۲ اکتوبر ۱۹۹۱

واقعی سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ ابا کل اپنی سالگرہ کے دن گھر آگئے۔ مگر کل انھیں پھر جانا ہوگا، اور اس کے بعد ہر دو دن چھوڑ کر۔ ہر بار انھیں دس گھنٹے ڈیوٹی پر حاضر رہنا ہوگا۔ میں سمجھتی ہوں یہ حاضری زیادہ عرصے تک ضروری نہیں ہو گی۔ مونٹے نیگرو کے کچھ سپاہی ہرزگووینا میں گھس آئے ہیں۔ کیوں؟ کیا کرنے کے لیے؟ غالباً سیاست کی کوئی بات ہے۔ مگر میں سیاست کو کیا جانوں؟ کیا سلووینیا اور کروشیا کے بعد جنگ کی ہوائیں ہمارے اپنے بوسنیا ہرزگووینا کی جانب چلنے لگیں گی؟ نہیں، کبھی نہیں۔ ناممکن!

بدھ ۲۳ اکتوبر ۱۹۹۱

دُبراونک میں سچ مچ جنگ ہو رہی ہے۔ وہ اس پر زبردست گولا باری کر رہے ہیں۔ لوگ پناہ گاہوں میں چلے گئے ہیں۔ پینے کو پانی نہیں، بجلی نہیں، فون کام نہیں کر رہے۔ ہم نے ٹی وی پر

Scanned with CamScanner

اس تباہی کی دہشت ناک تصویریں دیکھی ہیں۔ امی اور ابا فکر مند ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنا خوب صورت شہر تباہ و برباد کر دیا جائے! امی ابا دونوں کو دُبراونک سے محبت ہے، اس واسطے کہ اسی شہر کے دُوچال پیلیس میں انھوں نے قلم ہاتھ میں لے کر باقی زندگی اکٹھے بسر کرنے کے عہد نامے پر "ہاں" کا لفظ لکھا تھا۔ امی کہتی ہیں کہ یہ دنیا میں سب سے خوب صورت شہر ہے اور اس پر آنچ نہیں آنی چاہیے۔

ہم سرجان کے بارے میں فکر مند ہیں۔ (سرجان امی ابا کے بہترین دوست ہیں، دُبراونک میں ملازمت کرتے ہیں مگر ان کے بیوی بچے اب تک سرائیوو میں ہیں۔) خدا جانے جو کچھ وہاں دبراونک میں ہو رہا ہے، وہاں کے رہنے والے اس کا کیسے سامنا کر رہے ہیں! کیا وہ زندہ ہیں؟ ہم ایک رَیڈیو ہیم کی مدد سے سرجان سے بات کرنے کے جتن کر رہے ہیں مگر وہ کام نہیں کر رہا۔ بوکیچا (سرجان کی بیوی) غم سے نڈھال پڑی ہیں۔ خبر پانے کی ہر کوشش ناکام ہو جاتی ہے۔ دبراونک باقی دنیا سے کٹ چکا ہے۔

بدھ ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۱

میری پیانو سکھانے والی استانی نے ایک عمدہ خوش خبری سنائی۔ اسکول میں پیانو بجانے کا شو ہو گا، اور میں بھی اس میں حصہ لوں گی!!! میں کابالیکی کی "سلوواک گیت کی چھ دھنیں" بجاؤں گی۔ یہ سب دھنیں ہیں تو چھوٹی مگر ہیں کافی مشکل۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ اپنی طرف سے تو میں پوری کوشش کروں گی۔

اسکول میں کوئی نئی بات نہیں ہوئی جس کا ذکر کیا جائے۔ آدھی ٹرم ختم ہونے کو ہے اور ہم اچھے گریڈ حاصل کرنے کے لیے محنت کر رہے ہیں۔ دن اب چھوٹے ہو چلے ہیں۔ سردی زیادہ شدید ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا مطلب ہے جلد ہی برف پڑنے لگے گی۔ ہرّے! ہرّے! ہم یاہورینا جائیں گے۔ اسکی انگ کریں گے، دو سیٹوں والی، ایک سیٹ والی برف گاڑیوں میں بیٹھ کر برف پر پھسلیں گے۔ کتنا مزہ آئے گا! مجھ سے رہا نہیں جا رہا۔ میں اُس وقت کے لیے بے تاب ہو رہی ہوں۔ حالاں کہ ابھی کچھ دیر ہے لیکن ہم نے ابھی سے سارے موسم کے لیے ٹکٹ خرید لیے ہیں۔

منگل ۱۲ نومبر ۱۹۹۱

دُبراونک میں حالات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ آخر ہم نے ریڈیو ہیم کے ذریعے پتا لگا لیا کہ سرجان زندہ ہیں اور اُن کے ماں باپ خیریت سے ہیں۔ ٹی وی پر تصویریں دیکھ

کر خوف آتا ہے۔ لوگ فاقوں سے مر رہے ہیں۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ سرجان کو خوراک کا پارسل کیسے بھیجا جائے۔ شاید کارِتاس (امدادی ادارے) کے توسط سے ایسا کسی طرح ہو سکے۔ ابا ابھی تک ریزرو پولیس میں اپنی ڈیوٹی پر جا رہے ہیں۔ وہ تھکے ماندے گھر آتے ہیں۔ کب یہ مصیبت ختم ہو گی۔ ابا کہتے ہیں اگلے ہفتے۔ خدا تیرا شکر ہے!

منگل ۱۴ جنوری ۱۹۹۲

میں نے جمائی لی، اپنے قلم کو کھولا اور لکھنے لگی۔ میں ریڈیو پر "ٹاپ گن" کے نغمے سن رہی ہوں۔ اے لو، اب کچھ اور شروع ہو گیا ہے۔ میں نے ابھی ابھی "بازار" (فیشن میگزین) کے پچھلے صفحے کا اپنی "انشا پردازی" سے ستیاناس کیا ہے۔ میں نے امی سے فون پر بات کی۔ وہ اپنی ملازمت پر گئی ہوئی ہیں۔

تمہیں ایک بات بتاؤں۔ ہر رات میں یہ خواب دیکھتی ہوں کہ میں مائیکل جیکسن کے پاس کھڑی اس سے آٹو گراف دینے کو کہہ رہی ہوں۔ مگر کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہ منع کر دیتا ہے اور کبھی اُس کی جگہ اس کی سیکرٹری میری آٹو گراف بک میں لکھنے لگتی ہے، اور پھر سارے حروف تیرنے اور مٹنے لگتے ہیں۔ اس واسطے کہ مائیکل جیکسن نے انہیں خود نہیں لکھا تھا۔ افسوس صد افسوس، بچاری مَیں! غریب زلاتا! ہاہاہا! مجھے زور کی ہنسی آرہی ہے۔

چار بج کر پندرہ منٹ: میں وانیا اور آندرے کے ہاں تھی۔ وہاں کچھ زیادہ دیر ہوئی۔ گھر لوٹی تو امی پریشان۔ خوب ڈانٹ پڑی۔ وانیا اور آندرے کے ہاں ہوا یہ کہ ہمارا "مونا پلی" کا کھیل لمبا ہوتا گیا اور دیر میں جا کر ختم ہوا۔ وانیا اور آندرے دونوں کا دیوالہ پٹ گیا اور سب لال کر کراتے نوٹ (پانچ پانچ ہزار کے) میری جھولی میں آگئے۔ کل رقم ۱۲،۰۰۰،۰۰۰ میں نے کمائی۔ اور پلاس دجینیو اور کوت دازُور دونوں میرے حصے میں آگئے!

اوہو، آج تو ٹی وی پر Bugs Bunny کا پروگرام آرہا ہے، جو مجھے ضرور دیکھنا ہے۔

سات بج کر پچاس منٹ: میں Dial MTV دیکھ رہی ہوں۔
پانچویں نمبر پر "پیٹ شاپ بوائز" کا گانا "وازاِٹ ورتھ اِٹ!"
چوتھے نمبر پر: مجھے یاد نہیں رہا۔
تیسرے نمبر پر: "زوان"۔
دوسرے نمبر پر: "گنز اینڈ روزز"۔
پہلے نمبر پر: "نیو کِڈز آن دی بلاک"۔

Scanned with CamScanner

جمعرات ۵ مارچ ۱۹۹۲

اوہ میرے خدا! سرائیوو میں جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے ہیں۔ اتوار یکم مارچ کو مسلح شہریوں کے ایک ٹولے نے (ٹی وی پر بھی بتایا گیا ہے) ایک سرب براتی کو مار ڈالا اور نکاح خواں پادری کو زخمی کر دیا۔ سوموار ۲ مارچ کو سارے شہر میں جگہ جگہ مورچے اور ناکے بن گئے۔ کوئی ایک ہزار کے لگ بھگ۔ ہمارے گھر میں روٹی تک نہ تھی۔ آخر شام چھ بجے لوگ تنگ آ کر گھروں سے نکل آئے۔ جلوس بڑے کلیسا سے شروع ہوا، پارلیمنٹ کی عمارت کے سامنے سے گزرا اور سارے شہر میں گھوما پھرا۔ مارشل ٹیٹو بیرکس کے قریب بہت سے لوگ گولیوں سے گھائل ہوئے۔ لوگ ترانے گاتے اور "بوسنیا، بوسنیا! سرائیوو، سرائیوو!" کے نعرے لگاتے تھے۔ وہ یہ بھی بلند آواز سے کہتے تھے: "ہم ایک ساتھ رہیں گے! آؤ ہمارے ساتھ مل جاؤ!" زدراو کو گرےبو (سرائیوو کے زید ریڈیو کے صدر) نے ریڈیو پر کہا کہ تاریخ کا نیا باب شروع ہونے کو ہے۔

تقریباً آٹھ بجے رات ہم نے ایک ٹرام کی گھنٹی کی آواز سنی۔ اس دن کی پہلی ٹرام شہر سے گزر کر آئی تھی۔ اور زندگی معمول پر آ گئی۔ لوگ گلیوں بازاروں میں نکل آئے، اس امید کے ساتھ کہ ایسی غارت گری پھر کبھی سرائیوو میں نہیں ہوگی۔ ہم بھی امن کے جلوس میں شامل ہوئے۔ گھر آ کر ہم چین سکون کی نیند سوئے۔ دوسرے روز سب کچھ پہلے کی طرح تھا۔ وہی کلاس روم، میوزک اسکول۔۔۔ مگر شام کو یہ خبر آئی کہ تین ہزار چیتنک (سرب مسلح قوم پرست) پالے کی طرف سے سرائیوو پر دھاوا بولنے بڑھے آ رہے ہیں اور پہلے باش چارشیا پر حملہ کریں گے۔ خالہ میلیچا نے بتایا کہ اُن کے گھر کے آگے نئے مورچے بنا دیے گئے ہیں اور وہ لوگ رات کو اپنے گھر نہیں سوئیں گے کیوں کہ سخت خطرہ ہے۔ خالہ میلیچا اور ان کے گھر والے چچا نجاد کے گھر سوئے۔ بعد میں ٹی وی پر باقاعدہ چخ چخ سنی گئی۔ رادووان کراجک اور علیا عزت بیگووچ نے خبرنامے میں فون کیا اور باہم بحث میں الجھ پڑے۔ پھر گوران میلیچ (خبرنامے کے نیوز ریڈر) کو غصہ آ گیا اور اس کے سمجھانے بجھانے پر وہ دونوں کسی جنرل کوکانیاچ سے ملنے پر راضی ہو گئے۔ میلیچ زبردست ہے، واقعی گریٹ! شاباش!

چار مارچ بدھ کے روز مورچے اور ناکے ہٹا لیے گئے۔ لڑکے (سیاست دانوں کا عام لقب) کسی باہمی معاہدے پر متفق ہو گئے ہیں۔ اچھی بات!

اس دن ہماری آرٹ کی استانی ہماری کلاس ٹیچر کے لیے ایک تصویر لے کر آئیں جو آٹھ مارچ والے "یومِ خواتین" کے لیے کلاس روم میں ٹانگی جائے گی۔ ہم نے یہ تحفہ اپنی کلاس ٹیچر کو دیا تو انھوں نے ہمیں گھر جانے کو کہا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی گڑبڑ ہے اور خطرہ نہیں ٹلا۔ ہم

Scanned with CamScanner

سب پر ہیبت طاری ہو گئی۔ لڑکیاں رونے چیخنے لگیں اور لڑکے چپ چاپ اپنی آنکھیں جھپکنے لگے۔ ابا بھی اس دن جلد ہی کام سے گھر لوٹ آئے۔ لیکن سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا۔ خواہ مخواہ کا شور شرابا!

جمعہ ۶ مارچ ۱۹۹۲

حالات معمول پر آگئے ہیں۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک!

منگل ۲۴ مارچ ۱۹۹۲

سرائیوو میں اب کوئی بدامنی نہیں۔ مگر دوسرے شہروں میں کافی خون خرابا ہو رہا ہے: بوسانکی برود، دروینتا، مودریچا۔ ہر سمت سے ہولناک خبریں اور تصویریں آ رہی ہیں۔ ابا امی خبروں کے وقت مجھے ٹی وی دیکھنے سے منع کرتے ہیں۔ مگر بچوں سے ان سب بھیانک چیزوں کو کیسے چھپایا جاسکتا ہے جو چاروں طرف ہو رہی ہیں۔ لوگ پھر سہمے سہمے اور اُداس ہیں۔ نیلی ہلمٹوں (بلکہ نیلی بیرٹ ٹوپیوں) والے سرائیوو میں آگئے ہیں۔ ہم اب خود کو زیادہ محفوظ محسوس کرنے لگے ہیں۔ "لڑکے" منظر سے پیچھے ہٹ گئے ہیں۔

ابا مجھے یو این امن فوج کمانڈ کی عمارت میں لے گئے۔ انھوں نے کہا کہ اب جب کہ سرائیوو میں نیلا جھنڈا لہرا رہا ہے، ہم بہتر حالات کی امید کرسکتے ہیں۔

سوموار ۳۰ مارچ ۱۹۹۲

اری میری ڈائری، جانتی بھی ہو میں کیا سوچ رہی ہوں؟ این فرینک اپنی ڈائری کو "کِٹی" کہا کرتی تھی۔ میں بھی شاید تمھارا کوئی اچھا سا نام رکھ سکوں، کوئی بھلا سا نام۔ کیا رکھوں گی تمھارا نام؟

اسفالتینا، پدزاپیتا، شفیقہ، حکمتہ، شوالہ، میمی، یا کوئی اور؟

میں سوچ رہی ہوں، سوچ رہی ہوں۔

ٹھیک ہے، میں نے فیصلہ کرلیا۔ میں تمھیں اب سے بلایا کروں گی: میمی!

ہاں تو پیاری میمی!

اب تقریباً آدھی ٹرم ہو چکی ہے۔ ہم سب اپنے ٹیسٹوں کی تیاری میں مصروف ہیں اور دن رات پڑھ رہے ہیں۔ کل شاید ہمیں اسکندریہ ہال میں ایک میوزک کنسرٹ میں جانا ہے۔ مگر ہماری استانی کہتی ہیں کہ ہم وہاں نہ جائیں کیوں کہ وہاں دس ہزار لوگ، یعنی دس ہزار بچے، ہوں گے اور ہو

سکتا ہے کوئی بم کو یرغمال بنا لے۔ یا کنسرٹ ہال میں بم رکھ دے۔ امی بھی کہتی ہیں کہ میں ہرگز ہرگز نہ جاؤں۔ اس لیے میں نہیں جاؤں گی۔

ارے میمی، تم جانتی ہو بھلا یوگوسلاویا کے گیتوں کے کنسرٹ میں کون جیتا؟ ایکسترا نینا!

اگلی بات تمہیں بتانے سے میں ڈرتی ہوں۔ خالہ میلیجا کہتی ہیں کہ انھوں نے اتوار ۴ دسمبر کو ہیرڈریسر کی دکان پر یہ بات سنی تھی کہ بوم بوم، دھوں دھوں پھٹاک سرائیوو۔ یعنی وہ لوگ سرائیوو پر گولاباری کرنے والے ہیں۔

بہت بہت پیار، میری میمی۔

سوموار ۶ اپریل ۱۹۹۲

کل پارلیمنٹ کے سامنے کھڑے لوگوں نے وربانیا کے پُل سے گزرنے کی کوشش کی تو ان پر کسی نے فائرنگ کی۔ کس نے؟ کیوں کر؟ کیوں؟ ایک لڑکی، ڈبراونک کے میڈیکل کالج کی ایک طالبہ ماری گئی۔ اس کا خون پُل پر چھلک آیا۔ اپنے آخری لمحات میں اُس نے صرف یہ الفاظ کہے: "کیا یہ سرائیوو ہے؟" ہولناک! ہولناک! ہولناک!

یہاں کوئی شخص، کوئی چیز اب نارمل نہیں ہے۔

باشچارشیا کو تباہ کر دیا گیا ہے۔ پالے سے آنے والے شریف زادوں نے ہمارے باشچارشیا پر گولے پھینکے!

کل سے لوگ بوسنیا ہرزگووینا کی پارلیمنٹ کے اندر بیٹھے ہیں۔ کچھ لوگ عمارت کے سامنے کھڑے ہیں۔ ہم اپنے ٹی وی سیٹ کو سونے کے کمرے میں لے آئے ہیں۔ یہ ٹی وی میرا ہے۔ میں اس پر چینل نمبر ایک کے پروگرام دیکھتی ہوں۔ اور MTV کے گانے ابا امی کے ٹی وی پر۔ اب وہ ہالیڈے اِن کی طرف سے گولیاں چلا رہے ہیں۔ پارلیمنٹ کے سامنے کھڑے لوگ ہلاک اور زخمی ہو رہے ہیں۔ اور وانیا اور آندرے کے ساتھ بوکیچا بھی وہیں ہیں۔ اف میرے خدا!

شاید ہم تہ خانے میں چلے جائیں۔ ہاں میمی، تم میرے ساتھ جاؤ گی۔ میں بے آس، ڈری ہوئی ہوں۔ پارلیمنٹ کے سامنے کھڑے لوگ بھی بے آس، ڈرے ہوئے ہیں۔ پیاری میمی، جنگ آخر ہم تک آ پہنچی۔

امن! اب امن آ جانا چاہیے۔

سنا ہے وہ اب سرائیوو کے ریڈیو اور ٹی وی سنٹر پر حملہ کرنے والے ہیں۔ مگر اب تک انھوں نے کیا نہیں۔ ہمارے پڑوس میں گولیاں چلنی بند ہو گئی ہیں۔ تھپکو زلاتا، تھپکو! (میں خوش

Scanned with CamScanner

بختی کو بلانے کے لیے لکڑی کو تھپک رہی ہوں۔)

اوہ! میرے خدا! گولی تو کہیں آس پاس سے گزری ہے۔ وہ پھر گولیاں چلا رہے ہیں۔

زلاتا۔

جمعرات ۹ اپریل ۱۹۹۲

پیاری میمی، میں اسکول نہیں جا رہی۔ سرائیوو میں سارے اسکول اور کالج بند کر دیے گئے ہیں۔ سرائیوو کے اوپر جھکی پہاڑیوں میں خطرہ دبکا بیٹھا ہے۔ مگر میرا خیال ہے حالات آہستہ آہستہ پرسکون ہو رہے ہیں۔ وہ یوں کہ پہلے کی سی شدید، متواتر گولا باری اب رک گئی ہے۔ کبھی کبھی توپوں کی آواز آتی ہے، پھر وہ خاموش ہو جاتی ہیں۔ امی اور ابا بھی کام پر نہیں جا رہے۔ وہ کھانے پینے کی چیزیں ڈھیروں کے حساب سے خرید رہے ہیں۔ وہ اس لیے کہ کوئی نہیں جانتا کل کو کیا ہو۔ خدا بچائے!

اب بھی ہر کوئی سخت بے چین ہے۔ ایک تناؤ کی سی کیفیت میں مبتلا۔ امی فون پر بڑی دیر تک باتیں کرتی رہتی ہیں۔ وہ دوسرے لوگوں کو فون کرتی ہیں۔ اُدھر سے اُن لوگوں کے فون کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ بے چارے فون کو آرام نہیں ملتا! زلاتا۔

اتوار ۱۲ اپریل ۱۹۹۲

پیاری میمی، شہر کے نئے علاقوں -- دوبرنیا، موسیلو، وو یچکو پولیے -- پر شدید گولا باری ہو رہی ہے۔ ہر چیز تباہ کی جا رہی ہے، جلائی جا رہی ہے۔ لوگ پناہ گاہوں میں رہ رہے ہیں۔ یہاں شہر کے وسط میں، جہاں ہم رہتے ہیں، یہ بات نہیں۔ سکون ہے۔ لوگ باہر بھی نکلتے ہیں۔ آج کا دن موسم بہار کا ایک گرم، سہانا دن ہے۔ ہم بھی گھر سے باہر گئے۔ واسو مسکن اسٹریٹ میں لوگوں کی ریل پیل تھی۔ بچے بھی بہت تھے۔ ایسا لگا جیسے امن کا مارچ ہو رہا ہو۔ لوگ اکٹھے ہونے کے لیے باہر نکلتے ہیں۔ وہ جنگ نہیں چاہتے۔ وہ پہلے کی طرح جینا اور زندگی سے خوشیاں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ قدرتی بات ہے، ہے نا میمی؟ جنگ کو، جو دنیا کی سب سے بُری چیز ہے، کون پسند کرے گا؟

میں آج اِسی مارچ کے بارے میں سوچتی رہی جس میں مَیں بھی شامل تھی۔ یہ جنگ سے زیادہ بڑی، زیادہ توانا طاقت ہے۔ اور اس لیے اسی کی جیت ہو گی۔ جنگ کو منھ کی کھانی پڑے گی۔ لوگوں کی فتح ہو گی، جنگ کی نہیں، کیوں کہ جنگ کا انسانیت سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ جنگ غیر انسانی ہے، سراسر وحشی پن! زلاتا۔

Scanned with CamScanner

منگل ۱۴ اپریل ۱۹۹۲

پیاری میمی، لوگ سرائیوو سے بھاگ رہے ہیں۔ ایرپورٹ، اور ریل اور بس اسٹیشن جانے والوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں۔ میں نے ٹی وی پر دوستوں، ہم سایوں، عزیزوں کے ایک دوسرے سے جدا ہونے کی الم ناک تصویریں دیکھیں۔ کنبے اور دوست، شاید ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے بچھڑتے ہوئے۔ ایک ہی کنبے کے بعض افراد شہر سے جا رہے ہیں، بعض یہیں رہیں گے۔ مجھے یہ سب دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ آخر کیوں؟ یہ لوگ، یہ بچے بے قصور ہیں، ان کو کس جرم کی سزا مل رہی ہے؟ کیکا اور براکو آج صبح سویرے آئے تھے۔ اس وقت وہ کچن میں امی ابا کے ساتھ کھسر پھسر کر رہے ہیں۔ کیکا اور امی روئے جا رہی ہیں۔ میرا خیال ہے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ٹھہرے رہیں یا چلے جائیں۔ دونوں راستوں میں سے کوئی بھی اچھا نہیں۔ زلاتا۔

بدھ ۱۵ اپریل ۱۹۹۲

موسیلو محلّے میں خوفناک گولا باری ہوئی ہے۔ میری دوست میرنا کو پورے اڑتالیس گھنٹے تہ خانے میں گزارنے پڑے۔ میں نے اس سے فون پر بات کی، مگر زیادہ دیر تک نہیں کیوں کہ اُسے فوراً دوبارہ تہ خانے میں اترنا تھا۔ مجھے بہت رنج ہوا۔

بویانا اور ویریکا تو انگلستان جا رہی ہیں۔ اوگا اٹلی جا رہی ہے۔ اور سب سے بُری خبر یہ ہے کہ مارتینا اور ماتیا تو جا بھی چکی ہیں۔ وہ اوہرید گئی ہیں (مقدونیا میں جھیل کے کنارے ایک قصبہ)۔ کیکا رو رہی ہیں، براکو رو رہے ہیں، امی رو رہی ہیں۔ اور وہ پہاڑیوں میں محفوظ بیٹھے ہوئے لڑکے ہم پر نشانے لگا رہے ہیں۔ مجھے ابھی ابھی پتا چلا کہ دیان بھی چلی گئی۔

اوہ، اوہ، اوہ! جنگ کیوں؟

بہت بہت پیار، میری میمی۔ زلاتا۔

سوموار ۲۰ اپریل ۱۹۹۲

لگتا ہے جنگ کوئی مذاق نہیں ہے۔ یہ تباہی لاتی ہے، مار ڈالتی ہے، دکھ دیتی ہے۔ آج پرانے شہر کے مرکز باشچارشیا پر خوفناک گولے گرے۔ خوفناک دھماکے ہوئے۔ ہم تہ خانے میں اُتر گئے۔ سرد، تاریک، گھناؤنے تہ خانے میں۔ اور ہمارا تہ خانہ اتنا محفوظ بھی نہیں ہے۔ امی، ابا اور میں ایک کونے میں ایک دوسرے سے چمٹے کھڑے رہے جو کچھ محفوظ معلوم ہوتا تھا۔ میں اپنے ماں باپ کے بازوؤں کی گرمائی میں کھڑی سرائیوو سے چلے جانے کا سوچتی رہی۔ ہر کوئی یہی سوچ رہا

ہے، میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔ یہ میں کیسے برداشت کر سکتی ہوں کہ میں تو چلی جاؤں اور میرے امی ابا، دادی دادا پیچھے رہ جائیں؟ اور صرف امی کے ساتھ چلے جانا بھی کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔ سب سے اچھا تو یہ ہوگا کہ ہم تینوں ساتھ جائیں۔ لیکن ابا تو جا نہیں سکتے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ ہم سب اکٹھے یہاں ٹھہرے رہیں۔ کل میں کیکا سے کہوں گی کہ انہیں بہادر بننا ہوگا، یہیں ان لوگوں کے پاس ٹھہرنا ہوگا جو اُنہیں چاہتے ہیں۔ میں اپنے امی ابا سے جدا نہیں ہو سکتی۔ اور یہ بھی مجھے پسند نہیں کہ میں اور امی چلی جائیں اور ابا یہیں رہ جائیں۔ تمھاری زلاتا۔

منگل ۲۱ اپریل ۱۹۹۲

آج سرائیوو میں قیامت کا دن ہے۔ دھائیں دھائیں کرتے گولے گر رہے ہیں، لوگ اور بچے مر رہے ہیں، گولیاں چل رہی ہیں۔ غالباً آج پوری رات ہمیں تہ خانے میں گزارنی پڑے گی۔ ہمارا اپنا تہ خانہ محفوظ نہیں ہے، اس لیے ہم بوبار خاندان کے ہاں جا رہے ہیں۔ بوبار کنبے میں یہ لوگ ہیں: دادی میرا، خالہ بودا، خالو زیکا، مایا اور بویانا۔ جب فائرنگ بہت تیز ہو جاتی ہے تو زیکا ہمیں فون کر دیتے ہیں اور ہم صحن میں دوڑ لگا کر، میز اور زینے پر چڑھ کر اُن کے ہاں پہنچ جاتے ہیں اور دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ پرسوں تک ہم گلی میں سے ان کے گھر جایا کرتے تھے۔ مگر اب گولیاں چل رہی ہیں اور گلی سے جانا خطرناک ہے۔ میں تہ خانے میں جانے کی تیاری کر رہی ہوں۔ میں نے اپنے بیک پیک میں بسکٹ، جُوس کے ڈبے، تاش کی گڈی اور دوسری الم غلم چیزیں بھر لی ہیں۔ اس وقت بھی مجھے توپوں کی آواز آ رہی ہے۔ اور اس سے ملتی جلتی ایک اور آواز۔

پیار، میمی! زلاتا۔

سنیچر ۲ مئی ۱۹۹۲

آج سچ مچ سرائیوو میں سب سے بُرا دن تھا۔ فائرنگ دوپہر کے قریب شروع ہوئی۔ امی اور میں ہال کمرے میں آ گئے۔ ابا اُس وقت فلیٹ کے نیچے اپنے دفتر میں تھے۔ ہم نے انٹر فون پر اُن سے کہا کہ نکل کر نیچے لابی میں آ جائیں، ہم وہیں ملیں گے۔ میری پالتو مینا چکو بھی ہمارے ساتھ آئی۔ گولا باری شدید ہو گئی تھی اور ہم دیوار پھلانگ کر بوبار کنبے کے ہاں نہیں جا سکتے تھے۔ اس لیے ہم دوڑ کر اپنے تہ خانے میں اتر گئے۔

یہ تہ خانہ گھناؤنا، تاریک اور بدبودار ہے۔ امی کو، جنھیں چوہوں سے بہت ڈر لگتا ہے، اس بار دو چیزوں سے ڈرنا پڑا۔ ہم تینوں اُسی کونے میں کھڑے ہو گئے جہاں پچھلی بار کھڑے تھے۔ ہم

Scanned with CamScanner

دم سادھے کھڑے اوپر سے آتی پھٹتے ہوئے گولوں، فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں سنتے رہے۔ ہمیں ہوائی جہازوں تک کی آوازیں سنائی دیں۔ ایک لمحے مجھے خیال آیا کہ یہ ڈراونا تہہ خانہ ہی وہ واحد جگہ ہے جہاں ہماری زندگیاں بچ سکتی ہیں۔ پھر اچانک یہ تہہ خانہ گرم اور اچھا لگنے لگا۔ اسی طرح تو ہم اس خوفناک گولاباری کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ہم نے باہر اپنی گلی میں شیشے ٹوٹنے کی چھناکے سنے۔ خوفناک! میں نے اُن خوفناک آوازوں کی روکنے کے لیے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ میں اپنی بینا چکو کے لیے فکرمند تھی۔ ہم اُسے لابی ہی میں چھوڑ آئے تھے۔ کہیں وہ سردی سے ٹھٹھر کر مر نہ جائے۔ اسے کوئی گولی نہ لگ جائے۔ بھوک اور پیاس کے مارے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ ہم اپنا آدھا پکا لنچ باورچی خانے ہی میں چھوڑ آئے تھے۔

جب گولاباری کچھ ٹھنڈی پڑی تو ابا دوڑ کر فلیٹ میں گئے اور وہاں سے کچھ سینڈوچ اٹھا لائے۔ انھوں نے بتایا کہ اندر کچھ جلنے کی بُو آرہی تھی اور یہ کہ ٹیلی فون کام نہیں کر رہا۔ ابا ٹی وی بھی تہہ خانے میں لے آئے تھے۔ تبھی ہمیں پتا چلا کہ ہمارے پاس کا بڑا ڈاک گھر آگ کی لپیٹ میں ہے اور اُن لوگوں نے ہمارے صدر کو اغوا کر لیا ہے۔ رات آٹھ بجے ہم اپنے فلیٹ میں واپس آئے۔ ہماری گلی کی تقریباً ہر گلی کے شیشے کرچی کرچی ہو چکے تھے۔ خدا کا شکر، ہماری کھڑکیاں سلامت تھیں۔ میں نے ڈاک گھر میں شعلے بھڑکتے دیکھے۔ کیسا بھیانک منظر! آگ بجھانے والے بھڑکتی آگ سے زور آزمائی کر رہے تھے۔ ابا نے شعلوں میں گھرے ڈاک گھر کی کچھ تصویریں اتاریں۔ انھوں نے کہا کہ یہ تصویریں ٹھیک نہیں آئیں گی کیوں کہ میں، زلاتا، کیمرے سے چھیڑچھاڑ کرتی رہی ہوں۔ سارے فلیٹ میں جلنے کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ اوہ میرے خدا، میں روز اسی ڈاک گھر کے سامنے سے گزرتی تھی۔ انھیں دنوں اس کا رنگ روغن مکمل ہوا تھا۔ یہ بہت عالیشان اور خوب صورت تھا اور اب شعلے اسے بھسم کر رہے تھے۔ ڈاک گھر غائب ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ہمارے پڑوس کی دوسری عمارتوں کا بھی یہی حال ہے۔ پیاری میمی، پتا نہیں سرائیوو کے دوسرے علاقوں کا کیا حال ہوگا۔ ہمیں ریڈیو سے پتا چلا تھا کہ "دائمی شعلے" کے آس پاس بڑی بربادی ہوئی ہے۔ عمارتیں شیشے کے ملبے میں گھٹنوں تک دھنسی ہوئی ہیں۔ ہم نانا نانی کے لیے فکرمند ہیں۔ وہ اسی محلے میں رہتے ہیں۔ کل اگر ہم باہر نکل سکے تو اُن کی خیریت معلوم کریں گے۔ کیسا ہولناک دن! میری گیارہ برس کی زندگی میں کبھی ایسا خوفناک دن نہیں آیا۔ خدا کرے ایسا دن پھر نہ آئے!

امی اور ابا بہت بے چین ہیں۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ میں سونے جا رہی ہوں۔

چاؤ! زلاتا۔

جمعرات ۷ مئی ۱۹۹۲

پیاری میمی، مجھے یقین تھا کہ جنگ رک جائے گی، مگر آج پھر--- آج ہمارے گھر کے سامنے ایک گولا پھٹا۔ اسی پارک میں جہاں میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ بہت سارے لوگ زخمی ہوئے۔ سنتی ہوں یاکا، یاکا کی امی، سلمہ، نینا، ہمارے پڑوسی دادو، اور نہ جانے کتنے اور لوگ جو اس وقت وہاں تھے زخمی ہوگئے۔ دادو، یاکا اور اس کی امی اسپتال سے گھر آگئے ہیں۔ سلمہ کا ایک گردہ جاتا رہا مگر میں نہیں جانتی کہ وہ کیسی ہے کیوں کہ وہ ابھی تک اسپتال میں ہے۔ اور نینا! سنو، نینا مر گئی ہے۔ لوہے کا ایک ٹکڑا اس کے دماغ میں جا گھسا اور وہ فوراً مر گئی۔ وہ اتنی پیاری سی اچھی سی لڑکی تھی۔ میں اور وہ کنڈر گارٹن ساتھ ساتھ جاتے تھے اور پارک میں اکٹھے کھیلتے تھے۔ کیا سچ مچ میں اب نینا کو کبھی نہیں دیکھوں گی؟ نینا، ایک معصوم گیارہ سالہ چھوٹی سی لڑکی! ایک احمقانہ جنگ اسے مجھ سے کتنی دور لے گئی۔ میں غمگین ہوں۔ میں روتی ہوں اور حیرت زدہ ہوں کہ یہ کیسے ہو گیا۔ اس نے تو کوئی قصور نہیں کیا تھا۔ ایک مکروہ جنگ نے ایک کھلتی ہوئی بچی کی زندگی چھین لی۔ نینا! تم ہمیشہ میرے دل کی گہرائیوں کے اندر زندہ رہو گی۔ میں تمھیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔

پیار، میمی! زلاتا۔

بدھ ۲۰ مئی ۱۹۹۲

گولے برسنے کم ہوگئے ہیں۔ آج امی نے اپنے میں اتنی بہادری پیدا کی کہ پل پار کر لیا۔ وہ نانا نانی کو دیکھ آئیں اور کئی جاننے والوں سے مل آئیں۔ انھوں نے بہت سی غمناک خبریں سنیں۔ وہ لوٹیں تو بہت اداس اور بجھی بجھی تھیں۔ ان کے بھائی اپنے کام سے گاڑی میں گھر آتے ہوئے زخمی ہوگئے۔ ان کے بھائی زخمی پڑے تھے اور انھیں آج سے پہلے اس بات کی خبر ہی نہ تھی۔ کتنی خوفناک بات ہے! ان کی ٹانگ میں زخم آئے ہیں اور وہ اسپتال میں ہیں۔ امی کیوں کر اسپتال جا کر اپنے بھائی کو ایک نظر دیکھ سکتی ہیں؟ وہ تو اب جیسے دنیا کے دوسرے سرے پر ہے۔ جاننے والوں نے بتایا کہ وہ ٹھیک ہیں لیکن امی کو یقین نہیں آتا اور وہ روتی رہتی ہیں۔ اگر یہ گولاباری بند ہو جائے تو وہ خود اپنی آنکھوں سے اپنے بھائی کی حالت دیکھ آئیں۔ مگر یہ بند ہی نہیں ہوتی۔ امی کہتی ہیں: "جب تک میں خود اپنے بھائی کو نہ دیکھ لوں، مجھے چین نہیں آئے گا۔" زلاتا۔

Scanned with CamScanner

جمعرات ۲۱ مئی ۱۹۹۲

امی آج ماموں براکو کو دیکھنے اسپتال گئیں۔ وہ زندہ ہیں۔ اصل بات تو ان کی زندگی ہے، لیکن وہ بری طرح زخمی ہوئے ہیں۔ ان کا گھٹنا ٹوٹ گیا ہے۔ اُس دن دو سو دو سرے زخمی لوگ بھی اسپتال لائے گئے تھے۔ اسپتال والے اُن کی ٹانگ کاٹنے کو تھے مگر ان کے دوست سرجن عدنان دزدار نے انہیں پہچان لیا، ٹانگ نہ کاٹنے کا فیصلہ کیا اور انہیں آپریشن تھیئٹر میں لے گئے۔ آپریشن ساڑھے چار گھنٹے تک ہوتا رہا اور ڈاکٹر کہتے ہیں کہ کامیاب رہا۔ مگر انہیں ایک مدت تک بستر پر پڑا رہنا پڑے گا۔ اُن کی ٹانگ میں لوہے کے ڈنڈے، ایک سانچا اور دوسری الم غلم چیزیں ڈال دی گئی ہیں۔ امی بہت غمگین اور فکرمند ہیں۔ نانا نانی کا بھی یہی حال ہے۔ (مجھے امی نے بتایا، کیوں کہ میں ان دونوں سے ۱۴ اپریل کے بعد سے نہیں ملی۔ گھر سے باہر نکلنے کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔) میرا خیال ہے ماموں براکو کی قسمت اچھی ثابت ہوئی کہ ان کی جان بچ گئی۔ مجھے امید ہے ٹانگ بھی ٹھیک ہو جائے گی۔ ماموں، حوصلہ کیجیے! شاباش!

تمہاری زلاتا۔

بدھ ۲۷ مئی ۱۹۹۲

خوں ریزی! قتل! دہشت! جرم! لہو! چیخ پکار! آنسو! یاس و ناامیدی!

آج واسو مِسکن اسٹریٹ کی یہی حالت ہے۔ دو گولے سڑک پر پھٹے اور ایک بازار میں۔ امی اُس وقت کہیں نزدیک ہی تھیں۔ وہ نانا نانی کے گھر کی طرف بھاگیں۔ ابا کا اور میرا بُرا حال تھا کہ امی گھر نہیں پہنچیں۔ میں نے اس منظر کا کچھ حصہ ٹی وی پر دیکھا لیکن مجھے اب تک یقین نہیں آرہا کہ میں نے واقعی یہ سب دیکھا تھا۔ یہ ناقابلِ یقین ہے۔ میرا کلیجا منہ کو آرہا ہے اور پیٹ میں گرہیں پڑ رہی ہیں۔ خوفناک! لوگ زخمیوں کو اسپتال لے جارہے ہیں۔ یہ تو پاگل خانہ ہے! ہم بار بار کھڑکی کی طرف جاتے، اس امید میں کہ امی آتی نظر آجائیں گی لیکن امی نہیں آئیں۔ پھر مرنے والوں اور زخمیوں کی فہرست آنی شروع ہوئی۔ ابا اور میں اپنے بال نوچ رہے تھے۔ ہم نہیں جانتے تھے امی کے ساتھ کیا ہوا، کیا وہ زندہ ہیں؟ شام چار بجے ابا نے اسپتال جا کر پتا لگانے کا فیصلہ کیا۔ وہ کپڑے پہن کر تیار ہوئے اور میں بوبار خاندان کے گھر چلی گئی تاکہ گھر میں اکیلی نہ رہ جاؤں۔ میں نے ایک بار اور کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔۔۔ امی پل پر سے بھاگی چلی آرہی تھیں! گھر میں داخل ہوتے ہی وہ کانپنے اور رونے لگیں۔ انھوں نے روتے روتے ہمیں بتایا کہ ہر طرف جلی ہوئی، مسخ شدہ لاشیں پڑی ہیں۔ ہمارے سارے پڑوسی بھی آگئے کیوں کہ ان کو بھی امی کی فکر تھی۔ خدا تیرا

شکر، امی ہمارے پاس ہیں، خدا تیرا شکر!
ایک ہولناک دن، کبھی نہ بھلایا جانے والا! خوفناک!
تمھاری زلاتا۔

سنیچر ۳۰ مئی ۱۹۹۲

شہر کا میٹرنٹی اسپتال جل کر کھنڈر ہو گیا۔ میں اسی اسپتال میں پیدا ہوئی تھی۔ اب ہزاروں لاکھوں دنیا میں آنے والے بچے، سرائیوو کے نئے شہری، اس اسپتال میں آنکھیں کھولنے کی سعادت سے محروم رہیں گے۔ یہ اسپتال نیا نویلا اور شاندار تھا۔ آگ نے سب کچھ بھسم کر دیا۔ ماؤں اور بچوں کو بچا لیا گیا۔ جب آگ لگی، دو عورتیں بچے جن رہی تھیں۔ یہ بچے زندہ ہیں۔ میرے خدا! جہاں سرائیوو میں لوگ ہلاک ہو رہے ہیں، مر رہے ہیں، غائب ہو رہے ہیں، گھر اور عمارتیں آگ لگنے سے راکھ ہو رہی ہیں، وہیں نئی زندگیاں بھی جنم لے رہی ہیں۔
تمھاری زلاتا۔

سوموار یکم جون ۱۹۹۲

پیاری میمی، آج مایا کی سالگرہ ہے۔ وہ اٹھارہ سال کی ہو گئی۔ وہ اب بالغ ہے۔ وہ اب جوان عورت ہے۔ یہ اس کی زندگی کا ایک اہم دن ہے۔ مگر کیا کیا جا سکتا ہے، یہ دن اُسے جنگ کے دوران منانا پڑا۔ ہم سب نے اس دن کو "خاص" بنانے کے لیے جو کچھ ہو سکتا تھا کیا، مگر وہ اداس اور ملول تھی۔ اس جنگ کو مایا کی خوشیاں چھیننے کا کیا حق تھا؟ مایا اپنی بڑے ہونے کی سیر پر نہیں جا سکی، نہ شام کو پہننے کا گاؤن خرید سکی۔ یہاں تو صرف جنگ ہے، جنگ ہی جنگ۔

خوش قسمتی سے آج بہت زیادہ گولاباری نہیں ہوئی، اس لیے ہم سکون سے بیٹھ سکے۔ خالہ بووا نے اسپیشل لنچ تیار کیا۔ (جنگ کے زمانے میں کتنا اسپیشل ہو سکتا ہے؟) امی نے گھر کے آخری بچے کھچے اخروٹوں سے ایک کیک بنایا (مایا اور اس کی اٹھارویں سالگرہ اس کی مستحق تھی)۔ ہم نے اُسے ایک بار اور او ہرید کے موتیوں سے بنی ایک چوڑی دی۔ اسے بہت سے سونے کے بنے قیمتی تحفے ملے۔ کیوں نہیں؟ تم ایک بار ہی تو اٹھارہ سال کے ہوتے ہو! مایا! اس بڑے اہم دن پر تمھیں سالگرہ مبارک ہو۔ خدا کرے گا، تمھاری آنے والی سالگرہیں امن کے زمانے میں منائی جائیں گی۔

زلاتا۔

Scanned with CamScanner

سنیچر ۲۰ جون ۱۹۹۲

آنٹی رادمیلا (امی کی دفتر کی دوست) آج آئیں۔ وہ وو بچکو پولیے (ایک نئے محلے) میں رہتی ہیں۔ ان کا فلیٹ بالکل تباہ ہو گیا ہے۔ گولا باری سے ملیامیٹ ہو گیا۔ اس کے اندر کی ہر چیز ٹوٹ پھوٹ گئی۔ بچا کیا؟ ٹوٹے فرنیچر کا بے کار ڈھیر، کپڑے، تصویریں اور دوسری چیزیں جو فلیٹ میں سجائی جاتی ہیں۔ آنٹی رادمیلا بہت اُداس ہیں کیوں کہ ان کی بیٹیاں سُنیچکا اور میرنا اُن کے پاس نہیں (وہ زگرب میں ہیں)، مگر اس بات پر وہ خوش بھی ہیں کہ ان کی بیٹیوں کو ان کے محلے کی اس قیامت سے نہیں گزرنا پڑا۔ آج ہم نے سنا کہ تجرباتی تھیئٹر کے زرین تولیچ کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ کیسی غمگین کر دینے والی خبر!

ساشا اپنی نانی کے گھر ان کے ساتھ رہنے گیا ہے، مگر غالباً واپس آجائے گا۔

تمھاری زلاتا۔

بدھ ۲۴ جون ۱۹۹۲

۹-۴۵ پانی اب آرہا ہے۔ بجلی پہلے کی طرح غائب۔

۱۰-۳۰ پانی ابھی تک آرہا ہے۔

۱۲-۰۰ پانی غائب۔ بجلی آگئی ہے۔

ہاں! ہاں!

میمی، میں نے ابھی محسوس کیا کہ میرے سارے دوست سرائیوو سے جا چکے ہیں: اوگا، مارتینا، ماتیا، دیان، وانیا اور آندرے۔ اوہ! اوہ!

باہر گولیاں چل رہی ہیں۔ بویانا کو اور مجھے باہر صحن میں جانے کی ممانعت ہے اس لیے ہم بویانا کے فلیٹ والی لابی میں رولر اسکیٹنگ کر رہے ہیں۔ مزہ آرہا ہے۔

یہ ان کتابوں کے نام ہیں جو میں اب تک پڑھ چکی ہوں: "امی میں تمھاری ہوں"، اور "عقاب سویرے اڑتے ہیں"، اور اگلی کتاب جو میں پڑھوں گی وہ ہے "ننھا ٹوٹو"۔

تمھاری زلاتا۔

جمعرات ۲ جولائی ۱۹۹۲

ہم نے آج خوب اپنی خاطر داری کی۔ ہم نے صحن میں لگے درخت سے لال لال چیریاں توڑیں اور ساری چٹم کر ڈالیں۔ ہم اس درخت کے پھلنے پر نظریں لگائے بیٹھے تھے، اس کے ننھے

Scanned with CamScanner

سبز پھلوں کو دھیرے دھیرے لال ہوتا دیکھتے رہے تھے، اور اب ہم انھیں مزے لے لے کر کھا رہے ہیں۔ اوہ، چیری کے درخت، تم کتنے اچھے ہو! آلو بخارے کے پیڑ پر پھل نہیں ہیں، اس لیے ہم اس کے پاس نہیں گئے۔ میں پھلوں کو بہت یاد کرتی ہوں۔ ان جنگ کے دنوں میں سرائیوو میں کھانے کو کچھ نہیں ملتا، ضرورت کی کوئی چیز نہیں ملتی، اور پھل بھی غائب ہو چکے ہیں۔ لیکن اب میں کہہ سکتی ہوں کہ میں نے چیریاں کھا کھا کر اپنا بُرا حال کر لیا ہے۔

ماموں براکو کے زخم اب بہتر ہو رہے ہیں۔ اب وہ تھوڑا بہت چل پھر لیتے ہیں۔

زلاتا۔

سنیچر ۱۱ جولائی ۱۹۹۲

نیدو آج ہمارے لیے ایک چھوٹے سے ملاقاتی کو لے کر آئے۔ ایک بلونگڑا۔ وہ گلی میں ان کے پیچھے لگ گیا تھا اور ان کا دل نہ مانا کہ وہ اسے گلی میں چھوڑ دیں۔ انھوں نے اسے اٹھا لیا اور گھر لے آئے۔ ہم اس کا کیا نام رکھیں گے؟ اسکنی، لینکی، رکٹی، میکانا، پرسا، چیچی ---؟ اس کی رنگت نارنجی ہے۔ پنجوں پر جیسے سفید موزے، اور چھاتی پر سفید سا دھبّا۔ بڑا پیارا سا بلونگڑا ہے، مگر کچھ کچھ جنگلی۔

زلاتا۔

منگل ۱۴ جولائی ۱۹۹۲

۸ جولائی کو ہمیں یو این کا ایک ڈبّا ملا۔ یعنی "انسانی امداد"۔ اس ڈبے میں یہ چیزیں تھیں: گائے کے گوشت کے ۶ ٹن، مچھلی کے ۵ ٹن، پنیر کے ۲ پیکٹ، ۳ کلو کپڑے دھونے کا پاوڈر، ۵ صابن، ۲ کلو شکر، ۵ کلو پکانے کا تیل۔ شاندار ڈبّا! مگر ابّا کو اسے حاصل کرنے کی خاطر چار گھنٹے قطار میں کھڑا رہنا پڑا۔

دوبرینیا کے محلّے کو آزاد کرا لیا گیا ہے۔ آج وہاں بھی یو این کے ڈبے بانٹے گئے۔

ہم سب یہ جاننے کے منتظر ہیں کہ سکیورٹی کاؤنسل بوسنیا میں فوجی مداخلت کے بارے میں کیا فیصلہ کرتی ہے۔

پانی اور بجلی دونوں پرسوں سے غائب ہیں اور اب تک نہیں آئے۔ چاؤ!

زلاتا۔

جمعہ ۱۷ جولائی ۱۹۹۲

پیاری میمی، ہم نے بلونگڑے کا نام چی چی رکھ دیا۔ نیدو نے اسے نہلایا دھلایا۔ ہم اسے دودھ اور بسکٹ کھلاتے ہیں۔ اسے بھی ہم سب کی طرح جنگ کے زمانے کی خوراک کا عادی ہونا ہو گا۔ یہ دراصل بلونگڑا نہیں، بلونگڑی ہے، یعنی لڑکی! بہت پیاری ہے۔ اس کا سر بہت خوب صورت ہے۔ ہم سب کو اس سے محبت ہو گئی ہے اور وہ رفتہ رفتہ ہم سے مانوس ہو رہی ہے۔ میں اور بویانا اُسے اپنی گودی میں لے لیتے ہیں، اس کی پشم پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور وہ خرخراتی ہے۔ اس کا مطلب ہے ہمارا لاڈ پیار اُسے اچھا لگتا ہے اور وہ خوش و خرم ہے۔ وہ ضرور خوش قسمت ہے۔ کون جانتا ہے کہ وہ اس وقت زندہ ہوتی، گلی میں اسے گولے کا ٹکڑا لگ سکتا تھا یا وہ بھوک سے مر جاتی یا کوئی بازاری کتا اس پر پل پڑتا۔ نیدو نے اسے اٹھا کر اور گھر لا کر واقعی نیک کام کیا۔

اب ہمارے گھرانے میں ایک فرد کا اضافہ ہو گیا ہے۔ گھرانے سے مراد ہے ہم اور ہمارے ہم سائے۔

زلاتا۔

سوموار ۲۰ جولائی ۱۹۹۲

پیاری میمی، چوں کہ میں اب سارا وقت گھر میں رہتی ہوں اس لیے میں دنیا کا نظارہ کھڑکی میں سے کرتی ہوں۔ دنیا کا چھوٹا سا ٹکڑا۔

گلیوں میں کتنے ہی حسین و جمیل، اعلیٰ نسل کے کتے آوارہ پھرتے ہیں۔ ان کے مالکوں نے غالباً انہیں کھُلا چھوڑ دیا ہے کیوں کہ وہ اب انہیں کھِلا نہیں سکتے۔ ان کے اپنے پاس کھانے کو کیا ہے؟ افسوس! کل میں نے ایک کاکر اسپینیئل کو پُل پار کرتے دیکھا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ کدھر کو جانا ہے۔ جیسے رستا بھول گیا ہو۔ وہ آگے بڑھنے کو ہوتا، پھر رک جاتا، مڑ کر پیچھے دیکھتا، اچانک اُلٹی سمت چلنے لگتا۔ وہ غالباً اپنے مالک کو ڈھونڈ رہا تھا۔ کون جانتا ہے اُس کا مالک اب زندہ بھی ہے یا نہیں۔ یہاں سرائیوو میں آدمی تو آدمی، حیوان بھی دکھ اٹھاتے ہیں۔ جنگ نے ان کی بھی جاں بخشی نہیں کی۔

زلاتا۔

بدھ ۵ اگست ۱۹۹۲

پیاری میمی، اخبار میں ایک اور بری خبر! امّی کو معلوم ہوا کہ اُن کے چچا حلیم خدا کو پیارے

Scanned with CamScanner

ہوئے۔ وہ بوڑھے تو تھے ہی، مگر اس جنگ نے انھیں موت کے قریب کر دیا۔ مجھے اتنا افسوس ہوا۔ وہ ایک شاندار بوڑھے آدمی تھے۔ میں ان سے بہت محبت کرتی تھی۔ جنگ کے زمانے میں ایسا ہی ہوتا ہے میمی! وہ لوگ جنھیں تم پیار کرتے ہو مر جاتے ہیں اور تمھیں خبر تک نہیں ملتی۔ جنگ تمھیں عزیزوں دوستوں سے دور کر دیتی ہے۔ اور تمھیں پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ کس حال میں ہیں۔ ہم سایوں کا تو پھر بھی علم رہتا ہے۔ سب کچھ محلّے ہی میں ہوتا رہتا ہے، باقی ہر چیز دور ہو جاتی ہے۔ زلاتا۔

اتوار ۲۰ ستمبر ۱۹۹۲

پیاری میمی، ہرّے! میں نے آج پُل پار کیا۔ آخر کار میں گھر سے باہر گئی! مجھے یقین نہیں آرہا۔ پل نہیں بدلا، مگر اسے دیکھ کر میں اداس ہو گئی۔ وہ اُداس ہے، ڈاک گھر کے لیے۔ ڈاک گھر بھی بہت اداس لگتا ہے۔ ہے تو یہ ڈاک گھر اُسی جگہ پر مگر وہ پرانا ڈاک گھر نہیں لگتا۔ آگ نے اس پر اپنے نشان چھوڑ دیے ہیں۔ وحشیانہ بربادی کی گواہی دیتا وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہے۔

گلیاں پہلے کی سی نہیں رہیں۔ زیادہ لوگ نظر نہیں آتے۔ وہ سب فکر مند ہیں، اداس ہیں۔ ہر کوئی سر نیچا کیے تیز تیز چل رہا ہے۔ دکانوں کی سب کھڑکیاں ٹوٹ پھوٹ چکی ہیں۔ لوٹ مار بھی ہوئی ہے۔ میرے اسکول پر بھی ایک گولا پھٹا اور اسکول کی بالائی منزل تباہ ہو گئی۔ یہ مکروہ گولے تھیئٹر کی عمارت پر بھی لگے اور وہ زخمی ہو گئی۔ پیارے بوڑھے سرائیوو کی بہت سی عمارتیں زخم خوردہ ہو گئی ہیں۔

میں نانا نانی سے ملنے بھی جا پہنچی۔ خوشی کے مارے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انھوں نے مجھے اپنے سینے سے چمٹایا، چوما اور بہت پیار کیا۔ میں نے انھیں چار مہینے بعد دیکھا۔ کتنے نحیف اور بوڑھے ہو گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں پہلے سی بڑی لگ رہی ہوں۔ یہ تو قدرت کا کام ہے۔ بچے بڑھ کر بڑے ہو جاتے ہیں، بڑی عمر کے لوگ بوڑھے ہو جاتے ہیں، میرا مطلب ہے وہ سب جو اب تک زندہ ہیں۔

ہاں، سرائیوو میں بے شمار لوگ اور بچے اب زندوں میں نہیں ہیں۔ جنگ ان کو آناً فاناً لے گئی۔ اور وہ سب معصوم اور بے قصور تھے۔ اس مکروہ جنگ کے معصوم شکار۔

ماریانا کی امی سے ہماری اچانک ملاقات ہوئی۔ وہ لوگ شہر چھوڑ کر نہیں گئے۔ وہ سب زندہ اور خیریت سے ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ماریانا یہودیوں کے ایک قافلے کے ساتھ زگرب چلی گئی ہے۔

Scanned with CamScanner

ہم امی ابا کی دوست دودا سے بھی ملنے گئے۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت حیران ہوئی۔ وہ رونے لگی۔ اس نے بھی کہا کہ میں پہلے سے بڑی ہو گئی ہوں۔ ان کے شوہر سلوبو زخمی ہو گئے تھے مگر اب ٹھیک ہیں۔ ان کے بیٹے کی کوئی خبر نہیں آئی۔ اس وجہ سے وہ بہت اداس ہیں۔

پیاری میمی، مجھے تم سے ایک اقرار کرنا ہے۔ آج میں بن ٹھن کر نکلی تھی۔ میں نے وہ خوب صورت، چنٹوں والا لباس پہنا۔ میرے جوتے کچھ تنگ تھے، میں بڑی جو ہو گئی ہوں، مگر ٹھیک رہا۔

سو یہ ہے پُل اور ڈاک گھر اور نانا نانی اور زخمی سرائیوو سے میری ملاقات کا حال۔ اگر یہ جنگ ختم ہو سکے تو تو سرائیوو کے زخم بھر سکیں گے۔ چاؤ!

زلاتا۔

جمعرات ۱۹ نومبر ۱۹۹۲

سیاست کے محاذ پر کوئی خاص بات نہیں۔ وہ لوگ کچھ قراردادیں تجویز کر رہے ہیں، لڑکوں کے مذاکرات چل رہے ہیں، اور ہم مر رہے ہیں، سردی میں ٹھٹھر رہے ہیں، فاقے کر رہے ہیں، رو رہے ہیں، اپنے دوستوں سے بچھڑ رہے ہیں، اپنے پیاروں سے جدا ہو رہے ہیں۔

میں یہ احمقانہ سیاست خود کو سمجھانے کی کوشش کرتی رہتی ہوں کیوں کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ سیاست ہی اس جنگ کا سبب ہے، یہی اس جنگ کو روزمرہ کی حقیقت بنانے کی ذمے دار ہے۔ میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ اس سیاست کا مطلب سرب، کروٹ اور مسلمان لوگ ہیں۔ لیکن یہ سب تو لوگ ہیں، انسان ہیں! وہ سب ایک جیسے ہیں، وہی ایک سے بازو، ٹانگیں، سر۔ وہ سب انسان ہی دکھائی دیتے ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ سب چلتے پھرتے، باتیں کرتے ہیں۔ لیکن اب کوئی ایسی چیز ان کے بیچ میں آ پڑی ہے جو انھیں ایک دوسرے سے مختلف بنا رہی ہے۔

میری سہیلیوں میں، ہمارے دوستوں میں، خود ہمارے خاندان میں سرب، کروٹ اور مسلمان لوگ موجود ہیں۔ یہ ایک ملاجلا گروپ ہے اور مجھے یہ معلوم تک نہ تھا کہ کون سرب ہے کون کروٹ اور کون مسلمان۔ اب یہ سیاست کھنڈت ڈال رہی ہے۔ اس نے سربوں پر "س"، کروٹوں پر "ک" اور مسلمانوں پر "م" لکھ دیا ہے اور ان کو ایک دوسرے سے الگ کر دینا چاہتی ہے۔ اور لکھنے کے لیے اس نے سب سے گھناونی، سب سے کالی پنسل چُنی ہے: جنگ کی پنسل جو صرف مصیبت اور موت کے حروف لکھ سکتی ہے۔

Scanned with CamScanner

یہ سیاست کیوں ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر کے رنج اور دکھ دینے پر تلی ہوئی ہے جب کہ ہم خود جانتے ہیں کہ کون اچھا ہے کون بُرا؟ ہم اچھوں سے میل جول رکھتے ہیں، بروں سے نہیں۔ اور اچھوں میں بھی سرب، کروٹ اور مسلمان ہیں، اسی طرح جیسے بروں میں ہیں۔ یہ سیاست میرے پلّے تو پڑتی نہیں۔ ہاں جی، میں چھوٹی ہوں، اور سیاست کا کھیل بڑے لوگ سمجھتے اور کھیلتے ہیں۔ لیکن ہم چھوٹے اس کھیل کو زیادہ اچھی طرح کھیلتے۔ ہم یقیناً جنگ کا انتخاب نہ کرتے۔

لڑکے سچ مچ کھیل رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم بچے، بچیاں نہیں کھیل رہے۔ ہم خوف میں رہ رہے ہیں۔ دکھ اور غم جھیل رہے ہیں۔ ہم سہانی دھوپ اور پھولوں سے لطف نہیں اٹھا رہے، ہم اپنے بچپن کی خوشیاں نہیں سمیٹ رہے۔ ہم رو رہے ہیں!

میمی، تم کہو گی میں اپنی طرف سے بڑا فلسفہ بگھار رہی ہوں۔ مگر میں اکیلی تھی اور میں نے سوچا کہ تم سے یہ باتیں کر سکتی ہوں۔ میمی، تم میری باتیں سمجھتی ہو نا؟ میری خوش بختی کہ تم تو ہو جس سے میں دل کی باتیں کر سکتی ہوں۔ اور اب، پیار۔ زلاتا۔

سوموار ۲۸ دسمبر ۱۹۹۲

پیاری میمی، پچھلے چند دنوں میں میں اتنا چلی کہ میرے جوتوں کے تلے گھس گئے۔

آج میں گھر میں ہوں۔ میں نے اپنا پہلا پیانو کا سبق لیا۔ میری استانی اور میں چمٹ کر ایک دوسرے سے گلے ملیں۔ مارچ کے بعد سے ہم ملے نہیں تھے۔ پھر ہم سیرنی، باخ، موتسارت اور شوپاں کی طرف، سوناٹا اور دوسرے راگوں کی طرف چل نکلے۔ یہ پیانو کے سبق آسان نہیں ہوں گے۔ مگر میں ان دنوں اسکول تو جاتی نہیں، پیانو سیکھنے ہی میں اپنی جان ماروں گی۔ اس سے مجھے خوشی ملتی ہے۔ یعنی میں اب موسیقی کے اسکول کے پانچویں سال میں ہوں۔

تم جانتی ہو میمی، مدّتوں سے ہم پانی اور بجلی کے بغیر رہ رہے ہیں۔ جب میں باہر جاتی ہوں اور گولاباری نہیں ہو رہی ہوتی، تب خیال آتا ہے کہ جنگ کا زمانہ بیت گیا۔ پھر پانی اور بجلی سے محرومی، اندھیرا، یخ کر دینے والی سردی، لکڑی اور خوراک کی قلت، یہ ساری مصیبتیں مجھے خوش امیدی کے خیالوں سے زمین پر لے آتی ہیں اور میں خود سے کہتی ہوں کہ جنگ ابھی بند نہیں ہوئی ہے۔ کیوں؟ آخر یہ لڑکے جنگ ختم کرنے کا سمجھوتا کیوں نہیں کر لیتے؟ اس سے کیا حاصل ہے؟ یہ لڑکے سچ مچ کھیل رہے ہیں۔ اور یہ کھیل وہ ہمارے ساتھ کھیل رہے ہیں۔

میری پیاری میمی، جب میں بیٹھی تمہیں یہ سطریں لکھ رہی ہوں، میں آنکھ اٹھا کر ابا اور امی کو بھی ایک نظر دیکھ لیتی ہوں۔ وہ دونوں پڑھ رہے ہیں۔ وہ صفحے پر سے نظریں اٹھا کر کسی چیز کے

بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔ وہ کیا سوچ رہے ہیں؟ اس کتاب کے بارے میں جو وہ پڑھ رہے ہیں؟ یا وہ جنگ کے معنے کے ادھر اُدھر بکھرے ٹکڑوں کو جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں؟ میرا خیال یہ دوسری بات اُن کی سوچوں کو اُلجھاتی رہتی ہے۔ اور وہ دونوں تیل کے لیمپ کی روشنی میں نہایت غمگین دکھائی دیتے ہیں۔ (ہمارے پاس موم بتیاں نہیں ہیں اس لیے ہم نے اپنے تیل کے دیے ایجاد کر رکھے ہیں۔) میں ابا کو تکتی ہوں۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ دُبلے ہو گئے ہیں۔ وزن کرنے والی مشین تو بتاتی ہے کہ ان کا وزن ۲۵ کلو کم ہوا ہے، مگر میرا خیال ہے اس سے کہیں زیادہ۔ مجھے لگتا ہے ان کا چشمہ بھی ان کے ناتواں چہرے کے مطابق نہیں رہا اور ڈھلکا آتا ہے۔ وزن امی کا بھی بہت گھٹ گیا ہے۔ ان کا جسم سکڑ سا گیا ہے اور جنگ سے ان کے چہرے پر جھریاں پڑ گئی ہیں۔ اوہ خدایا! جنگ میرے ماں باپ کے ساتھ کیا کر رہی ہے؟ وہ اب ہرگز ہرگز میرے پہلے جیسے امی ابا دکھائی نہیں دیتے۔ کیا یہ جنگ کبھی ختم ہو گی؟ کیا ہماری مصیبتیں کبھی ختم ہوں گی تاکہ میرے امی ابا پھر پہلے کی طرح ہو جائیں؟ ہشاش بشاش، مسکراتے ہوئے، خوب صورت۔

یہ احمق جنگ میرا بچپن چھین رہی ہے۔ میرے ماں باپ کی زندگیاں ختم کر رہی ہے۔ آخر کیوں؟ اس جنگ کو ختم کرو! امن! مجھے امن کی ضرورت ہے۔

اچھا میمی، اب میں امی ابا کے ساتھ تاش کی بازی کھیلوں گی۔ پیار۔ زلاتا۔

جمعرات ۲۵ مارچ ۱۹۹۳

پیاری میمی، سلوبو بہت بیمار ہیں۔ وہ اسپتال میں پڑے ہیں۔ جب سے دودا گئی ہے ان کی تندرستی بھی چلی گئی ہے۔ وہ غم کی وجہ سے بیمار ہو گئے ہیں۔ جنگ نے ان کی زندگی تباہ کر دی ہے۔ ان کی دودا سلووینیا میں ہے، دیان اور اس کی امی سوبوتیکا میں ہیں۔ وہ اکیلے رہ گئے ہیں۔ اب بیماری ہی ان کی ساتھی ہے۔ اور یہ انھیں جانے نہیں دے گی۔ روز بروز ان کی طاقت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ میں بیماری کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ بخار ہو جاتا ہے، گلے میں خراش ہو جاتی ہے۔ مگر سب کہتے ہیں کہ سلوبو بہت سخت بیمار ہیں۔ امی ابا انھیں دیکھنے اسپتال گئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ بہتر دکھائی نہیں دیتے اور بہتر محسوس بھی نہیں کر رہے۔ انھوں نے کسی طرح کی ریڈیائی شعاعوں کا بھی ذکر کیا۔ میں سلوبو کے لیے بہت غمگین ہوں۔

تمھاری زلاتا۔

Scanned with CamScanner

جمعرات ۸ اپریل ۱۹۹۳

پیاری میمی، آج کی خبر اَور زیادہ خوفناک اور غمگین کرنے والی ہے۔

ہماری پیاری مینا چچکو مر گئی۔ وہ بس اوندھے منہ گری اور ختم ہو گئی۔ وہ بیمار بالکل نہیں تھی۔ یہ واقعہ کل ہوا۔

وہ اس وقت گا رہی تھی۔ اب اسے سردی نہیں لگا کرے گی۔ بیچاری نے جیسے تیسے سردی کا موسم کاٹا۔ ہم نے کسی طرح اس کے دانے کا بھی انتظام کر لیا تھا۔ اب وہ یہ سب کچھ چھوڑ کر جا چکی ہے۔ شاید وہ اس جنگ سے سیر ہو گئی تھی اور اس میں اپنی تکلیفوں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ رہی تھی۔ اس نے سردی اور بھوک کو جہاں تک ہو سکا سہا۔ اب وہ ہمیشہ کے لیے چلی گئی ہے۔ میں تو روئی مگر امی کا حال مجھ سے بھی بدتر تھا۔ ہم اس کی جدائی کو کیوں کر برداشت کریں گے؟ ہم اس سے اتنی محبت کرتے تھے۔ وہ ہمارے کنبے کا ایک فرد تھی۔ ہمارے ساتھ سات برس رہی۔ یہ بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ ابا نے اسے صحن میں دفن کیا۔ چچکو ہماری زندگی سے نکل گئی۔

تمھاری زلاتا۔

اتوار ۲۵ اپریل ۱۹۹۳

میں تمھارے لیے ایک اَور بڑی اداس کرنے والی خبر لے کر آئی ہوں۔ بوبو مر گئے۔ آنٹی دِیزا کے بیٹے بوبو۔ انھیں خالہ میلیچا کے باغیچے میں گولی لگی۔ کوئی بندوقچی تھا۔ خوفناک! سب لوگ باغیچے میں تھے اور بندوقچی نے اُنھیں کا نشانہ لیا۔ کیسی شرم کی بات ہے۔ کیسے شاندار آدمی تھے۔ ان کی چار سال کی بچی اینیز اپنی امی کے ساتھ پناہ گزیں بن کر جا چکی ہے۔

آنٹی دِیزا تو غم کے مارے اپنے ہوش حواس کھو بیٹھی ہیں۔ بس یہی بڑبڑاتی رہتی ہیں: "وہ نہیں مرا۔ یہ سچ نہیں ہے۔ میرا بیٹا میرے پاس لوٹ آئے گا۔"

کتنا خوفناک ہے یہ سب کچھ، میمی۔ بس اب میں اَور کچھ نہیں لکھ سکتی۔

تمھاری زلاتا۔

جمعرات ۶ مئی ۱۹۹۳

پیاری میمی، آج گھر میں عجیب ڈرامہ ہوا۔

میں کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی کہ اچانک کوئی چیز فرش پر تیزی سے سرسراتی ہوئی گزری۔ اور میمی! تم جانتی ہو یہ کیا چیز تھی؟ ایک ننھا سا چھوٹا چوہا! اتنا چھوٹا کہ پہلے تو میں پہچان ہی

نہ سکی کہ چوہا ہے۔ وہ دوڑ کر دیوار میں لگی کتابوں کی الماری کے نیچے گھس گیا۔ امی نے زور کی چیخ ماری۔ وہ لپک کر کرسی پر چڑھ گئیں اور پھر دوڑتی ہوئی میرے کمرے میں آئیں۔ میں جانتی ہوں اُن کا بس چلتا تو گھر سے بھی باہر بھاگ جاتیں، مگر باہر تو جنگ ہو رہی ہے۔

کریں تو کیا کریں؟ ہمیں اسے پکڑنا ہی تھا۔ میں فوراً اپنی بلی چیچی کو لینے دوڑی کیوں کہ بلیاں چوہوں کی اسپیشلسٹ ہوتی ہیں۔ ابا اور برا کو اپنے اوزار، پیچ کس اور دوسری چیزیں لے آئے۔ انھوں نے بک کیس کو نیچے اتار لیا۔ چیچی گھات میں بیٹھی تھی، چوہے پر جھپٹنے کو تیار۔ ابا اور برا کو نے الماری کے پیچ کھولے اور میں نے اس پر سے کتابیں ہٹائیں۔ اور امی، امی میرے کمرے میں کھڑی تھیں، چوہے کے پکڑے جانے کا انتظار کرتی۔ بک کیس ہٹا تو پیچھے دیوار میں ایک سوراخ نظر آیا جس میں چوہا گھسا تھا۔ انھوں نے سوراخ کا منھ پلاسٹر سے بند کر دیا اور ہر چیز دوبارہ اپنی جگہ پر جما دی اور امی کو بہت سمجھایا کہ اب آ جاؤ، گھر میں گھومو پھرو۔

ہم سب نے امی کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ چوہا اب نہیں آئے گا۔ مگر اُن کا خوف کے مارے برا حال تھا۔ ہم چیچی کو مستقلاً اپنے ہاں لے آئے۔ وہ اب ہمارے فلیٹ میں سوتی ہے اور امی کو تھوڑا بہت حفاظت کا احساس ہوتا ہے۔ (مجھے تو یہی امید ہے۔) چوہا بھاگ گیا اور غالباً واپس نہیں آئے گا (چیچی اس کی آؤ بھگت کو تیار بیٹھی ہے)۔ مگر امی کو ابھی تک یقین نہیں ہے۔

اور پھر یہ ہوا کہ جب ہم اپنی طرف سے مطمئن ہو گئے کہ ہم نے چوہے کے مسئلے کو حل کر لیا ہے تو وہ چوہا دیوار کو کھرچنے لگا۔ وہ سچ مچ احمق ہے۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ ہم اس سے جان چھڑانے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں اور چیچی اُس کے انتظار میں اپنے ناخن تیز کر رہی ہے۔ میمی، یہ چوہا آخر حیوان ہی تو ہے۔

ادھر امی کے حواس اس طرح اڑے ہوئے ہیں کہ مجھے چوہے کا کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہو گا۔ میں چیچی سے بات کروں گی، وہی کچھ بندوبست کرے گی۔ زلاتا۔

سوموار ۱۷ مئی ۱۹۹۳

ہمارے گھر میں سکون کا کوئی لمحہ آتا ہی نہیں۔ چوہا پھر اپنی پہلی حماقتوں اور شرارتوں پر اتر آیا ہے۔ یہ خاموش چوہا ہے۔ کئی کئی دن غائب رہتا ہے، پھر اچانک دیوار کھرچنے لگتا ہے۔ ابا کہیں سے گوند بھی لے آئے۔ مجھے ڈر ہے کہیں امی پاگل نہ ہو جائیں۔

چیچی کو اب چوہے کی کوئی پروا نہیں رہی۔ تم جانتی ہو کیوں، میمی؟ چیچی کو محبت ہو گئی ہے۔ تمھیں یقین نہیں آتا؟ واقعی وہ عشق میں مبتلا ہو گئی ہے۔ آج میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو

وہ چھت پر ایک باگڑبلے سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی- بلا اینڈتا ہوا اس کی طرف آیا- انھوں نے ایک دوسرے کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور پھر نزدیک آ گئے- پھر انھوں نے ایک دوسرے کو سونگھا، ایسا لگا جیسے ایک دوسرے کو چوم رہے ہوں- پھر بلا چلا گیا اور چیچی اکیلی کھڑی رہ گئی، پریشان، میاؤں میاؤں کرتی-

نیدو آج چلے گئے- نیدو، آپ کا سفر خیر سے گزرے اور خیر سے ہمارے پاس واپس آئیں- ابا کا خیال ہے کہ وہ اب واپس نہیں آئیں گے- لیکن میں چاہتی ہوں کہ وہ واپس آ جائیں، اور اسی لیے میں سوچتی ہوں کہ وہ ضرور واپس آئیں گے-

تمھاری زلاتا-

منگل ۲۵ مئی ۱۹۹۳

پیاری میمی، نیدو واپس آ گئے ہیں- دیکھا میمی، میرا خیال صحیح نکلا اور ابا کا غلط- نیدو اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ اسپلٹ میں تھے جو آسٹریا سے آئی تھی- وہ صرف نیدو سے ملنے آئی تھی- نیدو کا کہنا ہے کہ وہ اسپلٹ میں کچھ کھوئے کھوئے رہے مگر سمندر میں تیرے ضرور (سمندر؟ یہ کیا ہوتا ہے؟) وہ تیرنا نہیں بھولے- انھوں نے دھوپ کا غسل بھی کیا (ان کا رنگ پکا پکا سا ہے)، ساحل پر سیر کی، چائے خانوں میں گئے اور قسم قسم کی چیزیں کھائیں- مگر وہ ہمیں نہیں بھولے- ہم میں سے کسی کو بھی نہیں- وہ ہر ایک کے لیے کوئی نہ کوئی چھوٹا سا تحفہ لے کر آئے ہیں- مجھے ایک فلپ فلاپ کا جوڑا، ایک جوڑی موزے (جو ان کی گرل فرینڈ نے خریدے تھے)، ایک بڑی سی چاکلیٹ اور مزیدار ٹافیوں کا ایک پیکٹ ملا-

تو نیدو ہمارے پاس واپس آ گئے، اور ہم اکٹھے جنگ کے اس کڑے زمانے سے آخر کار گزر ہی جائیں گے-

ہم نے آج آخر چوہے کے مسئلے کو حل کر لیا- اس کا پیر گوند پر پڑ گیا، وہ وہیں چپکا رہ گیا- اس طرح وہ اپنے انجام کو پہنچا- چوہے کا خاتمہ! امی کے آزاروں کا خاتمہ! ویسے اس چوہے سے ہمارے گھر میں کچھ رونق، کچھ چلبل ضرور آ گئی تھی-

چیچی پھر ہم سے مانوس ہو گئی ہے اور آتی جاتی رہتی ہے- مگر بلا نہیں آتا- وہ شیخی خورا، جنگلی اور بدتمیز ہے اور چیچی کی محبت کی قدر نہیں کرتا- وہ اسے بلاتی رہتی ہے، اس کے لیے میاؤں میاؤں کرتی رہتی ہے- رات کو اسے نیند نہیں آتی- وہ باہر جا کر اس سے ملنا چاہتی ہے- نیدو اور خالہ بودا آج رات اسے اسپرین دینے کی سوچ رہے ہیں تاکہ اسے کچھ سکون ہو- بلیوں کے

ڈاکٹر نے بھی یہی مشورہ دیا ہے۔

زلاتا۔

منگل یکم جون ۱۹۹۳

پیاری میمی، جیسا کہ تم کو معلوم ہی ہے، آج جون کی پہلی تاریخ ہے۔ مایا کی سالگرہ کا دن، عید قرباں کا دن، منگل کا دن، اور جنگ کا دوسری یکم جون۔ کل میری طبیعت بہت خراب تھی، آج کچھ بہتر ہوں۔ ابھی ہم نے کھانا کھایا۔ کیا کھانا؟ سنو: ناشتہ، دوپہر کا کھانا، رات کا کھانا، سب اَن پکے تھے کیوں کہ کل سے گیس غائب ہے۔ اور تم جانتی ہو بجلی تو ہے ہی نہیں۔ ہم سب خودکشی کے دہانے پر ہیں۔ قیامت! اوہ میمی، میری قوت برداشت اب جواب دے رہی ہے۔ ہر چیز سے جی اچاٹ ہو گیا ہے۔ مجھے معاف کرو کہ میں جلی کٹی باتیں کر رہی ہوں جو چھوٹی لڑکیوں کو زیب نہیں دیتیں، لیکن مجھ میں اب یہ سب کچھ سہنے کی تاب نہیں رہی۔ کافی کچھ سہہ لیا۔ اس بات کا امکان بڑھتا جا رہا ہے کہ جلد ہی میں اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لوں گی (یعنی اگر پہاڑی پر بیٹھے ہوئے جنونیوں نے اسے پہلے ہی نہ لے لیا۔) مجھے ابھی سے اپنے بدن سے جان نکلتی محسوس ہو رہی ہے۔ میں زور زور سے چیخنا چاہتی ہوں، اپنی مٹھیوں سے دیوار پیٹنا چاہتی ہوں، ان پاگلوں کو جان سے مار دینا چاہتی ہوں۔ آخر میمی، میں بھی انسان ہوں۔ برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

میری آنکھوں میں آنسو آ رہے ہیں۔

زلاتا۔

جمعرات ۱۰ جون ۱۹۹۳

پیاری میمی، اس وقت ٹھیک ساڑھے نو بجے ہیں۔ ابا ریڈیو پر ڈوبچے ویلے اسٹیشن لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نیرا پیانو پر انگلیاں چلا رہی ہے اور ایک گیت گا رہی ہے جو اُسے ابھی ابھی سوجھا ہے۔ امی کام پر گئی ہیں اور میں گھر پر ہوں۔ جیسا کہ تم جانتی ہو، میں اسکول میں نہیں ہوں۔

میں صبح سات بجے اٹھی، ہاتھ منہ دھویا، دانت برش کیے، کپڑے پہنے، اپنی آئرن اور وٹامن کی گولیاں کھائیں اور اسکول گئی۔ اور وہاں کیا دیکھا؟ گنتی کے چند بچے۔ استانیوں میں سے بھی صرف ولاستا اور آرٹ کی ٹیچر آئی تھیں اور انھوں نے ہمیں بتایا کہ آج اسکول بند رہے گا۔ ان کو یہی بتایا گیا ہے۔ کیا پھر گولاباری ہو گی؟ اسکول میں، اور میوزک اسکول میں کلاسیں نہیں ہوں گی، اس لیے میں گھر پر ہوں۔ بور ہو رہی ہوں۔ نہیں جانتی تمھیں لکھوں تو کیا لکھوں۔

Scanned with CamScanner

ارے میمی، مجھے ابھی ایک چیز کا خیال آیا ہے۔ منگل کو ایک ناقابلِ یقین واقعہ ہوا۔ وہ یہ کہ میں نے اسمار ریزک کو دیکھا۔ چوتھی کلاس میں وہ میری محبت کا دم بھرتا تھا، مگر پانچویں میں اس کی یہ محبت سرد سی پڑ گئی۔ وہ میرے اور میریا کے بالکل آگے بیٹھتا تھا۔ چھوٹا سا لڑکا! وہ مجھ سے چھوٹا تھا۔ اور اب ۱۷۰ سینٹی میٹر (سو فیصد!) کا ہے! اور تم اس کی آواز تو سنو! گمبھری، گونج دار۔ اس میں خرخراہٹ سی آ گئی ہے۔ وہ بڑا ہو گیا ہے۔ تم کو یقین نہیں آئے گا۔ منگل کے روز سارا دن اپنے آپ سے کہتی رہی: وہ کتنا بڑا ہو گیا ہے، ذرا دیکھو تو!

ناقابلِ یقین!

زلاتا۔

اتوار ۱۳ جون ۱۹۹۳

پیاری میمی، آج مجھے تمھاری پانچ نقلیں ملیں! ان لوگوں نے ان خطوں کے جو میں تمھیں لکھتی ہوں، کچھ حصے چھاپ دیے ہیں۔ میرا مطلب ہے انھوں نے میری تحریر کے فوٹو سٹیٹ بنائے ہیں۔ پہلے صفحے پر میری تصویر ہے اور پچھلے صفحے پر ایک بڑی سی آنکھ! اتنی بُری بات نہیں ہے۔ مگر مجھے اترانا نہیں چاہیے۔

مجھے تم کو یہ بتانا ہے کہ کل میکیچا کی سالگرہ تھی اور میں نے اسے فون پر مبارک باد دی (جنگ کے طریقے کے مطابق)، کیوں کہ باہر گولاباری پھر شروع ہو گئی تھی۔

چیچی پچھلی چند راتوں سے گھر میں نہیں سوئی۔ وہ آوارہ ہو گئی ہے، میمی۔ اس نے خود کو عشقیہ زندگی کے حوالے کر دیا ہے۔ اس میں بالکل سوجھ بوجھ نہیں۔ بلوں کے ساتھ گھومتی پھرتی رہتی ہے۔

زلاتا۔

سوموار ۱۲ اگست ۱۹۹۳

آج پھر صحافیوں، رپورٹروں اور فوٹوگرافروں کا تانتا بندھا رہا۔ وہ اپنی نوٹ بکوں میں لکھتے ہیں، ہماری تصویریں اتارتے ہیں، فلمیں بناتے ہیں اور یہ سب کچھ فرانس، اٹلی، کینیڈا، اسپین اور امریکا چلا جاتا ہے۔ مگر میمی، تم اور میں تو یہیں ہیں، سرائیوو میں، انتظار کرتے ہوئے، ایک دوسرے کے ساتھ۔

کچھ لوگ مجھے این فرینک سے نسبت دیتے ہیں۔ اس پر میمی، میں ڈر جاتی ہوں۔ میں نہیں

چاہتی کہ این کا سا ہولناک انجام میرا ہو۔

زلاتا۔

منگل ۱۰ اگست ۱۹۹۳

پیاری میمی، آج میرے پاس تمھیں سنانے کو ایک نہایت اداس کرنے والی خبر ہے۔ ہماری بلی چیچی اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ ہماری چیچی مر گئی ہے۔ خوفناک! پہلے ببچکو اور اب چیچی! میں آج خالہ بووا کے ہاں گئی اور ادِھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ یہی کہ مجھے سولفیجیو میں C ملا ہے، آنٹی ایرینا نے مجھے پتلون تحفے میں دی ہے، میرے پیانو کے سبق کیسے جا رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ پھر میں نے پوچھا کہ وہ لوگ گزشتہ رات ہمارے ہاں کیوں نہیں آئے۔

خالہ: ہمیں ایک مسئلہ پیش آ گیا تھا۔

میں (بے وقوفی سے): کیا؟

خالہ: ہماری بلی نہیں رہی۔

میں (گھبرا کر): آپ--- آپ کا مطلب ہے، وہ مر گئی؟

میں (کلیجا منہ کو آتا ہوا) مجھے جانا ہے۔ میں اپنے گھر جا رہی ہوں۔ مجھے اپنے گھر جانا ہے، خدا حافظ!

اور گھر پہنچتے ہی میں سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

ابا امی (مل کر): کیوں؟ کیا ہوا زلاتا؟

میں: بلی--- بلی--- ہماری بلی مر گئی!

ابا امی (پھر مل کر): آہ--- آہ!

اور پھر ایک گھنٹے تک رونا دھونا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ ہماری بلی چیچی، دنیا کی سب سے حیران کن، حسین و جمیل، لاڈلی، سب سے پیاری، بہترین بلی--- سچ مچ تُو چلی گئی؟ اس کا سوچ سوچ کر میں اتنا روئی کہ میرے دیدے بہہ گئے۔ میں جانتی ہوں کہ المناک واقعات چاروں طرف ہو رہے ہیں، لوگ ہلاک کیے جا رہے ہیں اور جنگ چھڑی ہوئی ہے--- مگر پھر بھی، مجھے اتنا دکھ ہے، اتنا غم ہے! وہ ہم سب کو خوش کر دیتی تھی، ہمیں ہنساتی تھی، ہمیں بہلائے رکھتی تھی۔ میری نارنجی چیچی، میری سہیلی چیچی!

حارث اور انیس نے اسے صحن میں ببچکو کے ساتھ دفن کیا۔ انھوں نے رنگدار ٹائل لگا کر ننھی سی قبر تیار کی۔ وہ اس کی مستحق تھی۔

میں بہت بہت غمگین ہوں۔

زلاتا۔

جمعرات ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۳

پہاڑیوں پر بیٹھے پاگل لوگوں نے شاید وہ سب پڑھ لیا ہوگا جو میں نے تمھیں گولا باری کی بابت لکھا تھا۔ وہ ہمیں جتانا چاہتے ہیں کہ وہ ابھی گئے نہیں۔ آج انھوں نے پھر بڑے بازار کے آس پاس گولے برسائے ہیں، اور ہم نہیں جانتے کہ نانانانی پر کیا گزری۔ ان جنونیوں نے ہمارا بچپن چھین لیا ہے۔ انھوں نے میرے نانانانی اور دوسرے عمر رسیدہ لوگوں سے ان کا پرسکون بڑھاپا چھین لیا ہے۔ وہ انھیں ان کی آخری عمر میں چین سے رہنے نہیں دے رہے۔

آج میرے اسکول اور میوزک اسکول کی ایک بھی کلاس نہیں ہوئی۔ ہمیں گھر بھیج دیا گیا اس لیے میں آج سارا دن پڑھنے، پیانو بجانے اور نیرا اور حارث سے باتیں کرنے میں گزاروں گی۔ مجھے آج صبح میرنا کے گھر جانا تھا مگر یہ پاگل لوگ گھر سے نکلنے نہیں دیتے۔

میمی، میں نے بتایا نہیں، تم شائع ہو رہی ہو! تم باہر کھلی دنیا میں جا رہی ہو۔ میں تمھیں اس لیے جانے دے رہی ہوں کہ تم دنیا کو وہ باتیں بتا سکو جو میں تمھیں بتاتی رہی ہوں۔ میں نے تمھیں جنگ کے بارے میں، اپنے بارے میں اور جنگ کے دنوں کے سرائیوو کے بارے میں لکھا تھا اور دنیا اسے جاننا چاہتی ہے۔ جو کچھ میں نے محسوس کیا، دیکھا اور سنا وہی لکھا، اور اب سرائیوو سے باہر کے لوگ یہ سب کچھ جان لیں گے۔ جاؤ، دنیا میں تمھارا سفر اچھا گزرے!

زلاتا۔

**

Scanned with CamScanner

سہ ماہی

جامعہ

ترتیب: شمیم حنفی، سہیل احمد فاروقی

جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ماہ نامہ

شب خون

ترتیب و تہذیب: شمس الرحمن فاروقی

رانی منڈی، الہ آباد

ماہ نامہ

رجحانات

مدیر: طاہر اسلم گورا

پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، لوئر مال، لاہور

سہ ماہی کتابی سلسلہ

انشا

مدیر: شاہ انجم

ڈی ۳۵۰، لطیف آباد نمبر ۱۰، حیدر آباد

Scanned with CamScanner

۲

بانس سولمان: فوٹوگراف

جان سولین: خون میں لتھڑی سڑکیں

لوئیز میک کورکنڈیل: سرائیوو کی محصور عورتیں

مایا فش: سرائیوو کا سفر

ناگا بُوتورووِچ: پاتال سے

مارک پونتھس: سرائیوو کا نوحہ

اقبال احمد: اقوامِ متحدہ: ایک وفات نامہ

رابرٹ فِسک: گویا مارکس ہی کی بات درست نکلی

زوران فِلیپووِچ: جہنّم کا ایک موسم

سلاوینکا دراکولیچ: موت کا کلوز آپ

بورو تودورووِچ: میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں!

انتخاب کے اس حصے میں چند متفرق اخباری مضامین پیش کیے جا رہے ہیں۔ یہ مضامین سابق یوگوسلاویا کی ریاستوں کے علاوہ دیگر ملکوں کے اخبار نویسوں، ادیبوں اور فن کاروں نے تحریر کیے ہیں اور بوسنیا کی صورتِ حال کے مختلف پہلوؤں پر جداجدا نقطۂ نظر سے روشنی ڈالتے ہیں۔

***

ہانس مولمان (Hans Moleman) ایک ولندیزی اخبار نویس ہیں۔ سربیا سے تعلق رکھنے والے پریس فوٹوگرافر بویان استویانووچ (Bojan Stojanovic) کے بارے میں ان کا یہ مضمون برطانوی اخبار "گارڈین" میں ترجمہ کر کے شائع کیا گیا تھا۔ بلغراد میں متواتر دھمکیوں اور انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بننے کے بعد استویانووچ نے ہالینڈ میں سیاسی پناہ لے لی۔ "گارڈین" نے اس مضمون کے آخر میں یہ اضافہ کیا ہے:

> ایمسٹرڈیم کے اخبار de Volksrant میں مندرجہ بالا رپورٹ کے چھپنے کے بعد: ہالینڈ میں سربوکروٹ بولنے والے دو حملہ آوروں کے ہاتھوں اغوا کیے جانے کی کوشش کی دوران استویانووچ چلتی گاڑی سے نہر میں چھلانگ لگا کر بھاگ نکلا۔ اس واقعے کے بعد سے اسے ڈچ پولیس کا تحفظ فراہم کر دیا گیا ہے۔ ڈچ صحافیوں کی یونین NVJ اس کی مالی معاونت کر رہی ہے۔

***

سرائیوو کے مرکزی بازار میں شیلنگ سے ہونے والی تباہی کی رپورٹ جس کا ترجمہ یہاں "خون میں لتھڑی سڑکیں" کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے، جان مولین (John Mullin) نے تحریر کی اور ۱۳ فروری ۱۹۹۴ کے "گارڈین ویکلی" میں شائع ہوئی۔

***

لوئیز میک کورکنڈیل (Louise McCorkindale) اسکاٹ لینڈ میں یونیورسٹی کی استاد اور سماجی کارکن ہیں۔ انھوں نے انسانی امداد کے ایک وفد کی رکن کی حیثیت سے مارچ اور جون ۱۹۹۳ کے درمیان سرائیوو کے دورے کیے۔ ان کے جس مختصر مضمون کا ترجمہ یہاں "سرائیوو کی محصور عورتیں" کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے، وہ انھوں نے جولائی ۱۹۹۳ میں لندن میں ہونے والے بین الاقوامی تھیئٹر فیسٹول میں پڑھا تھا۔

***

مایا فش (Maja Fish) سرائیوو کی رہنے والی ہیں اور آج کل بی بی سی کے مانیٹرنگ کے شعبے میں سربوکروٹ مانیٹر کے طور پر ملازم ہیں۔ ان کے انگریز شوہر جیم فش بی بی سی ورلڈ سروس ٹیلی وژن سے رپورٹر کے طور پر وابستہ ہیں۔

***

ناٹکا بُوتورووچ (Natka Buturovic) بلغراد سے شائع ہونے والے اخبار *Borba* کے عملے میں شامل ہیں اور اس اخبار کے لیے جنگ شروع ہونے سے لے کر نومبر ۱۹۹۲ تک سرائیوو کے حالات کی رپورٹنگ کرتی رہی ہیں۔

***

مارک پونتھس (Mark Ponthus) ایک یوروپی موسیقار ہیں جنھوں نے دسمبر ۱۹۹۳ میں سرائیوو کے رہنے والوں کے لیے وہاں ایک کنسرٹ پیش کیا۔

***

اقبال احمد (Eqbal Ahmad) ایک پاکستانی اسکالر اور اخبار نویس ہیں۔ وہ ماساچوسٹس کے ہمپشائر کالج میں استاد ہیں اور روزنامہ "ڈان"، کراچی، میں مختلف موضوعات پر ان کے مضامین اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔

***

رابرٹ فِسک (Robert Fisk) برطانوی اخبار "انڈیپنڈنٹ" کے مشرقِ وسطیٰ کے نامہ نگار ہیں۔

***

زوران فلپووچ (Zoran Filipovic) بوسنیا کے رہنے والے ہیں اور جنگِ بلقان کے موضوع پر ان کی متعدد تحریریں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ ایک ماہر فوٹوگرافر بھی ہیں اور ان کی کھینچی ہوئی تصویریں مختلف بین الاقوامی رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ فلپووچ نے محصور سرائیوو کی صورتِ حال کو اپنی فوٹوگرافی کا موضوع بنایا اور ان تصویروں کی نمائش "جہنم کا ایک موسم" کے عنوان سے سرائیوو میں جولائی ۱۹۹۴ میں ہوئی۔ فلپووچ آج کل زگرب، کروشیا، میں مقیم ہیں۔

***

سلاوینکا دراکولچ (Slavenka Drakulic) کروشیا سے تعلق رکھنے والی اخبار نویس اور ادیب ہیں۔ ان کی تصانیف میں *How We Survived Communism and even Laughed* (۱۹۹۲)، *Balkan Express* (۱۹۹۳) اور *Marble Skin* (۱۹۹۳) شامل ہیں۔

***

بورو ٹودوروچ (Boro Todorovic) بلغراد سے تعلق رکھنے والے ایک اداکار ہیں جنھوں نے سربیا کی جارحانہ اور جنگی جنون پر مبنی قومی اُمنگوں کا ساتھ دینے سے واضح الفاظ میں انکار کیا۔ جو متن یہاں "میں تمھارے ساتھ نہیں ہوں!" کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے، وہ تودوروچ کے ایک انٹرویو پر مبنی ہے جو انھوں نے بلغراد کے آزاد ٹیلی وژن اسٹیشن YUTEL کو دیا تھا۔ اس متن کو بی بی سی کے میشا گلینی (Misha Glenny) نے اپنی کتاب *The Fall of Yugoslavia* (پنگوئن، ۱۹۹۲) میں پیش لفظ کے طور پر شامل کیا ہے۔

***

ہانس مولمان

ترجمہ: عرفان احمد خاں

فوٹو گرافر

بہت ہو چکا تھا۔ بلغراد کی جیل میں دو مہینے، اس کے والدین کے گھر پر تین حملے اور فون پر سوّر کی طرح ذبح کر دیے جانے کی لاتعداد دھمکیاں -- اس کے بعد فروری ۱۹۹۳ میں بویان استویانوِچ (Bojan Stojanovic) سربیائی قوم پرستی کی دہشت سے تنگ آ کر ملک چھوڑ گیا۔

اُن ہزاروں لوگوں کی طرح جو سابق یوگوسلاویا چھوڑ کر جا چکے ہیں، وہ اب ہالینڈ میں رہتا ہے، لیکن ۲۳ سالہ استویانوِچ کوئی عام پناہ مانگنے والا (assylum seeker) نہیں ہے۔ بلغراد کے اس نوجوان فوٹوگرافر کی کھینچی ہوئی ان تصویروں کو دنیا بھر کے اخباروں نے پچھلے سال پہلے صفحے پر چھاپا تھا جن میں شمالی بوسنیا کے ایک چھوٹے سے قصبے برچکو (Brcko) میں ایک سربیائی پولیس والے کو ایک مسلمان کو قتل کرتے دکھایا گیا تھا۔ ان میں سے ایک تصویر کو ورلڈ پریس فوٹو ایوارڈ کے اسپاٹ نیوز کے شعبے میں اول قرار دیا گیا تھا اور اپریل ۱۹۹۳ میں ایمسٹرڈیم میں اسے یہ انعام دیا گیا۔

یہ تصویریں مئی ۱۹۹۲ کی ہیں جب باقی دنیا کو بوسنیا میں کنسنٹریشن کیمپوں، موت کے اسکواڈز اور جنسی تشدد جیسے واقعات کے بارے میں کچھ بھی پتا نہ تھا۔ یہ اُن اوّلیں تصویروں میں سے تھیں جنھوں نے سربوں کے ہاتھوں نسلی خالصیت کی ہولناک کارروائیوں کی شہادت فراہم کی۔ ان تصویروں نے گہرا تاثر قائم کیا اور سربیا کے خلاف عالمی مذمت پیدا کرنے میں حصّہ لیا۔ انھیں تصویروں نے رائٹر نیوز ایجنسی کے لیے کبھی کبھار کام کرنے والے اس غیر معروف شخص کو سرب قوم پرستوں کی نگاہ میں غدّار بنا دیا۔ استویانوِچ کا اپنا خیال یہ ہے کہ وہ محض اپنا کام کر رہا ہے، یعنی جنگ کی حقیقتوں کو دکھانا۔

وہ کہتا ہے: "پچھلے سال ۵ مئی کو میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بلغراد سے سرائیوو جا رہا

Scanned with CamScanner

تھا۔ برچکو کے قریب ہم نے سنا کہ وہاں کچھ ہو رہا ہے۔ جب ہم قصبے میں پہنچے تو ہمیں ایک گلی میں کچھ لاشیں پڑی دکھائی دیں۔ میں نے جھپٹ کر اپنا کیمرا اٹھا لیا، اور چند ہی لمحوں بعد ایک پولیس والا اور ایک فوجی، ہتھکڑی لگے دو آدمیوں کو آگے آگے دھکیلتے ہوئے، ہمارے پاس سے گزرے۔ "جب پولیس والے نے ان میں سے ایک قیدی کو مارنے کے لیے اپنی بندوق سیدھی کی تو استویا نووِچ نے اپنے نِکون کیمرے کا رُخ اُدھر کیا اور موٹر ڈرائیو آن کر کے شٹر دبا دیا۔ فوکس کرنے کا موقع نہ تھا۔

اس خوف سے کہ کہیں کیمرا ضبط نہ ہو جائے، اس نے فلم کو نکال کر اپنے موزے میں چھپا لیا۔ لیکن پولیس والے اور فوجی نے استویا نووِچ پر کوئی دھیان نہ دیا۔ "میرا خیال ہے وہ قتل کے مشغلے میں بُری طرح مصروف تھے۔"

استویا نووِچ نے اسی وقت تصویریں بلغراد میں واقع رائٹر کے دفتر پہنچانے کا فیصلہ کیا۔ برچکو سے ذرا باہر نکل کر انھوں نے ایک اور منظر دیکھا: گوشت لے جانے والی سرد خانے کی گاڑی ایک فوجی گاڑی کے ساتھ ساتھ بڑی سڑک سے ایک بغلی گلی میں مڑ رہی تھی۔ انھوں نے گاڑیوں کا پیچھا کیا اور پھر برچکو کے مقتولوں کی لاشوں کو گاڑیوں سے گھسیٹ کر باہر نکالے اور اجتماعی قبر میں ڈالے جاتے دیکھا۔

"ان چند دنوں کے اندر اندر برچکو اور آس پاس کے علاقوں میں تقریباً تین ہزار مسلمانوں کو قتل کیا گیا،" استویا نووِچ نے بتایا۔ "ہم وہاں کچھ فوجیوں سے ملے اور ان میں سے ایک نے، جس کی عرفیت اڈولف تھی، چھ سو آدمیوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا تھا۔ لیکن صرف سرب ہی قصوروار نہیں، اس جنگ میں ہر کوئی ہر کسی کو قتل کر رہا ہے۔"

برچکو کی تصویریں جب بیرونی دنیا تک پہنچیں تو ادھر استویا نووِچ کی مصیبت کی ابتدا ہو گئی۔ باوجود اس کے کہ رائٹر نے تصویریں جاری کرتے وقت فوٹوگرافر کے طور پر اس کا نام جان بوجھ کر بدل دیا تھا، چند دن بعد سربیائی ٹیلی وژن کی ایک کیمرا ٹیم اُس کے گھر آ پہنچی۔ اس کا پاسپورٹ فوٹو ٹی وی پر دکھایا گیا، اور اس کی کھینچی ہوئی تصویروں کے چھپنے کے دس دن بعد اس کے گھر کے دروازے کے سامنے ایک بم پھٹا۔ ایک ہفتے بعد ایک چلتی ہوئی گاڑی سے اس کے گھر پر کلاشنکوف سے فائرنگ کی گئی۔ "میں اُس وقت گھر پر نہیں تھا، لیکن میری ماں نے اُن کو آتے دیکھ لیا اور اندر بھاگی۔ کوئی زخمی نہیں ہوا لیکن بعد میں مَیں نے دیوار پر گولیوں کے ۲۶ نشان دیکھے۔"

موسمِ گرما کے دوران اسپلٹ، ڈُبراونِک اور سرائیوو میں کام کرنے کے بعد ستمبر ۱۹۹۲

استویانووچ بلغراد واپس آیا۔ پولیس نے اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی کیوں کہ یہ بات بہت مشکوک نظر آتی تھی کہ اپنے سرب نام کے باوجود اس کو بوسنیا اور کروشیا میں آزادنہ کام کرنے میں کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا تھا۔ اس نے سازش کی ایک بے سروپا تھیوری سنی۔ "میرے بارے میں خیال کیا جارہا تھا کہ میں برطانوی سیکرٹ سروس M16 کے لیے کام کرتا ہوں، میری برچکو والی تصویریں محض پروپیگنڈا ہیں اور مجھے بیس ہزار ڈالر دیے گئے تھے تاکہ میں پولیس والے کو قیدی کو قتل کرنے کے لیے رشوت دے سکوں۔"

جب یوروپی برادری نے سربیا پر عائد پابندیوں کو سخت کرنے کا اعلان کیا تو بائیکاٹ کے اقدامات کی خبروں کے ساتھ استویانووچ کی کھینچی ہوئی تصویریں بھی سربیائی ٹی وی پر دوبارہ دکھائی گئیں۔ ہزاروں لوگ اس کے گھر پر فون کرنے لگے۔ "غدّار! ہم تمھیں سوّر کی طرح ذبح کر دیں گے!" اسے بتایا گیا۔

اس کے بعد اُسے ایک ایسی عورت کے قتل کے شبہے میں گرفتار کر لیا گیا جس وہ جانتا تک نہیں تھا۔ وہ دو مہینے جیل میں پڑا رہا۔ "وہ مجھے ربڑ کی سونٹی سے مارتے تھے۔ انھوں نے تین ہفتے قیدِ تنہائی میں رکھ کر میرا حوصلہ توڑنے کی کوشش کی۔ میری رہائی سے چند روز پہلے، ورزش کے وقفے کے دوران، ایک اور قیدی نے مجھے پیچ کس گھونپ کر زخمی کرنے کی کوشش کی۔ میں اس آدمی کو نہیں جانتا تھا۔ مگر محافظوں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے ہی اسے مجھ پر حملہ کرنے کو کہا ہو گا۔"

اوائل جنوری میں رہا ہونے پر اسے پتا چلا کہ اس کا تمام فوٹوگرافی کا سامان، چار ہزار نگیٹوز، پاسپورٹ اور دوسری ذاتی چیزیں گھر سے غائب ہو چکی ہیں۔ وہ ایک دوست کے ساتھ چوری چھپے بلغاریا کی سرحد پار کر کے سوفیا چلا گیا۔

"میرے پاس پاسپورٹ نہیں تھا، اس لیے میں نے رات کے وقت ٹرین کی چھت پر بیٹھ کر سرحد پار کی۔" ۱۶ فروری کو اسے رائٹر میں کام کرنے والے ایک شخص کی زبانی پتا چلا کہ اس کی تصویر کو ورلڈ پریس فوٹو کی جیوری نے انعام دینے کے لیے چُنا ہے۔ "مجھے بہت فخر محسوس ہوا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ کسی یوگوسلاو فوٹوگرافر نے یہ انعام جیتا ہو۔"

چند روز بعد کسی نے بلغراد میں اس کے گھر پر دستی بم پھینکا۔ استویانووچ فروری کے آخر میں جب انعام لینے ہالینڈ آیا تو اس نے وہیں پناہ لینے کا فیصلہ کیا۔

**

Scanned with CamScanner

جان مولین

ترجمہ: اجمل کمال

خون میں لتھڑی سڑکیں

بچ نکلنے کا کوئی راستا نہیں تھا۔ وہ سب ہر روز مرکالہ کے بازار میں، دھات کی میزوں اور بارش سے بچاؤ کے ترپالی سائبانوں کے اس جمگھٹے میں، آتے ہی تھے۔ اور وہاں سیکڑوں کی بھیڑ لگ جاتی تھی۔ جنگ کے دنوں میں یہ جگہ اشیا کے تبادلے کے مقام سے کچھ زیادہ اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ سرائیوو کے رہنے والوں کے لیے یہ بازار روزمرہ کی کم و بیش نارمل چہل پہل کی علامت بن گیا تھا۔ یار دوستوں سے ملنے، گپ شپ کرنے اور دکانوں میں رکھی اُن چیزوں کو تاکتے رہنے کی جگہ جن کو خریدنا ان کے بس سے باہر تھا۔

یہ بازار مارشل ٹیٹو اسٹریٹ پر واقع تھا جو شہر کے پُرانے، ترک محلّے کو جانے والی بڑی سڑک ہے۔ اور تھوڈوکس چرچ، کیتھولک کلیسا اور یہودیوں کا میوزیم اس جگہ سے چند گز کے فاصلے پر تھے۔ تین پہلوؤں پر سہ منزلہ عمارتوں سے گھرا یہ مصروف بازار گویا ایک بند ڈبّا تھا جہاں کوئی بھی دھماکا انتہائی ہیبت ناک نتائج پیدا کر سکتا تھا۔

بوسنیا کے محصور دارالحکومت سرائیوو کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے، پہاڑوں پر بیٹھے سرب ملیشیا کے سپاہی اسے اپنے بالکل سامنے دیکھ سکتے تھے۔ پہلے پہل کی رپورٹوں سے اندازہ ہوا کہ ۱۲۰ ملی میٹر کا یہ شیل شہر کے شمال میں واقع مرکوویچی کی پہاڑی کی طرف سے آیا تھا۔

دست فروشوں نے اپنا مال دھات کی بنی میزوں پر سجا رکھا تھا جنھیں ہمیشہ بالکل صاف ستھرا رکھا جاتا تھا۔ اس سامان میں جوتے اور کپڑے، ناخنوں کی آرائشیں اور فلیٹوں کی بالکنیوں میں اگائی ہوئی سبزیاں شامل تھیں۔ لوگ فائرنگ کا سامنا کرتے ہوئے گھر سے باہر نکلنے کے خوف سے کب کے بے نیاز ہو چکے تھے۔ متواتر شیلنگ نے دو ایک دنوں کے لیے ضرور سڑکوں کو سنسان کر دیا تھا، لیکن سرائیوو کے شہری جلد ہی دوبارہ گلیوں میں نکل آئے، ان کا موت کو خاطر میں نہ لانے کا رویہ برقرار تھا۔

Scanned with CamScanner

سنیچر کے دن دوپہر ساڑھے بارہ بجے کی چہل پہل میں وہ ہلاکت خیز شیل آ کر گرا۔ وہ بازار کے وسط میں رکھی ہوئی ایک دھات کی میز پر لگا۔ بارود کے ٹکڑوں میں سائبانوں کو تھامنے والی سلاخوں اور میزوں کے ٹوٹے ہوئے حصے بھی شامل ہو گئے۔ لوگ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئے۔

۲۲ مہینوں پر پھیلے ہوئے اس محاصرے کے دوران قتلِ عام کی یہ سب سے بڑی واردات تھی۔ شہر کے میئر محمود کریسلویا کووِچ کا کہنا تھا کہ پچھلے پانچ سو سالہ تاریخ میں موت اس شہر پر ایسی قساوت سے حملہ آور نہیں ہوئی تھی۔ سر جسموں سے الگ ہو کر دور جا پڑے تھے۔ ان میں ایک سر ایک میز پر رکھے کپڑوں کے ڈھیر میں گرا تھا۔ بازو اور ٹانگیں ہر طرف بکھری پڑی تھیں۔ خون بہہ کر گٹر میں جا رہا تھا۔ سانحے کی اطلاع پا کر آئے ہوئے پولیس والے اُلٹیاں کر رہے تھے۔

وہ طبی کارکنوں کے ساتھ مل کر مرے ہوؤں کو زندوں سے الگ کرنے کے ناممکن کام میں مصروف تھے۔ لیکن اس سے بھی بدتر کام ابھی باقی تھا، اور وہ تھا بکھرے ہوئے جسم کو اس کا سر یا بازو یا ٹانگ لگا کر پورا کرنا۔ ڈاکٹر علیا ہوزچ کا کہنا تھا کہ اکثر لاشیں اس قدر مسخ ہو چکی ہیں کہ انھیں شناخت کرنا ممکن نہیں ہے۔ لاشوں کا گننا بھی دشوار تھا کیوں وہ بے شمار ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی تھیں۔

مردہ خانے کے باہر سرائیوو کے رہنے والے باپ، مائیں، بیٹے اور بیٹیاں قطار لگائے منتظر کھڑے تھے۔ ایک افسر ہاتھ میں فہرست لیے باہر آیا۔ ہر نام کو سن کر غم ناک چیخیں بلند ہوتیں۔ ایک شخص کے حلق سے نکلنے والی ان چیخوں میں دوسرے شخص کے لیے امید کی ہلکی سی چبھن تھی۔ لیکن جلد ہی یہ امید خاک میں مل جاتی۔

پچھتر سالہ وزانکو پشکو اُن بدنصیبوں میں شامل تھا جو شیل پھٹنے کے وقت بازار میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ کوسیوو اسپتال میں ایک اسٹریچر پر پڑا تھا جس پر خون کے تھکے جمے ہوئے تھے۔ اس کی ٹانگوں کا قیمہ بن گیا تھا۔ "میں وہاں سے گزر رہا تھا،" اس نے کہا۔ "اچانک مجھے زور کا دھکا لگا اور میں زمین پر گر پڑا۔ مجھے اپنے ارد گرد بے شمار لوگ زخموں سے چُور پڑے دکھائی دیے۔"

زخمیوں کو اقوامِ متحدہ کے فوجی اسپتال، کوسیوو اسپتال اور فرنچ اسپتال میں لے جایا گیا۔ آخر الذکر اسپتال ایک دس منزلہ عمارت میں واقع ہے جسے اس قدر شیلنگ کا نشانہ بننا پڑا ہے کہ اس کی چھ اوپری منزلیں استعمال کے قابل نہیں رہیں۔ البتہ چار نچلی منزلیں ارد گرد کی عمارتوں کی اوٹ میں ہونے کے باعث اب تک محفوظ ہیں۔ اور ڈاکٹر انھیں چار منزلوں میں اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ باہر نکلنے کے دروازے پر سرائیوو کے اب تک کے مرنے والوں کے ناموں کی فہرست چپکی ہوئی ہے۔ بائیس مہینوں میں ۹۹۰۰ افراد مارے جا چکے ہیں۔

**

Scanned with CamScanner

لوئیز میک کورکنڈیل

ترجمہ: اجمل کمال

سرائیوو کی محصور عورتیں

میرے الفاظ بہت سی آوازوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایک آواز میری اپنی ہے، ایک اجنبی امدادی کارکن کی آواز۔ اس سے کہیں زیادہ اہم سرائیوو اُن عورتوں کی آوازیں ہیں جنھوں نے مجھے اپنی کہانیاں سنائیں: یہ آوازیں میری وساطت کے بغیر آپ تک نہیں پہنچ سکتی تھیں کیوں کہ وہ ایک دوسرے ملک کے مرتے ہوئے شہر میں محبوس ہیں۔

مجھے اپنی کہانیاں سناتے ہوئے، آج کے سرائیوو کی زندگی کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے اور اُس زندگی کے بارے میں بتاتے ہوئے جو یہاں پہلے موجود تھی اور اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکی ہے، ان میں سے بہت سی عورتیں رونے لگیں۔ "ہم ہمیشہ اس طرح نہیں رہتے تھے،" وہ اس ذلت کے بوجھ تلے دب کر کہہ اٹھتی تھیں کہ وہ اپنی مہمان کو قہوے کی پیالی یا پانی کا گلاس تک پیش نہیں کر سکتیں جو اُن کی روایتی میزبانی کی بنیاد ہوا کرتا تھا۔ "جنگ سے پہلے ہمارے پاس وہ سب کچھ تھا جو یوروپ کے عام باشندوں کے پاس ہوتا ہے۔ ہم سفر پر جاتے تھے، کام کرتے تھے، تھیئٹر دیکھتے تھے، رات کے کھانے پر دوستوں کو بلاتے تھے۔ اب ہم سڑک کے کنارے کھانا لینے کے لیے دھکّے کھاتے ہیں۔ اب ہم مہمان کو قہوہ تک پیش نہیں کر سکتے۔"

ہر عورت کے پاس اپنی کہانیاں تھیں۔ اُن شوہروں کی کہانیاں جنھیں چیتنکوں نے انسانی ڈھال بنا کر قتل کر دیا، اُن بھائیوں کی کہانیاں جو دو کلومیٹر دور محاذ پر مارے گئے، اُن دوستوں کی کہانیاں جو روٹی کی قطار میں کھڑے تھے اور شیل لگنے سے ہلاک ہو گئے، ان گھروں کی جو اُجڑ گئے، اُن بچوں کی جو ٹھنڈے بستروں میں سوتے رہ گئے اور شیلوں نے ان کے کمروں کو برباد کر دیا۔ یہ کہانیاں سناتے ہوئے بہت سی عورتیں خوف اور کم زوری سے لرزنے لگتی تھیں۔

اُن کی کم زوری کا سبب ۱۴ مہینوں کی کم خوراکی ہے اور وہ بے پناہ خوف جو اپنے پیاروں کے لیے ان پر ہر وقت طاری رہتا ہے، اور ان کے گھر سے نکلتے وقت زندہ واپس آنے کی دعائیں،

Scanned with CamScanner

اور یہ کاٹ دینے والا احساس کہ شاید آج کے بعد وہ دوبارہ دکھائی نہیں دیں گے، اور یہ خیال کہ ان کا خاتمہ اذیت ناک اور خون آلود ہو گا۔ چودہ مہینے سے وہ اپنے بچوں کو گھر سے باہر نکلنے سے روک رہی ہیں کہ کہیں وہ گلی میں کھیلتے ہوئے کسی شیل یا اسنائپر کی گولی کا نشانہ نہ بن جائیں۔ چودہ مہینے سے اپنے دسویں منزل کے ٹوٹے پھوٹے، بجلی اور گیس سے محروم فلیٹ میں استعمال ہونے والے پانی کو دور سے بھر بھر کر لا رہی ہیں۔ چودہ مہینے سے اپنے چاروں طرف شیل پھٹنے کی متواتر آوازیں، اور یہ مستقل خیال کہ شاید اگلا شیل انہیں کی دیوار توڑتا ہوا اندر گھس آئے گا اور انہیں خون آلود ڈھیر میں بدل دے گا۔ چودہ مہینے سے زندہ رہنے کی تھکا دینے والی کوشش، ریڈیو کی آواز تیز کر کے اور کھیلوں میں لگا لگا کر بچوں کو بہلانے کی کوشش، کہ جو خوف ان کے ننھے دلوں میں اتر گیا ہے تھوڑا بہت زائل ہو سکے۔

اور یہ ماؤں کی سب سے دل خراش تکلیف ہے، بچوں کا دکھ، اس بات کا دکھ کہ وہ اپنے بچوں کو پیٹ بھر کھانا نہیں دے سکتیں، نہ انہیں وہ جوش و خروش، وہ تعلیم، وہ آزادی اور وہ نشوونما فراہم نہیں کر سکتیں جس سے بچپن کے دن عبارت ہوتے ہیں۔ والدین کی یہ بے بسی کہ وہ اپنے بچوں کو پرورش اور تحفظ فراہم نہیں کر سکتے اس مایوسی کا سب سے گہرا سبب ہے جو رفتہ رفتہ شہر کا گلا گھونٹ رہی ہے۔

میری جن عورتوں سے بات ہوئی وہ سب مضطرب اور دل شکستہ تھیں: مارچ کے بعد اب دوبارہ اس شہر میں آ کر مجھے ان کے حوصلے میں زبردست کمی محسوس ہوئی۔ تب وہ اور مصیبتوں کے علاوہ وہ شدید ٹھنڈ کا بھی سامنا کر رہی تھیں، لیکن ان میں مزاحمت کا حوصلہ تھا، امید تھی کہ "بس یہ جاڑا کسی طرح کٹ جائے۔۔۔"

سردیاں گزر چکی ہیں اور کچھ بھی نہیں بدلا۔ بس اتنا ہوا ہے کہ گزرتے دنوں اور آتے جاتے موسموں نے لوگوں میں ان کے قید میں ہونے کا احساس اور گہرا کر دیا ہے اور یہ خیال کہ یہ جنگ، درد اور محرومی میں زندگی کو جاری رکھنے کی یہ تھکا دینے والی جدوجہد، زندگی اور امید کا مذاق اڑا رہی ہے۔ اور سب سے دردناک یہ خیال کہ اس صورتِ حال کا کبھی خاتمہ نہیں ہو گا: کسی مستقبل، کسی بہتری، کسی بچاو کی امید نہیں ہے۔

سرائیوو میں بہادری کا مطلب خطرہ مول لے کر کوئی عظیم کارنامہ سرانجام دینا نہیں ہے۔ سرائیوو میں بہادری کا مطلب ہر روز، ہر گھنٹے زندگی کو جاری رکھنے کے حق میں فیصلہ کرنا ہے: صبح اٹھنا، کپڑے بدلنا، آٹے اور تیل کے امدادی راشن سے کھانا تیار کرنا، اسنائپروں کی گولیوں کے درمیان سے گزر کر کسی دوست سے ملنے جانا، خود کو صرف اس خیال سے صاف ستھرا رکھنا کہ یہ بھی

Scanned with CamScanner

مزاحمت کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ اور یہ سب جی اُلٹ دینے والے خوف، ڈوبتی ہوئی امید اور اس بڑھتے ہوئے احساس سے دوچار ہوتے ہوئے کرنا کہ تمہارے گھر میں اور تمہارے وجود میں جو کچھ تھا وہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ چکا ہے اور اب اس کی جگہ زندگی کی بربریت نے احمقوں کی جنت کی ایک تلخ یاد کے سوا کچھ باقی نہیں چھوڑا ہے۔

اس شہر میں امید مر چکی ہے، سو اَب شہر بھی مر رہا ہے۔ امید کی موت میڈیا ایونٹ نہیں ہوتی۔۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں مرنے والے کو دفن کرتے ہوئے لوگوں کے قابلِ رحم ہیولے دکھائی نہیں دیتے۔۔ اس لیے یہ موت باہر والوں کی توجہ کے دائرے میں نہیں آسکی۔ عالمی بے حسی چیتنکوں کی تریب کی بربریت کو تقویت دے رہی ہے جو محاصرہ، بھوک، دہشت اور یاس، ہر چیز کو استعمال کرتے ہوئے سرائیوو کے وبنے والوں کو نیست و نابود کر رہے ہیں۔ سرائیوو کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر ہی قبولیت سے رہتے تھے کہ کسی مرد اور عورت کو شادی کرنے سے پہلے یہ پوچھنے تک کا خیال نہیں آتا تھا کہ ان کے رفیقِ زندگی کے خاندان کا مذہب کیا ہے۔ یہ باہمی قبولیت، یہ مثال کہ انسانی معاشرہ کس بلندی پر پہنچ سکتا ہے، چودہ مہینوں کے مسلسل محاصرے کے باوجود اب تک باقی ہے۔ لیکن شہر کی مرتی ہوئی امید کے ساتھ ساتھ یہ بھی مرتی جارہی ہے۔

میں شہر کے غریب محلوں میں گئی اور اُن عورتوں سے دوبارہ ملی جن سے چند مہینے پہلے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ کچھ اَور دُبلی، کچھ اَور کمزور ہو چکی تھیں، اس امدادی راشن کے سہارے زندہ رہنے کی جدوجہد کر رہی تھیں جو سرائیوو کے انتہائی غیر معمولی حالات کے لحاظ سے نہایت ناکافی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اور دردناک انداز میں زندگی سے دور سرکتی جارہی ہیں۔ ان کی بہادری دیکھ کر طبیعت متلانے لگتی ہے، ناگزیر کا مقابلہ کرتا ہوا ان کا عزم احمقانہ معلوم ہوتا ہے۔ اِس بار انھیں بیرونی دنیا سے، ہنسی مذاق اور گفتگو سے کوئی دل چسپی باقی نہیں رہ گئی تھی۔

"باقی یوروپ نے ہمیں کیوں چھوڑ دیا ہے؟" مجھ سے یہ سوال بار بار کیا گیا۔ "آپ لوگ ہمیں گولیوں اور شیلوں کی خوراک بننے کے لیے کیوں پال رہے ہیں؟" میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

امداد لیتے ہوئے لوگ میرا ہاتھ چومتے اور بتاتے کہ انھیں باہر کی دنیا سے تحفے وصول کر کے کس قدر خوشی ہوتی ہے۔ محض اس لیے نہیں کہ اس سے ان کی ضرورت پوری ہو رہی ہے، بلکہ اس لیے کہ انھیں احساس ہوتا ہے کہ باہر، دنیا میں، کوئی ہے جو اُن کے لیے فکرمند ہے۔ لیکن ممنونیت کے پہلو بہ پہلو ان کا یہ تلخ احساس بھی قائم رہتا ہے کہ اس امداد کو مختلف ملک (مثلاً ہمارا

Scanned with CamScanner

ملک برطانیہ) کس طرح سیاسی مقصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

"تم لوگ مسلمانوں کو کھلا پلا رہے ہو تاکہ چیتنک ان کا شکار کھیل سکیں۔"

"ہم لوگ بھوک سے نہیں، جنگ سے مر رہے ہیں۔ آپ ہمیں امداد صرف اس لیے دے رہے ہیں کہ اپنے ضمیر کو مطمئن رکھ سکیں۔"

"تم لوگ نہ ہمیں اپنا دفاع کرنے دیتے ہو نہ خود ہماری حفاظت کرتے ہو۔"

"چیتنک اُس وقت تک انتظار کریں گے جب ہم کمزور ہو کر لڑنے کے قابل نہ رہیں۔ پھر وہ ہم سب کو مار ڈالیں گے۔"

سرائیوو کے لوگوں نے میرے پچھلے دو دوروں میں مجھے اپنی کہانیاں سنائی تھیں تو یہ سوچ کر کہ باقی یوروپ کو علم نہیں ہے کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اگر علم ہوتا تو وہ اس آہستہ رو، ہلاکت خیز بربریت کو روکنے کے لیے ضرور کچھ کرتا جو اس شہر کی تہذیب کو، اور باقی دنیا میں تہذیب کے امکان کو، ختم کرنے کے لیے کی جا رہی ہے۔ تیسری بار مجھے وہاں صرف اس خیال سے کہانیاں سنائی گئیں کہ میں ان کی بات سننے کے لیے وہاں موجود تھی۔ ورنہ ان لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہو چکا ہے کہ انھیں تنہا چھوڑ دیا گیا ہے اور اُن پر دنیا کی توجہ کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ انھیں سیاسی اور اقتصادی منافعے کے لیے استعمال کر سکیں جن کے دل برتری اور خوشحالی کے باعث پتھر کے ہو گئے ہیں۔

مجھے سرائیوو کے لوگوں کو یہ اطلاع دینے کی ضرورت نہیں پڑی کہ دنیا نے انھیں دھوکا دیا ہے، اس لیے نہیں کہ انھوں نے اپنی کہانیاں نہیں سنائیں بلکہ اس لیے کہ ان کی کہانیاں سننے یا ان کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہونے والے لوگ کہیں نہیں ہیں۔ میں نے سرائیوو کی عورتوں کی آوازیں آپ تک پہنچانے کا ذریعہ بننے کی کوشش اس لیے کی ہے کہ شاید کسی طرح یہ آوازیں بے حسی کی اس دیوار کے پار پہنچ سکیں جس نے سرائیوو کا محاصرہ کر رکھا ہے۔

**

Scanned with CamScanner

مایا فش

ترجمہ: اجمل کمال

سرائیوو کا سفر

"آپ برطانیہ میں کتنا عرصہ ٹھہرنا چاہتی ہیں؟" جب میں لندن جانے والی ایک پرواز پر سوار ہونے کے لیے پہنچتی ہوں تو برسلز ایرپورٹ پر ایک نوجوان افسر مجھ سے سوال کرتی ہے۔

"میں وہیں رہتی ہوں۔"

"اچھا اچھا، مگر میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ کو وہاں کب تک ٹھہرنے کی اجازت دی گئی ہے؟" وہ اپنی بات پر اصرار کرتی ہے۔

میں اُسے اپنے پاسپورٹ پر لگی مہر دکھاتی ہوں جس کی رو سے مجھے لندن لوٹنے اور غیر معیّنہ مدّت تک ٹھہرنے کی اجازت حاصل ہے۔

"ٹھیک ہے، لیکن آپ کے ویزا کی کوئی معیاد تو ہوگی۔" ظاہر ہے کہ وہ بات کو سمجھ نہیں پا رہی ہے۔

"بابا، میں وہیں رہتی ہوں، میرے شوہر اور بچے بھی وہیں رہتے ہیں اور مجھے کسی ویزا کی ضرورت نہیں ہے!" میری آواز اونچی ہو جاتی ہے۔ حالاں کہ ایسی صورت حال سے مجھے پہلے بھی بار بار سابقہ پڑ چکا ہے، پھر بھی مجھے خود پر قابو رکھنے میں کبھی کامیابی نہیں ہوئی۔

"مگر مجھے کوئی نہ کوئی تاریخ چاہیے!"

"نہیں چاہیے! تمھیں دراصل ایک عدد ڈکشنری چاہیے!" مجھے احساس ہے کہ میرا چہرہ سُرخ ہو رہا ہے۔ آخر کار وہ مجھے آگے جانے دیتی ہے۔ میں اس قدر بپھری ہوئی لگ رہی ہوں گی کہ اسے میری بات سچ معلوم ہونے لگی ہوگی۔

میرے ساتھ ہر سفر میں یہی ہوتا ہے۔ میں دس برس سے برطانیہ میں رہ رہی ہوں، اور نو سال سے ایک برطانوی شہری کی بیوی کے طور پر۔ حتیٰ کہ میرے دونوں بچوں کو بھی برطانوی شہریت حاصل ہے، لیکن ضوابط کی رو سے میں اب تک برطانوی پاسپورٹ کی مستحق نہیں ہوئی

Scanned with CamScanner

ہوں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ میں نے مناسب حد تک طویل عرصہ انگلستان میں متواتر نہیں گزارا ہے: شہریت کی درخواست کرنے کے لیے ضروری ہے کہ درخواست گزار مسلسل تین سال تک برطانیہ میں رہ چکا ہو۔

میرے شوہر، بی بی سی ورلڈ سروس ٹی وی کے رپورٹر، جم فِش زابیبا اور یوگوسلاویا میں نامہ نگار کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے ہیں اور ہماری زندگی خانہ بدوشوں کی طرح گزری ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بیرونِ ملک سفر سے واپسی پر ہم سب اکٹھے انگلستان میں داخل نہیں ہو سکتے: میرے شوہر اور بچوں کو اشارے سے اُس دروازے سے گزر جانے کی دعوت دی جاتی ہے جس پر "یوروپین یونین پاسپورٹس" کی تختی لگی ہوتی ہے، جب کہ مجھے "دیگر پاسپورٹ" والے دروازے پر سیاحوں کے ساتھ قطار میں کھڑے رہنا پڑتا ہے۔ انگلستان میں خوش آمدید!

میں پاسپورٹوں کے اس گورکھ دھندے پر ہنسنا اور بیوروکریسی کی اس لغویت کا مضحکہ اڑانا چاہتی ہوں، مگر میں ایسا کر نہیں پاتی: اس نے میری زندگی کو اُلٹ پلٹ کر کے رکھ دیا ہے۔

پچھلے سولہ مہینوں سے مَیں بی بی سی کے مانیٹرنگ کے شعبے میں ہوں اور میرے ذمّے سابق یوگوسلاویا کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں کی نشریات، خصوصاً وہ نشریات سننا ہے جن کا تعلق بوسنیا اور میرے آبائی شہر سرائیوو میں ہونے والی جنگ سے ہے۔ میرے کنبے کے افراد نے جنگ کے پورے دو سال اسی شہر میں رہ کر گزارے ہیں۔ اُن سے میرا رابطہ صرف اُن خطوں کے ذریعے سے برقرار ہے جو اُس شہر کا دورہ کرنے والے صحافی اسمگل کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کئی موقعوں پر، سرائیوو اسٹیشن کی نشریات سنتے ہوے، مجھ پر یہ ہولناک انکشاف ہوا ہے کہ میرے ماں باپ کے گھر کے آس پاس کچھ لوگ شیلنگ کی زد میں آ کر ہلاک ہو گئے۔ میرے بس میں کچھ نہیں ہے، سواے اس کے کہ مرنے والوں کے ناموں کے اعلان کا انتظار کروں اور امید کرتی رہوں کہ اُن کے نام اس فہرست میں نہ ہوں۔

میری بھتیجیاں الیکساندرا اور مارینا، جو اَب بالترتیب سولہ اور دس سال کی ہیں، لگ بھگ دو سال سے ہمارے پاس لندن میں رہ رہی ہیں۔ ان کے انگلستان میں داخلے کے فوراً ہی بعد حکومت نے بوسنیائی مہاجروں کو یہ مژدہ سنا کر کہ اپنے گھروں کے قریب رہنا اُن کے لیے بہتر ہے، داخلے کا دروازہ بند کر دیا تھا۔

بچیوں کے ماں باپ ابھی تک سرائیوو میں ہیں۔ وہاں جانے والے اخبار نویسوں سے اُن کے لیے خط، دوائیں اور خوراک ساتھ لے جانے کی التجائیں کرتے رہنا اَب میری زندگی کا معمول

Scanned with CamScanner

بن گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ان میں سے بیشتر بڑے نفیس لوگ ہیں۔ میں اُن کی اس مہربانی کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی کہ وہ مجھے اپنے پہلے سے بھرے ہوئے رگ سیکوں میں زیادہ سے زیادہ چیزیں ٹھونسنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔

میں نے خود سرائیوو جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میرے والدین بوڑھے اور نحیف ہیں اور اگر میں جلد ہی نہ پہنچی تو شاید اُنہیں کبھی نہ دیکھ پاؤں۔ اگر مجھے یوروپی یونین کے عام شہری کا رتبہ حاصل ہوتا تو میں فقط اپنا اسباب باندھتی اور اس پیچیدہ سفر پر نکل کھڑی ہوتی۔ لیکن میرے سفر کی پیچیدگی تو ابھی شروع ہوئی ہے: مجھے معلوم ہوتا ہے کہ سابق یوگوسلاویا کے پاسپورٹ کے ساتھ مجھے سرائیوو میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ملے گی۔

یہی وجہ تھی کہ مجھے بوسنیائی پاسپورٹ حاصل کرنے کے لیے برسلز جانا پڑا، کیوں کہ لندن میں یہ عمل کہیں مہینے بھر میں پورا ہوتا۔ لندن لوٹ کر مجھے کروشیا کے سفارت خانے سے وہاں کا ویزا لینا پڑتا ہے: یہ کام فقط دو دن میں ہو جاتا ہے۔ میری ولندیزی ہم کار ماریئل مجھے سر کٹی مرغی کی طرح اِدھراُدھر سرگرداں دیکھ کر کہتی ہے: "میں نہیں جانتی تھی کہ یہ معاملات اتنے پیچیدہ بھی ہو سکتے ہیں۔ شکر ہے میں ڈچ ہوں۔" "اس میں کیا شک ہے!

سرائیوو پہنچنے کا واحد ذریعہ اقوامِ متحدہ کا جاری کردہ پریس ایکریڈیٹیشن کارڈ حاصل کر کے کمیشن برائے مہاجرین (UNHCR) کی امدادی پرواز پر سوار ہونا ہے، اور یہ پروازیں اسپلٹ (کروشیا) اور انکونا (اٹلی) سے روانہ ہوتی ہیں۔ میں پہلے اسپلٹ والا راستا اختیار کرنے کی کوشش کرتی ہوں، لیکن وہاں اقوامِ متحدہ کے ملازموں اور اخبار نویسوں کی ایک لمبی ویٹنگ لسٹ ہے۔ سو آخر کار میں خود کو انکونا پہنچاتی ہوں اور رائل ایر فورس کی ایک امدادی پرواز پر سرائیوو جانے کے لیے سوار ہو جاتی ہوں۔

جہاز میں مَیں خود کو ہنسنے سے باز نہیں رکھ پاتی: تمام ضروری پرمٹ، سرٹیفکیٹ، ویزا اور ایکریڈیٹیشن حاصل کرنے کے چکر میں مَیں نے خود کو لوگوں کے لیے اچھی خاصی مصیبت بنا دیا تھا۔ میں لوگوں کو بار بار فون کر کے ان کا جینا حرام کر دیتی اور اُس وقت تک ہتھیار نہ ڈالتی جب تک ہر "نہیں" کو "ہاں" میں تبدیل نہ کروا لیتی۔ میرا یوں انتھک ڈٹے رہنا آخر کام آیا: چند گھنٹوں کے اندر اندر میں اپنے والدین کے پاس ہوں گی۔ سرائیوو ایرپورٹ پر اُترتے اُترتے میں مارے جوش کے شل ہو چکی ہوں۔

برطانوی فوجیوں کی ایک ٹولی شہر جانے کے لیے مجھے اپنی اقوامِ متحدہ کی جیپ میں لفٹ

دے دیتی ہے۔ میں مقامی چیک پوسٹوں کے بارے میں فکر مند ہوں، مگر ہمیں کوئی نہیں روکتا۔ چاندنی رات میں ہماری جیپ تباہ شدہ عمارتوں، جلی ہوئی کاروں اور بسوں کے درمیان سے گزر رہی ہے۔ میں ٹیلی وژن پر یہ سب اتنی بار دیکھ چکی ہوں کہ ذرا بھی تعجب نہیں ہوتا۔ جب جنگ شروع ہوئی ہے، میں ہر نیوز بلیٹن پر آنسو بہایا کرتی تھی۔ چند مہینے بعد مَیں ضبط کرنا سیکھ گئی۔ میں نے اپنے شہر کی تباہی کے مناظر کو رفتہ رفتہ اپنی زندگی کا حصّہ مان لیا۔

میرے والدین جس اپارٹمنٹ بلاک کی چوتھی منزل پر رہتے ہیں اُس کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میرا دل دھک دھک کر رہا ہے۔ اب وہ دیکھنے میں کیسے لگتے ہوں گے؟ اتنا تو میں جانتی ہوں کہ دونوں کا وزن بیس بیس کلوگرام کم ہو گیا ہے، اور اماں پر فالج گرا تھا اور بابا کو دل کا دورہ پڑا تھا۔

میں دروازے پر دستک دیتی ہوں اور اچانک وہ سامنے آ جاتے ہیں۔ وہ بے یقینی سے میرا چہرہ تکتے ہیں؛ انھیں معلوم تھا کہ میرا آ جانا ممکن ہے، پھر بھی انھیں یقین نہیں آ رہا۔ ہم دیر تک ایک دوسرے سے چمٹے کھڑے رہتے ہیں۔ بابا کی آنکھیں نم ہیں۔ میں تھوک نگلتی ہوں۔ میں نے خود سے عہد کیا ہے کہ سرائیوو میں آنسوؤں سے کوئی سروکار نہیں رکھوں گی۔

اماں کا بدن سکڑ گیا ہے اور وہ بہت بوڑھی دِکھنے لگی ہیں۔ بہت دُبلی بھی ہو گئی ہیں۔ وہ تُرکی قہوہ تیار کرتی ہیں۔ پیالیوں میں قہوہ انڈیلتے ہوئے اُن کے ہاتھ بُری طرح کپکپا رہے ہیں۔

اس سے پہلے کہ میں اُن سے کچھ پوچھ سکوں، وہ مجھ پر سوالوں کی برسات کر دیتے ہیں۔ وہ بچوں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ کیا ٹامی اب بھی اپنی کلاس میں سب سے لمبا ہے؟ بچوں میں کون آسانی سے کھانا کھا لیتا ہے؟ ننھی لِلی باتھ روم استعمال کرنا سیکھ گئی یا ابھی تک نیپیز پہنتی ہے؟ اتنے بہت سارے سوال ہیں جو میں اُن سے کرنا چاہتی ہوں مگر مجھے پتا ہے کہ جب تک بچوں کا موضوع پورا نہیں ہو جاتا ان سوالوں کی باری نہیں آ سکتی۔

میں اپنے رَگ سیک کو اپنے بچوں اور دونوں بھتیجیوں کی تصویروں کی تلاش میں اُلٹ پلٹ دیتی ہوں۔ اماں اور بابا تحسین بھری نظریں تصویروں پر جما دیتے ہیں۔ پھر اُنھیں نئے سرے سے دیکھنے لگتے ہیں۔ بابا کو بچوں سے دیوانوں کا سا لگاؤ ہے۔ اپنے اکلوتے نواسے کے لیے اُن کے دل میں خاص جگہ ہے۔

دنیا کے اِس حصّے میں اب تک بیٹوں کو بیٹیوں سے زیادہ وقعت دی جاتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کیوں۔ شاید وہ بڑے ہو کر اچھے سپاہی بنتے ہوں اور ان جنگوں میں زیادہ اچھی طرح حصّہ لے سکتے ہوں جو ہمارے خطّے میں کتنی ہی بار ہو چکی ہیں۔

ایک ہم سایہ ریڈ کراس کی طرف سے پنشن یافتہ افراد کو ملنے والا پکا پکایا کھانا لا کر دیتا ہے۔ اماں کھانے کی تین حصے کر لیتی ہیں۔ اچھا، تو امدادی کھانے کا یہ ذائقہ ہوتا ہے۔ کسی قسم کا اسٹو ہے، بُرا نہیں۔ ان دونوں نے رِفیوجی کمیشن کی دی ہوئی چیزوں میں سے تھوڑا بہت آٹا، چاول اور بین بچا بچا کر جمع کر لیے ہیں۔

چند سال پہلے اگر کسی نے ایسی بات کہی ہوتی کہ میری اماں اور بابا کو امدادی خوراک پر گزارا کرنا ہوگا تو میں اسے ایک بھونڈا مذاق گردانتی۔ ایسی چیزیں میرے خیال میں صرف دُور دراز جگہوں پر اجنبی انسانوں کے ساتھ پیش آتی ہیں؛ اپنے گھر والوں کے ساتھ ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے!

ہم پلاسٹک کی بالٹیوں میں سے پانی اُنڈیل کر ہاتھ دھوتے ہیں۔ ہر تیسرے دن بارہ گھنٹے کے لیے پانی آتا ہے۔ تھوڑے وقت بجلی بھی رہتی ہے، مگر ہر دوسرے دن بند کر دی جاتی ہے۔

اماں نے فلیٹ کو ایسے حالات میں بھی خاصا صاف ستھرا رکھا ہوا ہے مگر ٹوائلٹ صاف ہونے کے باوجود عجیب سی بُو دے رہا ہے۔ میں پوچھتی ہوں کہ گھر میں تھوڑا سا ڈِس انفکٹنٹ یا بلیچ ہو تو میں صفائی کر دوں۔ وہ سر جھکا کر چپ ہو رہتی ہیں۔ کاش میں نے یہ سوال نہ کیا ہوتا!

میرے بھائی زوران اور اس کی بیوی سنیز انا کو اپنا فلیٹ چھوڑ کر بھاگنا پڑا کیوں کہ وہ ایک اونچے ٹاور بلاک میں تھا، بالکل محاذ کے سامنے: سڑک کی دوسری طرف گرباویچا کا محلّہ تھا جس پر سربوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ان کی بیٹیوں کا کمرہ جس کی کھڑکی "اسنائپرز ایلی" میں کھلتی ہے، گولیوں اور شیل کے ٹکڑوں سے چھلنی ہو چکا ہے۔ فلیٹوں کے اس بلاک میں سات آدمی مارے گئے ہیں اور اٹھارہ زخمی ہوئے ہیں۔ ایک جوان عورت نے سترھویں منزل سے خود کو نیچے گرا دیا۔

سنیز انا اپنی بیٹیوں کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہے۔ "میں خود کو دوسروں کے بچّوں کو گھورتے ہوئے، اُن سے حسد کرتے ہوئے پاتی ہوں۔ ابھی کل ہی مجھے ایک لڑکی دکھائی دی جو بالکل میری ساشا جیسی لگ رہی تھی۔ میں اُس پر سے نظریں نہ ہٹا سکی۔ اُس نے پلٹ کر مجھے یوں گھور کر دیکھا جیسے میں پاگل ہوں۔ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی۔"

وہ بچیوں سے ملنے لندن جانا چاہتی ہے، مگر اتنی رکاوٹیں ہیں کہ اس کا جانا ناممکن لگتا ہے۔ اگر اُسے بوسنیا سے نکلنے کی اجازت مل بھی جائے تو برطانیہ میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ بوسنیا کے لوگوں کو کوئی نہیں آنے دیتا، تھوڑی دیر کے لیے بھی نہیں کہ وہ اپنے بچوں سے مل لیں۔ مجھ سے اس بات کا تصوّر ہی نہیں کیا جاتا کہ سنیز انا کو کیسا لگ رہا ہوگا۔

لندن میں ہر رات بستر پر جانے سے پہلے میں اپنے بچوں کے کمرے میں جھانکتی ہوں، یہ

Scanned with CamScanner

دیکھنے کے لیے کہ کہیں اُن کی رضائی ہٹ تو نہیں گئی، اور یہ کہ وہ سوتے ہوئے کتنے پُرسکون لگتے ہیں۔ سنیژانا کی بچیاں اُس کی دسترس سے دور ہیں، اور دور ہوتی چلی جارہی ہیں، اور وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ یہ بات سوچنے میں اچھی لگتی ہے کہ شاید تھوڑی سی ہمدردی ہوم آفس میں رینگ کر فیصلہ کرنے والوں کے پاس چلی آئے، مگر مجھے اس پر پوری طرح یقین نہیں آتا۔

میرے بیشتر دوست سرائیوو سے جاچکے ہیں۔ وہ اب غیر ملکوں میں رہتے ہیں، امریکا میں، کینیڈا میں، ڈنمارک میں، دو ایک برطانیہ میں بھی۔ پھر بھی، اکادکا دوست ابھی تک سرائیوو میں ہیں: مثلاً ایگور اور مِنکا باروس، جو جنگ کے دوران اپنی چشموں کی دکان کھلی رکھنے کی وجہ سے خاصے مشہور ہوگئے ہیں۔

اِیگور آدھا سرب اور آدھا کروٹ ہے۔ مِنکا نصف مسلم اور نصف مقدونیائی۔ میں خود سرب ہوں۔ لیکن ہم میں سے کوئی اپنی قومیت کو ذرا بھی اہمیت نہیں دیتا۔ میرے دوستوں میں سے کسی نے بھی قومیت کے معاملے کو پاس نہیں پھٹکنے دیا۔ ایسے تعصّب تو قبائلیوں میں ہوتے ہیں، میں ہمیشہ سوچا کرتی تھی۔ مشکل یہ ہے کہ قبائلی کبھی کبھی غالب آجاتے ہیں۔

۱۹۸۹ سے ۱۹۹۱ تک میں بلغراد میں رہتی اور کام کرتی تھی اور اپنے "ہم نسل بھائیوں" میں گھرے ہوئے مجھے کبھی گھر کا سا احساس نہیں ہوا۔ سربوں کے درمیان سرب کی حیثیت سے تو مجھے خوب پنپنا چاہیے تھا -- جیسا کہ رادووان کراجِک وغیرہ کی حالیہ تعلیمات بتاتی ہیں -- مگر میں نے خود کو ہمیشہ بوسنیا ہی کا باشندہ محسوس کیا۔

میں بوسنیا والوں کی تُند اور آزاد حسِ مزاح کی دل دادہ ہوں۔ میری وابستگی اپنے سرائیوی دوستوں سے ہے، اپنے آبائی شہر سے جہاں میں اسکول گئی، باسکٹ بال کھیلی، پہلی بار محبت میں گرفتار ہوئی۔ مجھے کسی بھی قوم پرستانہ کورس میں شامل ہونے سے انکار ہے جہاں مجھے حکم دے کر گوایا جائے۔ جنگ سے پہلے کی بات ہے، ایک بار میرے ایک کزن نے مجھے یہ کہہ کر اپنے گھر سے نکال دیا تھا کہ میں سرب دشمن اتحاد میں شامل ہوں۔ میں فیصلہ نہ کرسکی کہ اس پر ہنسوں یا روؤں۔ آخر میں نے ہنسنے کا انتخاب کیا۔

"آؤ تمھیں اپنا شیل دکھائیں!" جوں ہی میں اپنے عینک ساز دوستوں کے فلیٹ میں داخل ہوتی ہوں تو مِنکا کہتا ہے۔ یخچی الماری کے اوپر ۳۸ سینٹی میٹر قطر کا ایک دھاتی ستون سا کھڑا ہے۔ اچھا، تو ایسا ہوتا ہے شیل! میں یہ چیز پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ اس شیل نے ۱۹۹۲ کے جاڑوں میں ان کا کچن تباہ کردیا تھا۔ خوش قسمتی سے دونوں اس وقت باہر تھے۔

Scanned with CamScanner

ایگور اور مینا مجھے شہر کے ایک کافی بار میں لے جاتے ہیں۔ پچھلے چند مہینوں میں، جب سے شیلنگ ذرا تھمی ہے، بہت سی دکانیں اور بار دوبارہ کھل گئے ہیں۔ کئی جوڑے ساتھ ساتھ بیٹھے ہیں، ریڈیو سے نرم موسیقی کی لہریں اُٹھ رہی ہیں۔ مجھے یہی سرائیوو یاد ہے: ایک شہر جس میں سیکڑوں کافی بار تھے جہاں میں گھنٹوں بیٹھی دوستوں سے گپ کیا کرتی تھی۔

اُن دنوں یہ شہر بہترین روک بینڈز کی تال پر دھمکتا تھا۔ یہ پورے یوگوسلاویا میں فلموں کا مرکز تھا۔ ہم جاڑوں میں شہر کے باہر پہاڑوں پر اسکی انگ کرتے اور گرمیاں بحیرہ ایڈریاٹک کے ساحل پر گزارتے۔ زندگی کا مزہ لینے میں ہم عالمی چیمپیئن تھے۔

لیکن شہر کا چہرہ بدل گیا ہے۔ جوان اور پڑھے لکھے باشندے زیادہ تر شہر چھوڑ کر جا چکے ہیں اور جو ہیں ان میں سے بہتیرے جانے کی سوچ رہے ہیں۔ گلیوں میں مجھے جو لوگ دکھائی دیتے ہیں وہ اُن سے مختلف ہیں جو مجھے یاد تھے۔

آس پاس کے گاؤوں کے بہت سے لوگوں نے شہر میں پناہ لے لی ہے۔ میں جوان عورتوں کو سر پر اسکارف باندھے دیکھتی ہوں جیسے اسلامی ملکوں میں ہوتا ہے: یہ بات چند سال پہلے ناقابلِ تصور تھی۔ مجھے سن کر تعجب ہوتا ہے کہ حکام الکحل پر پابندی لگانے پر غور کر رہے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ڈبلن میں گِنِس پر پابندی لگا دی جائے۔ میں تمنا کرتی ہوں کہ میرے سارے دوست سرائیوو لوٹ آئیں، وہی لوگ اس شہر کی واحد امید ہیں۔ وہی اسکارفوں اور پابندیوں کی مزاحمت کر سکتے ہیں اور ایسے حکام منتخب کر سکتے ہیں جو سیکولر اور یوروپی طرزِ زندگی کے حامی ہوں۔

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا ہے۔ میرے پاس ڈھیروں خط ہیں جو مجھے شہر بھر میں پھیلے ہوئے لوگوں کو پہنچانے ہیں۔ اپنے پرائمری اسکول کے پاس سے گزرتے ہوئے میں اپنے پُرانے ہم جماعت فیکو سے ٹکرا جاتی ہوں۔ ہم دونوں اپنے اسکول کی باسکٹ بال ٹیموں کے کپتان تھے۔ مجھے وہ رات ہمیشہ یاد رہے گی جب ہماری مقامی ٹیم، بوسنیا کی ٹیم، نے یوروپین کپ جیتا تھا۔ پورے شہر نے گلیوں میں نکل کر اس کا جشن منایا تھا۔ لوگ ایک دوسرے کو چوم رہے تھے، گا رہے تھے، ناچ رہے تھے -- سچ مچ جیسے کوئی میلا لگا ہو!

ہم دونوں اسکول میں جا کر رجسٹر نکلواتے ہیں اور نام پڑھ پڑھ کر یاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کون اَب کہاں ہے۔ دو تہائی کے قریب لوگ سرائیوو سے جا چکے ہیں۔ ہمارے ہم جماعت یوگوسلاو نے اپنا نام بدل لیا ہے: اَب وہ اُوگو کہلاتا ہے۔ یوگوسلاو نام لوگوں میں عام تھا، اگرچہ اس میں کچھ ضرورت سے زیادہ حب الوطنی جھلکتی تھی۔ اَب یہ نام مضحکہ خیز معلوم ہونے لگا ہے۔ لیکن اس عمر کو پہنچ کر نام بدلنے کا ذرا تصور کیجیے! ہم چیخیں مار مار کر ہنسنے لگتے ہیں۔

ابھی تو میں یہاں پہنچی ہوں، اور واپسی کا وقت آ گیا۔ اماں اور بابا کو الوداع کہنا مجھے سخت ناگوار ہوتا ہے۔ رخصت کے وقت کی جذباتیت مجھ سے کبھی برداشت نہیں ہوتی: میں بعد میں، اکیلے میں، رو لوں گی۔ وہ دونوں مجھے چھوڑنے نیچے سڑک تک جانا چاہتے ہیں۔ میں جلد واپس آنے کا وعدہ کرتی ہوں۔

سرائیوو سے اسپلٹ، وہاں سے زگرب۔ لندن جانے والا جہاز پکڑنے مَیں زگرب ایرپورٹ پر پہنچتی ہوں۔

"آپ برطانیہ میں کتنا عرصہ ٹھہرنا چاہتی ہیں؟" ایک کروشین پولیس افسر میرا پاسپورٹ جانچتے ہوئے مجھ سے سوال کرتا ہے۔

"میں وہیں رہتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے، مگر آپ کو وہاں کب تک ٹھہرنے کی اجازت دی گئی ہے؟"

**

Scanned with CamScanner

ناتکا بوتوروِچ

ترجمہ: ذی شان ساحل

پاتال سے

سرائیوو: جہنم کا آخری گھیرا۔ آج تک بننے والا سب سے بڑا اجتماعی کیمپ، جہاں لوگوں اور عمارتوں کو ایک ہی طرح سے توڑا مروڑا جاتا رہا ہے۔ پیٹ بھر خوراک اور پانی کے بغیر، روشنی اور حرارت کے بغیر، اپنے پیاروں کی خیر خبر سے محروم، بیماروں اور زخمیوں کے لیے پریشان، مرنے والوں کے لیے سوگوار۔۔ سرائیوو کے باسی محض اپنی بقا کے جذبے کے سہارے جی رہے ہیں۔

میں ایک اخبار نویس، ایک جنگی وقائع نگار، کے طور پر جنگ شروع ہونے کے دن سے نومبر ۱۹۹۲ کے وسط تک سرائیوو میں رہی۔ سرائیوو میری جنم بھومی ہے۔ میرے والدین، میری بہن اور میرے دوست اب تک وہیں ہیں۔ مجھے سرائیوو چھوڑنا پڑا، کیوں کہ میرے لیے اپنا کام کرنا ناممکن ہو گیا تھا اور میں اپنے پیاروں کے لیے ایک اضافی بوجھ بن گئی تھی۔ میں ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ شہر سے رخصت ہوئی۔ یہ جان کر میں اور زیادہ غم زدہ ہو جاتی تھی کہ باقی دنیا کو جنگ سے پہلے کے سرائیوو کے بارے میں کتنا کم معلوم ہے: اتنا کم کہ پوری بات سکڑ کر خبروں کا ایک چھوٹا سا حصہ بن جاتی ہے کہ: "آج شہر پر اتنے گولے گرے اور ایرپورٹ پر اتنے امدادی جہاز اترے۔"

میں اور میرے اخبار "بوربا" (Borba) کے سرائیوو بیورو کا نگراں زیلیکو وُوکوچ، اخبار کے آخری دو کارکن تھے جو وہاں سے خبریں بھیجنے میں کامیاب رہے تھے۔ اخبار کا صدر دفتر بلغراد، سربیا، میں ہے۔ عملے کے باقی سب لوگ یا تو پالے (Pale) جا چکے تھے یا اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ ہم دونوں کے گھر سرائیوو ہی میں ہیں۔

سرائیوو میں جنگی وقائع نگار ہونا کیسا لگتا ہو گا؟ جنگ کے پہلے ہی دن میں بوسنیا ہرزگووینا کی پارلیمنٹ کی عمارت کے سامنے سڑک پر لیٹی ہوئی تھی اور گولیاں میرے چاروں طرف سنسنا رہی

Scanned with CamScanner

تھیں۔ ایسی جگہ سے خبریں بھیجنا ناممکن ہے۔ میرا دفتر اس جگہ سے صرف سو گز کے فاصلے پر تھا۔ میں بھاگی۔

جنگ کے دوران ہر روز، سرائیوو کے تمام دوسرے شہریوں کی طرح، میں بھاگ کر فاصلہ طے کیا کرتی تھی۔ اوپر پہاڑیوں پر موجود نشانچی تمھاری آنکھوں کا رنگ تک دیکھ سکتا ہے۔ وہ تمھاری تاک میں ہے۔ بھاگنے کی صورت میں تمھارے بچنے کا زیادہ امکان ہے۔ کسی نشانچی کی بندوق کی زد میں آجانا کیسا لگتا ہے؟ مجھے بتایا گیا: "پہلے تو بس یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے دھکا دیا ہو، بہت زور سے۔ درد بعد میں ہوتا ہے۔"

میں خوف زدہ تھی۔ خوف کا مطلب ہوتا ہے درد اور بد نظمی کا شکار معدہ اور مسلسل سکڑنے کو بے قرار جسم۔ مجھے موت کا خوف نہیں تھا۔ میرے چاروں طرف لوگ مر رہے تھے۔ مجھے جسمانی اذیت دیے جانے کا خوف تھا۔ اگر ایسا ہوا تو میں خود کو مار ڈالوں گی، یہ میں نے طے کر لیا تھا۔ میرے کچھ دوستوں نے بتایا کہ وہ بھی اسی طرح سوچ رہے تھے۔ لیکن میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتی جس نے واقعی ایسا کیا ہو۔

مایوسی اور خوف کے بیچ، سرائیوو کے دوسرے شہریوں کی طرح، پناہ گاہ کی طرف جاتے ہوئے، میں بھی دوڑنے کا انتخاب کرتی تھی۔ ہم نے بہت جلد آتے ہوئے گولوں کے رخ کا اندازہ کرنا سیکھ لیا۔ میں صرف اُس وقت پناہ گاہ کی طرف جاتی جب اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا۔ جس گولے پر تمھارا نام لکھا ہوا ہو، اس کی آواز تمھیں سنائی نہیں دے گی۔ باقی گولے شائیں شائیں کر کے تمھارے پاس سے گزر جاتے ہیں۔ میرا معدہ اب تک اِس طرح کی آوازوں پر میرے دماغ سے زیادہ سرعت کے ساتھ ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔

میں نے اُس گولے کی آواز بھی نہیں سنی جس نے میرے شوہر کو زخمی کیا۔ ہم ایک گلی سے ساتھ ساتھ گزرے، نکڑ پر جدا ہوئے اور الگ الگ سمتوں میں چلنے لگے۔ ابھی ہم پندرہ بیس قدم گئے ہوں گے کہ کانوں کو پھاڑ دینے والا دھماکا سنائی دیا۔ میں جس عمارت کی دیوار کے پاس سے گزر رہی تھی اُس کی دیوار سے چپک کر رہ گئی۔ میں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اندھیرے اور مکمل خاموشی میں میرا بدن سیسے کا ہو گیا۔ نہ جانے کتنی دیر اسی طرح گزری، ایک سیکنڈ، پانچ سیکنڈ یا ایک منٹ، مجھے نہیں معلوم۔ آخر کار میں نے دیوار کا سہارا لے کر خود کو کھڑا کیا اور اِدھر اُدھر دیکھا، یہ جاننے کے لیے کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ وہ زندہ تھا۔ وہ ایک زخمی شخص کو سہارا دے کر کار میں سوار کرا رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو چلایا کہ میں کہیں چھپ جاؤں۔ یہ بات مجھے اگلے دن معلوم ہوئی کہ وہ بھی زخمی ہوا تھا۔

ایک دن، ایک دھماکے سے چند منٹ پہلے جس میں درجنوں لوگ مارے گئے جو واسو مِسکن اسٹریٹ پر روٹی لینے کے لیے قطار میں کھڑے تھے، میں اسی گلی سے گزرتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ یہ لوگ یہاں کیوں کھڑے ہیں۔ یہ ضرور جانتے ہوں گے کہ پاس کے بازار میں ابھی ابھی ایک گولا آ کر پھٹا ہے۔ یہ ایک طرح کا قاعدہ تھا کہ گولے تین تین کی تعداد میں آتے ہیں۔ اگر تم نے پہلا دھماکا سن لیا ہے تو فوراً دور بھاگ جانا چاہیے، اس بات کو یقینی سمجھتے ہوئے کہ دوسرا گولا بس آیا ہی چاہتا ہے۔ میرے بچ نکلنے کی یہی وجہ تھی۔ میں نے مرنے والوں کی چیخیں نہیں سنیں۔ میرے کانوں میں زور کی دھمک ہو رہی تھی۔ جب میں ایک دفتر میں پہنچی اور ٹی وی دیکھا، تب مجھے پتا چلا کہ میں موت کے منھ سے بال بال بچ نکلی ہوں۔ شاید اسی کو قسمت کہتے ہیں۔ اگر روٹی کی قطار میں مجھے کسی جاننے والے نے روک لیا ہوتا تو؟ اس خیال ہی سے مجھے کپکپی چڑھنے لگی۔

مجھے جنگ کے دوران ہمیشہ جاڑا لگتا رہا، یہاں تک کہ بہار اور گرمی کے دنوں میں بھی۔ میں ہمیشہ اپنا سردیوں والا جیکٹ پہنے رہتی۔ اب تک اسے اپنے آپ سے علیحدہ کرنا میرے لیے بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ بارہا میں نے اپنے آس پاس لوگوں کو مرتے ہوئے دیکھا۔ میں نے ہمیشہ آنکھیں بند کر لیں اور منھ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں اُن کی کوئی مدد نہیں کر سکی۔

دوسرے لوگوں کی میں نے حتی الامکان مدد کی۔ جب دکانوں میں روٹی بکنی بند ہو گئی تو میں صبح ساڑھے پانچ بجے اٹھ کر گیس کے تنور والی ایک بیکری میں روٹیاں سینکنے جاتی۔ میرا کتا بھی میرے ساتھ جاتا۔ میں کھانے کی تلاش میں بازار کے چکر لگاتی۔ سلاد کے لیے گکروندے کی پتّیاں جمع کرتی۔ پانی کی تلاش میں شہر بھر میں پھرتی اور پانی بھر کر اُسے اٹھا کر گھر لاتی۔ جنگ کے دنوں میں لوگوں کا تم پر اور تمھارا لوگوں پر دارومدار امن کے زمانے سے زیادہ ہوتا ہے۔ لوگ ہر چیز میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ وہ روٹی ساتھ ساتھ سینکتے ہیں۔ پانی کے ڈول ساتھ ساتھ اٹھاتے ہیں۔ اگر تمھارے پاس ایک موم بتی ہو تو تم اسے جلا کر دوسروں کو اس کی روشنی میں شریک کرتے ہو۔ پڑوسی ایک جگہ جمع ہو کر ریڈیو پر تازہ خبریں سنتے ہیں۔ احاطے میں رکھا ہوا چولھا مل جل کر جلاتے ہیں اور کھانا پکاتے ہوئے اور اس میں ایندھن لالا کر ڈالتے ہیں تاکہ آگ جلتی رہے۔ اگر وہ چولھا جلانے میں کوئی مدد نہ کر سکیں، تب بھی وہ اس پر کھانا پکا سکتے ہیں۔

مجھے بتایا گیا کہ سرائیوو میں سخت جاڑے کی راتوں میں دو تین خاندان مل کر ایک کمرہ گرم کر کے سوتے ہیں۔ بہت سے لوگ پالے کا شکار ہوئے؛ اگر جان بچ بھی گئی تو زندگی بھر کے لیے معذور ہو گئے۔

خبریں، اطلاعات: کس طرح انھیں حاصل کیا جائے؟ ان تک کیسے پہنچا جائے؟ مقامی ریڈیو

کے ذریعے، سرائیوو کے اخبار Oslobodjenje ("آزادی") اور شام کی خبروں کی مدد سے، پریس کانفرنسوں میں شریک ہو کر۔ ان سب کے پاس رپورٹروں کے عملے موجود ہیں۔ جب بجلی ہوتی تو ہم سرائیوو، پالے اور بلغراد اسٹیشنوں کی نشریات دیکھتے۔ لیکن جنگ کے نتیجے میں پروپیگنڈا تیزی سے پروان چڑھنے لگا۔ ہمیں اپنی اور اپنے اخباروں کی ساکھ کی فکر ہونے لگی۔ ہمارے پیشے کا اصول ہے کہ ہر اطلاع کی اچھی طرح جانچ پڑتال کی جائے اور پھر دوبارہ جانچ پڑتال کی جائے۔ ہم اپنے اُن عزیزوں، دوستوں اور ملنے والوں سے فون پر اطلاعات کی تصدیق کیا کرتے جو ان رونما ہونے والے واقعات کی جگہ سے نزدیک رہتے تھے۔ بہت سے لوگ ہماری مدد کو تیار تھے۔

یہ عمل ۲ مئی ۱۹۹۲ تک جاری رہ سکا۔ اس کے بعد سارا شہر مسلسل گولاباری کی زد میں آ گیا۔ سات دن تک ہم پناہ گاہوں سے باہر نہ نکل سکے۔ ہمیں ایک دوسرے کی کچھ خبر نہ تھی۔ ڈاک خانہ مسمار ہو گیا تھا۔ ٹیلی فون خاموش پڑے تھے۔ کسی کارآمد فون کی تلاش میں ہمیں میلوں دور جانا پڑتا۔ ایک دوست نے مجھے اپنا فلیٹ اور فون استعمال کرنے کی پیشکش کی تھی۔ میں اور زیلیکو لفٹ لیتے، رکتے چلتے وہاں پہنچتے۔ ہم نان بائیوں، کوڑا کرکٹ اٹھانے والوں اور مختلف قسم کی مقامی ملیشیاؤں کے لوگوں سے لفٹ لیتے۔ بعد میں ایک ہم سائے نے ہمیں ضرورت کے وقت اپنی کار استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ مگر اُن دنوں پٹرول حاصل کرنا آسان نہیں تھا۔ ہم لوگوں سے زبانی بات چیت کر کے اطلاعات کی تصدیق کرتے رہے۔ ابھی ایسے بہت سے لوگ تھے جن پر اعتبار کیا جا سکتا تھا۔ تاہم، ہماری رپورٹیں کم سے کم ہوتی چلی گئیں۔

اور اس کے بعد سرائیوو کے تمام ٹیلی فونی رابطے ختم ہو گئے۔ ہَیم ریڈیو آپریٹر؟ اچھا خیال ہے! میں ایک کو جانتی تھی۔ اس نے مجھے بتایا: "میں تمھاری مدد نہیں کر سکتا۔ سارے شوقیہ ریڈیو آپریٹر ان دنوں بوسنیائی فوج کے لیے کام کر رہے ہیں۔" مگر شاید کوئی مل جائے۔ میں نے تلاش جاری رکھی اور چند اچھے لوگ مجھے مل گئے: ہوسو کرنوور ستنین اور دینو زالییک۔ ان کا بلغراد میں اپنے ایک دوست توموواِلکیچ سے رابطہ برقرار تھا۔ وہ تینوں ہفتے میں تین بار ہماری رپورٹوں کی ترسیل پر رضامند ہو گئے۔ لیکن کوئی ایسا تھا جسے یہ بندوبست ایک آنکھ نہ بھایا۔

۱۷ ستمبر ۱۹۹۲ کو بوسنیا ہرزگووینا کی وزارتِ داخلہ نے ایک بیان جاری کیا۔ یہ بیان سرائیوو کے اخباروں میں شائع ہوا اور ٹی وی اور ریڈیو سے بھی نشر کیا گیا۔ بیان میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ "بوربا" اخبار کے نمائندے یوگوسلاو فوج کے جاسوس ہیں۔ بوسنیا کی حکومت نے ہمیں کام کرنے سے نہیں روکا۔ ہمارے پاس حکومت کی طرف سے جاری کردہ دستاویزات بھی موجود تھیں۔ لیکن وہ لوگ جو کسی "عظیم مقصد" کے لیے لڑ رہے تھے، جن کو یہ بات ناپسند تھی کہ "بوربا" بلغراد

Scanned with CamScanner

سے شائع ہوتا ہے، اور وہ جو جاسوسوں کی نشان دہی کر کے قومی ہیرو بن جانے کا خواب دیکھ رہے تھے، ہمارے ساتھ جو چاہتے کر سکتے تھے۔ ہم جنگ میں ملوث تینوں دھڑوں سے ہراساں رہتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس اپنی وجوہ تھیں، لیکن ایک بات پر تینوں متفق تھے: تم ہم میں سے نہیں ہو!

ہم نے وزارت داخلہ سے رابطہ قائم کیا اور مطالبہ کیا کہ یا تو وہ ہمیں حراست میں لے لے یا پھر اپنے بیان کی تردید کرے۔ اگر اُن کے پاس ہمارے خلاف عدالت میں پیش کیا جاسکنے والا کوئی ثبوت ہو تو ہمیں بتائیں، اور اگر ایسا نہ ہو تو الزامات واپس لیں۔ وزارت نے ان میں سے کوئی بھی اقدام نہیں کیا۔ ہمارے چاروں طرف خاموشی کی ایک دیوار کھڑی ہو گئی تھی۔ سب دروازے ہم پر بند کر دیے گئے تھے۔ ہم چلتے پھرتے ہدف بن کے رہ گئے تھے۔ بہت جلد ہم نے اپنی رپورٹیں بھیجنی بند کر دیں۔ ہمیں اپنے ریڈیو آپریٹر دوستوں کو کسی خطرے میں ڈالنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ میں زیلیکو کے فلیٹ میں منتقل ہو گئی۔ مجھے اپنے خاندان کے تحفظ کو داؤ پر لگانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ ساتھیوں اور جان پہچان کے لوگوں کی تندوتیز باتیں ہی کافی تھیں۔ ہمارے دفتر کے دروازے پر سے اخبار کا نام اور پتا اتار پھینکا گیا تھا۔ خاموشی انتہائی ہولناک تھی۔

ہم روپوش نہیں ہوئے؛ بس ہم نے عام جگہوں پر جانا بند کر دیا۔ ہمیں پتا چلا کہ ہمارے بلغراد کے ساتھیوں نے ہمیں سرائیوو سے بہ حفاظت نکال لے جانے کے لیے تمام ممکنہ اقدامات کر لیے ہیں۔ بلغراد پہنچ کر ہمیں غیر ملکی صحافتی انجمنوں اور اپنے صحافی دوستوں کی اُن اپیلوں کا علم ہوا جو ہمارے تحفظ کے سلسلے میں کی گئی تھیں۔

میرے ایک دوست نے بلغراد میں مجھ سے پوچھا: "سرائیوو کے جہنم سے نکل کر معمول کی دنیا میں آنا کیسا لگا؟" میرا جواب تھا: "معمول کی دنیا اب باقی نہیں رہی ہے۔" سرائیوو سے اپنی روانگی کے بعد سے کئی مہینوں تک، میں دو متوازی دنیاؤں میں یوں رہتی رہی گویا دو زندگیاں گزار رہی ہوں۔ کئی بار روٹی لے جاتے ہوئے لوگوں سے میں بے اختیار پوچھ بیٹھتی کہ یہ اُنھیں کہاں سے مل گئیں۔ نلکے سے بہتے پانی کو دیکھ کر میں دیر تک حیران رہتی۔ ایسی آوازیں سن کر میں خوف سے سمٹ جاتی جو مجھے گولوں کی آوازوں یا دھماکوں کی یاد دلاتیں۔ ابھی کچھ دن پہلے تک مجھے ڈراونے خواب راتوں کو دہلاتے تھے۔ میں نے جنگ زدہ سرائیوو میں ساڑھے سات مہینے گزارے ہیں۔ کیا سرائیوو سے زندہ بچ نکلنے والے لوگ کبھی معمول کی زندگی گزار سکیں گے؟ میں نہیں جانتی۔

**

Scanned with CamScanner

مارک پونتھس

ترجمہ: اجمل کمال

سرائیوو کا نوحہ

میں محصور سرائیوو کے وسط میں واقع ایک چھوٹے سے تھیئٹر میں اپنی پرفارمنس شروع کرنے والا ہوں۔ بیرونِ در اس وقت منفی دو سینٹی گریڈ درجۂ حرارت ہے، اندر ایک آدھ ڈگری زیادہ ہو گا۔ ہال کو گرم رکھنے کا کوئی انتظام نہیں ہے، اور کھڑکیاں بھی ساری ٹوٹ چکی ہیں۔ پلاسٹک کی ڈھیلی ڈھالی چادریں سردی کو روکنے میں بالکل ناکام ہیں۔ یہ سوموار کی سہ پہر ہے۔ بجلی نہیں ہے اور پرفارمنس کے لیے ہمیں دن کی روشنی درکار ہو گی۔ باہر اسنائپروں کے گولیاں چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ میں ایک چھوٹے سے سادہ پیانو کو استعمال کروں گا جو جنگ کی تباہ کاریوں میں اتفاق سے محفوظ رہ گیا ہے۔

تھیئٹر کے اندر نفیس لوگوں کا ایک اجتماع ہے، لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ کنسرٹ کی اطلاع زیادہ لوگوں تک پہنچانا ناممکن ثابت ہوا ہے، کیوں کہ خبر پھیل جانے سے خطرہ ہے کہ کہیں تھیئٹر پر شیلنگ نہ شروع ہو جائے۔ مجھے خیر مقدمی داد و تحسین کو سن کر ندامت ہوتی ہے۔ میں بھونڈے سے انداز میں جوابی خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں، اس بات پر کہ یہ لوگ یہاں موجود ہیں، اس پر کہ یہ لوگ زندہ ہیں۔

ہاں، میں بھی وہاں موجود تھا۔ میں نے دہشت کی گہرائیوں میں براہِ راست نظر نہیں ڈالی، لیکن میں اسے اپنے بہت نزدیک محسوس کر سکتا تھا۔ میں اسے گولیاں چلنے کی متواتر آوازوں میں سن سکتا تھا۔ میں اس کی بُو بھی سونگھ سکتا تھا اور یہ بُو میرے کپڑوں اور بالوں سے چپک کر رہ گئی تھی۔

جنگی وقائع نگاروں کا کہنا تھا کہ یہاں کی صورتِ حال ویت نام سے بھی بدتر ہے، کیوں کہ ستانے یا چھپنے کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں۔ آپ ہر وقت شیلوں یا گولیوں کی زد میں ہیں، رات کے وقت بھی جب آپ ہوٹل کے بستر پر لیٹے ہوئے ہوں، جو کبھی ایک شاہانہ قیام گاہ تھی۔ کبھی کبھی آپ گولیاں چلنے کی آوازوں کو پس منظر میں سنائی دینے والا شور، جیسے براڈوے سے گزرتی ہوئی

Scanned with CamScanner

کاروں کا شور، سمجھ کر سونے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر اچانک آپ کی نیند ٹوٹ جاتی ہے اور آپ کو احساس ہوتا ہے کہ ٹھیک اسی لمحے کہیں پاس ہی کوئی شخص مر رہا ہوگا۔ کچھ لوگ ہفتے بھر مصروف رہنے کے بعد ویک اینڈ پر سرائیوو کے ارد گرد کی پہاڑیوں پر پہنچ جاتے ہیں تاکہ کچھ اور رقم کما سکیں۔ یہ چھٹی کے دنوں کے اسنائپر ہیں۔ لوگوں کا شکار کرنا ایک طرح کا کھیل بن گیا ہے۔

کچھ اخبار نویس بھی، جن کا پیشہ ہی خطروں سے کھیلنا ہے، یہاں چند دن ٹھہر کر حوصلہ ہار جاتے ہیں، کیوں کہ دن رات کسی وقت نہ رکنے والی فائرنگ انھیں بے حال کر دیتی ہے۔ اُن کا جب جی چاہے یہاں سے نکل کر جا سکتے ہیں۔ اور اگر وہ مارے جائیں یا زخمی ہو جائیں تو ہیرو بن جاتے ہیں۔ مگر بوسنیا کے رہنے والوں کے لیے ایسی کسی عظمت، کسی ولولہ انگیزی کا وجود نہیں ہے۔ ان کے حصے میں محض مسلسل خوف، مسلسل ابتلا، اور اپنے عزیزوں کا مسلسل ماتم آیا ہے۔ جن پہاڑیوں نے شہر کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے ان کا حلقہ متواتر تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ پہاڑیاں موت اُگلتے ہوئے بڑے بڑے جبڑوں کی طرح ہیں، یہ جہنم کے جبڑے ہیں۔ دو برس تک، باہر نکلنے کے کسی راستے سے محروم، ایسے شہر میں رہنا ایک ایسی بات ہے جس کا تصور کرنا بھی دشوار ہے۔ گلیوں میں جو چند کتے دکھائی دیتے ہیں وہ بھی مسلسل فائرنگ سے سہمے ہوئے ہیں۔ یہ شہر (وِرت نام کے شہر) ڈیئن بیئن پھُو کی تکرار ہے، اس سے سَو گنا زیادہ شدید۔

میں یہاں رہنے والے چند لوگوں سے ملا ہوں۔ یہ لوگ اگر پیرس، لندن یا نیویارک میں ہوتے تو خود کو ذرا بھی اجنبی محسوس نہ کرتے۔ ان میں سے بعض ان جگہوں پر جا بھی چکے ہیں۔ ان میں زلاتکو ہے جو کسی امریکی یونیورسٹی کے کیمپس پر وقت گزارنے کا خواب دیکھتا ہے، لڑکوں جیسے چہرے والی اولیا ہے، نک چڑھا اور نرگسیت پسند دراگو ہے، راویل (Ravel) کی موسیقی پر جان دینے والی آلدانیا ہے، آتشک کام کرنے والا میرو ہے، سایارِک ہے جسے بُولے (Boulez) کی کتاب *Le Marteau sans Maitre* کی ایک جلد درکار ہے، اپنے حُسن کے جلوے دکھاتی سمیرا ہے، پیانو کے سُر ملانے والا لڑکا ہے (جسے دیکھ کر مجھے تعجب ہوتا ہے کہ اس نے آج سے پہلے بھی کبھی پیانو کے سُر ملائے ہیں)، یاسمینا ہے جو نیویارک کے تھیٹر کی نئی خبریں جاننے کے لیے بے تاب ہے، یہاں کے اخبار *Oslobodjenje* ("آزادی") میں کام کرنے والی ایک اخبار نویس ہے جس نے گھر امیک اَپ کر رکھا ہے۔

یہ تمام چہرے میرے ذہن میں رقص کر رہے ہیں۔ اور ان کی آنکھیں، وہ ساری ہنستی ہوئی، اداس، خالی، ملامت کرتی ہوئی، جھجکتی ہوئی، مایوس ہوتی ہوئی آنکھیں۔ وہ سب لوگ مجھ پر کسی آسیب کی طرح مسلط ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ چند مہینے بعد ان میں سے کون کون زندہ ہوگا، اور آیا

مجھے ان کی خبر بھی مل سکے گی، اور جو لوگ زندہ بچ جائیں گے اپنے جسم کے کس کس عضو سے محروم ہو چکے ہوں گے، ان کی دماغی صلاحیت کا کتنا حصہ باقی رہ جائے گا، ان کی کون کون سی آرزوئیں خاموش ہو چکی ہوں گی، ان کی روحیں سکڑ کر کتنی سی رہ گئی ہوں گی۔

میں ان لوگوں سے واقف ہوں۔ میں ان کے مقابل تنہا ہوں۔ میں کچھ کر نہیں سکتا۔ صرف اندر ہی اندر اپنے دل کو خون کرنا میرے بس میں ہے، اور انھیں یہیں چھوڑ کر چلے جانا، اور خود کو اس جھوٹ سے بہلاتے رہنا کہ میں اب بھی ان کے ساتھ ہوں۔

یہ سب کچھ اب میرے ساتھ ساتھ ہے۔ میں نے وہاں ہونے والا تازہ ترین واقعہ تھوڑی دیر پہلے ٹی وی کی خبروں میں دیکھا ہے۔ میں نے اُس تباہ شدہ شہر کی جھلک دیکھی ہے۔ اس کی حقیقت مجھ پر انتہائی شدّت کے ساتھ حملہ آور ہو گئی ہے۔ اتوار کی اس دھوپ بھری سہ پہر کو سائیکل پر سوار، سات آٹھ سال کا یہ ننھا لڑکا، جسے ہم سب کی توجہ اور حفاظت میں ہونا چاہیے تھا، کسی اسنائپر کی گولی سے ہلاک ہو جاتا ہے۔

مسٹر کلنٹن، مسٹر متراں، مسٹر میجر، آپ کے ہاتھ اس لڑکے کے خون سے آلودہ ہیں۔ آپ اس کی طرف نہیں بلکہ اس کے قاتل کی طرف ہیں۔ آپ ہی نہیں، مَیں بھی۔ ہم سب اُس اسنائپر کے پہلو میں بیٹھے ہیں، اور کچھ نہ کرتے ہوئے، یا ضرورت سے کم کوشش کرتے ہوئے، یا غلط قدم اٹھاتے ہوئے، ہم اُس شخص کو تسلّی دے رہے ہیں کہ اس ننھے لڑکے کو مار ڈالنا کوئی ایسی بُری بات نہیں ہے۔ آپ کو اور مجھے اپنے اس فعل کے لیے جواب دینا پڑے گا۔ اس بچے کے خون نے پوری دنیا کو ڈھانپ لیا ہے۔

ہم سب کو یہ سوچنا اچھا لگتا ہے کہ ہم مظلوم کی طرف ہیں۔ لیکن اپنی بے عملی سے، اپنے غلط اقدامات سے، اپنی کوتاہی سے، اپنی بزدلی سے، اپنے تسلیم و رضا کے رویّے سے، اپنے ذہنی بگاڑ سے، ہم سب اس جرم میں شریک ہو گئے ہیں، ہم سب کی انگلیاں اُس بندوق کی لبلبی پر ہیں۔ اور پھر ہم اپنے ضمیر کو تسکین دینے کی کوشش کرتے ہیں، ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارا دل خون ہوا جا رہا ہے، ہم یہاں تک تسلیم کر لیتے ہیں کہ ہمارا ضمیر ہمیں کچوکے دے رہا ہے اور امید کرتے ہیں کہ اس بات کو تسلیم کر لینے سے ہمیں نجات مل جائے گی!

مجھے یاد آتا ہے کہ عامرہ نے مجھے اور اپنے چند دوستوں کو ایک سابقہ کمیونسٹ ملک سے آئے ہوئے خاصے معروف ادیب* کا قصہ سنایا تھا جس نے سرائیوو کے اردگرد کی پہاڑیوں کا دورہ کیا تو اسے ایک مشین گن دکھائی گئی۔ وہ بیٹھ گیا، بندوق پر لگی ہوئی دوربین سے شہر کی طرف نگاہ ڈالی، اور ایک متحرک شے کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ اس مکروہ فعل پر، اور وہ بھی ایک نام نہاد

Scanned with CamScanner

دانش ور کے ہاتھوں، مجھے کس قدر صدمہ اور نفرت محسوس ہوئی تھی: اُس آدمی کا پیچھا کر کے اسے ایک جنگی مجرم کی طرح گرفتار کیا جانا چاہیے۔

مگر پھر مجھے احساس ہوا کہ آخر ہم اُس شخص سے کس طرح مختلف ہیں۔ ہم بھی تو بے عملی کے جرم کے قصوروار ہیں۔ بودلیر کی بات یاد کیجیے: "میرے ریاکار پڑھنے والے، میرے ہم شکل، میرے بھائی!" بچنے کا کوئی راستا نہیں ہے۔ اگر یہ سب کچھ اس قدر ہولناک نہ ہوتا تو اسے ایک مذاق کہا جاسکتا تھا۔

جب میں نے سرائیوو جانے کا فیصلہ کیا تو میرا ایک کم زور عذر خود پر عائد ہونے والے الزام کی شدت کو کم کرنا بھی تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس دورے نے میری جواب دہی اور بڑھا دی۔ اور اگر میں ایک بار پھر وہاں گیا تو میری ذمے داری میں اور اضافہ ہو جائے گا۔

ہاں! ان حیلہ ساز فقروں میں چھپے احساسِ تفاخر پر ذرا نظر کیجیے! اور جس وقت میں وہاں موجود تھا، یہ خوف، خود غرضی کی نقاب اوڑھے ہوئے یہ بزدلی، سطلے پن کی خوشی کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں، میں یہاں سے نکل کر جا سکتا ہوں! اور چند روز بعد، پیرس میں، سرائیوو کو اپنے پیچھے چھوڑ کر، اس بات کا ولولہ انگیز احساس کہ میں وہاں ہو آیا ہوں جہاں کم لوگ گئے ہوں گے اور خود کو پیرس میں پانے اور اپولینیر (Apollinaire) کے بارے میں سوچنے کی مسرّت، جس نے کہا تھا:

Soirs de Paris, livres dû gin, flambant de
l'electricite... vers toi, toi!

مجھ پر تنقید کیجیے، مجھ پر شدید نکتہ چینی کیجیے! مجھے امید ہے کہ میں آپ سے زیادہ سخت نکتہ چیں ثابت ہوں گا۔ اور میں جانتا ہوں کہ آپ کو اپنی نکتہ چینی کے لیے، اس کے محرکات کے لیے، خواہ ان میں سے بعض آپ کے ذہن کے کونے کھدروں میں چھپے ہوئے ہوں، کم از کم اپنے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ جب ہم کچھ بھی کرنے کے قابل نہ ہوں اور ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہرا رہے ہوں تو دراصل ایک دوسرے کے اندرون سے واقف ہو جاتے ہیں۔

اپنے آزاد ترین تخیل میں بھی ہمارے لیے کسی ایسی قوم کو تصور میں لانا محال ہے جس کے تمام افراد ظالموں اور مظلوموں میں تقسیم ہو گئے ہوں۔ اور باقی رہے ہم، تو ہماری حیثیت یا تو اس الم انگیزی کے تماش بینوں کی ہے، یا پھر اندھے، گونگے، بہرے اور مفلوج شخص کی سی، اور ہم نے اپنی مرضی سے، اور پورے ارادے کے ساتھ، کچھ نہ جاننے کا، کچھ بھی جاننے کی خواہش نہ رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

وکٹر ہیوگو آج کہاں ہیں؟ کہاں ہیں آج سارتر؟ کیا وہ سب بھی آج گونگے ہو گئے ہیں؟

ہمارے اجتماعی ضمیر کی آوازیں کہاں ہیں؟ اوہ، میں بھول گیا! آج انھیں شاعر یا فن کار نہیں، بلکہ ٹی وی کے anchors کہا جاتا ہے۔ اور جہاں کل شاعر اپنا فرض ادا کرنے میں ناکام رہے تھے، صحافیوں کو اپنا فرض ادا کرنے میں اس سے بھی کہیں زیادہ ناکامی ہوئی ہے۔ مگر کیا انھوں نے کوشش بھی کی ہے؟

سرائیوو کے سلسلے میں ہم سب کو جواب دینا پڑے گا، خاص طور پر آپ کو اور مجھے۔ اب اس سے فرار کا کوئی راستا نہیں رہا۔ ہم آزاد نہیں ہیں۔ ہم اب آزادی کی تمنا نہیں کر سکتے۔ ہم سب اپنے اندر قید ہو گئے ہیں۔ ہمیں عمر قید کی سزا ملی ہے۔

شاید کسی اور موقعے پر میں وہ سب کچھ کہہ سکوں جسے کہنا آج میرے بس میں نہیں۔ اس وقت تک کے لیے خدا حافظ، میرے دوست! میں آپ کو سکونِ قلب کی دعا نہیں دوں گا۔

**

*اشارہ غالباً روس کے شاعر اور ناول نگار ایدوارد لیمونوف (Eduard Limonov) کی جانب ہے۔ ایک زیرِ زمین شاعر کے طور پر لیمونوف کو برژنیف کے زمانے میں سوویت یونین سے نکال دیا گیا تھا۔ امریکا پہنچنے کے بعد لیمونوف نے اپنا ناول *It's Me, Eddie* لکھا جو پہلی بار فرانس سے شائع ہوا۔ روس میں یہ ناول ۱۹۸۰ کی دہائی کے آخری برسوں میں ایک غیر سرکاری اشاعتی ادارے نے شائع کیا اور ۱۹۹۳ تک اس کی بیس لاکھ سے زیادہ جلدیں فروخت ہو چکی تھیں۔ روس واپس جا کر لیمونوف نے انتہاپسند روسی قوم پرست ولادیمیر ژرنوفسکی (Vladimir Zhirinovsky) کی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ (یہ پارٹی، جسے روسی انتخابات میں تقریباً ۲۵ فیصد ووٹ حاصل ہوئے، روسی امپیریلزم کی اُس قومی اُمنگ کو زندہ کرنے کی داعی ہے جو زار کے زمانے سے چلی آ رہی ہے اور جس کے حساب سے وسطی ایشیا، افغانستان اور برصغیر جنوبی ایشیا روسی سلطنت کا حصہ ہیں۔) ایدوارد لیمونوف کے اخباری مضامین کا مجموعہ *Disappearance of the Barbarians* ۱۹۹۰ کی دہائی کے اوائل میں شائع ہوا ہے۔ لیمونوف نے سابق یوگوسلاویا میں مسلمانوں پر گولی چلانے کا بڑے فخر کے ساتھ اقرار کیا ہے۔ مجاہدانہ جوش و خروش سے سرشار ہر شخص کی طرح وہ بستر میں فطری موت مرنے کو بے نتیجہ خیال کرتا ہے اور میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے مارے جانے کو ترجیح دیتا ہے۔ لیمونوف کے رویے کو سوویت یونین کے خاتمے کے بعد روس میں قوم پرستی (یا نسل پرستی) کے بڑھتے ہوئے رجحان کے نمائندے کے طور پر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ رجحان روسی حکومت کی جانب سے سربیا کی غیر مشروط حمایت اور مادّی امداد کی صورت میں متواتر سامنے آ رہا ہے۔ "گارڈین ویکلی" کی ۲۷ فروری ۱۹۹۴ کی اشاعت میں اس امر کی چشم دید رپورٹ شائع ہوئی کہ جب روسی فوجی اقوامِ متحدہ کی "امن فوج" کے دستوں کے طور پر بوسنیا کے سرب مقبوضہ علاقوں میں داخل ہوئے تو قوم پرست سربوں نے اپنے ساتھیوں کی حیثیت سے ان کا

Scanned with CamScanner

استقبال کیا۔ کروشیائی ادیب دُبراوکا اُگریشک کے مضمون "بلقان کے اُداس گیت" میں بھی لیمونوف کا ذکر آیا ہے۔ یہ مضمون بھی موجودہ انتخاب میں شامل ہے۔(مترجم۔)

اقبال احمد

ترجمہ: اجمل کمال

اقوامِ متحدہ: ایک وفات نامہ

اقوامِ متحدہ ۱۸ اپریل ۱۹۹۴ کو سرب فسطائیوں کے ہاتھوں، جنھیں پہلے ہی جنگی مجرم کی حیثیت سے شناخت کیا جا چکا تھا، مہلک زخم کھا کر چل بسی۔ جب دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر سان فرانسسکو میں اقوامِ متحدہ کا جنم ہوا تھا تو دنیا بھر میں امیدیں بیدار ہو گئی تھیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ اپنی پیش رو، لیگ آف نیشنز، کے برخلاف، امن قائم کرنے کا ایک موثر ذریعہ ثابت ہو گی۔ جوں جوں اقوامِ متحدہ ریاست ہائے متحدہ امریکا اور اس کے اتحادیوں کی لونڈی بنتی گئی، یہ امیدیں مدھم پڑنے لگی تھیں۔ اس کے باوجود کروڑوں لوگ اس کی موت کا سوگ منائیں گے۔ متوفیہ بوسنیا میں واقع اقوامِ متحدہ کے "محفوظ علاقے" یعنی گورازدے کے ملبے میں دب کر مری۔ پس ماندگان میں اس نے اپنی مالک بڑی طاقتیں چھوڑی ہیں جنھوں نے متوفیہ کی نعش کو حنوط کر کے حکمتِ عملی کے ایک اثاثے کے طور پر استعمال کرنے کا عہد کیا ہے۔ آخری رسوم کے لیے تاحال کسی تاریخ کا اعلان نہیں کیا گیا ہے۔

غم و غصے کے جذبات کا ذخیرہ رفتہ رفتہ ختم ہو جاتا ہے۔ اداسی اور شرم کے احساسات باقی رہ جاتے ہیں اور اکثر صورتوں میں چھلک کر تاریخِ عالم کے صفحات کو سرخ رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔ یہ وفات نامہ سخت کرب کے عالم میں لکھا جا رہا ہے۔ اس ہفتے گورازدے میں اقوامِ متحدہ کے فوت ہونے کے ساتھ ہی اس میں پوشیدہ اس کم زور سے امکان کا بھی خاتمہ ہو گیا کہ ہولوکاسٹ جیسے واقعات گزرے ہوئے کل کا حصہ بن جائیں گے۔ اس کے مصری سرپرست اور گورکن، بطرس بطرس غالی، اپنے کام سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ یہ توقع کرنا بے سود ہو گا کہ وہ آخری رسوم ادا کر کے گھر واپس چلے جائیں گے۔ وہ اُس وقت تک سیکرٹری جنرل کے عہدے پر متمکن رہیں گے جب تک پانچوں فرعون دریائے شرق کے کنارے متوفیہ کی حنوط شدہ لاش کے پہرے دار کے طور پر ان کی ملازمت برقرار رکھنے پر آمادہ ہیں۔

Scanned with CamScanner

اس عالمی تنظیم کے والدین اور پرورش کنندہ، یعنی سلامتی کاؤنسل کے ارکان، جو در حقیقت عالمی عدم سلامتی اور قتلِ عام کے محافظ ہیں، اس ہولوکاسٹ کے بارے میں کھوکھلے عذر تراشتے رہیں گے جس کو جاری رکھنے کی خود انھوں نے اجازت دی ہے۔ خوف اور اندیشوں کے احساس کو کم کرنے کے لیے وہ طلسمی منتر پڑھیں گے اور اوٹ پٹانگ نمائشی رسمیں اختراع کریں گے جنھیں لارڈ اوون، ڈگلس ہرڈ اور کرسٹوفر وارن جیسے بے حس پنڈتوں اور پیدائشی جھوٹوں کے ہاتھوں سرانجام دیا جائے گا۔

اپنے پوپلے دہانوں سے چند اَور ناقابلِ فہم آوازیں نکال کر وہ بلاشبہ اپنا کام دوبارہ شروع کر دیں گے اور یہی ظاہر کریں گے گویا ان کے قبضے میں کوئی نعش نہیں بلکہ ایک زندہ ہستی ہے جو دنیا میں امن قائم کرنے والے کا کردار ادا کرنے پر آمادہ ہے۔ اس کے نام پر یہ لوگ، جب کبھی ان کے اپنے عالمی مفادات کا تقاضا ہوا، امن کے قیام کے بڑے بڑے منصوبے اور بڑی بڑی جنگیں شروع کریں گے، جن کو "ڈیزرٹ اسٹورم" جیسے عجیب و غریب نام دیے جائیں گے۔ اس عمل میں انھیں نوآبادیت کی جانشین، پس ماندہ اور لالچی، طفیلی ریاستوں کی برخوردارانہ تقلید حاصل رہے گی جس طرح خلیج اور سومالیا کے سلسلے میں حاصل ہوئی تھی۔

اقوامِ متحدہ کے باقی ارکان کو -- جن میں پچاس سے زیادہ مسلم حکومتیں بھی شامل ہیں جن کے قائدین اُمّہ کی یک جہتی کے نعرے لگانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے -- ایسا رویہ اختیار کرنے کی ہر گز جرأت نہیں ہو گی کہ گویا بادشاہ سچ مچ ننگا ہے۔ وہ بوسنیا کو بچانے کے لیے ایک جیتی جاگتی انگلی تک ہلانے میں اپنی عظیم ناکامیابی کی حدود اور اسباب کو تسلیم کرنے کا بھی حوصلہ پیدا نہیں کر سکیں گے۔ وہ اُس وقت مداخلت کرنے سے قاصر رہے جب مداخلت ممکن -- بلکہ ضروری -- تھی، اور ان ملکوں کے اپنے قومی مفادات کے لیے مفید بھی۔ انھوں نے مغرب کے ساتھ اپنی تجارت اور سرمایہ کاری کو اس قتلِ عام کے فوری خاتمے سے مشروط نہیں کیا۔ وہ قتل کا ہدف بننے والوں کے ہتھیار حاصل کرنے پر مغرب کی جانب سے بدمعاشی سے عائد کی گئی پابندیوں کو توڑنے سے بھی قاصر رہے۔ آنے والی نسلیں آج کے مسلم رہنماؤں کو پلاسٹک کے بنے مردوں اور عورتوں کے طور پر یاد کریں گی جو مشینی انداز سے اتحاد کی باتیں ضرور کیا کرتے تھے مگر دراصل غلامی کے آداب کے سوا کسی چیز سے واقف نہیں تھے۔ بجز اس کے کہ خاکستر کے اس ڈھیر میں کہیں کوئی چنگاری چھپی بیٹھی ہو۔

بوسنیا کے المیے میں اب تک سامنے آنے والا عظیم معجزہ صرف بوسنیا کے لوگ ہیں۔ مغربی دنیا اور مسلم دنیا -- جو دونوں بوسنیا کی شخصیت کے دو رخ ہیں -- ان دونوں دنیاؤں نے اپنی

محبوب اقدار کی بابت لفاظی اور خطابت کے سوا ان اقدار سے اپنی وابستگی نبھانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ مغربی قیادت خود کو روشن خیالی اور کثیر مشربی کا علم بردار، تحمل اور رواداری کی اقدار کا نگہبان اور ایک کثیر النسل کلچر کا نمائندہ ظاہر کرتی ہے۔ لیکن بیسویں صدی کے اواخر کے ان دو سفاک برسوں میں اس نے نفرت اور نسل پرستانہ قتلِ عام کے نظریات کے حامل ایک مسیحی گروہ کے ہاتھوں یوروپ کی قدیم ترین اور واحد مسلمان قوم کی تباہی کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ اس کام میں اعانت بھی کی ہے۔ دوسری طرف مسلمان قائدین، جو اُمّہ کے اتحاد کی مالا جپنے سے کبھی نہیں تھکتے، ایک مسلم برادری پر توڑی جانے والی اس قیامت کے دوران کام و دہن کی لذتوں سے آسودہ ہونے میں مشغول اور ناروا طور پر حاصل کی ہوئی مرسڈیز اور بی ایم ڈبلیو گاڑیوں میں سوار ہو کر ذاتی مفاد اور انبساط کی تلاش میں سرگرداں رہے۔

ان دونوں گروہوں کے برعکس بوسنیا کے لوگوں نے ان دونوں تہذیبوں کے وارث ہونے کا حق ادا کیا ہے۔ انھوں نے اپنے ملک میں رواداری اور کثیر مشربی کی شمع روشن رکھی ہے۔ سربوں کی اشتعال انگیزیوں اور خود اپنی دردناک ابتلاؤں کے باوجود انھوں نے، سچے مسلمانوں اور حقیقی طور پر مہذب لوگوں کی حیثیت سے، ایک ہمہ گیر آدرش سے وفاداری نبھائی ہے۔ "بوسنیا زبردست اہمیت کا حامل ہے، کیوں کہ اس نے صرف اپنی خودمختاری کا نہیں بلکہ صدیوں تک باثمر طور پر ساتھ رہنے والی مختلف نسلوں کی طویل عرصے میں قائم ہونے والی قدروں کا بھی تحفظ کیا ہے،" کرسٹوفر ہچنز نے بوسنیا کے دورے سے لوٹ کر لکھا ہے، "اندلس کے بعد سے اب تک یوروپ تہذیبوں کی ہم آہنگی کے اس نمونے سے زیادہ کسی کا مقروض نہیں رہا۔۔۔" مٹا دینے پر تلے ہوئے جنونی دشمن اور اردگرد کی بےحس دنیا، دونوں کا سامنا کرتے ہوئے بوسنیا کے لوگوں نے اپنی مسلم شناخت کو فخر کے ساتھ قائم رکھا ہے۔

ان محصور لوگوں نے ثابت قدمی اور ہوشیاری کے ساتھ اپنا دفاع کیا ہے، جب کہ ان کے پاس گھروں میں اور غیر روایتی طور پر قائم کیے گئے ناقص کارخانوں میں تیار کیے ہوئے ہتھیاروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بہت کم لوگ ان کے اتنے طویل عرصے تک زندہ بچ جانے کی توقع کرتے تھے، اور یہ گمان تو کسی کو بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے حملہ آوروں سے باقاعدہ جنگ کریں گے اور اکادکا لڑائی جیت بھی جائیں گے۔ گورازدے کا شہر غالباً حملہ آور سربوں سے شکست کھا جائے گا۔ ہزاروں جانیں تلف ہو جائیں گی، اور ان کے علاوہ بہت سے لوگ اذیت دہی کا اور بہت سی عورتیں جبری زنا کا نشانہ بنیں گی۔ اس فتح کے بعد سرب اپنے مشرقی بوسنیا کے مفتوحہ علاقوں کو جنوب اور جنوب مغرب کے اُن علاقوں سے ملانے میں کامیاب ہو جائیں گے جن پر وہ پہلے ہی قبضہ کر چکے

Scanned with CamScanner

ہیں۔ گورازدے کے ہاتھ سے نکل جانے کا مطلب یہ ہو گا کہ بوسنیا پوبیئدا (Pobjeda) میں واقع گولا بارود کے زیرِ زمین کارخانے سے محروم ہو جائے گا۔ تاہم، جو لوگ جارحانہ قبضے کی مزاحمت کا عزم رکھتے ہوں ان کے لیے کوئی بھی نقصان فیصلہ کن نہیں ہو سکتا۔ بوسنیا کے لوگوں میں یہ عزم موجود ہے، اور ان کی مدد کی جانی چاہیے۔

اسلحہ حاصل کرنے پر لگی ہوئی پابندی کو لازماً ختم ہونا چاہیے۔ حکومتوں پر رائے عامہ کا دباو پڑنا چاہیے کہ جب تک سلامتی کاؤنسل یہ پابندی اُٹھا نہیں لیتی، اقوامِ متحدہ کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے۔ کاؤنسل کے پانچ بڑوں پر ہر طرح سے زور ڈالا جانا چاہیے کہ وہ جارحیت کا شکار ہونے والوں کو زندہ رہنے کی مہلت دیں۔ متعلقہ سفارت خانوں پر وفد لے جانے اور ان کے سامنے مظاہرے کرنے سے ہمیں کسی نے نہیں روکا ہے۔ متعلقہ افراد کو چاہیے کہ اسلحے پر پابندی کے معاملے کو اس قدر نمایاں کریں کہ کم از کم چند حکومتیں -- انفرادی طور پر -- اس پابندی کو توڑنے پر مجبور ہو جائیں۔ ایسا کرنے والی حکومتوں کو ایسے غیر متوقع حلقوں سے حمایت حاصل ہو گی کہ وہ حیرت میں رہ جائیں گی۔

غیر منصفانہ قوانین اُسی وقت منسوخ کیے جاتے ہیں جب اُن کو توڑا جانے لگتا ہے۔ حکومتوں، خصوصاً مسلم حکومتوں، پر سخت دباو ڈالا جانا چاہیے کہ وہ اس پابندی کو توڑ ڈالیں، اگر ضروری ہو تو خاموشی سے، اور اگر ممکن ہو تو علانیہ طور پر۔ بوسنیا اور کروشیا کے درمیان ہونے والے حالیہ معاہدے نے بوسنیا کی بحیرۂ ایڈریاٹک تک رسائی کو ممکن بنا دیا ہے، اس طرح اُسے ایک ایسی ضروری سپلائی لائن مل گئی ہے جو پہلے میسر نہیں تھی۔ بوسنیا کے پاس خواندہ اور تربیت یافتہ افراد کی خاصی بڑی تعداد موجود ہے۔ اسے بھاری اسلحے کی، خصوصاً ٹینک شکن توپوں، عمدہ آرٹلری، مشین گنوں اور راکٹ لانچروں، اور گولا بارود کی ایک بڑی مقدار کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنا دفاع کر سکے۔ اقوامِ متحدہ، جو یوں بھی جارحیت کا نشانہ بننے والوں کی مدد کے لیے شاذونادر ہی آگے بڑھتی تھی، اَب عملاً مردہ ہو چکی ہے۔ بنی نوعِ انسان کو اس بات کے لیے مزید منتظر نہیں رہنا چاہیے کہ واشنگٹن، لندن اور پیرس میں بیٹھے ہوئے خبطی حقیقت پسند افراد اُن کی تقدیر کا فیصلہ کریں۔

**

Scanned with CamScanner

رابرٹ فِسک

ترجمہ: اجمل کمال

گویا مارکس ہی کی بات درست نکلی

بوسنیا کے کس وزیر نے یوروپی ثالثوں کے ساتھ اپنی ملاقات کا احوال مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا تھا؟

> "اس نے عجلت میں اور سطحی قسم کے سرسری پن کے ساتھ اپنی بات میں اضافہ کیا کہ ہماری جانب سے کوئی جواب مطلوب نہیں ہے، اور یہ کہ جہاں تک اُن کا تعلق ہے وہ اس منصوبے کو تسلیم شدہ ہی خیال کرتے ہیں، اور یہ کہ ہماری حکومت کے پاس صرف اُس روز تین بجے سہ پہر تک کی مہلت ہے کہ وہ اپنے نمائندوں کو کمیشن کے اجلاس میں شرکت کے لیے بھیج دے۔۔۔ اس نے کہا کہ یہ ماحول تمام دنیا کے لیے خطرے کا باعث بنتا جارہا ہے۔۔۔ الف نے اپنی اکتاہٹ کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس نے دوسرا، قدرے تبدیل شدہ نقشہ ہمارے حوالے کیا۔ پھر وہ ہم سے فارغ ہوگئے اور ہمیں جانے کی اجازت دے دی گئی۔"

کیا یہ بیان بوسنیا کے صدر علیا عزت بیگووچ کا ہے؟

لارڈ اوون کو بھی اکثر بوسنیا کی حکومت پر اپنی جھنجھلاہٹ اور اکتاہٹ چھپانے میں ناکامی ہوتی رہی ہے اور انھوں نے ۔۔اب لگتا ہے کتنے طویل عرصے پہلے ہی۔۔ شکایت شروع کر دی کہ وہ شکست خوردہ ملک کے بجائے فتحمند ملک جیسا رویّہ اختیار کیے ہوئے ہے۔

اس ہولناک پیراگراف کی حقیقت یہ ہے کہ یہ ولیم شیرر (William Shirer) کی کتاب *The Rise and Fall of the Third Reich* سے لیا گیا ہے اور یہ بیان ڈاکٹر ہیوبرٹ

Scanned with CamScanner

مسارک کے قلم سے ستمبر ۱۹۳۸ میں چیکوسلوواکیا کی وزارتِ خارجہ کے نام لکھی گئی ایک رپورٹ کا حصہ ہے۔

مسارک کے ہاتھ میں زبردستی نقشہ تھمانے والا فرانسیسی دفترِ خارجہ کا سیکرٹری جنرل تھا۔

"الف" دراصل نویل شامبرلین تھا۔

نسلی نقشہ درحقیقت سوڈیٹن لینڈ کا تھا۔

فتح منداصل میں اڈولف ہٹلر کو ہونا تھا۔

یوروپی وزرا بہت پہلے اس قسم کی مماثلتیں دریافت کرنے کی مذمت کر چکے ہیں۔ یہ طریقہ رسوا کن، شرمناک اور غلط سلط ہے، انھوں نے ہمیں بتا دیا ہے۔ اور وہ ایک عالمی کھیل میں مشغول ہیں۔

بوسنیا، ان کا دعویٰ ہے، ایک خانہ جنگی کا معاملہ ہے۔ وہ اس بات کو فراموش کر چکے ہیں کہ ۱۹۳۹ سے ۱۹۴۵ تک جاری رہنے والی قیامت بھی ایک یوروپی خانہ جنگی ہی سے شروع ہوئی تھی۔

لیکن مشرقِ وسطیٰ میں بیٹھ کر سرائیوو کے تازہ ترین قتلِ عام کی خبر سننا بڑا تکلیف دہ کام ہے۔ یہاں سے دیکھنے پر لگتا ہے کہ یوروپی حکومتوں کا ردعمل اشتعال پر نہیں بلکہ اس عزم پر مبنی ہے کہ خواہ جنگی جرائم کتنے ہی کیوں نہ بڑھ جائیں، کوئی فوجی کارروائی نہیں کی جائے گی۔

کیوں کہ جو کچھ سرائیوو میں پچھلے سنیچر کو پیش آیا دراصل ایک جنگی جرم کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس کے باوجود، اتوار کو اقوامِ متحدہ سرائیوو کے بازار میں شیل پھٹنے سے بننے والے گڑھے کا بڑی سنجیدگی کے ساتھ معائنہ کرتی پائی گئی۔ تاحال، مسٹر بطرس بطرس غالی کی "امن" فوج کے افسروں نے اعلان کیا، اس بات کا حتمی ثبوت حاصل کرنا ممکن نہیں ہوا ہے کہ یہ مہلک شیل کس کی طرف سے پھینکا گیا تھا۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ستمبر ۱۹۳۹ میں لیگ آف نیشنز کی جانب سے ایک وفد وارسا بھیجا جاتا کہ جرمن بمباری کے ہاتھوں شہریوں کی ہلاکت کی تحقیقات کرے۔ کیا عجب کہ پولینڈ والوں نے خود ہی اپنے پر بم مار لیے ہوں!

اتنا تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ مماثلتیں مکمل طور پر درست نہیں بیٹھتیں۔ بوسنیا والوں کے ہاتھوں ان کے اپنے شہری اس سے پہلے ہلاک ضرور ہوئے ہیں۔ مگر دوسری طرف پولینڈ کی آمرانہ اور یہود دشمن حکومت بھی دوسری جنگِ عظیم سے پہلے کے عرصے میں مکمل طور پر بے قصور نہیں کہلا سکتی تھی۔

Scanned with CamScanner

لیکن جس بات پر آدمی کو تعجب ہوتا ہے وہ یہ ہے: اقوامِ متحدہ کی حفاظتی فوج کے سپاہی --اور یوروپی اربابِ حکومت-- آخر کس کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہیں؟

مشرقِ وسطیٰ کے طول و عرض میں مسلمان یہی سوال کر رہے ہیں۔ وہ اپنے آپ سے پوچھ رہے ہیں کہ بوسنیا میں ان کے ہم مذہبوں کا قتلِ عام کیوں جاری رہنے دیا جا رہا ہے۔

سوال نہایت سادہ ہے: اگر بوسنیا میں مسلمان مسیحیوں کو ذبح کر رہے ہوتے تو کیا تب بھی مغرب یوں خاموش تماشائی بنا رہتا؟ زیادہ تفصیلی تحقیق ہمیں اُس اخلاقی صلیبی جنگ کی یاد دلا دیتی ہے جس نے ہمیں تین سال پہلے مشغول کر رکھا تھا، جب مسیحی دنیا کی عظیم ترین فوج مسلم دنیا کی طاقتور ترین فوج کے سامنے صف آرا ہو گئی تھی۔

ہاں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُس وقت اخلاقی سوالات خاصے واضح تھے۔

مجھے ظہران، سعودی عرب، میں جنرل نورمن شوارزکوف کی پہلی پریس کانفرنس یاد ہے۔ "آپ اپنے فوجیوں کو یہ بات کب بتائیں گے،" یہ میرا سوال تھا، "کہ انھیں تیل کے سلسلے میں عراق سے جنگ آزما ہونا پڑے گا؟"

"یہ تیل کا سلسلہ نہیں ہے، زنا بالجبر کا معاملہ ہے!" اس نے جواب میں غرّا کر کہا تھا۔ "درحقیقت یہ اجتماعی زنا بالجبر کا مسئلہ ہے۔" کویت میں عراقی فوجیوں نے بلاشبہ کئی سو عورتوں کو جبری زنا کا شکار بنایا تھا۔ لیکن پھر بوسنیا کا معاملہ سامنے آیا جہاں بیس ہزار مسلمان عورتیں منظم اور منصوبہ بند انداز میں -- بلکہ جنگی حکمتِ عملی کے طور پر -- جبری زنا کا نشانہ بنیں۔

تب کوئی جنرل شوارزکوف کہیں دکھائی نہیں دیا۔ برطانوی وزرا -- جنھوں نے خلیج کی جنگ میں حصہ لینے کے لیے برطانوی فوجیوں کو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے روانہ کر دیا تھا، جنھوں نے ہر اُس آواز کو پرزور مذمت کر کے خاموش کر دیا تھا جس نے اس تنازعے کے اخلاقی مقاصد کے بارے میں شک شبہے کا اظہار کیا -- آج کل اپنا وقت بوسنیا میں برطانوی فوجیوں کو پہنچنے والے ممکنہ نقصان کے خطرے سے خبردار کرنے میں گزارتے ہیں۔

دراصل ان کی تمام کوششیں بلقان کے خطے میں ہونے والی ہولناکیوں کو روکنے کے لیے فوجی مداخلت کی نہیں بلکہ یوروپ کی ایک محتاط پسپائی کی منصوبہ بندی کے لیے وقف ہو چکی ہیں، ایک ایسی پسپائی کے لیے جو میونخ والی پسپائی سے ذرہ بھر کم ذلت آمیز نہیں ہے۔

جب ہٹلر اپنی ایک لاکھ افواج کے ساتھ یوگوسلاویا پر قابو نہ پا سکا، یوروپی حکومتیں نشان دہی کرتی ہیں، تو پھر ہم ایسا کس طرح کر پائیں گے؟ وتیز (Vitez) میں ہونے والی ایک پریس کانفرنس میں، جہاں میں خود موجود تھا، برطانیہ کے سیکرٹری دفاع مالکم رِفکنڈ (Malcolm

(Rifkind) نے شرم ناک انداز میں نازیوں کے یہ اعداد و شمار اس موقف کی شہادت میں پیش کیے کہ دراصل بلقان کے خطے میں امن کا نفاذ ناممکن ہے۔

مگر چلیے، مشرقِ وسطیٰ واپس چلتے ہیں جہاں کی قوموں کو۔۔ اکثر قوموں کو۔۔ کویت کو آزاد کرانے کی جنگ میں شامل ہونے پر آمادہ کر لیا گیا تھا۔

پوری عرب دنیا میں بوسنیا کے سوال پر غم و غصہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ سٹیلائٹ ٹیلی وژن ہر رات لاکھوں عرب گھروں میں جبری زنا اور قصابیت کے اس ہتک آمیز رزمیے کی جھلکیاں دکھلاتا ہے۔ اور اس کا اثر ہونے لگا ہے۔

الجزائر میں حالیہ مہینوں کے دوران ہونے والا ہولناک ترین واقعہ بارہ کروٹ مزدوروں کا قتل تھا جن کے حلق چاک کر دیے گئے، اور اس واقعے کی ذمے داری قبول کرنے والوں کا کہنا ہے کہ اس کا سبب بوسنیا تھا۔

پچھلے سال قاہرہ میں سب مشین گن سے مسلح ایک شخص سمیر امس ہوٹل کے قہوہ خانے میں گھس آیا اور وہاں موجود ایک امریکی اور ایک فرانسیسی کے چہرے گولیوں سے چھلنی کر دیے۔ بعد میں مصری پولیس نے بتایا کہ، قاتل کے بیان کے مطابق، اس نے "بوسنیا کا انتقام لیا تھا"۔

محض اکاد کا واقعات! آپ شاید کہیں گے، اور اس بات کو بھول جائیں گے کہ پچھلے موسم خزاں میں تیس ہزار مصریوں نے مسلم دنیا کی عظیم ترین درس گاہ الازہر میں جمع ہو کر بوسنیا کے قتلِ عام پر احتجاج کیا تھا۔ ان کا اعتراض اتنا اس بات پر نہیں تھا کہ یورپ کی ۔۔ خاص کر برطانیہ کی ۔۔ پالیسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی حقوق کے احترام اور ان کی خلاف ورزیوں پر اپنی ذمے داری کو فراموش کر دیا گیا ہے، جتنا اس پر کہ مداخلت نہ کرنے کا دانستہ پروگرام بنایا گیا ہے، کہ مغرب نے جان بوجھ کر یوروپی افراد کی جانوں کو ایک یوروپی تنازعے کے سلسلے میں خطرے میں ڈالنے سے انکار کر دیا ہے جس میں ہلاک ہونے والے بیش تر لوگ مسلمان ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ مغرب میں اس ہفتے کے اختتام پر سرائیوو کی گل چینی لفظوں کے کھیل کے چند نئے پیرائے سامنے لائے گی۔ لارڈ اوون اتوار کے دن اپنے کام پر لوٹ آئے تھے اور فوجی کارروائی کے ہر پیدا ہونے والے قیاس کی تردید کر رہے تھے۔ برطانیہ کی پالیسی میں کسی تبدیلی کا سراغ نہیں ملتا۔ یوروپ کی جانب سے کسی بھی عملی اقدام کا مطلب برطانیہ کی کھیل سے دست برداری ہو گا۔

برطانوی رجمنٹوں کے پاس بہت سے جنگی اعزازات ہیں: کورونا، واٹرلو، مونز، ڈنکرک، العالمین۔ کسے معلوم، بلقان کے اس جھنجھٹ کا سامنا ہونے پر کولڈسٹریم گارڈ کو اپنی فہرست میں

Scanned with CamScanner

"بوسنیا سے پسپائی" کا بھی اضافہ کرنا پڑے۔ اگر ایسا ہی ہوا تو مشرقی یوروپ ہم پر بھروسا کرنا ترک کردے گا۔ مسلم دنیا میں مغرب کے اصل عزائم کے بارے میں سلگتے ہوئے شبہات تیزی سے بھڑک اٹھیں گے۔ یہ نیو ورلڈ آرڈر کو آخری اور حتمی الوداع ہو گی۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہمارے بس میں صرف اشارہ جائے گا کہ ولیم شیرر کی لکھی ہوئی تیسری رائخ کی تاریخ کو بیٹھے پڑھا کریں۔

**

Scanned with CamScanner

زوران فلِپووِچ

ترجمہ: اجمل کمال

جہنّم کا ایک موسم

جہنّم، اپنی تعریف کے لحاظ سے، شر کا ایک عمومی مقام ہے جہاں خدا ایسے لوگوں کی روحوں کو بھیجتا ہے جنھوں نے اپنی زندگی میں اتنی ڈھٹائی کے ساتھ ایسے بھیانک گناہ کیے ہوں کہ نہ ان کی بخشش ممکن ہو اور نہ اصلاح۔ اُن کی روحیں وہاں ہمیشہ "رہیں" گی، کبھی نہ ختم ہونے والی تکلیف میں اپنے ناقابلِ معافی گناہوں کا سخت اور بےرحم خمیازہ ہمیشہ ہمیشہ بھگتتی رہیں گی جو انھوں نے اپنی مختصر ارضی زندگی میں کیے تھے۔ وہ گناہ جو اپنے سرزد ہونے کے دوران میں، وقت میں، محدود اور متعیّن رہے ہوں گے، خواہ کسی انسان کی پوری زندگی پر محیط رہے ہوں، اُن کا خمیازہ ابدالآباد تک جاری رہے گا، اُس بےحد و نہایت وقت میں جو صرف اِس علم کے محیط میں آسکتا ہے کہ وہ لامتناہی وقت ہوگا۔ یہ مقام ابدی آگ کی اقلیم میں کہیں واقع ہے اور وہاں گناہ گاروں کی روحیں اس غیر مختتم عذاب کی ہولناکی سے پِس کر، چیخ چیخ کر "موت" کی آرزو کریں گی کیوں کہ یہ عذاب اتنا ہولناک ہوگا، اتنا ہولناک، کہ بیان کرنا تو کجا، تصوّر میں نہیں آسکتا۔ اور اس جہنّم سے نکلنے کا واحد راستا "موت" کا خیال ہوگا، صرف خیال، کیوں کہ موت صرف ایک بار آتی ہے، اور یہ عذاب ہمیشہ ہمیشہ جاری رہنے والا ہے۔

سرائیوو شر کا ایک عمومی مقام ہے۔ سرائیوو میں وقت ناموجود ہو چکا ہے۔ گزرا ہوا کل اور آنے والا کل، دونوں معدوم ہو چکے ہیں۔ سرائیوو میں صرف حال کا لمحہ موجود ہے، دہشت ناک اور بخشش سے محروم لمحہ۔ اسی لمحے کھانا کھانا ہے، اسی لمحے خود کو ٹھٹھرنے سے بچانا ہے، اسی لمحے پانی تلاش کر کے لانا ہے۔ کب تک؟

سرائیوو پہنچنا سخت دشوار ہے۔ روانگی کی تیاریاں نازک، پیچیدہ، دقت آمیز اور طویل ہوتی

Scanned with CamScanner

ہیں- یا پھر یہ فیصلہ لمحے بھر میں ہو جاتا ہے، ہر چہ بادا باد- کسی سخت تکلیف کو، وہاں ہونے کی شدید اور دہشت انگیز ضرورت کو، محسوس کیے بغیر آدمی سرائیوو جانے کا فیصلہ نہیں کرتا- سرائیوو تو ایسی جگہ ہے جسے چھوڑ کر جایا جاتا ہے، جہاں سے فرار ہوا جاتا ہے- لیکن سرائیوو میں داخل ہونا اور سرائیوو سے باہر نکلنا، دونوں عمل طویل، پیچیدہ اور پُر ہیجان تیاریوں سے مشروط ہیں- روانگی کے فیصلے پر، سرعام یا چوری چھپے، دیر تک گفتگو کی جاتی ہے، پھر آدمی اس عمل میں، قانونی یا غیر قانونی طور پر، داخل ہوتا ہے- روانگی کے تصوّر باندھے جاتے ہیں، خواب دیکھے جاتے ہیں- ہر شخص سرائیوو سے چلا جانا چاہتا ہے- اور وہ جو کہتے ہیں کہ وہاں سے نہیں جانا چاہتے، کہ وہ وہیں رہنا چاہتے ہیں، اور جو وہیں جمے بھی رہتے ہیں، وہ لوگ سب سے بڑھ کر اس شہر سے جانا چاہتے ہیں- فرار ہو جانا چاہتے ہیں- غائب ہو جانا چاہتے ہیں- ہمیشہ ہمیشہ کے لیے-

سرائیوو ایک جال ہے- چاروں طرف سے چیتنکوں کے گھیرے ہیں، دشمنوں کے دوہرے، تہرے، چوہرے حلقوں میں مکمل طور پر محصور ہے- دشمن کی نفری اور اس کی ہلاکت خیز اور ناقابلِ تصوّر توپوں اور بندوقوں کی زد میں بالکل بے مدافعت ہے- یہ توپیں اور بندوقیں اندھادھند، اور رک رک کر، چلتی ہیں اور ان کا نشانہ ہمیشہ درست بیٹھتا ہے، کیوں کہ ان سے نکلا ہوا بارود جس مقام پر بھی جا کر لگے وہی ان کا درست ہدف ہے- اوپر سے، پہاڑیوں پر سے، چھوٹنے والے ہر شیل کا مطلب نیچے، شہر میں، کم از کم ایک موت ہے، اسٹیڈیم میں، باغ میں، کارپارک میں، عجلت میں کھودی جانے والی کم از کم ایک نئی قبر- قبرستان بہت پہلے بھر چکے ہیں- مارے جانے والے (فطری موت اب شاذونادر ہی پیش آتی ہے) جلدی میں، کسی تفصیلی رسم کے بغیر، آنسوؤں اور نوحوں کے بغیر، دفن کیے جاتے ہیں- جنازے میں شامل گنے چنے لوگ، قریب ترین عزیز، خشک چہروں کے ساتھ، مارے جانے والے کو اُتھلی سی قبر میں لٹا دیتے ہیں، ذرا سی مٹّی اُن کے جوتوں کے تلوں میں لگ جاتی ہے- وہ سب جلدی جلدی مٹّھیاں بھر بھر کر قبر پر ڈالتے ہیں، پھر قبر برابر کر کے اس پر سوکھے ہوئے، یا شاید پلاسٹک کے، پھول پھینک دیتے ہیں- پہچان کے لیے گتّے کے ٹکڑے پر چند، بے حد بنیادی، تفصیلات لکھ کر اسے قبر کے سرھانے کی مٹّی میں گاڑ دیا جاتا ہے: نام، خاندانی نام، پیدائش کا سال اور موت کا سال- بیلچوں سے قبر پر مٹّی ڈالتے ہوئے گورکن اپنی آستینوں سے ماتھے کا پسینا پونچھتے ہیں- وقت بالکل نہیں ہے، وہ ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے، لمحہ بھر ستانے کو نہیں رکتے- اپنا کام ختم کرتے ہی وہ الگ ہٹ جاتے ہیں اور پکارتے ہیں: "اگلا کون ہے؟" یہ بات وہ تیز لہجے میں کہتے ہیں اور فوراً ہی ان کے بیلچے اگلی، نئی قبر

Scanned with CamScanner

پر مٹی پھینکنے لگتے ہیں اور اُس قبر کے گرد کھڑے قریب ترین عزیز اپنے پیارے کو وداع کرنے لگتے ہیں۔ سرائیوو ایک جال ہے۔ سرائیوو میں چھپنے یا پناہ لینے کی کوئی جگہ باقی نہیں ہے۔ آپ شہر کے کسی بھی حصّے میں ہوں، کسی بھی سڑک پر، کسی بھی جانب چل رہے ہوں، کبھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ امکان کہ ابھی کوئی شیل آئے گا اور آپ اگلا شکار ہوں گے، ہمیشہ برابر رہتا ہے۔ نصیحت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دن کا کوئی مخصوص لمحہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں آپ کہہ سکیں: "اتنے بجے انھوں نے کبھی شیلنگ نہیں کی!" نشانہ بازی ہر وقت ہوتی ہے۔ رات کے وقت، دن میں، صبح سویرے۔ دن کے وقت سڑکیں اور گلیاں ہمیشہ لوگوں سے بھری رہتی ہیں۔ خوراک اور ایندھن کی لکڑی ڈھونڈتے ہوئے لوگوں سے۔ روٹی یا پانی کے لیے قطار لگائے ہوئے لوگوں سے۔ ایسے مقام پر گرنے والا شیل باقاعدہ قتلِ عام کا منظر پیش کرتا ہے۔ جیسا کہ واسا مِسکِن اسٹریٹ پر ہوا تھا، اور ابھی کچھ دن پہلے شراب کی فیکٹری کے باہر، جہاں لوگ پانی بھرنے کے لیے قطار لگائے کھڑے تھے۔ اس طرح شہر کے سب لوگ برابر، یکساں ہو جاتے ہیں۔ رات میں، جب شہر پر اندھیرا چھا جاتا ہے اور ہر شے تاریکی میں گم ہو جاتی ہے، لوگ سڑکوں اور گلیوں کو سُونا کر جاتے ہیں، شہر خالی ہو جاتا ہے۔ صرف کوئی کوئی شخص، جس کی ضرورت انتہائی شدید ہو، رات میں نکلنے کی ہمّت کرتا ہے۔ رات ہر چیز کو نگل جاتی ہے۔ لوگ غائب ہو جاتے ہیں۔ تب شہر میں صرف دیوانگی کی حد تک، خودکشی کی حد تک تیز رفتاری سے دوڑتی کاروں کی روشنیاں ہوتی ہیں۔ ان میں ہر گاڑی پر کوئی نہ کوئی نشان بنا ہوتا ہے: پولیس، ملٹری پولیس، اسپیشل پولیس۔ یہ سب کسی نہ کسی قسم کی پولیس کی گاڑیاں ہیں۔ ہر شخص جس کے پاس پٹرول کے لیے پیسے ہیں (جس کا نرخ سات جرمن مارک فی لٹر ہے)، یا کسی قسم کی طاقت ہے، وہ پولیس کی گاڑی میں سفر کرتا ہے۔

کبھی کبھی شہر پر کُہرا اُتر آتا ہے، گاڑھا اور بھاری کہرا، جو دنوں چھایا رہتا ہے۔ دن میں بھی بمشکل کچھ دکھائی دیتا ہے، اور رات کو تو آنکھیں بالکل اندھی ہو جاتی ہیں۔ ایک مختصر سے لمحے کے لیے ٹارچ جلانا بالکل بے سود ہوتا ہے۔ پھر بھی لوگ ایسا کرتے ضرور ہیں، کہ شاید! کُہرا اس قدر گاڑھا ہے کہ حلق میں چبھنے اور کاٹنے لگتا ہے۔ تب آپ کو یادداشت کے سہارے، سنبھل سنبھل کر چلنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی آپ ٹرام کی پٹری کے پاس گرے ہوئے کیبلوں میں اُلجھ کر گر پڑتے ہیں۔ ایک رات چلتے چلتے مجھے اپنے جوتوں کے نیچے خون محسوس ہوا۔ یہ مت پوچھیے کہ کیسے اور کیوں، بس مَیں جان گیا اور محسوس کرنے لگا کہ میں خون پر چل رہا ہوں۔ میں نے ٹارچ جلائی اور قدموں کے نیچے دور تک پھیلی، جمی ہوئی کیچڑ دیکھی۔ سڑکیں ابھی تک برف سے ڈھکی ہوئی تھیں اور دوسری جگہوں

پر یہ برف بہت سخت تھی۔ مگر یہاں، اس مقام پر وہی برف چپچپی اور لال رنگ کی تھی۔ فٹ پاتھ کے اس حصے میں کئی جگہ اور بھی کیچڑ کے ایسے ہی چھینٹے، پھیلے ہوئے دھبے تھے۔ یہ جگہ پریزیڈنسی کی عمارت کے بالکل سامنے تھی۔ اس روز وہاں ایک شیل پھٹا تھا جس میں چھ افراد مارے گئے تھے۔ عمارت کے دو پہرے داروں کی ٹانگیں بارود کے ٹکڑے لگنے سے اڑ گئی تھیں۔

اتوار کو ماس ہوتا ہے۔ کیتھولک دینیات کے گرجا میں، دن کے گیارہ بجے۔ گرجا کا ہال بھرا ہوا ہے۔ وردی پہنے لوگ۔ اسپیشل پولیس کے لوگ۔ عام لوگ۔ سب کے سب ایمان رکھنے والے۔ پادریوں کا کہنا ہے کہ ہر ماس میں ایسا ہی ہے: بڑے کلیسا میں، فرانسِسکن گرجا میں۔ جمعے کے دن میں ایک مسجد میں گیا جو واسا مِسکِن اسٹریٹ پر کلیسا سے کچھ دور واقع ہے۔ دوپہر کے وقت نماز ہوئی۔ دروازے پر امام نے پوچھا کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں۔ وہ پہچان گیا کہ میں اجنبی ہوں۔ میں نے کہا زگرب کا۔ پھر تم ہمیں میں سے ہو، وہ بولا، اندر آجاؤ۔ مسجد بھری ہوئی ہے، اور وردیوں والے وہاں بھی ہیں۔ بوسنیا ہرزگووینا کی فوج کے سپاہی۔ عام لوگ۔ خدا کو نہ ماننے والے وہ ہیں جو ہمارا نشانہ لے کر گولیاں چلا رہے ہیں، بعد میں ہم نے کہا۔ اگر پہاڑیوں پر بیٹھے لوگ ایمان رکھنے والے ہوتے تو ہرگز ایسا نہ کرتے۔ کبھی نہیں۔ ایمان والے ایسا نہیں کیا کرتے۔ وہ بے دین ہیں۔ سرائیوو ایک جال ہے۔ سرائیوو میں کچھ بھوکے، ٹھٹھرے ہوئے، غلیظ لوگ اب بھی رہ رہے ہیں۔ اتفاق ہے کہ وہ اب تک کسی شیل یا گولی کی زد میں نہیں آئے، یا بال بال بچے۔ امن کے زمانے کے کیلنڈر سے حساب لگائیے تو یہ سب دس مہینے سے چل رہا ہے۔ شہر والوں کے حساب سے یہ برسوں کے برابر ہے۔ صرف ایک دھماکا ہوا اور آپ کا سب کچھ چلا گیا: گھر والے، گھر، اور یادیں۔ کل ان کے پاس سب کچھ تھا۔ آج، کچھ نہیں۔ وقت بھی چلا گیا۔ صرف حال کا لمحہ باقی ہے۔ ایک دہشت ناک، پرہیجان، روزمرّہ کا لمحہ۔ پرندے جو خزاں میں شہر کے پیڑوں سے رخصت ہوئے، وہ بہار میں واپسی کا راستا کھو بیٹھیں گے۔ واپس آتے ہوئے وہ شہر کو پہچان نہیں پائیں گے اور آگے، کسی اور سمت میں اڑتے چلے جائیں گے۔ ان میں سے اکادکا پرندے جو بھٹک کر ادھر آنکلیں گے، انھیں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں ملے گی۔ جن چھتوں پر وہ بیٹھنے کے لیے خم کھائیں گے وہ اپنی جگہ پر نہیں ہوں گی۔ جن پیڑوں میں رہ کر وہ پلے بڑھے تھے، وہ جا چکے ہوں گے۔ اب یہاں صرف کھنڈر ہیں اور لوگ، اپنی ہولناک تقدیر اور اپنے حال کے لمحے کے ساتھ۔ کب تک؟

(سرائیوو، زگرب۔ فروری ۱۹۹۳۔)

***

مجھے سرائیوو کی طرف (خدا جانے کون سی بار) گئے چار ہفتے ہو چکے، اور سرائیوو سے لو (خدا جانے کون سی بار) تین ہفتے گزر گئے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس بار میری "اندھیرے" سے رخصت ہونے کی وجہ مختلف تھی۔ اِس بار میں سرائیوو کو وہ سب کچھ لوٹانے گیا تھا جو میں نے ۱۹۹۲ اور ۱۹۹۳ میں اپنے قیام کے دوران اس شہر سے حاصل کیا تھا۔ چھ مہینے کی متواتر کوششوں اور تیاریوں کے بعد میں اپنی تصویروں کی نمائش "جہنم کا ایک موسم" سرائیوو لے جانے اور وہاں کی آرٹ گیلری میں پیش کرنے میں کامیاب ہوا۔ وہاں اپنے اس فوٹوگرافک متن کے کرداروں سے میری دلخراش ملاقات ہوئی۔ افتتاح پر غیر معمولی رش تھا۔ بوسنیا کے آرچ بشپ وینکو پولیچ اور مسز عذرا بیگچ نے نمائش کا افتتاح کیا۔ متاثر کن تقریریں، خوب صورت الفاظ۔ تقریروں کے دوران میں یہی سوچتا رہا کہ کیا میں واقعی ان خوب صورت الفاظ کا مستحق ہوں۔ ان خوب صورت لفظوں کا وزن برداشت کرنا بہت دشوار تھا جب کہ اتنی ساری آنکھیں دیکھ رہی تھیں، سمجھ رہی تھیں کہ وہاں موجود ہر شخص اس سے دگنے اعزاز کا مستحق ہے۔

اس سرائیوو کو برداشت کرنا دشوار ہے جو گزرے ہوئے تمام زمانوں سے مختلف ہے۔ جو دکانیں پہلے اُجڑی ہوئی تھیں اب ان کی کھڑکیوں میں سے کیلے، انناس اور کیوی میرا منھ چڑاتے ہیں، جیسے یونانی دیونیس کے مدہوش عبادت گزاروں کے مکھوٹے ہوں۔ دکانوں کے شیلف فرانس، برطانیہ، دنیا بھر کی نفیس چیزوں سے بھرے ہوئے ہیں: ہالینڈ کی بیئر، اسپین کی وائن، اٹلی کی اشیاے آرائش، ہر ناپ کے مردانہ اور زنانہ جوتے اور کپڑے۔ قیمتیں دنیا بھر میں سب سے کم ہیں۔ پری کہانی کی طرح۔ خواب کی طرح۔ ڈراونے خواب کی طرح۔ سرائیوو ایک درمیانی وقفے سے گزر رہا ہے جو جنگ اور --- مزید جنگ کا درمیانی وقفہ ہے۔ دوست مجھے شہر کی سیر کراتے ہیں: یہ دیکھو، یہ دیکھو--- میں ماہ زدہ سا، لڑکھڑاتا ہوا ان کے پیچھے پیچھے چلتا ہوں: اس سے تو جنگ کا زمانہ بہتر تھا۔ جنگ زیادہ سچی تھی۔ اُس وقت کیا ہوگا جب یہ طلسم ٹوٹے گا، جب لوگوں کی آنکھ کھُلے گی؟ یا اس سے بھی بدتر: جب پہاڑیوں پر بیٹھے لوگ جاگ اٹھیں گے اور وہی سب دوبارہ شروع ہو جائے گا؟ وہی بھوک، وہی جما دینے والی ٹھنڈ، وہی ناداری اور وہی ذلت؟ تب کیا ہوگا؟ اور اب بھی، جب دکانوں اور اسٹالوں پر چیزوں کے ڈھیر لگے ہیں، انھیں کون خرید سکتا ہے؟ کچھ بھی خریدنے کے لیے پیسے کس کے پاس ہیں؟ پہلے صورت حال مختلف تھی، ہر کسی کے لیے ایک جیسی تھی: بُری۔ وہ سب لوگ انھیں چیزوں کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ اب، جب کہ یہ چیزیں ہاتھ بھر کی دوری پر رکھی ہیں، ان کے خواب اَور دور ہو گئے ہیں۔ اب اس چیز کا خواب دیکھنا بھی ممکن

Scanned with CamScanner

نہیں رہا کیوں کہ وہ گلی میں نگاہوں کے بالکل سامنے سے گزرتی ہے: ضمیر کے احساسِ جرم کی طرح۔ جب خواب دیکھنے تک کی صلاحیت جاتی رہے تب بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔ سفاک حقیقت سے فرار کا آخری راستا بھی بند ہو جاتا ہے۔ چیزوں کی یہ کثرت صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جو انھیں خریدنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔

میرے دوست مجھے اَور آگے لے جاتے ہیں، اَور چیزیں دکھاتے ہیں۔ دیکھو، وہ کہتے ہیں، ٹرام پھر چلنے لگی ہے۔ ہاں، میں سوچتا ہوں، نشانہ لگانے کے لیے ایک متحرک ہدف! میں اُن کی خوشی کو خاک میں نہیں ملانا چاہتا۔ میں جانتا ہوں یہ زیادہ دیر کی خوشی نہیں ہے۔ ہاں! میں بلند آواز میں کہتا ہوں، کتنا اچھا لگ رہا ہے! تم نے دیکھا، وہ کہتے ہیں، سب کچھ ٹھیک ہو گیا، پہلے سے بہتر ہو گیا۔ ہاں، میں منھ ہی منھ میں کہتا ہوں۔ میرے اندر سے ایک چیخ اُبھر رہی ہے: بس، بس، بہت ہو چکا! کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے، کچھ بھی بہتر نہیں ہوا! سب کچھ پہلے سے بدتر ہو گیا ہے! کیوں کہ دیکھنے میں اچھا لگنے لگا ہے۔

سرائیوو ایک جال ہے۔ سرائیوو ایک پنجرا ہے۔ سرائیوو کے رہنے والے سرائیوو چھوڑ کر نہیں جا سکتے، نہ اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اِس وقت سرائیوو ایک سنہری پنجرا ہے۔ باہر کے لوگ فوٹو کھنچوانے سرائیوو میں آتے ہیں۔ سیاست داں، ادیب، فلسفی، گلوکار، مداری، سرکس والے۔۔۔ پھر وہ اپنے گھروں کو، اپنے دوستوں، اپنی حکومتوں، اپنے ملکوں کو لوٹ جاتے ہیں۔ وہ پریس کانفرنسیں کرتے ہیں، انٹرویو دیتے ہیں، کہتے ہیں: "دیکھیے، میں سرائیوو گیا تھا۔" وہ اپنے فوٹو دکھاتے ہیں، لوگ ان سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ راتوں رات وہ ذرائع ابلاغ کے ہیرو بن جاتے ہیں۔ جو لوگ اب تک ایسی پُراسرار جگہ نہیں جا سکے، رشک سے تکتے رہتے ہیں، سوچتے ہیں: "ایک دن میں بھی سرائیوو جا کر فوٹو کھنچواؤں گا۔"

(سرائیوو۔ اگست ۱۹۹۴۔)

**

Scanned with CamScanner

سلاوینکا دراکولیچ

ترجمہ: اسد محمد خاں

موت کا کلوز اَپ

ٹی وی کیمرے دعوت دیتے ہیں:

موت اور خبیثانہ ظلم اور بدمعاشی کو دیکھنے دکھانے کے مرگ پسندانہ شوق سے مغلوب ہو کر کیمرے دعوت دیتے ہیں۔ یادداشت کے نام پر، اور اِس خوش فہمی کے ساتھ کہ پھر ایسا کبھی نہیں ہوگا، ٹی وی کیمرے اپنے ناظرین کو شرکت کی دعوت دیتے ہیں۔

بتاتے ہیں کہ ایک چھوٹی لڑکی "الف میم" اُس وقت ماری گئی جب وہ اپنی رمادان پائی کھا رہی تھی۔ کچھ اس طرح سمجھیے کہ فروری کے آخر میں صبح کا وقت تھا، اور وہ روشن اور سرد صبح تھی جب یہ واقعہ ہوا۔ آپ خود سے پوچھتے ہیں کہ اُس عورت، یعنی بچی کی ماں، نے جنگ کی شروعات کے دس مہینے بعد سرائیوو میں یہ پائی کیسے تیار کر لی؟ اُس نے کیسا آٹا، کس طرح کا تیل استعمال کیا؟ پائی میں اُس نے بھرا کیا ہوگا؟ یقیناً اُس نے اسے ایک رات پہلے پکایا ہوگا۔ مگر پھر سوال اٹھتا ہے کہ کیسے؟ بجلی تو نہیں ہے، یا اگر ہے تو کبھی کبھی آتی ہے۔ یا شاید اُس نے یہ پائی کھُلی آگ پر پکائی تھی؟ مگر لکڑی ہے کہاں؛ بہت پہلے ہی شہر کے سب درخت کاٹ دیے گئے تھے--- بہ ہر حال، ڈھائی سالہ لڑکی ابھی تک، آدھی سوئی آدھی جاگی، میز پر بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی کہ اُس نے شیلنگ کی آواز سنی۔ ممکن ہے وہ اس آواز سے ڈر گئی ہو، اس لیے وہ دوڑ کر ماں کے پاس چلی گئی۔ ہوسکتا ہے نہ گئی ہو۔ شیلنگ کی آواز تو اب یہاں کا معمول بن گئی ہے۔ مگر نہیں، یہ آواز وہ سن ہی نہیں سکتی تھی۔ لوگ کہتے ہیں ہٹ ہونے والوں کو کچھ بھی سننے کا موقع نہیں ملتا۔ اُن کے پاس تو خوف زدہ ہونے کا بھی وقت نہیں ہوتا۔ ایک شیل ان کے گھر کی چھت سے گزرتا کچن میں آ رہا۔ بچی فرش پر گر گئی۔ سبھی کچھ برق رفتاری سے ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ اُس کے ماں باپ یا دادا دادی سمجھ پاتے کہ کیا ہُوا ہے، وہ مر چکی تھی۔ جب تک اُس کا باپ اُسے اپنے ہاتھوں میں اٹھاتا، مدد مانگتا، سب ختم ہو چکا تھا۔

Scanned with CamScanner

اور پھر--- پھر ایک ٹی وی کیمرا موقعے پر آجاتا ہے۔ بعض تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید یہ آمد شیلنگ کے محض ایک یا دو گھنٹے بعد ہوئی ہو گی۔ ہم چھوٹا سا کچن دیکھتے ہیں جہاں اَب چھوٹی لڑکی نہیں ہے۔ کچن کا فرش پلاسٹر اور اینٹوں سے، ادھراُدھر پڑے جوتوں سے، اُس کے ننھے بُوٹوں سے ڈھک چکا ہے۔ ٹی وی کیمرا چھت پر زُوم اِن کرتے ہوئے شیل کا چھوڑا ہوا سوراخ دکھاتا ہے جس میں سے ٹھنڈک اور آسمان کچن میں دَر آتے ہیں۔ باپ میز پر اپنے بازو ٹکائے بیٹھا رو رہا ہے۔ کیمرا اُس کی نیلی آنکھوں اور آنسوؤں کا کلوز اَپ دیتا ہے-- حقیقت میں یوں لگ رہا ہے جیسے وہ "آن کیمرا" رو رہا ہو-- تاکہ ہم، یعنی ٹیلی وژن ناظرین، یہ تسلی کر لیں کہ اُس کے آنسو اصلی ہیں، کہ وہ واقعی رو رہا ہے، وہ، مَری ہوئی بچّی کا باپ۔ وہ شخص کسانوں کے کام آنے والے موٹے اُون کا سفید پُل اوور پہنے ہے۔ عام طور پر کچن میں ایسے گرم کپڑے پہن کر نہیں بیٹھا جاتا لیکن ہم اُس سردی کے بارے میں کیا جان سکتے ہیں جسے اِس وقت وہ بھگت رہا ہے۔ اُس کی آنکھوں سے ہٹ کر کیمرا اُس کے پُل اوور پر آتا ہے تاکہ یہاں ہم وہ سُرخ دھبّا دیکھ سکیں جہاں اُس نے فرش سے اٹھا کر اپنی لڑکی کو اپنے بدن سے لگایا تھا--- اور دیر ہو چکی تھی۔ خون ابھی سُوکھا نہیں ہے۔ دھبّا چمک دار، سُرخ ہے، تازہ لگتا ہے۔ میں کھُردرے، ہاتھ کے بٹّے اس اُون کو پہچانتی ہوں جس سے باپ کا پُل اوور بُنا گیا تھا۔ یوں لگتا ہے میں اسے اپنے پوروں تلے محسوس کر رہی ہوں۔ مدّتیں لگتی ہیں اِس اُون کو سوکھنے میں، اور خون آلودہ اُون تو اَور بھی لمبے عرصے گیلا رہتا ہے۔ خون کو دیکھنے سے جی متلا رہا ہے۔ پھر بھی کیمرا لوٹ لوٹ کر بار بار اس پر آتا ہے۔ یہ بالکل غیر ضروری ہے۔ مگر اس طرح کی تصویروں سے آپ بچ نہیں سکتے۔ کوئی نہیں ہے جو کہے کہ بھئی یہ سب بے کار ہے۔

اب ہم اسپتال میں ہیں۔ ماں کو پہلی بار دیکھتے ہیں۔ رپورٹر کی آواز بتاتی ہے کہ ماں کے پیٹ میں زخم آئے ہیں۔ تب وہ رپورٹر (مرد یا عورت) ایک بات قطعی طور پر لغو اور فضول کہتا ہے۔ جس عورت کا بچّہ ابھی ابھی مرا ہو اُس کی اِبتلا اور یاس کے لمحے میں آخر اس بک بک کی کیا ضرورت ہے۔ رپورٹر کی آواز کہتی ہے کہ یہ نوجوان عورت شاید اب اَور بچے پیدا نہ کر سکے گی۔ وہ ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے ایک طرح کے اسٹریچر پر پڑی ہے۔ وہ سسکیاں لیتی ہے۔ اُس کی آواز ایسے آتی ہے جیسے ٹوٹی ہوئی، ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہو۔ باپ اپنے سُرخ دھبّے والے سفید پُل اوور میں آتا ہے اور اُسے گلے سے لگا لیتا ہے۔ صاف ظاہر ہے وہ چھوٹی بچی کی موت کے بعد پہلی بار یہاں ملے ہیں، اسپتال کے کمرے میں۔ "آن کیمرا"، پہلی بار۔ ماں کوئی آواز نکالتی ہے: کسی اَور جگہ، اَور وقت میں اِسے شاید چیخ یا واویلا کہہ سکتے تھے، یہاں بس ایک خالی پن کا آوازہ ہے یہ۔ اِس آواز سے

Scanned with CamScanner

عورت نے اپنے شوہر کو بتایا ہے کہ ابھی ابھی وہ سب کچھ کھو بیٹھی ہے۔ یہ خاتمہ ہے۔ جی ہاں، خاتمہ نہیں تو اور کیا ہے۔ کیمرا اُس ماں کے غیر انسانی اندوہ سے آگے نہیں جاسکتا جس نے اپنا بچہ کھو دیا ہو۔ اب نہ تو ہم (ٹیلی وژن ناظرین) اور نہ ہی کیمرے کے پیچھے کھڑے لوگ (جو ہمیں نظر نہیں آتے: رپورٹر، کیمرامین، ساؤنڈ مین)، ہم اب اور برداشت نہیں کرسکتے۔ اسے رک جانا چاہیے، اب رک جانا چاہیے۔ میں دل ہی دل میں دُہراتی ہوں، اور کیمرا رول کرتا رہتا ہے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا، لیکن نظر جو آرہا ہے وہی ہے۔ اب ہم ایک سفید چادر دیکھ رہے ہیں جس پر سُرخ دھبے پڑے ہیں۔ ہم پہلے ہی اسے ممنوع قرار دے چکے ہیں۔ اس علامت کو پہچانتے ہیں ہم۔ سفید پر سُرخ، یہ علامت موت کی ہے۔ خدایا! اس کا خون کتنا چمک دار ہے، میں سوچتی ہوں، اور میرا پورا وجود چیختا رہتا ہے: بس، بس، بس کرو! میں نہیں چاہتی کیمرا اُس چادر میں داخل ہو جس سے اُس کا چھوٹا سا بدن ڈھکا ہوا ہے۔ لیکن کسی کا ہاتھ میرے خیالوں پر سبقت لے جاتا ہے اور سفید چادر اُٹھا دیتا ہے۔ چہرہ، ہم اُس کا چہرہ دیکھتے ہیں۔ اُس کا ننھا مسخ شدہ چہرہ جو اب انسان کی صورت نہیں ہے۔ سیاہ بالوں کے میلے چپکیلے گچھوں کے فریم میں گھرا ہوا۔ اُس کی آدھ کھُلی آنکھیں۔ ہم ایک موت کا کلوزاپ دیکھتے ہیں، اور پھر--- کٹ! جنازہ۔ لوگ کچھ کہتے ہوئے، ایک "آف اسکرین" آواز، باپ، دادا، اُتھلی یخ بستہ زمین میں ایک چھوٹا سا تابوت۔ رپورٹ ختم ہو گئی۔ مجموعی طور پر یہ تین منٹ چلی۔

لمحے بھر بعد ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ٹی وی براڈکاسٹ جو ہم نے ابھی دیکھا ایک فیملی کی ٹریجڈی ہے جسے اُن کے بچے کے ہلاک ہونے کے صرف دو گھنٹے بعد فلم بند کیا گیا اور یہ کہ: یہ پوری ٹریجڈی "آن کیمرا" واقع ہوئی ہے! بس ایک چیز جس کے ہم عینی شاہد نہیں ہیں، وہ ہے ڈھائی برس کی الف میم کی موت کا لمحہ۔ جس وقت شیل چھت کو لگے اُس وقت باہر سے ایک ٹیک (take) کی جائے۔ پھر اندر کا ایک منظر جب لڑکی کرسی سے گرتی ہو، سلوموشن میں، بالکل یوں لگے جیسے اُڑتی چلی جارہی ہے۔ اس کے ہاتھ سے چھُوٹ کر پائی کا ایک ٹکڑا زمین پر گرے اور لڑھکتا چلا جائے۔ یہ ہوئی نا بات! رپورٹر بہت خوش ہے۔ کیوں نہ ہو، ٹھیک تو ہے! اب ہم لوگ بھی، یعنی عوام، اتنے بالغ ہو گئے ہیں کہ جس ڈاکیومنٹیشن (documentation) پر ہم ایمان لائے ہیں اُس کے نام پر یہ سب برداشت کرلیں گے۔ بس یہی ایک چیز ہے جو ہم نے اب تک اپنے ٹی وی اسکرین پر نہیں دیکھی۔ اور سب کچھ دیکھا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ سر کٹی لاشوں کو سؤر اور کتے کھا رہے ہیں۔ دیکھا کہ نوکیلے ہتھیار سے دیدے نکال کر پھینک دیے گئے ہیں۔ ہم نے انسانی بدن

کے بکھرے ہوئے ٹکڑے دیکھے جو اَب کسی بھی جسم، کسی بھی چیز سے متعلق نہیں ہیں۔ پنجر اور آدھ کھائی کھوپڑیاں، بےٹانگوں کے بچے۔ اور ہم نے شیر خوار دیکھے جنھیں چھپ کر بیٹھے ہوئے کسی رائفل بردار نے گولی ماری تھی۔ اور ہم نے زنا بالجبر کی شکار بارہ سالہ بچی دیکھی جو کیمرے کے سامنے بیٹھی روداد سنا رہی تھی۔

دن پر دن گزرتے جاتے ہیں۔ بوسنیا میں موت کو زیادہ، اور زیادہ بہتر طریقے پر ڈاکیومنٹ کیا جارہا ہے۔ دس مہینوں میں سرائیوو پر آٹھ لاکھ شیل گرے۔ شہر میں اسی ہزار بچے محبوس ہیں -- گویا یہ بچوں کا دنیا میں سب سے بڑا قید خانہ ہے۔ اُن میں سے پانچ ہزار (بچے!) مار دیے گئے، یا بس، مر گئے۔ باقی بھوک اور طویل موت، آہستہ رو موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ پچاس برس پہلے یہودیوں نے دکھ بھوگے تھے، اب مسلمانوں کی باری ہے۔ کیا آپ کو آوش وِتز (Auschwitz) یاد ہے؟ واقعی؟ کیا کسی کو این فرینک یاد ہے؟ ہاں ہاں، ہمیں سب کچھ یاد ہے، اور اسی یادداشت کی وجہ سے ہمیں خیال آیا کہ ہر چیز کو بہت احتیاط سے ڈاکیومنٹ کیا جائے تاکہ وہ شرم ناک تاریخ کبھی نہ دُہرائی جا سکے۔ اور اَب، دیکھیے، وہی سب پھر ہو رہا ہے۔ اسکولوں میں نسلوں نے کنسنٹریشن کیمپوں کے بارے میں، موت کے بارے میں جانکاری حاصل کی؛ نسلیں جن کے والدین قسمیں کھاتے تھے کہ جو کچھ ہوا دوبارہ نہیں ہوگا -- کم سے کم یوروپ میں تو نہیں ہوگا -- جی ہاں، بالکل درست، ماضی قریب کی زندہ یادداشت کی وجہ سے (نہیں ہونا چاہیے)۔ اور وہی لوگ (وہی لوگ!) یہ جنگ لڑ رہے ہیں۔ تو پھر اُس تمام ڈاکیومنٹیشن نے کیا بدلا؟ اُس موت کی شعوری اور ٹھیک ٹھیک بُک کیپنگ کر کے کہ جو سرائیوو میں مرنے والوں کے ٹرانسمیشن دیکھتے ہوئے گویا ہماری زندگیوں میں، ہمارے لِونگ روم میں، واقع ہو رہی ہوتی ہے، آخر اَب کون سی چیز بدلی جا رہی ہے؟ چھوٹی بچی کی موت بہت سی بیہت ناکیوں میں سے ایک ہے۔ اُن میں سے تو ہر ایک ہمیں اَور بھی زیادہ بھیانک باتوں کے لیے تیار کر دیتی ہے۔

سب سے بڑی تبدیلی تو ہمارے اندر واقع ہوئی ہے، ہم جو حاضرین، تماشائی اور پبلک ہیں۔ کاسٹ کی اس تنظیم میں ہم نے اپنے پبلک کے رول کو حقیقت سمجھنا شروع کر دیا ہے: اور یہ بھی کہ پبلک کا رول ادا کرنا ممکن ہے۔ گویا جنگ نہیں کوئی تھیئٹر ہے۔ بہت آہستگی سے، اور ہمارے جانے بغیر، کوئی چیز ہم میں سرایت کر گئی ہے، ایک نوع کی سختی، حقیقت کا ادراک نہ کر سکنے کی معذوری -- یہ علامتیں ہیں ہمارے اپنے خاتمے کی۔ بچی کے مُردہ چہرے کا کلوزاَپ کچھ

زیادہ ہی ہو گیا، نہ ہوتا تو (ہمارے لیے) بہتر تھا۔ یہ احساس کہ جنگ کو پہلی بار اس قدر نزدیک سے اس کی انتہائی بھیانک تفاصیل کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے، صرف اُس وقت بامعنی بن سکتا ہے جب اس کی وجہ سے کسی چیز میں بہتری اور تبدیلی آ سکتی ہو۔ مگر بدلتا تو کچھ بھی نہیں۔ اس لیے اِس قتلِ عام کا ڈاکیومنٹیشن مریضانہ بے راہ روی، موت کی پورنوگرافی بنتا جا رہا ہے۔

**

بورو تودوروویچ

ترجمہ: زینت حسام

میں تمھارے ساتھ نہیں ہوں!

ہم سب کبھی کبھی کوئی بھیانک خواب دیکھتے ہیں، ہولناک، ڈراونا خواب جو ہمیں رات کی تاریکی میں، یا صبح کے سرمئی اُجالے میں اُٹھا کر بٹھا دیتا ہے۔ ہم دہشت زدہ، پسینے میں شرابور رہ جاتے ہیں۔ اور پھر اچانک ہماری پور پور اس احساس سے سرشار ہو اُٹھتی ہے کہ وہ صرف ایک خواب تھا۔

افسوس، کہ آج جو کچھ ہمارے ارد گرد ہو رہا ہے، ہماری زمین پر، یوروپ کے دل میں، اکیسویں صدی کے آغاز پر، یہ ہولناکی، یہ انتشار، یہ تباہی، یہ قتل و غارت، یہ نفرت —۔ افسوس، یہ کوئی خواب نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا، زندہ بد خواب ہے۔

یہ سب اتنا غیر حقیقی، اس قدر ناقابلِ تصوّر ہے کہ اسے شعور کی گرفت میں لانا مشکل ہے، کم از کم میرے لیے۔ یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے، اس نے مجھے اس قابل نہیں چھوڑا ہے کہ میں اسے سمجھ سکوں، اس سے کوئی نتیجہ اخذ کر سکوں، اس کی بابت کوئی عقلی رویّہ اختیار کر سکوں۔ اور اگر بلغراد میں رہتے ہوئے، جہاں مجھے کوئی جسمانی خطرہ لاحق نہیں، جہاں مجھے صرف ذرائع ابلاغ کی پہنچائی ہوئی اذیت کا سامنا ہے، میں ایک ناقابلِ بیان کرب میں مبتلا ہوں، تو میں تصوّر کر سکتا ہوں کہ وہ لوگ جو ڈُبراونک، زدار، کاوتات، کنین، گلینا، شیشاک اور خاص طور پر وُوکوور کے رہنے والے ہیں، کس ابتلا کا شکار ہوں گے۔ میں سوچ سکتا ہوں اُن لوگوں کے کیا احساسات ہوں گے جو اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے ہیں، وہ سب کچھ جس کے لیے انھوں نے زندگی بھر تگ و دو کی، اُن گھرانوں کے کیا جذبات ہوں گے جن کی مائیں اور باپ، جن کی عزیز اولاد، بہن بھائی، بزرگ اس جنون کا شکار ہو گئے۔ یا وحشت!

یہ سب کس مقصد کے حصول کے لیے؟ کس کی خاطر؟ میں خود سے پوچھتا ہوں، (شاید تم

Scanned with CamScanner

بھی خود سے یہ سوال کرتے ہو گے) یہ بے حس، جنونی قومی ہیجان جو تم پر ایک قومیت کی رکنیت بزور لاگو کرتا ہے، جو تم کو اس دائرے کے اندر دھکیل رہا ہے، بند کر رہا ہے۔

قومیت کا درس پڑھانے والے یہ لوگ وہی ہیں جو کل تک لیگ آف کمیونسٹس کے علم بردار تھے، جو ابھی کچھ دن پہلے تک اخوت، یگانگت اور اتحاد کے نعرے لگاتے تھے، جو بہت دن نہیں گزرے کمیون سے سنٹرل کمیٹی تک مختلف سرکاری اداروں کے سیکرٹری تھے۔

ٹھیک ہے، اگر آج صورت حال یہی ہے تو کامریڈ سیکرٹری، آپ صاحبان میرا خیال چھوڑ دیں، مجھ پر انحصار نہ کریں۔ میں آپ لوگوں کا ہم قدم نہیں ہو سکتا۔ آپ حضرات مجھے کسی سے بھی نفرت کرنا نہیں سکھا پائیں گے۔ اور سچ پوچھیے تو آپ جتنا مجھے اپنی طرف راغب کرنے کے جتن کریں گے اور مجھے میری قومیت کا احساس دلائیں گے، اُتنا ہی میرا یہ احساس بڑھتا جائے گا کہ میرا اس قومیت سے کوئی تعلق نہیں۔ جس قدر زور شور سے آپ میری حب الوطنی کو آواز دیں گے، اُتنا ہی میں آپ کی وجہ سے خود کو غیر محبِ وطن محسوس کروں گا۔

تو یہ ہے، یہ ہے میرا موقف۔

**

Scanned with CamScanner

۵

سوزن سونٹاگ : سرائیوو میں "گودو کا انتظار"

سُوزن سونٹاگ (Susan Sontag) امریکا کے نمایاں ترین ادیبوں میں شمار ہوتی ہیں۔ انھوں نے ناولوں اور کہانیوں کے علاوہ ادبی اور معاشرتی تنقید کے مختلف موضوعات پر مضامین اور کتابیں تحریر کی ہیں جو اپنے اپنے میدان میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ تحریر کے علاوہ سونٹاگ فلم اور تھیٹر کی دنیا میں بھی سرگرم ہیں۔ ان کی تصانیف میں ناول *The Benefactor*، *Death Kit*، کہانیوں کا مجموعہ *I, Etcetra*، ادبی تنقید کی کتابیں *Against Interpretation* اور *Styles of Radical Will* شامل ہیں۔ ان کی دیگر کتابیں *On Photography*، *Illness as Metaphor* اور *Under the Sign of Saturn* ہیں۔

Scanned with CamScanner

سوزن سونٹاگ

ترجمہ: اجمل کمال

سرائیوو میں "گودو کا انتظار"

"Nothing to be done."

("گودو کا انتظار" کی پہلی سطر۔)

جولائی ۱۹۹۳ کے وسط میں میرا سرائیوو جا کر Waiting for Godot ("گودو کا انتظار") کی پروڈکشن پیش کرنا محض اس سبب سے نہیں تھا کہ مجھے سموئل بیکٹ کا یہ ڈراما اسٹیج پر پیش کرنے کی ہمیشہ آرزو رہی ہے (حالاں کہ یہ حقیقت ہے)، بلکہ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس طرح مجھے دوبارہ سرائیوو جانے اور وہاں مہینے بھر یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کا ایک ذاتی جواز ملتا تھا۔ میں اپریل میں وہاں دو ہفتے گزار آئی تھی اور تباہی کا شکار ہونے والے اس شہر سے، ان تمام چیزوں سے جن کی یہ شہر نمائندگی کرتا ہے، شدید لگاو محسوس کرنے لگی تھی، سرائیوو کے کئی شہری میرے دوست بن گئے تھے۔ لیکن میں دوسری بار وہاں محض تماشائی کی حیثیت سے نہیں جانا چاہتی تھی، یعنی صرف ملنے جلنے، خوف سے کپکپانے، خود کو دلیر محسوس کرنے، غم زدہ ہونے، کربناک گفتگوئیں کرنے، اور زیادہ مشتعل ہونے اور وزن گھٹانے کی غرض سے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اگر میں دوبارہ وہاں گئی تو وہاں کی صورتِ حال میں شریک ہو کر کچھ کام کروں گی۔

اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ کوئی لکھنے والا یہ سمجھے کہ ایسی جگہ پر جانا اور وہاں کی خبریں باہر پہنچا دینا ہی سب سے اہم کام ہے۔ خبر تو باہر پہنچ چکی ہے۔ بے شمار عمدہ بیرونی اخبار نویس (جن میں سے اکثر میری طرح اس خیال کے ہیں کہ سرائیوو کو بچانے کے لیے عملی مداخلت کی جانی چاہیے) محاصرہ شروع ہونے کے دن سے جھوٹ کا پردہ چاک کر کے قتلِ عام کی رپورٹیں برابر بھیجتے رہے ہیں، اور مغربی یوروپ اور امریکا کی طاقتیں عدم مداخلت کے فیصلے پر، یعنی سرب فاشزم کی پشت پناہی پر، سختی سے ڈٹی رہی ہیں۔ میں اس قسم کی خودفریبی میں بھی مبتلا نہیں تھی کہ وہاں جا کر

Scanned with CamScanner

اسٹیج پر ایک ڈراما پیش کر دینے سے میں اتنی ہی کار آمد ہو جاؤں گی جتنا کوئی ڈاکٹر یا واٹر سسٹم انجنیئر کار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔ مجھے اپنا چھوٹا سا حق ادا کرنا تھا۔ میں صرف تین کام کر سکتی ہوں: لکھنا، فلمیں بنانا اور تھیئٹر کی ہدایت کاری کرنا۔ اور تینوں میں سے یہ واحد کام تھا جو سرائیوو میں رہ کر، وہاں کے لوگوں کو شریک کر کے اور وہاں کے ناظرین کے لیے، کیا جا سکتا تھا۔

اپریل میں میری جن لوگوں سے ملاقات ہوئی اُن میں ایک نوجوان تھیئٹر ڈائرکٹر حارث پاشووچ بھی تھا جو اگرچہ سرائیوو میں پیدا ہوا تھا مگر تعلیم پوری کر کے شہر سے چلا گیا تھا اور زیادہ تر سربیا کے شہروں میں کام کر کے خاصی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اپریل ۱۹۹۲ میں جب سربوں نے جنگ شروع کی، وہ یوگوسلاویا سے باہر تھا، لیکن اُسی سال، موسمِ خزاں میں، جب وہ آنٹ ورپ کے شہر میں "سرائیوو" کے نام سے ایک ڈراما پیش کر رہا تھا، اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس محفوظ جلاوطنی میں مزید نہیں رہ سکتا اور سال کے ختم ہوتے ہوتے، اقوامِ متحدہ کے گشتی دستوں اور سربوں کی مسلسل فائرنگ سے بچتا بچاتا، کسی طرح رینگ رینگ کر وہ جاڑے میں ٹھٹھرتے ہوئے محصور شہر میں لوٹ آیا۔ پاشووچ نے مجھے اپنی پروڈکشن Grad ("شہر") دیکھنے کے لیے مدعو کیا تھا جو دراصل کونستنتین کوافی، زبگنیو ہربرٹ اور سلویا پلاتھ کی شاعری کے پاروں اور موسیقی سے ملا کر بنایا گیا ایک کولاژ تھا جسے اس نے بارہ اداکاروں کے ساتھ مل کر آٹھ دن میں تیار کیا تھا۔ اب وہ اس کی نسبت بہت بڑے منصوبے، یعنی یوری پیڈیس کے Alcestis کی پروڈکشن پر کام کر رہا تھا، اور اس کے بعد اس کا ایک شاگرد (پاشووچ ڈراما اکیڈمی کا استاد بھی ہے جو آج بھی کام کر رہی ہے) سوفوکلیز کا ڈراما Ajax پیش کرنے والا تھا۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے اچانک احساس ہوا کہ پاشووچ ڈرامے کا صرف پروڈیوسر نہیں بلکہ ہدایت کار بھی ہے، اور میں نے اس سے دریافت کیا کہ اگر میں چند ماہ بعد کوئی ڈراما لے کر سرائیوو آؤں تو کیا وہ میرے کام میں شریک ہو گا۔

"بے شک!" اس نے جواب دیا۔

لیکن میرے یہ کہنے سے پہلے ہی کہ "اچھا تو پھر میں سوچوں گی کہ مجھے کون سا ڈراما پیش کرنا چاہیے"، اس نے مجھ سے سیدھا سوال کر دیا، "کون سا ڈراما؟" اور اپنی ہی اچانک تجویز سے پیدا ہونے والی بدحواسی نے مجھے فوراً اس ڈرامے کا نام سجھا دیا، جس پر میں غور کرنے سے کبھی نہ پہنچتی، جو میرے اس منصوبے کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھا۔ بیکٹ کا چالیس برس پہلے کا لکھا ہوا یہ کھیل معلوم ہوتا ہے سرائیوو کے لیے اور سرائیوو کے بارے میں لکھا گیا تھا۔

سرائیوو سے لوٹنے کے بعد متواتر اس سوال کا سامنا کرتے کرتے کہ "کیا وہاں آپ کو پیشہ ور اداکار مل گئے تھے؟"، میں جان گئی ہوں کہ اکثر لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ اس محصور شہر میں تھیٹر اب تک باقی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگ سے پہلے سرائیوو میں جو پانچ تھیٹر موجود تھے ان میں سے دو اب بھی، مسلسل نہیں تو وقفے وقفے سے، چل رہے ہیں۔ ان میں سے ایک "چیمبر تھیٹر ۵۵" ہے جہاں میں نے اپریل میں پاشووچ کے "شہر" کے علاوہ Hair نامی کھیل کی ایک روکھی پھیکی پیش کش بھی دیکھی تھی۔ دوسرا "یوتھ تھیٹر" ہے جسے میں نے "گودو کا انتظار" اسٹیج کرنے کے لیے منتخب کیا تھا۔ یہ دونوں چھوٹے چھوٹے ہال ہیں۔ بڑا تھیٹر ہاؤس، جو جنگ کے آغاز سے بند پڑا ہے، "نیشنل تھیٹر" کہلاتا ہے جس میں ڈراموں کے علاوہ اوپرا اور سرائیوو کا بیلے بھی پیش کیا جاتا تھا۔ زرد پتھر کی بنی اس عمارت کے سامنے (جسے شیلنگ سے ہلکا سا نقصان پہنچا ہے) اپریل ۱۹۹۲ میں لگایا گیا ایک پوسٹر اب بھی لگا ہوا ہے جس میں Rigoletto کی ایک نئی پیش کش کا اعلان درج ہے۔ یہ کھیل پیش نہیں کیا جا سکا۔ سربوں کے حملے کے فوراً بعد زیادہ تر گلوکار اور موسیقار اور بیلے میں حصہ لینے والے رقاص شہر سے چلے گئے اور باہر جا کر کام کرنے لگے، لیکن بہت سے نہایت باصلاحیت اداکار اب بھی شہر میں موجود ہیں اور اپنا کام کرتے رہنے کے سوا کچھ نہیں چاہتے۔

شہر کی تباہی کی تصویریں دیکھتے رہنے سے یہ بات ذہن میں لانا واقعی دشوار ہو جاتا ہے کہ سرائیوو کبھی ایک بے حد زندہ اور دلکش علاقائی شہر تھا جس کی تہذیبی زندگی کا موازنہ وسطی یوروپ کے پرانے، درمیانہ پھیلاؤ کے شہروں کی زندگی سے کیا جا سکتا تھا۔ اور تھیٹر دیکھنے والے لوگ بھی اس تہذیبی زندگی کا حصہ ہیں۔ وسطی یوروپ کے دوسرے شہروں کی مانند سرائیوو میں بھی تھیٹر بنیادی طور پر ریپرٹری (repertory) تھا جس میں ماضی کے ڈرامائی شاہکار اور بیسویں صدی کے مقبول کھیل پیش کیے جاتے تھے۔ جس طرح عمدہ اداکار اب تک سرائیوو میں ہیں اسی طرح تھیٹر کا رچا کا ذوق رکھنے والے ناظرین بھی موجود ہیں۔ فرق صرف یہ پڑا ہے کہ اب ہال تک پہنچتے اور واپس گھر جاتے ہوئے، اداکاروں اور ناظرین دونوں کو کسی اسنائپر کی گولی یا شیل سے ہلاک یا زخمی ہو جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے، لیکن یہ خطرہ تو سرائیوو کے شہریوں کو اس وقت بھی رہتا ہے جب وہ اپنے لونگ روم میں بیٹھے ہوں، خواب گاہ میں سو رہے ہوں، کچن سے کوئی چیز لے کر لوٹ رہے ہوں یا گھر کے دروازے سے باہر نکل رہے ہوں۔

مجھ سے یہ سوال بھی بارہا کیا گیا ہے: کیا آپ کے خیال میں بیکٹ کا یہ ڈراما بہت زیادہ غمناک کر دینے والا نہیں ہے؟ یعنی: کیا یہ سرائیوو کے ناظرین کے لیے بہت یاس انگیز نہیں ہے؟

یعنی: کیا وہاں جا کر "گودو کا انتظار" جیسا کھیل پیش کرنا تصنع اور بے حسی کا مظاہرہ نہیں ہے؟ گویا جس وقت لوگ واقعی یاس کے عالم میں ہوں تو یاس کی تصویر پیش کرنا غیر ضروری ہے۔ گویا ایسی صورتِ حال میں لوگ مثلاً *The Odd Couple* جیسا کوئی کھیل دیکھنا چاہتے ہوں گے۔ مگر یہ خیال درست نہیں ہے کہ سرائیوو میں تمام لوگ اُس قسم کی تفریح کے طلبگار ہیں جس سے ان کی حقیقی صورتِ حال کچھ دیر کے لیے اوجھل ہو جائے۔ کسی بھی دوسرے مقام کی طرح سرائیوو میں ایسے لوگ اچھی خاصی تعداد میں ہیں جنھیں آرٹ کے ذریعے اپنے حقیقت کے احساس کی تصدیق اور تصویر کشی کرنے سے تسکین اور تقویت ملتی ہے۔ اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ وہاں کے لوگ خالص تفریح کی کمی محسوس نہیں کرتے۔ نیشنل تھیئٹر کی ایک کارکن نے، جو کولمبیا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر چکی تھی اور پہلا ہفتہ گزرنے کے بعد ہماری ریہرسلوں میں آ کر بیٹھنے لگی تھی، لوٹتے وقت مجھ سے فرمائش کی کہ میں اس مہینے کے آخر میں سرائیوو آتے ہوئے **Vogue** اور *Vanity Fair* کے کچھ پرچے لیتی آؤں، تاکہ وہ اُن تمام چیزوں کو یاد کر سکے جو اس کی زندگی سے نکل گئی ہیں۔ یقیناً سرائیوو میں ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو "گودو کا انتظار" دیکھنے کے بجائے ہیریسن فورڈ کی کوئی فلم دیکھنے یا **Guns n' Roses** کا کنسرٹ سننے کو ترجیح دیں گے۔ یہ بات جنگ سے پہلے کے دنوں میں بھی درست تھی اور اب بھی درست ہے، اگر کوئی فرق پڑا ہے تو صرف اتنا کہ اب ذرا کم درست ہے۔

اگر معلوم کیا جائے کہ محاصرہ شروع ہونے سے پہلے سرائیوو میں کون سے ڈرامے چل رہے تھے — یہاں فلموں کا ذکر نہیں ہے جو تقریباً سب کی سب ہالی وڈ کی عام کامیاب پیشکشیں ہوتی تھیں (مجھے بتایا گیا کہ عمدہ فلمیں دکھانے والا چھوٹا سا cinematheque، جنگ سے پہلے ہی ناظرین کی کمی کے باعث بند ہونے کے قریب تھا) — تو "گودو کا انتظار" کسی طرح عجیب یا غم انگیز انتخاب ثابت نہیں ہوتا۔ آج کل وہاں جن ڈراموں کی پیش کش یا ریہرسل جاری ہے ان میں سے ایک *Alcestis* ہے (جس کا موضوع موت کی ناگزیریت اور قربانی کا مفہوم ہے)، دوسرا *Ajax* ہے (جو ایک جنگ آزما کے پاگل ہو کر خودکشی کر لینے کے بارے میں ہے)، اور تیسرا *In Agony* ہے (جس کا نفسِ مضمون عنوان ہی سے ظاہر ہے)۔ یہ کروشیائی ڈراما نگار میروسلاو کریئزا (Miroslav Krieza) کا لکھا ہوا پہلا کھیل ہے۔ (میروسلاو کریئزا اور بوسنیائی ناول نگار آئیوو آندرچ اس صدی کے نصفِ اوّل کے سابق یوگوسلاویا سے تعلق رکھنے والے دو ایسے ادیب ہیں جنھیں عالمی شہرت حاصل ہے۔) ان تینوں ڈراموں سے موازنہ کیا جائے تو "گودو کا انتظار" کو غالباً ہلکی پھلکی تفریح کے خانے میں رکھنا پڑے گا۔

در حقیقت، سوال یہ نہیں ہونا چاہیے کہ سرائیوو میں اب تک اتنی ثقافتی سرگرمی کیوں کر باقی ہے، بلکہ یہ کہ وہاں ثقافتی سرگرمی آج کل اتنی کم کیوں ہے۔ چیمبر تھیئٹر کے بالکل ساتھ واقع سنیما گھر کی تختے جڑی عمارت کے باہر فلم The Silence of the Lambs کا دھوپ کھایا ہوا پوسٹر اب تک چسپاں ہے۔ اس پوسٹر کے مقابل کے کونوں کے درمیان جلی حروف میں DANAS (آج) کا لفظ لکھا ہے جس سے مراد ۶ مئی ۱۹۹۲ ہے، یعنی وہ تاریخ جب سارے سنیما گھر بند کر دیے گئے۔ سرائیوو کے سارے سنیما گھر جنگ کے آغاز سے بند ہیں حالاں کہ ان میں بعض کی عمارتوں کو شیلنگ سے نقصان بھی نہیں پہنچا۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ایسی عمارت جہاں لوگوں کی اتنی بڑی تعداد ہر شام پابندی سے جمع ہوتی ہو، سرب توپوں کے لیے بہت بڑی ترغیب ثابت ہو سکتی ہے۔ یوں بھی پروجیکٹر چلانے کے لیے بجلی نہیں ہے۔ کنسرٹ اب نہیں ہوتے، سوائے اس واحد string quartet کے جو ہر صبح چالیس حاضرین کی گنجائش کے ایک چھوٹے سے کمرے میں پریکٹس اور کبھی کبھار شام کے وقت سامعین کے لیے موسیقی پیش کرتا ہے۔ یہ چھوٹا سا کمرہ آرٹ گیلری کا کردار بھی ادا کرتا ہے اور مارشل ٹیٹو اسٹریٹ پر اسی عمارت میں واقع ہے جس میں چیمبر تھیئٹر ہے۔ مصوری اور فوٹوگرافی کی نمائش کے لیے صرف ایک جگہ باقی بچی ہے: "اوبالا گیلری"، جہاں نمائش کے لیے تصویریں زیادہ سے زیادہ ہفتے بھر کے لیے اور بعض صورتوں میں صرف ایک دن کے لیے لگائی جا سکتی ہیں۔

سرائیوو میں مَیں جن لوگوں سے ملی ان میں سے کسی ایک نے بھی اس خیال سے اختلاف نہیں کیا کہ شہر میں -- جہاں لوگ تین لاکھ سے چار لاکھ تک کی تعداد میں، بہ ہر حال، اب بھی رہ رہے ہیں -- ثقافتی سرگرمی بہت کم ہو گئی ہے۔ شہر کے زیادہ تر دانشور اور تخلیقی لوگ، اور سرائیوو یونیورسٹی کے بیش تر اساتذہ، جنگ شروع ہوتے ہی، سرائیوو کے پوری طرح محصور ہو جانے سے ذرا پہلے جان بچا کر نکل گئے تھے۔ اس کے علاوہ سرائیوو کے اکثر باشندے انتہائی ضرورت کے سوا، یعنی جب انھیں پانی بھرنے یا اقوامِ متحدہ کا دیا ہوا راشن لینے جانا ہو، اپنے فلیٹوں سے باہر نکلتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ اگرچہ وہ اپنے گھروں میں بھی محفوظ نہیں ہیں لیکن سڑک پر انھیں زیادہ خوف محسوس ہوتا ہے۔ اور خوف سے بھی کہیں زیادہ ان پر ڈپریشن کا غلبہ ہے -- سرائیوو کی بیش تر آبادی شدید ڈپریشن میں مبتلا ہے -- جو غنودگی، تھکن اور مُردہ دلی کو راہ دیتا ہے۔

علاوہ ازیں، سابق یوگوسلاویا میں ثقافتی مرکز کا مقام بلغراد کو حاصل تھا، اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ سرائیوو کے بصری آرٹ وہیں سے ماخوذ تھے اور یہ کہ پہلے، اوپرا اور موسیقی عام درجے کی

Scanned with CamScanner

تھی۔ صرف فلم اور تھیئٹر ممتاز فنون تھے، اس لیے یہ تعجب کی بات نہیں کہ یہ دونوں فنون محاصرے کے دوران بھی پھلتے پھولتے رہے ہیں۔ ایک فلم کمپنی SAGA دستاویزی اور فکشن فلمیں بنارہی ہے اور دو تھیئٹر اب بھی فعال ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تھیئٹر کا ذوق رکھنے والے "گودو کا انتظار" جیسا کھیل دیکھنے کی توقع رکھتے ہیں۔ میرا وہاں جا کر یہ کھیل پیش کرنا اُن لوگوں کے لیے یہ معنویت تو رکھتا ہی تھا کہ ایک سکی امریکی ادیب اور تھیئٹر کی جزوقتی ہدایت کار نے ان کے تھیئٹر کے لیے رضاکارانہ کام کر کے ان کے شہر سے اپنی یگانگت کا اظہار کیا (اس اطلاع کو مقامی اخباروں اور ریڈیو نے اس بات کی شہادت کے طور پر پیش کیا کہ باہر کی دنیا ان کے لیے اب بھی "فکرمند" ہے، جب کہ میں یہ سوچ کر اشتعال اور شرمندگی میں مبتلا تھی کہ میں اپنے سوا کسی کی نمائندگی نہیں کر رہی ہوں)۔ لیکن ان کے لیے اس سے بڑی معنی خیز بات یہ تھی کہ "گودو کا انتظار" ایک عظیم یوروپی ڈراما ہے اور یہ کہ وہ لوگ اب تک یوروپی کلچر میں شامل ہیں۔ امریکا کے پاپولر کلچر سے اپنی وابستگی کے باوجود -- جو سرائیوو میں بھی اُتنی ہی شدید ہے جتنی کسی بھی اَور جگہ -- وہ یوروپ کے اعلیٰ کلچر ہی کو اپنا آدرش، اپنی یوروپی شناخت کا پاسپورٹ سمجھتے ہیں۔ اپریل میں مجھ سے سرائیوو کے لوگوں نے بار بار یہ بات کہی: ہم یوروپ کا حصہ ہیں۔ ہم سیکولرزم، مذہبی رواداری اور کثیر نسلی کی یوروپی اقدار کے نمائندہ ہیں۔ پھر باقی یوروپ نے ہمیں تنہا کیوں چھوڑ دیا ہے؟ جب میں جواب میں کہتی کہ یوروپ ہمیشہ کی طرح آج بھی، بربریت کا اُتنا ہی بڑا مرکز ہے جتنا تہذیب کا، تو انھیں یہ بات ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ اب، صرف چند ماہ بعد، اس بات سے کوئی شخص اختلاف نہیں کرے گا۔

سرائیوو کے لوگ خود کو بےحد کمزور اور حتمی طور پر مایوس سمجھتے ہیں: منتظر، امید کرتے ہوئے، امید کرنا نہ چاہتے ہوئے، جانتے ہوئے کہ اُنھیں بچایا نہیں جائے گا۔ وہ اپنی مایوسی سے سخت ذلت محسوس کرتے ہیں، اور روزمرہ زندگی میں قدم قدم پر پیش آنے والی جنگ ان کے اس احساس کو اَور بڑھادیتی ہے۔ مثلاً انھیں اپنے دن کا بڑا حصہ اس کوشش کی نذر کرنا پڑتا ہے کہ ان کا بیت الخلا صاف رہے اور اس میں سے بدبو نہ اُٹھنے لگے؛ جان کا خطرہ مول لیتے ہوئے، کھلی عوامی جگہوں پر قطار میں کھڑے ہو کر وہ جتنا پانی حاصل کر پاتے ہیں، اس کا زیادہ حصہ اِسی کوشش میں صرف ہو جاتا ہے۔ ذلت کا یہ شدید احساس شاید اُن کے خوف سے بھی کہیں زیادہ ہے۔

سرائیوو کے پیشہ ور تھیئٹر والوں کے لیے کسی بھی کھیل کی پیش کش بہت اہم تھی، کیوں کہ اس سے انھیں احساس ہوتا تھا کہ وہ نارمل ہیں، یعنی اُسی کام میں مشغول ہیں جو جنگ سے

پہلے کے دنوں میں کیا کرتے تھے۔ انھیں احساس ہوتا تھا کہ وہ صرف پانی بھرنے والے یا قطار لگا کر امدادی راشن وصول کرنے والے نہیں ہیں۔ بلاشبہ آج سرائیوو میں وہی لوگ خوش قسمت ہیں جو اپنا پیشہ ورانہ کام جاری رکھ سکتے ہیں۔ اور یہ پیسے کا معاملہ نہیں ہے کیوں کہ سرائیوو میں صرف چور بازار کی معیشت قائم ہے جہاں جرمن سکہ چلتا ہے؛ اور زیادہ تر لوگ اپنی سابقہ بچت پر، جو ہمیشہ جرمن مارک کی شکل میں ہوتی تھی، اور باہر سے بھیجی جانے والی رقم پر گزر بسر کر رہے ہیں۔ (شہر کی معاشی حالت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ کوئی ہنرمند پیشہ ور شخص، مثلاً شہر کے بڑے اسپتال کا سرجن یا ٹی وی سے متعلق صحافی، تین جرمن مارک کما پاتا ہے، جب کہ مارلبرو کے درجے کے مقامی سگریٹ کے ایک پیکٹ کی قیمت دس جرمن مارک ہے۔) اداکاروں کو، اور ظاہر ہے مجھے بھی، کوئی تنخواہ نہیں مل رہی تھی۔ تھیئٹر سے وابستہ دوسرے لوگ اگر ہماری ریہرسلوں میں آ کر بیٹھتے تھے تو صرف اس لیے نہیں کہ ہمارا کام دیکھنا چاہتے تھے بلکہ اس لیے بھی کہ انھیں ایک ایسا تھیئٹر دوبارہ دستیاب ہو گیا تھا جہاں وہ روزانہ جا سکتے تھے۔

سرائیوو میں ڈراما اسٹیج کرنا -- خواہ "گودو کا انتظار" یا کوئی اور -- کوئی سرسری اہمیت کی بات نہیں بلکہ اپنے نارمل ہونے کا سنجیدہ اظہار تھا۔ جب ایک اخبار نویس عورت نے ہمارے ڈرامے کے ایک اداکار سے سوال کیا کہ "ایسے حالات میں ڈراما کرنا کیا ایسا ہی نہیں ہے جیسے جلتے ہوئے روم کو دیکھتے ہوئے بانسری بجانا؟"، تو مجھے فکر ہوئی کہ کہیں وہ اداکار بُرا نہ مان جائے اور میں نے اس اخبار نویس کو ٹوک دیا۔ اس نے وضاحت کی کہ "میں تو صرف اکسانے کے لیے ایسا سوال پوچھ رہی تھی۔" لیکن اداکار نے بُرا نہیں مانا۔ اس کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ وہ خاتون کیا بات کر رہی ہے۔

۲

سرائیوو پہنچنے کے اگلے ہی دن سے میں نے اداکاروں کا آڈیشن لینا شروع کر دیا۔ ایک پارٹ کے لیے میں پہلے ہی اپنے ذہن میں فیصلہ کر چکی تھی۔ مجھے وہ بھاری بھرکم، قدرے عمر رسیدہ عورت اچھی طرح یاد تھی جسے میں نے اپریل میں تھیئٹر کے لوگوں سے ملاقات کے دوران دیکھا تھا۔ وہ ایک چوڑے چھجے والا بڑا سا سیاہ ہیٹ لگائے ایک کونے میں خاموشی اور تمکنت سے بیٹھی تھی۔ چند روز بعد میں نے اُسے اسٹیج پر، پاشووچ کے کھیل "شہر" میں دیکھا، اور تب مجھے پتا چلا کہ وہ محاصرے کے قبل کے سرائیوو کی کہنہ مشق اداکار ہے۔ اور جب میں نے "گودو کا انتظار" پیش کرنے کا ارادہ کیا تو فوراً میرے ذہن میں اس کھیل کے کردار "پوزو" کے لیے اُس کا خیال آیا۔ یہ

معلوم ہونے پر پاشووچ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ شاید میں کھیل کے تمام کرداروں کے لیے عورتوں کو کاسٹ کروں گی (بلکہ اس نے مجھے یہ بھی اطلاع دی کہ چند سال پہلے بلغراد میں یہ کھیل اس طرح اسٹیج کیا گیا تھا کہ سارے کردار عورتوں نے ادا کیے تھے۔) لیکن میرا یہ ارادہ نہیں تھا۔ میں چاہتی تھی کہ کرداروں کے لیے اداکاروں کا انتخاب صنف سے بے نیاز (gender-blind) ہو، کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ "گودو کا انتظار" ان چند ڈراموں میں سے ایک ہے جس میں یہ طریقہ معقول محسوس ہو گا، اس لیے کہ کردار (اشخاص نہیں بلکہ) نمائندہ، تمثیلی ہیولے ہیں۔ اگر (انگریزی کے ضمیر he کی طرح) "ہر آدمی" (Everyman) سے مراد "ہر شخص" (Everybody) ہے -- جیسا کہ عورتوں کو ہمیشہ بتایا جاتا ہے -- تو کیا ضروری ہے کہ "ہر آدمی" کا کردار کوئی مرد ہی ادا کرے؟ جابر "پوزو" کے رول کے لیے اینیز فانیووچ کا انتخاب کر کے میں دراصل یہ بات نہیں کہنا چاہتی تھی (جیسا کہ پاشووچ نے سمجھا) کہ عورت بھی جابر ہو سکتی ہے۔ میں صرف اتنا کہنا چاہ رہی تھی کہ عورت بھی جابر کا پارٹ ادا کر سکتی ہے۔ اس کے برعکس آدمیر گلاموچاک (عرف "آمکو") جسے میں نے "لکی" کے کردار کے لیے چُنا، تیس برس کا ایک دُبلے پُتلے بدن والا شخص تھا اور پوزو کے غلام لکی کے کردار کے روایتی تصور پر پورا اُترتا تھا۔ میں نے اُسے Alcestis میں موت کا تمثیلی کردار ادا کرتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کا کام مجھے بہت پسند آیا تھا۔

اب تین کردار باقی رہ گئے: "ولادیمیر" اور "استراگون" (یعنی نا امید آوارہ گردوں کا جوڑا) اور تیسرا گودو کا ہرکارہ، جو کھیل میں ایک چھوٹا سا لڑکا ہے۔ اُلجھن کی بات یہ تھی کہ جتنے کردار باقی تھے ان سے کہیں زیادہ عمدہ اداکار دستیاب تھے، اور میں جانتی تھی کہ آڈیشن کے لیے آنے والے اداکاروں کے لیے اس کھیل میں شریک ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ ان میں سے تین بے حد باصلاحیت معلوم ہوتے تھے: ایک ویلیبور توپِیک، (وہ بھی Alcestis میں موت کا کردار ادا کر چکا تھا)، دوسرا عزالدین باژرووچ (عرف "عزو") جو اُسی ڈرامے میں ہرکولیس بنا تھا، اور تیسری نادا جوریوسکا جس نے کرِسزا کے کھیل In Agony میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔

تب اچانک مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ سٹیج پر آوارہ گردوں کے ایک کے بجائے تین جوڑے بیک وقت دکھائے جائیں۔ ویلیبور اور عزو سے مجھے امید تھی کہ سب سے پُرزور اور کامیاب جوڑا ثابت ہوں گے، اور بیکٹ کے اصل خیال، یعنی اسٹیج کے ٹھیک وسط میں دو آوارہ گرد مردوں کے کردار، کا حق ادا کر سکیں گے۔ کوئی وجہ نہیں تھی کہ بیکٹ کی بنائی ہوئی اس بنیادی تصویر کو چھیڑا جائے۔ لیکن ان کے داہنے اور بائیں ہاتھ پر دو اور جوڑے بھی دکھائے جا سکتے ہیں، جن میں سے ایک، دو عورتوں پر اور دوسرا ایک مرد اور ایک عورت پر مشتمل ہو۔ اس طرح جوڑے کے تصور کی

تینوں ممکنہ تعبیریں بیک وقت پیش کی جا سکتی ہیں۔

ننھے لڑکے کے کردار کے لیے کوئی اداکار موجود نہ تھا، اور غیر پیشہ ور اداکار کو لیتے ہوئے مجھے خوف آتا تھا، اس لیے میں نے ہرکارے کو بالغ دکھانے کا فیصلہ کیا۔ اس کردار کے لیے میں نے ایک باصلاحیت اداکار میرزا جلیلووِچ کو منتخب کیا جو اتفاق سے پوری کاسٹ میں سب سے اچھی انگریزی بولتا تھا۔ باقی آٹھ اداکاروں میں سے تین بالکل انگریزی نہیں جانتے تھے۔ میرزا میرے لیے ترجمان کے طور پر بھی بہت مددگار ثابت ہو سکتا تھا اور اس کے ذریعے سے میں ہر اداکار سے بیک وقت رابطہ قائم رکھ سکتی تھی۔

ریہرسل کا دوسرا دن آنے تک میں نے ڈرامے کے متن کو، موسیقی کے اسکور کی طرح، ولادیمیر اور استراگون کے تینوں جوڑوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ کسی غیر ملکی زبان میں کام کرنے کا مجھے اس سے پہلے صرف ایک بار اتفاق ہوا تھا جب میں نے تورینو (اٹلی) کے تیاترو استابیلے میں لوئجی پیراندیلو کا کھیل As You Desired Me پیش کیا تھا۔ لیکن تھوڑی بہت اطالوی زبان مجھے آتی تھی، لیکن جہاں تک سربوکروشیئن زبان کا تعلق ہے، (جسے سرائیوو میں لوگ "مادری زبان" کے نام سے یاد کرتے ہیں، "سربوکروشیئن" کا لفظ ادا کرنا اب دشوار ہو گیا ہے)، اس سے میری واقفیت یہاں پہنچنے پر صرف "پلیز"، "ہیلو"، "شکریہ" اور "ابھی نہیں" کے ہم معنی لفظوں تک محدود تھی۔ میں اپنے ساتھ انگریزی سربوکروشیئن لغت، کھیل کے پیپر بیک انگریزی ایڈیشن کی جلدیں، اور متن کی بڑھی ہوئی فوٹو کاپی لے کر آئی تھی جس کی سطروں کے درمیان میں نے کھیل کے "بوسنیائی" متن کو، موصول ہوتے ہی، سطر بہ سطر، پنسل سے انگریزی حروف میں اتار لیا تھا۔ یہی کام میں نے بوسنیائی متن کے ساتھ کیا کہ اس کی سطروں کے درمیان انگریزی متن بوسنیائی حروف میں پنسل سے لکھ دیا۔ تقریباً دس دن میں بیکٹ کے ڈرامے کے الفاظ مجھے اُس زبان میں ازبر ہو گئے جس زبان میں میرے اداکار انھیں ادا کر رہے تھے۔

سرائیوو شہر کی آبادی اس قدر ملی جلی ہے، اور مخلوط النسل شادیوں کا اتنا زیادہ رواج رہا ہے، کہ کسی بھی قسم کے گروپ کا تصور کرنا دشوار ہے جس میں تینوں "نسلی" گروہوں کے لوگ یکجا نہ ہوں۔ اور میں نے اپنے گروپ کے لوگوں سے کبھی دریافت نہیں کیا کہ ان میں سے کون نسلی اعتبار سے کیا ہے۔ یہ بات مجھے محض اتفاق سے اور بہت بعد میں معلوم ہوئی کہ ویلیبور توپیک ("استراگون نمبر ۱") کی ماں مسلمان اور باپ سرب ہے، حالاں کہ اس کے نام سے ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا تھا؛ جب کہ اِنیز فانیجووِچ ("پوزو") یقیناً کروٹ ہو گی کیوں کہ اِنیز کروشیائی نام ہے۔ وہ

Scanned with CamScanner

اسپلٹ نامی ساحلی قصبے میں پیدا ہوئی اور وہیں پلی بڑھی، اور تیس سال پہلے سرائیوو آئی تھی۔ میلانا زیرو یےوچ ("استراگوں نمبر ۲") کے ماں باپ دونوں سرب ہیں، جب کہ آئرینا مولاسوچ ("استراگوں نمبر ۳") کا کم سے کم باپ ضرور مسلمان ہوگا۔ میں تمام اداکاروں کا نسلی پس منظر نہ جان سکی۔ البتہ وہ خود ایک دوسرے کے پس منظر سے واقف تھے اور اسے کوئی انوکھی بات نہ سمجھتے تھے۔ ایک تو وہ کام کے ساتھی تھے -- اور کئی کھیلوں میں اکٹھے کام کر چکے تھے -- اور پھر ایک دوسرے کے دوست بھی تھے۔

حملہ آوروں کے پروپیگنڈے میں متواتر یہ بات کہی جاتی رہی ہے کہ یہ جنگ قدیم نفرتوں کا نتیجہ ہے؛ کہ یہ دراصل خانہ جنگی اور وراثت کا جھگڑا ہے اور میلوشےوچ درحقیقت اتحاد قائم رکھنے کی کوشش کر رہا ہے؛ کہ مسلمانوں کو (جنھیں سرب پروپیگنڈا میں اکثر "ترک" کہا جاتا ہے) ٹھکانے لگا کر سرب دراصل یوروپ کو اسلامی بنیاد پرستی سے بچا رہے ہیں۔ واپسی پر اس سوال کا سامنا ہونے پر مجھے حیرت نہیں ہونی چاہیے تھی کہ کیا میں نے سرائیوو میں بہت سی عورتوں کو پردے میں یا چادر اوڑھے ہوئے دیکھا۔ بوسنیا پر سربوں کی جارحیت پر جو "مغربی" ردعمل ہوا اس میں مسلمانوں کے بارے میں ان طے شدہ "تصورات" کے اثرات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ سرائیوو میں مذہب پر کاربند لوگوں کا تناسب کم و بیش اُتنا ہی ہے جتنا لندن، پیرس، برلن یا وینس کے اصل باشندوں میں پایا جاسکتا ہے۔ جنگ سے پہلے اس شہر میں کسی "مسلمان" کا کسی سرب یا کروٹ سے شادی کر لینا اتنا ہی تعجب خیز ہوسکتا تھا جتنا یہ کہ امریکا میں ریاست نیویارک کا کوئی باشندہ ریاست ماساچوسٹس یا کیلی فورنیا کے رہنے والے سے شادی کر لے۔ سربوں کے حملے سے پہلے کے ایک سال میں سرائیوو میں جتنی شادیاں ہوئیں ان میں سے ساٹھ فیصد مختلف مذہبی پس منظر رکھنے والوں کے درمیان ہوئیں -- یہ سکیولرزم کی ایک نہایت قوی علامت ہے۔ سرائیوو کے مسلمان باشندے اُن خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے بوسنیا کے عثمانی سلطنت کا صوبہ بننے کے بعد اسلام قبول کیا تھا، اور دیکھنے میں اُن میں اور ان کے جنوبی سلاو پڑوسی، رفیقِ حیات یا ہم وطن میں کوئی فرق نہیں ہے، اس لیے کہ دراصل وہ جنوبی سلاو مسیحیوں ہی کے اخلاف ہیں۔

اسلام کا جو روپ موجودہ صدی کے دوران یہاں قائم رہا ہے دراصل اُسی اعتدال پسند سنی عقیدے کی مزید معتدل شکل ہے جسے ترک اپنے ساتھ لے کر آئے تھے، اور اس میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے جسے بنیاد پرستی کا نام دیا جاسکے۔ جب میں اپنے دوستوں سے دریافت کرتی کہ اُن

Scanned with CamScanner

کے خاندانوں میں کون لوگ مذہب پر کاربند رہے ہیں، تو ان کا ایک ہی جواب ہوتا: دادا دادی یا نانا نانی۔ اگر جواب دینے والوں کی عمر پینتیس برس سے کم ہوتی تو وہ عموماً ایک نسل اور پیچھے کا ذکر کرتے۔ "گودو کا انتظار" کے نو اداکاروں میں صرف نادا ایسی تھی جو مذہب کی طرف تھوڑا بہت رجحان رکھتی تھی، اور وہ ایک ہندوستانی گرو کی عقیدت مند تھی۔ سرائیوو سے میرے رخصت ہوتے وقت اس نے مجھے ایک کتاب تحفے میں دی، جو Teachings of the Shiva کا پنگوئن ایڈیشن تھا۔

۳

POZZO: There is no denying it is still day.
(They all look up at the sky.)
Good.
(They stop looking at the sky.)

ہم اندھیرے میں ریہرسل کیا کرتے تھے۔ پروسینیئم اسٹیج کا ننگا فرش عموماً تین یا چار موم بتیوں، اور میرے ساتھ آئی ہوئی چار فلیش لائٹوں سے روشن ہوتا تھا۔ جب میں نے مزید موم بتیاں طلب کیں تو مجھے بتایا گیا کہ ختم ہو چکی ہیں؛ بعد میں مجھے پتا چلا کہ اُنھیں کھیل کی اصل پیش کش میں استعمال کرنے کے لیے محفوظ رکھا گیا ہے۔ درحقیقت مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ موم بتیاں کون مہیا کرتا ہے؛ ہر صبح جب میں گلیوں اور مکانوں کے صحن میں پیدل چلتی ہوئی ریہرسل کے لیے تھیئٹر پہنچتی اور اسٹیج والے دروازے سے (جو واحد قابلِ استعمال دروازہ تھا) عمارت کے پچھلے حصے میں داخل ہوتی تو موم بتیاں فرش پر رکھی جل رہی ہوتی تھیں۔ تھیئٹر کی عمارت کا پیش رُخ، لابی، کلوک روم اور بار سال بھر پہلے شیلنگ سے تباہ ہو چکے تھے اور ان کا ملبہ اب تک ہٹایا نہیں گیا تھا۔

پاشووچ نے ساتھیوں کی سی دردمندی کے ساتھ مجھے خبردار کیا تھا کہ سرائیوو کے اداکار دن میں صرف چار گھنٹے کام کرنے کی توقع کرتے ہیں۔ "اُن پرانے سوشلسٹ بُرے دنوں کی کچھ بد عادتیں ہمارے اندر اب بھی باقی ہیں۔" لیکن میرے تجربے سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوئی؛ بے ہنگم آغاز کے بعد ۔۔ کیوں کہ پہلے ہفتے میں ہر شخص کا ذہن دوسرے ڈراموں اور ریہرسلوں میں اُلجھا ہوا تھا ۔۔ تمام اداکاروں کا جوش و خروش ایسا تھا کہ میں اس سے زیادہ پُراشتیاق اور پُرجوش ٹیم کی خواہش نہیں کر سکتی تھی۔ محاصرے کے دنوں کی نیم تاریکی کو چھوڑ کر، سب سے بڑی رکاوٹ

Scanned with CamScanner

کم خوراکی کے مارے ہوئے اداکاروں کی جسمانی تکان تھی جن میں سے کئی ایک کو، صبح دس بجے ریہرسل کے لیے پہنچنے سے پہلے، پانی حاصل کرنے کے لیے گھنٹوں قطار میں کھڑا رہنا اور پھر پانی سے بھری بالٹیوں کو آٹھ آٹھ دس دس زینے چڑھا کر اوپر پہنچانا پڑتا تھا۔ ان میں سے بعض کو تھیئٹر پہنچنے کے لیے دو گھنٹے پیدل چلنا پڑتا اور ظاہر ہے ریہرسل ختم ہونے پر واپس بھی اسی خطرناک طریقے سے جانا پڑتا۔

اڑسٹھ سالہ اینیز فانیووچ ٹیم کی معمر ترین رکن تھی مگر ایک وہی تھی جس کی نارمل جسمانی قوت برقرار تھی۔ محاصرے کی ابتدا سے اب تک ۶۰ پاؤنڈ سے زیادہ وزن گنوا بیٹھنے کے باوجود وہ ایک قوی ہیکل عورت ہے اور اس کی غیر معمولی توانائی کی غالباً یہی وجہ تھی۔ باقی تمام اداکار کم خوراکی کے باعث دیکھنے ہی میں نحیف لگتے اور جلد تھک جاتے تھے۔ ڈرامے کے کردار "لکی" کو اپنے طویل منظروں کے دوران اپنا بھاری بیگ زمین پر رکھے بغیر تقریباً تمام وقت بے حس و حرکت کھڑے رہنا تھا۔ یہ رول ادا کرنے والے آگو نے (جس کا وزن اب سو پاؤنڈ سے زیادہ نہیں رہا ہوگا) مجھ سے اجازت مانگی کہ وہ ریہرسل کے دوران کبھی کبھی اپنا خالی سوٹ کیس زمین پر ٹکا لیا کرے۔ جب کبھی میں کسی مکالمے یا ایکشن میں تھوڑی بہت ترمیم کرنے کی غرض سے چند منٹ کے لیے ریہرسل روکتی تو اینیز کے سوا تمام اداکار فوراً اسٹیج کے فرش پر لیٹ کر سستانے لگتے۔

تکان کی ایک اور علامت یہ تھی کہ ان اداکاروں کو اپنے مکالمے یاد کرنے میں اتنی زیادہ دیر لگتی تھی جس کا مشاہدہ مجھے مختلف قسم کے اداکاروں کے ساتھ کام کرتے ہوئے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ کھیل کے افتتاح سے فقط دس دن پہلے بھی انھیں اپنے اسکرپٹ سے رجوع کرنے کی ضرورت پڑتی، اور ڈریس ریہرسل سے پہلے تک انھیں ایک ایک لفظ ازبر نہیں ہو سکا تھا۔ یہ بات بجائے خود اتنا بڑا مسئلہ نہ ہوتی اگر اسٹیج پر ہاتھوں میں پکڑے ہوئے اسکرپٹ کو پڑھنے کے لیے مناسب روشنی میسر ہوتی۔ اگر کسی اداکار کو مکالمہ ادا کرتے ہوئے اسٹیج پر ایک جگہ سے چل کر دوسری جگہ جانا ہوتا، اور وہ اس دوران اپنا مکالمہ بھول جاتا، تو اسے اپنا راستا تبدیل کر کے کسی قریب ترین موم بتی تک پہنچنا پڑتا تا کہ اسکرپٹ پر نظر ڈال کر مکالمہ یاد کر سکے۔ (اسکرپٹ دراصل کھلے ہوئے اوراق پر مشتمل تھا کیوں کہ انھیں باندھنے والے کلپ سرائیوو میں نایاب ہو چکے تھے۔ کھیل کے متن کو پاشووچ کے دفتر میں ایک چھوٹے سے دستی ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کیا گیا تھا جس کے ربن کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اسے محاصرہ شروع ہونے کے بعد سے تبدیل نہیں کیا گیا ہے۔ ٹائپ کی ہوئی اور جنل کاپی مجھے ملی اور باقی نو کاربن کاپیاں اداکاروں میں تقسیم کی گئیں جن میں سے آخری پانچ کاپیوں کو کسی بھی قسم کی روشنی میں پڑھنا محال تھا۔)

Scanned with CamScanner

صرف یہی نہیں کہ اداکار اپنے اسکرپٹ کو پڑھنے سے قاصر تھے، بالکل ناک سے ناک ملا کر کھڑے نہ ہوں تو وہ ایک دوسرے کو بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ دن کی یا بجلی کی روشنی میں انسانی نگاہ کو جو نارمل دائرہ میسر ہوتا ہے اُس سے محرومی کی حالت میں اُن کے لیے اتنی حرکت بھی درست طور پر ممکن نہ تھی کہ دو کردار اپنے اپنے باوٴر ہیٹ ڈرامے کے تقاضے کے مطابق بیک وقت اتار سکیں۔ اور میں اُنھیں تقریباً تمام وقت مایوسی کے ساتھ سیاہ پرچھائیوں کی صورت میں دیکھنے پر مجبور رہی۔ ڈرامے کے پہلے ایکٹ کے شروع ہی کے حصے میں، جب ولادیمیر (جس کا کردار میری ترمیم کے مطابق تین مختلف اداکار کر رہے تھے) "اچانک باچھیں چِیر کر مسکراتا ہے، کچھ دیر مسکراتا رہتا ہے، اور پھر اچانک مسکرانا بند کر دیتا ہے"، میں ان تینوں اداکاروں کے بالکل سامنے، صرف دس فٹ دور، ایک اسٹول پر بیٹھی تھی اور ان میں سے ایک کی بھی مسکراہٹ مجھے دکھائی نہ دے سکی کیوں کہ میری فلیش لائٹ کا رخ میرے اپنے اسکرپٹ کی طرف تھا۔ خیر، رفتہ رفتہ میری اندھیرے کی نگاہ بہتر ہوتی گئی۔

اداکاروں کو اپنے مکالمے اور حرکات یاد کرنے میں جو دشواری ہو رہی تھی اور وہ جو یوں کھوئے ہوئے اور بے دھیان سے معلوم ہوتے تھے، اُس کی وجہ بلاشبہ صرف تکان نہیں تھی۔ اس کا سبب ذہنی اضطراب اور خوف بھی تھا۔ ہر بار جب ہمیں باہر کسی شیل کے پھٹنے کا دھماکا سنائی دیتا تو محض اس بات پر اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ شیل تھیئٹر پر نہیں گرا ہے۔ اداکاروں کو اس بات کی بھی فکر ہوتی تھی کہ شیل کہاں گرا ہے۔ میری ٹیم میں سے صرف دو اداکار، سب سے معمر اینیز اور سب سے کم عمر ویلیبور، ایسے تھے جو تنہا رہا کرتے تھے۔ تھیئٹر میں موجود باقی سب لوگوں کی بیویاں اور شوہر، بچے اور ماں باپ، گھروں پر ہوتے تھے اور ان میں سے کئی ایک کے گھر محاذِ جنگ کے بالکل سامنے واقع تھے، مثلاً گرباویچا محلّے کے پاس جس پر سربوں نے ایک سال پہلے قبضہ کر لیا تھا یا علی پاشینو پولیے میں جو ایرپورٹ کے قریب تھا جس پر سربوں کا قبضہ تھا۔

۳۰ جولائی کو نادا، جو ہر سل کے پہلے دو ہفتوں میں عموماً دیر سے پہنچتی تھی، دوپہر دو بجے یہ خبر لے کر آئی کہ زلاتکو اسپاراوولو ہلاک ہو گیا ہے۔ زلاتکو ایک معروف اور سینیئر اداکار تھا اور شیکسپیئر کے مشہور کردار ادا کرنے میں خاص مہارت رکھتا تھا۔ اس کے مکان کے صدر دروازے پر ایک شیل آ کر گرا جس سے وہ اور اس کے دو پڑوسی ہلاک ہو گئے۔ تمام اداکار اسٹیج خالی کر کے خاموشی کے ساتھ برابر والے کمرے میں چلے گئے۔ میں اُن کے پیچھے پیچھے گئی اور اُن میں سے بولنے کے قابل ہونے والے پہلے شخص نے مجھے بتایا کہ یہ خبر ان سب کے لیے خاص طور پر اضطراب کا

Scanned with CamScanner

باعث ہے، کیوں کہ اس سے پہلے کوئی اداکار مارا نہیں گیا تھا۔ (میں نے اس سے پہلے دو اداکاروں کا ذکر سنا تھا جن کی ایک ایک ٹانگ شیلنگ میں ضائع ہوئی تھی۔ ان کے علاوہ میں ایک اور اداکار زرین ٹموریچ سے واقف تھی جس کی دونوں ٹانگیں کولھوں پر سے اُڑ گئی تھیں اور جس کا کام اب یوتھ تھیئٹر کا انتظام سنبھالنے تک محدود ہو گیا تھا۔) جب میں نے اپنے اداکاروں سے پوچھا کہ آیا وہ ریہرسل جاری رکھنا چاہتے ہیں، تو عزّو کے سوا سب نے اثبات میں جواب دیا۔ لیکن کوئی گھنٹا بھر آگے کام کرنے کے بعد سب کی طاقت جواب دے گئی۔ صرف وہ ایک دن تھا جب ریہرسل وقت سے پہلے ختم کرنی پڑی۔

جو سیٹ میں نے ڈزائن کیا تھا —— یہ سوچ کر کہ اس میں چیزیں کی تعداد کم سے کم رہے، جیسا کہ بیکٹ نے خود بھی خواہش کی ہوتی —— دو سطحوں پر مشتمل تھا۔ پوزو اور لکی اسٹیج کی پچھلی دیوار کے ساتھ رکھے اُبھرے ہوئے پلیٹ فارم پر نمودار ہوتے، مکالمے ادا کرتے اور اُسی پر سے باہر نکلتے تھے۔ یہ پلیٹ فارم چار فٹ اونچا، آٹھ فٹ چوڑا اور لمبائی میں اسٹیج کی پوری چوڑائی کے برابر تھا، بائیں ہاتھ پر کنارے کے پاس درخت تھا۔ پلیٹ فارم کے سامنے سے دکھائی دینے والے چار فٹ اونچے پہلو کو پولی یورِیتھین پلاسٹک کی اُن چادروں سے ڈھانپا گیا جو اقوامِ متحدہ کے پناہ گزینوں کے ہائی کمیشن (UNHCR) نے جاڑوں میں سرائیوو کی ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں میں ہوا روکنے کی غرض سے لگانے کے لیے بھیجی تھیں۔ آوارہ گردوں کے تینوں جوڑے زیادہ تر اسٹیج کے فرش پر کھڑے رہتے تھے البتہ کسی کسی وقت اُن میں کوئی ولادیمیر یا استراگوں چڑھ کر اوپر کے پلیٹ فارم پر چلا جاتا۔ ان تینوں جوڑوں کی جدا جدا شناخت اُبھارنے کے لیے کئی ہفتوں کی ریہرسل درکار ہوئی۔ اسٹیج کے وسط میں کھڑے ولادیمیر اور استراگوں (عزّو اور ویلیبور) کلاسیکی وضع کے دو دوست تھے۔ کئی بار بھدّے پن سے ابتدا کرنے کے بعد دونوں عورتیں (نادا اور میلیانا) رفتہ رفتہ ایک اور خاص طرح کے جوڑے میں (یعنی چالیس بیالیس سالہ ماں اور نوعمر بیٹی کے کرداروں میں) ڈھل گئیں جن کے تعلق میں شیفتگی اور باہم انحصار کے ساتھ ساتھ بیزاری اور آزردگی کا بھی رنگ موجود تھا۔ تیسرا جوڑا (سیمبو اور آدرینا) سب سے زیادہ معمر جوڑا تھا اور جھگڑالو اور بدمزاج میاں بیوی کے کرداروں پر مشتمل تھا جنھیں میں نے مَین ہیٹن کے مرکزی علاقے میں پائے جانے والے بےگھر لوگوں کے مشاہدے سے کام لے کر ڈھالا تھا۔ لیکن جس وقت پوزو اور لکی اوپر کے پلیٹ فارم پر موجود ہوتے تو آوارہ گردوں کے تینوں جوڑے اکٹھے ہو جاتے اور یہ چھوٹا سا ہجوم ایک طرف یونانی کورس کی سی شکل اختیار کر لیتا اور دوسری طرف آقا اور غلام کے پیش کیے ہوئے

Scanned with CamScanner

ناٹک کے لیے ناظرین کا کام کرتا۔

ولادیمیر اور استراگوں کے تین جوڑے بنانے، اور مکالمے اور حرکات کے علاوہ خاموشی کے وقفے بڑھانے، کے باعث کھیل کے دورانیے میں اصل کی نسبت خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ پہلا ایکٹ کم سے کم نوے منٹ چلے گا۔ دوسرا ایکٹ مقابلتاً مختصر تھا کیوں کہ اس میں مَیں نے صرف عزّو اور ویلیبور والے جوڑے کو سامنے رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن دوسرے ایکٹ کو تیز رفتار اور کم تفصیل رکھنے کے باوجود کھیل ڈھائی گھنٹے پر محیط ہوتا۔ اور میں لوگوں سے یہ درخواست نہیں کر سکتی تھی کہ وہ یوتھ تھیٹر میں کھیل دیکھیں، کیوں کہ خدشہ تھا کہ اگر اس کی عمارت، یا برابر والی عمارت پر بھی، شیل آ کر لگا تو اس کے دھماکے سے ہال میں لگے ہوئے نو چھوٹے فانوس ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ ہال میں بیٹھے ہوئے پانچ سو ناظرین کے لیے ممکن ہی نہ تھا کہ وہ چند موم بتیوں سے روشن کیے ہوئے گہرے پرو سینیئم اسٹیج پر ہونے والی حرکات و سکنات کو دیکھ سکیں۔ اسٹیج کے ٹھیک سامنے، اداکاروں کے بالکل پاس، خالی کھوکھوں کی چھ قطاریں رکھ کر صرف سو آدمیوں کو بٹھایا جا سکتا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے اور انھیں بالکل ایک دوسرے سے سٹ کر بیٹھنا پڑتا۔ میں جانتی تھی کہ اسٹیج والے دروازے کے باہر کھیل دیکھنے کے خواہش مندوں کی قطاریں لگی ہوں گی (داخلہ مفت تھا)۔ ایک ایسے تھیٹر میں جہاں لابی اور باتھ روم تباہ ہو چکے ہوں اور پینے کا پانی موجود نہ ہو، لوگوں کو ڈھائی گھنٹے اس حالت میں بیٹھے رہنے پر کیوں کر مجبور کیا جا سکتا ہے؟

ان سب باتوں پر غور کر کے میں اس نتیجے پر پہنچی کہ "گودو کا انتظار" کو مکمل صورت میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن پہلے ایکٹ کی صورت وضع کرنے کے لیے میں نے جو فیصلے کیے تھے اُن کا تقاضا تھا کہ پیش کش پورے کھیل کی نمائندگی کر سکے خواہ الفاظ صرف پہلے ایکٹ کے استعمال کیے جائیں۔ ڈراما کے ادب کا یہ واحد نمونہ ہے جس کا پہلا ایکٹ بجائے خود ایک مکمل کھیل ہے۔ پہلے ایکٹ کا مقام اور وقت یوں بیان کیا گیا ہے: "ایک دیہی سڑک۔ ایک درخت۔ شام۔" (جب کہ دوسرے ایکٹ کے شروع میں کہا گیا ہے: "اگلا دن۔ وہی وقت۔ وہی جگہ۔") اگرچہ دونوں ایکٹ شام کے وقت پیش آتے ہیں لیکن دونوں ایک ایک پورے دن کا تاثر دیتے ہیں جس کا آغاز ولادیمیر اور استراگوں کے دوبارہ آملنے سے ہوتا ہے اور خاتمہ شام ختم ہوتے ہوتے جدا ہونے پر (حالاں کہ یہ دونوں جنسی تعلق کو چھوڑ کر باقی ہر لحاظ سے ایک جوڑے کی حیثیت رکھتے ہیں)۔ ہر ایکٹ کے آغاز پر ولادیمیر (جو اپنے ساتھی کی نسبت بالادست ہے، بحث کرتا اور معلومات حاصل کرتا ہے اور مایوسی کو زائل کرنے میں نسبتاً زیادہ کامیاب ہے) استراگوں سے دریافت کرتا ہے کہ

اس نے رات کہاں گزاری۔ وہ دونوں گودو کے (وہ جو کوئی بھی ہے) انتظار کی باتیں کرتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح وقت کاٹنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ پوزو اور لکی آتے ہیں، کچھ دیر ٹھہرتے اور اپنی "معمول کی" حرکات ادا کرتے ہیں (جنھیں ولادیمیر اور استراگوں ناظرین کے طور پر دیکھتے ہیں) اور آخر چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد تناؤ میں کمی اور تسکین کا ایک وقفہ آتا ہے اور دونوں آوارہ گرد گودو کے انتظار میں دوبارہ مشغول ہو جاتے ہیں۔ تب ہرکارہ آ کر انھیں اطلاع دیتا ہے کہ اس بار بھی ان کا انتظار بے نتیجہ ثابت ہوا۔

بلاشبہ پہلے ایکٹ، اور دوسرے ایکٹ میں پہلے ایکٹ کی تکرار کے درمیان فرق موجود ہے۔ نہ صرف یہ کہ ایک اور دن گزر گیا، بلکہ یہ بھی کہ ہر چیز کچھ اور بدتر ہو گئی۔ لکی اب بول نہیں پاتا۔ پوزو بینائی سے محروم اور قابلِ رحم حالت میں ہے۔ ولادیمیر نے مایوسی کے آگے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ ممکن ہے میں نے یہ سوچا ہو کہ سرائیوو کے ناظرین کے لیے پہلے ایکٹ میں ظاہر کی گئی مایوسی ہی کافی ہے، اور میں نے انھیں دوسرے دن کے بے ثمر انتظار سے محفوظ رکھنا چاہا ہو۔ ممکن ہے میں نے اشارتی انداز میں یہ بات کہنے کی کوشش کی ہو کہ دوسرے ایکٹ کا پہلے ایکٹ سے مختلف ہونا بھی ممکن ہے۔ جس طرح "گودو کا انتظار" سرائیوو کے باشندوں کی موجودہ حالت کی نہایت مناسب تصویر کشی کرتا ہے -- بے وسیلہ، غذا سے محروم، مایوسی کے شکار اور کسی ایسی بے شکل اجنبی طاقت کے منتظر جو انھیں بچا لے یا اپنی پناہ میں لے لے -- اسی طرح مجھے یہ بات بھی مناسب معلوم ہوئی کہ یہاں "گودو کا انتظار، پہلا ایکٹ" ہی پیش کیا جائے۔

۴

"Alas, alas..."

(لکی کی خود کلامی۔)

سرائیوو میں لوگ دل خراش زندگی گزار رہے ہیں: "گودو کا انتظار" کی یہ پیش کش بھی دل خراش تھی۔ پوزو کے کردار میں اینیز کا انداز بھڑکیلا اور تھیٹریکل تھا، اور آنکو ایسا دل دوز لکی بنا کہ میں نے زندگی بھر نہ دیکھا تھا۔ آنکو نے، جو بیلے کی تربیت حاصل کر چکا تھا اور اکیڈمی میں حرکات (movement) کے مضمون کا استاد تھا، ضعیفی کی حرکات و سکنات پر بہت جلد عبور حاصل کر لیا اور جب میں نے لکی کے رقصِ آزادی کی تجویز پیش کی تو اس کی بہت پُرجوش ہو کر تائید کی۔ لکی کی خود کلامی کو حتمی شکل دینے میں کافی وقت لگا جو میری دیکھی ہوئی تمام پیش کشوں میں -- جن میں

Scanned with CamScanner

۱۹۷۴ میں برلن کے شلر تھیئٹر میں ہونے والی بیکٹ کی اپنی پیش کش بھی شامل تھی۔۔ میرے ذوق کے نقطۂ نظر سے، بہت تیز تیز اور بے ربط گفتگو کے انداز میں لائی جاتی تھی۔ میں نے اس تقریر کو پانچ حصوں میں بانٹ دیا، اور ہم دونوں نے اس پر سطر بہ سطر بحث کر کے اسے ایک استدلال، تمثالوں اور آوازوں کے ایک سلسلے، ایک نوحے، ایک پکار کی شکل دے دی۔ میں چاہتی تھی کہ آنکو خدائی بے حسی اور بے اعتنائی، اور دنیا کی سنگ دلی اور بے عملی کے بارے میں بیکٹ کے لکھے ہوئے طویل متن کو یوں ادا کرے کہ وہ بامعنی معلوم ہو۔ اور وہ بامعنی معلوم بھی ہوتا تھا، خصوصاً سراییوو میں۔

مجھے ہمیشہ محسوس ہوا ہے کہ "گودو کا انتظار" کا اسلوب انتہائی حقیقت نگاری کا ہے، حالاں کہ اسے ہمیشہ ایک ایسے انداز میں پیش کیا جاتا ہے جس میں حقیقت کے عناصر کم سے کم اور طنزومزاح کا تاثر زیادہ ہوتا ہے۔ جس "گودو کا انتظار" کو سراییوو کے اداکار اپنے میلان، مزاج، تھیئٹر کے سابقہ تجربے اور موجودہ (خوفناک) حالات کے پیشِ نظر پیش کرنے پر قادر تھے، اور جس کا میں نے ہدایت کار کے طور پر انتخاب کیا تھا، وہ ایک بے پناہ کرب، سخت الم اور، آخری حصے میں، دہشت ناک تشدد پر مبنی تھا۔ ہرکارے کے بالغ ہونے کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ جب وہ بُری خبر لے کر آئے تو ولادیمیر اور استراگوں اس کے ردعمل میں نہ صرف مایوسی کا بلکہ طیش کا بھی اظہار کر سکتے تھے۔ یہ طیش ہرکارے کے ساتھ جسمانی بدسلوکی کی شکل میں ظاہر کیا گیا جو اصل صورت میں، جب کہ ہرکارہ ایک بچہ تھا، ہرگز ممکن نہ ہوتا۔ (اور یہ نہ بھولیے کہ آوارہ گردوں کے تین جوڑے تھے اور ہرکارہ اکیلا تھا۔) اس کے گرتے پڑتے فرار ہو جانے کے بعد وہ چھ کے چھ افراد ایک طویل دہشت انگیز خاموشی میں ڈوب جاتے ہیں۔ یہ انتہائی غم و الم کا چیخوفیئن (Chekhovian) لمحہ تھا، بالکل ویسا جیسا چیخوف کے کھیل "چیری کا باغ" کے خاتمے پر آتا ہے جب بوڑھے بٹلر فیرس کی آنکھ کھلتی ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ سب لوگ اسے ویران مکان میں تنہا چھوڑ کر جا چکے ہیں۔

"گودو کا انتظار" کی پیش کش اور سراییوو میں اپنے دوسرے قیام کے دوران مجھے یہی محسوس ہوتا رہا کہ میں واقعات کے کسی جانے پہچانے سلسلے کو ازسرِنو بسر کر رہی ہوں۔ محاصرے کے آغاز سے لے کر اب تک کی سخت ترین شیلنگ میرے قیام کے پہلے دس دنوں میں کی گئی۔ ان میں ایک دن ایسا تھا جب سراییوو شہر پر چار ہزار شیل پھینکے گئے۔ امریکی مداخلت کی امیدیں ایک بار پھر بیدار ہوئیں لیکن کلنٹن کو (اگر یہ ایک انتہائی ڈانواڈول ارادے کے لحاظ سے بہت سخت الفاظ نہ

بجھے جائیں تو) اقوامِ متحدہ کی سرب نواز امن فوج کی قیادت نے چکما دے دیا جس کا دعویٰ تھا کہ امریکی مداخلت سے اقوامِ متحدہ کے سپاہیوں کی جانیں خطرے میں پڑ جائیں گی۔ سرائیوو کے شہریوں کی بے اعتباری اور مایوسی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ جنگ بندی کا ایک جھوٹا اعلان ہوا، جس کا مطلب تھا کہ شیل اور گولیوں کی تعداد میں ذرا سی کمی کر دی جائے، لیکن چوں کہ اعلان سن کر معمول سے زیادہ لوگ سڑکوں پر نکل آئے تھے اس لیے ہلاک اور زخمی کیے جانے والوں کی روزانہ تعداد وہی رہی جو اس اعلان سے پہلے تھی۔

میں اور میری کاسٹ کے لوگ آپس میں "کلنٹن کا انتظار" کے بارے میں مذاق کرنے سے کتراتے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جولائی کے اُن آخری دنوں میں، جب سربوں نے ایرپورٹ کے بالکل اوپر کوہ اگمان پر قبضہ کر لیا تھا، یا کم از کم محسوس یہی ہوتا تھا کہ ان کا قبضہ ہو چکا ہے، ہم یہی کر رہے تھے۔ کوہِ اگمان پر قبضے سے وہ اس قابل ہو گئے کہ شیل افقی سمت میں پھونک کر شہر کے مرکز کو براہِ راست نشانہ بنا سکیں، اور امیدیں پھر بیدار ہو گئیں کہ امریکا سربوں کی توپوں پر ہوائی حملے کرے گا، یا کم سے کم اسلحے کی رسد پر سے پابندی ہٹا لے گا۔ اگرچہ لوگ امید کرتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں مایوسی نہ اٹھانی پڑے، لیکن یہ بات ہر ایک کے لیے ناقابلِ یقین تھی کہ کلنٹن ایک بار پھر مداخلت کی بات کرے گا اور ایک بار پھر کوئی عملی قدم نہیں اٹھائے گا۔ میں خود ایک بار پھر اس امید کی ترغیب میں آ گئی تھی جب ایک اخبار نویس دوست نے مجھے مداخلت کے حق میں سینیٹر بیڈن (Biden) کی شاندار تقریر کی نقل دکھائی جو اس نے ۲۹ جولائی کو سینیٹ کے اجلاس میں کی تھی۔ یہ متن سٹیلائٹ فیکس سے آیا تھا اور گنجان ٹائپ کے بارہ دھندلے صفحوں پر مشتمل تھا۔ سرائیوو کا واحد فعال ہوٹل ہالیڈے ان -- جو مرکزِ شہر کے مغربی پہلو میں، قریب ترین سرب اسنائپروں سے چار بلاک کے فاصلے پر، واقع ہے -- اخبار نویسوں سے بھرا ہوا تھا جو سرائیوو کی شکست یا بیرونی مداخلت کا انتظار کر رہے تھے۔ ہوٹل کے عملے کے ایک رکن کا کہنا تھا کہ ۱۹۸۴ کے سرمائی اولمپک کھیلوں کے بعد سے اب تک اس ہوٹل میں ایسی بھیڑ کبھی نہیں لگی۔

کبھی کبھی مجھے خیال آتا کہ ہم گودو (یا کلنٹن) کا انتظار نہیں کر رہے ہیں۔ ہم دراصل اپنے اسٹیج کے لیے درکار سامان کی آمد کے منتظر ہیں۔ لکی کا سوٹ کیس اور پکنک والی ٹوکری، پوزو کا سگریٹ ہولڈر (اصل ڈرامے کے پائپ کا متبادل) اور چابک، ان تمام ضروری چیزوں کا حاصل کرنا ناممکن دکھائی دیتا تھا۔ جہاں تک اس گاجر کا تعلق ہے جسے استراگوں کھیل کے دوران آہستہ آہستہ اور بڑی مسرت کے ساتھ چباتا ہے، اس کے متبادل کے طور پر ہم پیش کش شروع ہونے سے دو

دن پہلے تک اُن خشک رولز سے کام چلاتے رہے جو میں اداکاروں اور مددگار کارکنوں کے کھانے کے لیے بالیڈے ان کے ڈائننگ روم سے کھوج کر لے آتی تھی (یہ خشک رول ہوٹل میں ناشتے کے طور پر پیش کیے جاتے تھے)۔ اسٹیج پر اپنا کام شروع کرنے کے ایک ہفتے بعد تک ہمیں پوزو کے لیے رسّا دستیاب نہ ہو سکی، اور ایسٹیرز کی ہر بھی قابلِ فہم تھی جب ریہرسل کے تین ہفتے گزرنے پر بھی ہمیں مناسب لمبائی کی رسّی، ایک درست چابک، سگریٹ ہولڈر اور ایٹمائزر نہ مل سکے۔ استراگون کے تین کرداروں کے لیے باؤلر ہیٹ ریہرسل کے آخری چند دنوں میں مہیا ہو سکے۔ اور کاسٹیوم، جن کے ڈیزائن میں نے تجویز کیے تھے اور جن کے خاکے ریہرسل کے پہلے ہفتے کے دوران تیار ہو چکے تھے، اصل پیش کش شروع ہونے سے صرف ایک دن پہلے موصول ہوئے۔

ان چیزوں کی عدم دستیابی کا ایک سبب تو یہ تھا کہ سرائیوو میں قریب قریب ہر چیز نایاب ہے۔ کسی حد تک اس کی ذمے داری "جنوب" والوں (یا بلقانیوں) کی ٹالنے کی عادت پر بھی تھی ("سگریٹ ہولڈر آپ کو کل ضرور مل جائے گا،" مجھے تین ہفتوں تک ہر صبح یہ اطلاع دی جاتی رہی۔) لیکن ان چیزوں کی قلت کی ایک وجہ تھیٹروں کی باہمی رقابت بھی تھی۔ اسٹیج کا سامان نیشنل تھیٹر میں (جسے بند کر دیا گیا تھا) یقیناً موجود ہونا چاہیے تھا۔ یہ سامان ہمیں کیوں مہیا نہیں ہو رہا؟ کھیل کی پیش کش شروع ہونے سے چند دن پہلے مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں سرائیوو کی "تھیٹر کی دنیا" کی مہمان رکن نہیں ہوں بلکہ سرائیوو میں تھیٹر والوں کے کئی قبیلے موجود ہیں، اور حارث پاشووچ سے مل کر کام کرنے کے نتیجے میں مَیں باقی قبیلوں کے تعاون سے محروم ہوں۔ (یہ عدم تعاون یک طرفہ نہیں تھا۔ ایک موقعے پر جب مجھے ایک اَور پیشکار کی جانب سے، جو میرے پچھلے سفر کے دوران میرا دوست بن گیا تھا، مدد کی نہایت قیمتی پیش کش ملی تو پاشووچ نے، جو ویسے بہت معقول اور تعاون کرنے والا آدمی ہے، مجھ سے کہنے لگا: "میں نہیں چاہوں گا کہ آپ اُس شخص کی مدد قبول کریں۔")

بلاشبہ یہ کسی بھی شہر کے لیے ایک نارمل صورت حال ہے۔ محصور سرائیوو میں آخر کیوں نہ ہو؟ کسی بھی دوسرے یوروپی شہر کی طرح جنگ سے پہلے کے سرائیوو میں بھی یقیناً یہ رقابت، تناو اور حسد موجود رہا ہو گا۔ میرا احساس ہے کہ میرے تمام مددگار، سیٹ اور کاسٹیوم ڈیزائنر آگنییشکا سیچی، اور خود پاشووچ، مجھ سے یہ بات چھپانے کے لیے بے قرار تھے کہ اس شہر میں ہر کسی پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ جب مجھے کچھ سن گن ملنی شروع ہوئی کہ ہماری مشکلات ایک حد تک دوسرے تھیٹر والوں کی رقابت، بلکہ دانستہ رخنہ اندازی، کا نتیجہ ہیں تو میرے ایک مددگار نے بڑے اُداس لہجے میں مجھ سے کہا: "اب آپ ہمیں جان گئی ہیں اور شاید دوبارہ یہاں نہیں آنا چاہیں گی۔"

سرائیوو محض ایک ایسا شہر نہیں ہے جو کثیر مشربی کے آدرش کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہاں کے بہت سے باشندے اسے ایک آئیڈیل شہر سمجھتے تھے: اگرچہ یہ کوئی اہم مقام نہیں ہے (کیوں کہ بڑا شہر، مال دار شہر نہیں ہے)، لیکن پھر بھی بہترین جگہ ہے، چاہے شہرت پانے کی خواہش میں کبھی کبھی یہاں سے باہر ہی کیوں نہ نکلنا پڑے، جیسے سان فرانسسکو کے لوگوں کو آخرکار لاس اینجلز یا نیویارک منتقل ہونا پڑتا ہے۔ "آپ تصور نہیں کر سکتیں کہ اس شہر کا ماحول کیسا تھا،" پاشووِچ نے مجھ سے کہا، "بالکل جنت کی طرح۔" اپنے شہر کو یوں آئیڈیل کے طور پر دیکھنے کا رویہ فریبِ نظر کے شکست ہونے پر بڑی شدید مایوسی کو جنم دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرائیوو میں جن لوگوں سے میری ملاقات ہوئی اُن میں سے قریب قریب ہر شخص نے سرائیوو کے اخلاقی انحطاط پر بے اختیار ماتم کیا: رہزنی اور چوری کی وارداتیں، غنڈا گردی، ہوس ناک چور بازاری، فوج کے بعض یونٹوں کی دراز دستی، شہری تعاون کا فقدان۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ ٹھنڈے دل سے سوچیں تو خود کو، اور اپنے شہر کو، معاف کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ سترہ مہینے سے یہ شہر چاندماری کا میدان بنا ہوا ہے۔ میونسپل حکومت کم و بیش مفقود ہے، جس کے باعث شیلنگ کا ملبہ اُٹھایا نہیں جاتا، بچوں کے اسکولوں کا انتظام موقوف ہو چکا ہے وغیرہ وغیرہ۔ محاصرے میں آیا ہوا ہر شہر، جلد یا بدیر، افراتفری کا شکار ہو جاتا ہے۔

لیکن سرائیوو کے بیشتر باشندے موجودہ حالات اور اس کے ذمے دار "عناصر" (وہ کربناک ابہام سے کام لیتے ہوئے اُن کے لیے یہی لفظ استعمال کرتے ہیں) کی مذمت بڑی بے رحمی سے کرتے ہیں۔ "یہاں کوئی بھی اچھی چیز ہو رہی ہو تو اسے معجزہ سمجھنا چاہیے،" میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا۔ ایک اور دوست کا کہنا تھا: "یہ بُرے لوگوں کا شہر ہے۔" جب ایک برطانوی فوٹو جرنلسٹ نے ہمیں نو موم بتیوں کا بیش بہا عطیہ دیا تو یہ موم بتیاں فوراً ہی چوری ہو گئیں۔ ایک روز جب میرزا اسٹیج پر تھا، اس کا کھانا، جو گھر کی بنی روٹیوں اور ایک آڑو پر مشتمل تھا، اس کے تھیلے میں سے نکال لیا گیا۔ یہ کام اس کے ساتھی اداکاروں کا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن باقی لوگوں، مثلاً اسٹیج کے مددگار کارکنوں یا ریہرسلوں میں آتے جاتے ڈراما اکیڈمی کے طلبا، میں سے کوئی بھی شخص اس کا ذمے دار ہو سکتا تھا۔ اس چوری کے انکشاف پر تمام اداکار بہت دل گرفتہ ہوئے۔

اگرچہ بہت سے لوگ شہر چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں، اور موقع ملتے ہی چلے بھی جائیں گے، لیکن ایسے لوگوں کی تعداد حیرت انگیز ہے جن کا کہنا ہے کہ انھیں اپنی زندگی ناقابلِ برداشت معلوم نہیں ہوتی۔ "ہم پوری زندگی اِسی طرح گزار سکتے ہیں،" ایک مقامی اخبار نویس بروویلے باتینیک

Scanned with CamScanner

نے، جس سے میری اپریل والے سفر میں دوستی ہوئی تھی، مجھ سے کہا۔ "میں سو برس اسی حالت میں زندہ رہ سکتی ہوں،" ایک نئی دوست زبرا کرہو، نیشنل تھیٹر کی منتظم، نے ایک شام مجھے بتایا۔ ان دونوں کی عمر پینتیس برس کے لگ بھگ ہے۔

کبھی کبھی مجھے خود بھی یہی احساس ہوتا۔ بلاشبہ میرے لیے یہ بات بالکل مختلف تھی۔ "مجھے غسل کیے سولہ مہینے ہو گئے ہیں،" ایک ادھیڑ عمر عورت نے مجھ سے کہا۔ "تم جانتی ہو اس حالت میں کیسا محسوس ہوتا ہے؟" ظاہر ہے میں بالکل نہیں جانتی؛ میں زیادہ سے زیادہ اتنا جانتی ہوں کہ ایک مہینے تک غسل نہ کر پانے پر کیسا محسوس ہوتا ہے۔ میں اپنے کام میں پیش آنے والی دشواریوں کو سر کرنے میں مشغول، سرشاری اور توانائی کے عالم میں تھی۔ ساتھ کام کرنے والوں کا جوش اور ولولہ میرے اس احساس کو تقویت دے رہا تھا۔ مگر میں یہ بات کسی طرح فراموش نہیں کر سکتی تھی کہ اُن میں سے ہر ایک کے لیے زندگی کس قدر دشوار ہے اور اس شہر کا مستقبل کتنا مایوس کن معلوم ہوتا ہے۔ میرے لیے میری کمتر دشواریوں اور خطروں کا سامنا کرنا اس لیے نسبتاً آسان تھا کہ میں یہاں سے جا سکتی تھی، جب کہ وہ لوگ نہیں جا سکتے تھے۔ میرے لیے یہ سب کچھ اس لیے بھی آسان تھا کہ میری تمام توجہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں پر اور بیکٹ کے کھیل پر مرکوز تھی۔

۵

پیش کش شروع ہونے سے تقریباً ایک ہفتے پہلے تک میرا یہی خیال تھا کہ ڈراما بہت اچھا نہیں ہو سکے گا۔ میں نے دو سطحوں والے اسٹیج اور پانچ کردار ادا کرنے والے نوادا کاروں کی مدد سے جو ترتیب پیدا کرنے کی کوشش کی تھی، مجھے ڈر تھا کہ یہ لوگ اس کی کوریو گرافی اور جذباتی تانے بانے پر اتنے کم وقت میں حاوی نہیں ہو سکیں گے۔ اور پھر مجھے یہ بھی خیال تھا کہ میں نے اداکاروں سے اپنے مطالبوں میں اتنی سختی نہیں دکھائی جتنی دکھانی چاہیے تھی۔ پاشووچ نے، اور میرے دو مددگاروں نے بھی، مجھ سے کہا کہ میں بہت دوست داری سے، بڑی "مادرانہ" شفقت سے کام لے رہی ہوں، اور یہ کہ اب مجھے ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دینی چاہیے اور خاص طور پر یہ کہہ دینا چاہیے کہ جن اداکاروں کو مکالمے اب تک یاد نہیں ہوئے ہیں اُنھیں ڈرامے سے نکال دیا جائے گا۔ لیکن میں اپنے طریقے پر جمی رہی اور امید کرتی رہی کہ پیش کش زیادہ بُری نہیں ہو گی۔ تب اچانک، ریہرسل کے آخری ہفتے میں، ان سب نے ایک انوکھا موڑ لیا، سب چیزیں بالکل درست ہوتی چلی گئیں اور ڈریس ریہرسل کے دن مجھے محسوس ہوا کہ ہماری پیش کش خاصی موثر اور عمدہ ہے، دلچسپی

Scanned with CamScanner

آخر تک برقرار رہتی ہے اور ہماری کوشش بیکٹ کی تصنیف کے شایانِ شان ہے۔

مجھے عالمی پریس کی اس توجہ پر بھی حیرت تھی جو "گودو کا انتظار" کی اس پیش کش کو حاصل ہو رہی تھی۔ میں نے بہت کم لوگوں کو اطلاع دی تھی کہ میں یہ کھیل پیش کرنے سرائیوو جا رہی ہوں؛ شاید میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ واپس آ کر میں اس کے بارے میں کچھ لکھوں گی۔ یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی کہ میں جس جگہ جا رہی ہوں وہ آج کل اخبار نویسوں کی ڈارمیٹری بنی ہوئی ہے۔ سرائیوو پہنچنے کے اگلے ہی دن مجھے ہالیڈے اِن کی لابی اور ڈائننگ روم میں انٹرویو کی کوئی درجن بھر درخواستیں ملیں، اور ایسا اگلے دن، اور اُس سے اگلے دن بھی ہوا۔ میں نے کہا کہ میرے پاس بتانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے، کہ میں ابھی اداکاروں کا آڈیشن لے رہی ہوں؛ پھر یہ کہا کہ ابھی اداکار میز کے گرد بیٹھ کر کھیل کے مکالمے بلند آواز سے دُہرانے میں مشغول ہیں؛ پھر یہ کہ ہم نے اسٹیج پر ریہرسل شروع کی ہے، اور یہ کہ روشنی کا انتظام نہیں ہے اس لیے کچھ بھی دیکھا نہیں جا سکتا۔

لیکن ایک ہفتے بعد جب میں نے اخبار نویسوں کی درخواستوں کا پاشووچ سے تذکرہ کیا، اور اداکاروں کو اس خلل اندازی سے محفوظ رکھنے کی خواہش ظاہر کی، تو مجھے پتا چلا کہ اس نے میری ایک پریس کانفرنس کا بندوبست کیا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میں صحافیوں کو ریہرسل میں آنے دوں، انٹرویو دوں اور نہ صرف اس کھیل کے لیے بلکہ اس پورے عمل کے لیے جس کا حصہ بن جانے کا مجھ پر اچانک انکشاف ہوا، زیادہ سے زیادہ تشہیر حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ اس عمل سے مراد تھیٹر اور فلم کا سرائیوو فیسٹول تھا، جس کا اہتمام پاشووچ نے کیا تھا، اور اس کے Alcestis کے بعد فیسٹول کی اگلی پیش کش یہی "گودو کا انتظار" تھی۔ جب میں نے اداکاروں سے آنے والی خلل اندازیوں کے لیے معذرت طلب کی تو مجھے پتا چلا کہ وہ خود بھی اخبار نویسوں کی موجودگی کے خواہش مند ہیں۔ شہر میں میرے تمام دوستوں نے مجھ سے یہی بات کہی کہ ڈرامے کی خبریں "سرائیوو کے لیے اچھی" ہوں گی۔

ٹیلی وژن، ریڈیو اور اخباری صحافت اس جنگ کا ایک بے حد اہم حصہ ہیں۔ جب میں نے اپریل میں فرانسیسی دانش ور آندرے گلوکسمان (Andre Glucksmann) کے چوبیس گھنٹے کے دورۂ سرائیوو میں اس کی تقریر سنی تھی، جس میں اس نے پریس کانفرنس میں آئے ہوئے شہریوں سے کہا تھا کہ "جنگ اب ایک میڈیا ایونٹ (media event) ہے" اور یہ کہ "جنگوں میں شکست و فتح ٹی وی کے اسکرین پر ہوتی ہے"، تو اپنے آپ سے یہ تبصرہ کیا تھا: یہ بات ذرا اُن

Scanned with CamScanner

سے کہہ کر دیکھو جو اس جنگ میں اپنے بازو اور ٹانگیں کھو بیٹھے ہیں! لیکن گلوکسمان کی یہ ناشائستہ بات ایک اعتبار سے بالکل درست تھی۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ آج جنگ کی نوعیت بدل گئی ہے یا وہ محض، یا بنیادی طور پر، ایک میڈیا ایونٹ میں تبدیل ہو چکی ہے، لیکن ذرائع ابلاغ کی کوریج توجہ دلانے کا ایک بنیادی حربہ ہے، اور ذرائع ابلاغ کی یہی توجہ کبھی کبھی اصل خبر کی جگہ بھی لے لیتی ہے۔

مثال کے طور پر، جب میں سرائیوو میں تھی تو بالیڈے ان میں صحافیوں میں میرے بہترین دوست، بی بی سی کے ممتاز خبر نگار ایلن لٹل نے شہر کے ایک اسپتال کا دورہ کیا۔ اسے ایک پانچ سالہ بے ہوش بچی دکھائی گئی جس کا سر زخمی تھا اور توپ کے اسی گولے سے اس کی ماں ہلاک ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اگر اسے سرائیوو سے نکال کر کسی ایسے اسپتال میں نہ پہنچایا جا سکا جہاں دماغ کی اسکیننگ اور سر کی چوٹ کے علاج کی ترقی یافتہ سہولتیں موجود ہوں تو وہ ایک دو دن میں مر جائے گی۔ بچی کی حالتِ زار سے متاثر ہو کر ایلن نے اپنے مراسلوں میں اس کا تذکرہ شروع کر دیا۔ کئی روز تک کچھ نہ ہوا۔ پھر دوسرے صحافیوں نے اس معاملے کو اٹھا لیا اور "ننھی ارما" کی کہانی کو برطانوی ٹیبلوئڈ اخباروں میں صفحۂ اول کی اسٹوری اور ٹی وی پر بوسنیا کے بارے میں واحد خبر کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ وزیرِ اعظم جان میجر نے، جو کچھ کرتا ہوا دکھائی دینے کے لیے بے چین تھا، بچی کو لندن لے جانے کے لیے ہوائی جہاز بھیجا۔

پھر اس معاملے کا ردِ عمل سامنے آیا۔ ایلن نے، جو شروع میں اس بات سے بے خبر تھا کہ اس اسٹوری کو اتنی شہرت حاصل ہو چکی ہے، اس بات پر مسرّت کا اظہار کیا کیوں کہ اسے خیال ہوا کہ اس دباؤ کے ذریعے بچی کو باہر نکالا جا سکے گا، لیکن جلد ہی اسے "ذرائع ابلاغ کے سرکس" پر کیے جانے والے ان حملوں کا سامنا کرنا پڑا کہ انھوں نے ایک ننھی بچی کی تکلیف کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا ہے۔ نقادوں کا کہنا تھا کہ صرف ایک بچی پر پوری توجہ مرکوز کر دینا اخلاقی طور پر فحش ہے جب کہ ہزاروں دوسرے بچے اور بالغ لوگ، سرائیوو کے عملے اور سہولتوں سے محروم اسپتالوں میں، اپنے ہاتھ پیر کٹوائے، اپاہج اور مفلوج پڑے ہیں اور انھیں اقوامِ متحدہ کی عنایت سے (یہ ایک اور کہانی ہے) شہر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دی جا رہی۔ یہ بات بالکل عیاں ہونی چاہیے تھی کہ کسی ایک بچی کی جان بچانا بھی بجائے خود اچھی بات ہے اور کچھ نہ کرنے سے بہرحال بہتر ہے، لیکن جس خبر کو سرائیوو کے اسپتالوں کی حالتِ زار کے سامنے آنے کا ذریعہ ہونا چاہیے تھا وہ مسخ ہو کر پریس کی کارکردگی کے بارے میں ایک ناگوار بحث میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔

Scanned with CamScanner

موجودہ صدی کے یوروپ میں جو تین قتلِ عام پیش آئے ہیں، اُن میں یہ پہلا قتلِ عام ہے جس کی خبریں ہر روز اخباروں میں، اور ہر رات ٹیلی وژن پر، باقاعدگی سے آتی رہی ہیں۔ 1915 کے آرمینیا میں اخبار نویس موجود نہیں تھے جو ہر شام دنیا بھر کے اخباروں کو رپورٹیں بھیج سکتے، اور داخاؤ (Dachau) اور آؤشوِتز (Auschwitz) کے کنسنٹریشن کیمپوں میں کسی غیر ملکی ٹیلی وژن کا عملہ داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ بوسنیا کے قتلِ عام کے پیش آنے تک آدمی یہ خیال کر سکتا تھا (یہاں موجود بہت سے بہترین رپورٹروں، مثلاً "نیوزڈے" کے رائے گٹمان اور "نیویارک ٹائمز" کے جان برنز، کا یہی خیال تھا) کہ اگر دنیا کو خبر مل گئی تو وہ ضرور کچھ نہ کچھ کرے گی۔ بوسنیا کے قتلِ عام کی کوریج نے اس خوش فہمی کو رفع کر دیا ہے۔

اخبار اور ریڈیو کی رپورٹنگ، اور سب سے بڑھ کر ٹیلی وژن کی کوریج، نے بوسنیا کی جنگ کو غیر معمولی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے لیکن اگر دنیا کے وہ چند افراد جن کے ہاتھ میں ہر سیاسی اور فوجی فیصلے کا اختیار ہے، مداخلت پر آمادہ نہ ہوں تو یہ تمام خبریں جنگ کو کسی دور دراز مقام پر پیش آنے والے سانحے میں، اور قتل اور اذیت رسانی کا شکار بننے والے لوگوں کو اس سانحے کے "متاثرین" میں منقلب کر دیتی ہیں۔ لوگوں کی تکلیف صاف دکھائی دیتی ہے، بلکہ کلوزاَپ میں دیکھی جا سکتی ہے، اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ بہت سے لوگ ان ستم رسیدوں سے ہمدردی بھی محسوس کرتے ہیں۔ جس چیز کو ٹی وی پر یا تصویروں میں دکھایا نہیں جا سکتا وہ دراصل ایک عدم موجودگی ہے۔۔ اس تکلیف کا خاتمہ کرنے کے سیاسی عزم کی عدم موجودگی۔ زیادہ صاف الفاظ میں، بوسنیا میں، جو یوروپ کی ذمے داری ہے، دخل دینے سے انکار کا فیصلہ جس کا سبب فرانسیسی اور برطانوی محکمۂ خارجہ کا روایتی سرب نواز رویّہ ہے۔ اس فیصلے پر عمل درآمد کا ذریعہ شہر پر اقوامِ متحدہ کی فوج کا قبضہ ہے جس میں زیادہ تر فرانسیسی سپاہی شامل ہیں۔

میں ٹیلی وژن کے نقادوں کی جانب سے پیش کیے جانے والے اس استدلال کی قائل نہیں ہوں کہ چھوٹے اسکرین پر ہولناک واقعات کو رونما ہوتے ہوئے دیکھنا ان واقعات کو حقیقی تو بنا دیتا ہے لیکن اتنا ہی دیکھنے والے سے دور بھی کر دیتا ہے۔ ہم لوگوں کو محض تماشائیوں میں بدل دینے کی ذمے داری اس بات پر ہے کہ جنگ کے مناظر مسلسل دکھائے جا رہے ہیں اور اسے روکنے کے لیے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا جا رہا۔ ہمارے ٹیلی وژن نے نہیں بلکہ ہمارے سیاست دانوں نے تاریخ کو نشرِ مکرر میں تبدیل کر دیا ہے۔ ہم یہ مناظر بار بار دیکھ کر تنگ آ گئے ہیں۔ اگر یہ سب کچھ غیر حقیقی نظر آتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بیک وقت بیبت ناک اور بظاہر ناگزیر محسوس ہونے لگا ہے۔

Scanned with CamScanner

خود سرائیوو کے باشندے بھی کبھی کبھی کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ انہیں غیر حقیقی محسوس ہوتا ہے۔ وہ شدید صدمے کی حالت میں ہیں جو کسی طرح زائل ہونے میں نہیں آتا، جو ایک طرح کی خطیبانہ بے یقینی کی شکل اختیار کر لیتا ہے ("یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ سب واقعی ہو رہا ہے۔") وہ لوگ سربوں کے دہشت ناک مظالم پر، اور اس زندگی کے ٹھوس پن اور سخت نامانوسیت پر، جسے وہ آج کل گزارنے پر مجبور کر دیے گئے ہیں، سچ مچ حیرت کے عالم میں ہیں۔ "ہم ازمنۂ وسطیٰ میں رہ رہے ہیں،" کسی نے مجھ سے کہا۔ "یہ سائنس فکشن ہے،" ایک اور دوست کا کہنا تھا۔

لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آیا مجھے اپنے قیام کے دوران سرائیوو کبھی غیر حقیقی محسوس ہوا تھا۔ سچ یہ ہے کہ جب سے میں نے وہاں جانا شروع کیا ہے (آنے والے موسم سرما میں مَیں وہاں چیخوف کا کھیل "چیری کا باغ" پیش کروں گی جس میں نادا "مادام رینیوسکی" کا اور ویلیبور "لوپاخن" کا کردار ادا کرے گا) یہ مجھے دنیا کا سب سے زیادہ حقیقی شہر معلوم ہونے لگا ہے۔

اسٹیج پر رکھی بارہ موم بتیوں کے ساتھ "گودو کا انتظار" کی پیش کش کا افتتاح ۱۷ اگست ۱۹۹۳ کو ہوا۔ اس روز کھیل دو بار پیش کیا گیا ایک بار دوپہر دو بجے اور دوسری بار چار بجے۔ سرائیوو میں اب صرف میٹنی شو کی گنجائش ہے: اندھیرا ہونے کے بعد کوئی گھر سے نہیں نکلتا۔ بہت سے لوگوں کو مایوس لوٹنا پڑا۔ پہلی چند پیش کشوں میں مجھ پر جوش کا تناؤ طاری تھا۔ مگر پھر، غالباً تیسری پیش کش کے دوران، ایک لمحہ آیا جب میرے اعصاب پُرسکون ہونے لگے۔ پہلی بار میں اس کھیل کو تماشائی کی حیثیت سے دیکھنے لگی۔ اب آخر کار اس فکر سے آزاد ہوا جا سکتا تھا کہ اینیز اپنے کاغذی چکن کو بھنبھوڑتے ہوئے کہیں اُس رسی کو ڈھیلا نہ چھوڑ دے جس نے اس کے غلام آنگو کو اس کے ساتھ باندھ رکھا ہے، اور کہیں سیجو (ولادیمیر نمبر ۳) پیشاب کرنے کے لیے دوڑ جانے سے پہلے جسم کا زور کئی بار ایک ٹانگ سے دوسری ٹانگ پر ڈالنا نہ بھول جائے۔ کھیل اب اداکاروں کے ہاتھوں میں تھا، اور میں جانتی تھی کہ یہ ہاتھ اپنے کام میں مہارت رکھتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ بدھ ۱۸ اگست کو دو بجے والی اس پیش کش کے اختتام پر ۔۔ ہرکارے کی سنائی ہوئی اس خبر کے بعد کہ مسٹر گودو آج بھی نہیں آ سکیں گے البتہ کل ضرور آئیں گے، ولادیمیروں اور استراگونوں کی طویل المناک خاموشی کے دوران ۔۔ مجھے اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کی چبھن محسوس ہونے لگی۔ ویلیبور بھی رو رہا تھا۔ ناظرین پر گہری خاموشی طاری تھی۔ آواز صرف تھیٹر کے باہر سے آ رہی تھی جہاں اقوامِ متحدہ کی ایک بکتر بند گاڑی سڑک پر دندنا رہی تھی اور سرب اسنائپر گولیاں چلا رہے تھے۔

**

Scanned with CamScanner

ربائی

ندیدی

اور

انسان کا دیش

کے بعد

حسن منظر

کی کہانیوں کا نیا مجموعہ

جلد شائع ہو رہا ہے

Scanned with CamScanner

٦

نجاد ابریشیمویچ : دوبرینیا

نجاد ابریشیمووچ (Nedzad Ibrisimovic) ایک بوسنیائی ادیب ہیں اور سرائیوو ہی میں مقیم ہیں۔

Scanned with CamScanner

نجاد ابریشیموِچ

ترجمہ: اسد محمد خاں

دوبرینیا

دوبرینیا کے محاصرے کا چودھواں دن:

آدم قہرمان ایک کتاب لکھ رہا ہے۔ آدم پانچویں فلور پر رہتا ہے، میں چوتھے پر۔ ہم دونوں کی کھڑکیوں سے سرائیوو ایرپورٹ اور اس سے پرے اگمان پہاڑیوں کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ پہاڑیاں دن رات، مسلسل رنگ بدلتی ہیں اور ہر وقت حسین نظر آتی ہیں۔ کوہ تریسکاوِچا کی برف پوش چوٹیاں کبھی کہر کی اوٹ سے دکھائی دے جاتی ہیں۔ آدم کو برف بھلی لگتی ہے۔ وہ باون سال کا ہے۔ وہ ایک کتاب لکھنا چاہتا ہے جو ماضی میں ہو چکے جرائم کو سرزد ہونے سے روک دے گی۔

آدم قہرمان کس قسم کا آدمی ہے؟

وہ سرائیوو میں پیدا ہوا تھا۔ مگر یہ ذرا اُلجھن میں ڈالنے والی بات ہے۔ کوئی سرائیوو میں کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ وہ گوری رنگت والوں میں سے نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی درست نہیں۔ شاید یوں بیان کیا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا: کھچڑی ہوتے بال، چہرے پر نہ ڈاڑھی نہ مونچھ، موزوں ناک نقشہ، شناختی نشان کوئی نہیں۔

افلاطون کہتا ہے کہ آدمی دو ٹانگوں والی بے پروں کی ایک مخلوق ہے۔ اس تعریف کا اطلاق، بڑی ایمان داری سے، آدم قہرمان پر کیا جا سکتا ہے۔ آدم کا اپنا وجود اُس کے اوپری آدھے دھڑ میں اکٹھا ہو گیا ہے: اُس کے دل میں، اور اس کے دماغ میں۔ وہ ایک روح کا مالک ہے، حساس اور ایمان دار ہے، وہ اُن میں سے ہے جو وقوعے سے قبل محسوس کر لیتے ہیں کہ کچھ ہونے والا ہے۔ اُس میں یہ صلاحیت ہے کہ منھ کھولنے سے پہلے آدمی کو سمجھ لیتا ہے۔ جب آدم اکیلا ہوتا ہے تو لوگوں کے خیال ہی سے ہیبت زدہ ہو جاتا ہے۔ تمام جانور آدم کے لیے ناقابلِ فہم ہیں مگر اُنہیں

Scanned with CamScanner

دیکھنا اُسے اچھا لگتا ہے۔

شاید یہ سمجھانا آسان ہے کہ آدم قہرمان کس قسم کا ادیب ہے: وہ اچھا ہے، بہت اچھا ہے، مگر غیر معروف ہے۔

یہ آدم کی کتاب کا پہلا جملہ ہے:

> "۱۹۴۲ میں چیتنکوں نے فوچا (Foca) کے حاجی طاہرووچ کی پیٹھ کی کھال کھینچ لی۔ یہ کھال اوڑھنی کی طرح حاجی کے سر پر اُلٹ کر انھوں نے پن کی مدد سے ایک پرچا لگا دیا جس پر لکھا تھا: دیکھو، یہ نقاب گرائے ہوئے مسلمان عورت ہے!"

تو آدم قہرمان حاجی طاہرووِچ کی کھال کھینچنے سے چیتنکوں کو کیسے روکے گا جب کہ وہ لوگ یہ کر ہی چکے؟

آدم نے اِس سال اپریل میں اپنی کتاب شروع کی۔ ایسا ہوا کہ اِس مہینے میں ایک شخص نے، جو پروفیسر ہے اور خود بھی کتابیں لکھتا ہے، تباچی گاؤں میں ایک بُریدہ انسانی کھوپڑی کو کِک ماری۔ اتفاق سے یہ گاؤں تباچی اُنھیں پہاڑیوں میں بسا ہوا ہے جو فوچا شہر کو گھیرے ہوئے ہیں۔

پروفیسر کھوپڑی کو اکیلا کِک نہیں مار رہا تھا۔ بوسنیائی حکومت کا کوئی وزیر بھی موجود تھا، وہ جو بھی ہو، اُس کی طرف کھوپڑی کو کِک ماری گئی تھی۔ یعنی اُس کی شکل میں کوئی ایسا تھا جو کِک مار کر کھوپڑی کو لوٹا بھی سکے۔ میں یہ فرض کر لیتا ہوں کہ بعد میں انھوں نے اپنے جوتے دھو لیے ہوں گے۔ کیا معلوم انھوں نے اپنی پتلونوں کے پائنچے بھی پلٹے تھے یا نہیں پلٹے تھے۔

یہ انسانی سر جسے بوسنیائی وزیر نے کِک مار کر پروفیسر کی طرف اور پروفیسر نے کِک مار کر واپس وزیر کی طرف پھینکا، کبھی گاؤں کے ایک کسان کے شانوں پر ہوتا تھا۔ کسان کے پاس بھیڑوں کا ایک گلہ تھا: اصل میں انھیں اعلیٰ قسم کی بھیڑوں کی وجہ سے وہ علاقے میں اتنا مشہور تھا۔ مگر فوراً ہی اُس کا سر نہیں اُتار لیا گیا: پہلے اُس سے بھیڑ کے دس بچے طلب کیے گئے تھے، پھر برانڈی ۔۔ بہت سی برانڈی ۔۔ اور پھر تیس بھیڑیں۔ وہ سب کسان کی میز کے گرد لکڑی کی بنچوں پر بیٹھ گئے: وزیر، پروفیسر، اور سات چیتنک۔ کسان نے بھیڑیں حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے اُس سے رقم مانگی۔ اُس نے پھر انکار کر دیا۔ اس لیے تین چیتنک اُسے اُس کے گھر کے پیچھے

جنگل میں لے گئے اور وہاں اُنھوں نے اُسے مار دیا۔

شاید وجہ اَور ہی تھی: وہ کسان سرب نہیں تھا۔ دریاے درینا، جس کے قریب وہ کسان رہتا تھا، صرف سربوں کے لیے ہے۔ جو لوگ بلغراد میں کتابیں لکھتے ہیں، کم از کم وہ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔

***

دوبرینیا کے محاصرے کا پندرھواں دن:

آدم قہرمان سے میں نے پوچھا: "جو جُرم سرزد ہو چکے، اُنھیں کیسے روکنے کا ارادہ ہے؟"

کہنے لگا: "کتاب لکھ کے، اور وہ میں نے شروع کر دی ہے۔"

"مگر یہ کیسے ممکن ہے!"

"تم نے میری کتاب کا پہلا جملہ پڑھا ہے؟"

"ہاں پڑھا ہے۔"

"کیا پہلا جملہ پڑھنے سے پہلے تمھیں خبر تھی کہ فوچا کے حاجی طاہر ووِچ پر کیا آفت آئی ہے؟"

"نہیں۔"

"اب تمھیں اُس کا حشر معلوم ہو چکا ہے؟"

"ہاں۔"

"یہ بتاؤ، تم اُسے دیکھ سکتے ہو؟ حاجی کو؟"

"ہاں، دیکھ سکتا ہوں۔"

"کیا تم اُسے مَرا ہوا دیکھ رہے ہو؟"

"نہیں۔ میں اُسے اس بھیانک حالت میں زندہ دیکھ رہا ہوں۔"

"تو بس، اَب یہی کَرنا باقی رہتا ہے کہ میں اُنھیں حاجی کی کھال کھینچنے سے روک دوں۔"

"مگر کیسے؟"

آدم قہرمان بولا: "ناممکن تو لگتا ہے، مگر کم سے کم میں کوشش کروں گا۔"

اُسی روز روگاتیچا کے اوپر والے گاؤوں میں سے ایک میں چیتنک داخل ہوے۔ انھوں نے تمام مَردوں کو اکٹھا کیا۔ پھر اُنھیں آگ لگا کر ختم کر دیا۔

Scanned with CamScanner

حاشیے:

چیتنک: یہ فوجی کے لیے استعمال ہونے والے لفظ "چے تا" سے مشتق ہے۔ چیتنک اپنی بہت سی خاصیتوں سے پہچانے جاتے ہیں: وہ جھوٹ بولتے ہیں، وہ سرب ہیں، وہ بوسنیا والوں کا قتلِ عام کرتے ہیں، وہ قتلِ عام کے ذریعے -- یا زیادہ صحت کے ساتھ کہا جائے تو ذبح اور ہلاک کر کے، آبروریزی کر کے، آگ لگا کے اور لوٹ مار کر کے -- وہ ملک بوسنیا کو تسخیر کرنا چاہتے ہیں۔ چیتنک سرب کاز کے محافظ ہیں، اور سرب کاز ہے ہر چیز کا سرب ہونا: سرب مرد، سرب عورتیں، سرب چڑیاں، مچھلیاں، پودے، حتیٰ کہ سرب کوے بھی۔ یہ دیکھیے ڈاکٹر سوِستی سلاف زیچ نے اپنی کتاب "سربیائی عالمِ طبیعی" (مطبوعہ زموم ۱۹۳۸) میں تشویش ظاہر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"پچھلے تیس برسوں کے دوران یہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ سربیائی کوے کی پرواز میں اور زیادہ آلکس اور سستی آتی جا رہی ہے، اور اگر یہ رجحان جاری رہا تو سرب کوا سو سال کے عرصے میں پرواز کرنا چھوڑ دے گا۔"

کوئی عام سا کوا نہیں، سربیائی کوا -- تشویش کی بات ہے!

سرائیوو: بوسنیا کا دارالحکومت۔ (اگر گاہکوں اداکاروں کا ذکر خاص طور پر نہ کیا جائے تو) مسجدوں، گرجا گھروں اور کیتھیڈرلز کا شہر۔ شہر کو پہاڑیوں نے گھیر رکھا ہے۔ دریائے ملیاکا، اُتھلا سا دریا، شہر کے درمیان سے گزرتا ہے جس کے کناروں پر اونچی سفید دیواریں کھڑی ہیں۔ اس کے بہاو پر بیچ بیچ میں آبشار بنے ہیں، پُل کھنچے ہوئے ہیں۔ ہر پُل محلسرا کے دروازے جتنا خوب صورت ہے۔ لفظ "سرائیوو" تُرکی لفظ "سرائے" سے بنا ہے جس کے معنی محل کے ہیں۔ پہلی بار سن ۱۵۰۷ میں یہ لفظ سامنے آیا تھا۔

سن ۱۶۹۷ میں یوجن سیوائیکی نے سرائیوو کو لوٹا اور اسے آگ دکھا دی۔ اگلے تین سو برسوں میں سرائیوو کو پانچ مرتبہ اور جلایا گیا۔ شہر اَب تریبےوِچ پہاڑی کے عقب سے دوبرینیا تک پھیلا ہوا ہے جہاں آدم قہرمان اور میں رہتا ہوں۔

Scanned with CamScanner

بوسنیا: اچھا ملک۔

بوسنیا اور ہرزگووینا: ایک ہی بات ہے، سوائے اس کے کہ ہرزگووینا کی پہاڑیاں ننگی ہیں۔

درینا: خوب صورت، ٹھنڈا دریا جو ملک بوسنیا کو ملک سربیا سے ملاتا اور علیحدہ کرتا ہے۔ اس دریا کے کناروں پر باغات ہیں جو میرے تصوّرِ جنّت کی تشریح ہو سکتے ہیں۔ بلندی پر اونچی مہربان پہاڑیاں ہیں؛ شانت ہوائیں ان پہاڑیوں سے اُترتی رہتی ہیں۔

***

دوبرینیا کے محاصرے کا سولھواں دن:

"کیا حاجی طاہر ووِچ اَب بھی تکلیف میں ہے؟" میں پوچھتا ہوں۔ مجھے فکر ہے۔

"ہاں، وہ تکلیف میں ہے،" قہرمان کہتا ہے۔ "لو، یہ پڑھو۔"

"مارچ ۱۹۴۲ کی آخری جمعرات کو علی الصباح چیتنک ایک گاؤں وَرسینیے میں داخل ہوئے جو ٹیلیچی کے مقام سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اُنھیں جو ملتا گیا اکٹھا کرتے گئے۔ پھر سب کو ایک مسجد میں دھکا دے کر اُنھوں نے اُسے آگ لگا دی۔ ورسینیے میں اُس صبح ایک سو تراسی جیتے جاگتے آدمی مار دیے گئے، زندہ جلا دیے گئے۔ ان ایک سو تراسی شہیدوں میں ایک مقامی معلّم حسین آفندی تالووِچ بھی تھا، اور اس کے کنبے کے افراد بھی: بیوی، چار لڑکے، بیٹی۔"

میں آدم سے کہتا ہوں: "اگر تم اسے روک نہیں سکتے تو مجھے یہ اَور مت دکھاؤ۔" سارا منصوبہ ہی یہ تھا کہ آدم ماضی میں ہو چکے جرائم کو سرزد ہونے سے روک دے گا۔

"بارش!" آدم نے سکون سے کہا۔ "دھواں دھار بارش آگ کو بجھا دے گی۔ سمجھو بچا لیے گئے وہ لوگ۔"

"ہاں، مگر صرف تمھاری کتاب میں!"

آدم کہتا ہے: "چلو یوں ہی سہی۔"

***

Scanned with CamScanner

اچانک آدم مجھے آستین سے پکڑ کر کھینچتا ہے اور فرش پر جھکا دیتا ہے؛ وہ خود بھی دبک کر بیٹھ گیا ہے۔ ہم باہر گولیاں چلنے کی آواز سنتے ہیں۔ شیلنگ دوبارہ شروع ہو گئی ہے۔ گوکاد بچا بیر کس سے دوبرینیا پر شیلنگ کا سولھواں دن ہے۔ ہم کرال کرتے ہوئے برآمدے میں نکل آتے ہیں۔ کوئی وجہ ضرور ہے جو ہم برآمدے میں خود کو محفوظ سمجھتے ہیں۔

آدم ابھی تک سرگوشیوں میں بات کر رہا ہے۔ کہنے لگا: "تم نے نوٹ کیا ہو گا، شیلنگ کے ابتدائی دنوں میں چڑیوں کی آوازیں بالکل سنائی نہیں دیتی تھیں۔ انھوں نے گانا بند کر دیا تھا۔ پہلا ہفتہ گزرنے کے بعد وہ دوبارہ آ گئیں اور فائرنگ کے وقفوں میں اُنھیں گاتے ہوئے سنا جا سکتا تھا۔ اور اب، فائرنگ جاری ہو یا بند ہو، اُن کے گانے کی آواز آتی رہتی ہے۔"

حاشیے:

ورسینیے: چند گھروں، ایک اسکول، کچھ چیریوں کا گاؤں۔ گردوپیش کی پہاڑیاں بالکل خطِ عرب جیسی ہیں مگر ان پر گھاس اگی ہوئی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ورسینیے کی پہاڑیاں سرما میں سفید ہو جاتی ہیں، خطِ عرب کی پہاڑیاں سفید نہیں ہوتیں۔ سرما میں بھی عرب میں برف باری نہیں ہوتی۔

مسجد: منارے اور دوسری بہت سی چیزوں کے بغیر ایک مسلم عبادت گاہ۔ اُن بہت سی چیزوں کا ذکر میں یہاں نہیں کروں گا، ورنہ مجھے اُن کی بھی وضاحت کرنی پڑے گی۔ مسجد وہ جگہ ہے جہاں چیتنکوں نے ۱۸۳ لوگوں کو زندہ جلا دیا۔ اگرچہ یہ تمام مرد، عورتیں اور بچے چیتنکوں نے نذرِ آتش کیے تھے، کمیونسٹوں نے نہیں، تاہم کمیونسٹوں نے پچاس برس تک ورسینیے کے لوگوں کو یہ مسجد دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دی۔

معلم: دینی مدرّس۔

پارٹیزن: مارشل ٹیٹو کے لڑاکے۔

حاشیے پر حاشیہ:

یوسپ بروز ٹیٹو: وہ پارٹیزن فوجیوں کا سپریم کمانڈر تھا جنھوں نے ۱۹۴۵ میں چیتنکوں اور اُستاشوں کو مار لگائی تھی۔ ۱۹۸۰ میں اُس کی موت کے بعد ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور سرب چیتنکوں نے اُس کی فوج

Scanned with CamScanner

کے سب ہتھیاروں پر قبضہ کر لیا۔ دوسری عالمی جنگ کے آغاز میں ٹیٹو نے فاشسٹوں کے خلاف لڑائی میں چیتنکوں کو دو مرتبہ پارٹیزن فوجیوں کا ساتھ دینے کو کہا تھا جس پر وہ کہتے رہے کہ ہاں ہم ساتھ دیں گے، مگر وہ جھوٹ بولتے تھے۔

***

موسم بہار کی ایک دل آویز اور حسین صبح میں کریپولائسکو پہاڑی کی ڈھلان پر پارٹیز فوجیوں کا ایک جتھا کھڑا تھا۔ اس جتھے میں کچھ سرب تھے، ایک مسلمان تھا جس کا نام مصطفیٰ دُواڑیا تھا۔

سرب پارٹیزنوں نے بڑی محبت سے کہا: "ڈیر کامریڈ! آؤ چلیں۔"
مصطفیٰ اُن کے ساتھ چلا گیا۔ اُسے کسی شیطنت کا شبہ بھی نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد یہ پارٹیزن اچانک چیتنک بن گئے اور مصطفیٰ دُواڑیا کو انھوں نے ایک مضبوط لکڑی میں زندہ پرو دیا۔ یہ واقعہ ۱۹۴۲ میں مئی کی دوسری تاریخ کو ہوا۔

ہمارا نوبیل انعام یافتہ ادیب آئیو آندرچ اسے اس طرح بیان کرتا ہے:

"زمین پر شاہ بلوط کی لکڑی کا ایک کھمبا پڑا تھا، ڈھائی میٹر لمبا۔ اُس میں لوہے کی دھاردار شام لگی ہوئی تھی۔ انھوں نے جب مصطفیٰ کو زمین پر لیٹنے کا حکم دیا تو اُس نے سر جھکا دیا۔ چیتنک اُس کے پاس گئے۔ اُنھوں نے مصطفیٰ کا کوٹ اور قمیص اُتار پھینکی۔ جیسا کہ کہا گیا تھا، پارٹیزن مصطفیٰ خاموشی سے زمین کی طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔ انھوں نے اُس کی دونوں ٹانگوں سے ایک ایک رسا باندھا، پھر دو چیتنکوں نے یہ رسے کھینچ کر اُس کی ٹانگیں جتنی چوڑی کھل سکتی تھیں کھول دیں۔ اسی عرصے میں دوسرے چیتنک یووان نے شاہ بلوط کے کھمبے کو لکڑی کے دو ٹھوں پر اس طرح ٹکا کر رکھ دیا تھا کہ اُس کی نوک اب مصطفیٰ کی ٹانگوں کے بیچوں بیچ تھی۔ یووان نے اپنی بیلٹ سے ایک مختصر، چوڑا سا خنجر کھینچ لیا اور اوندھے پڑے ہوئے آدمی پر جھک کر اُس کی ٹانگوں کے بیچ پتلون کی میانی کا کپڑا کاٹتے ہوئے وہ جگہ چوڑی کر دی جہاں سے کھمبے کو بدن میں

Scanned with CamScanner

داخل ہونا تھا۔ خنجر کے اس چھوٹے سے وار سے بندھے ہوئے آدمی کا جسم ایک بار لرزا۔ اُس نے اپنا اوپری بدن ایسے اُٹھایا جیسے کھڑا ہونا چاہتا ہو، پھر فوراً ہی اسے زمین پر گرا دیا۔ قصابی کا سب سے دہشت ناک عمل پورا ہو چکا تو یووان اُچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے مضبوط لکڑی کی ایک موگری اٹھائی اور کھمبے کے نچلے، کند سرے پر آہستہ آہستہ، جما جما کر ضربیں لگانی شروع کر دیں۔ وہ رک گیا۔ اُس نے جھک کر پہلے اُس بدن کو دیکھا جس میں وہ کھمبا داخل کر رہا تھا، پھر دونوں چینتگوں کی طرف دیکھا: اُنھیں یاد دلایا کہ آدمی کی ٹانگیں جھٹکے سے ایک دم نہیں چیر دینی، ہمواری سے اور آہستہ آہستہ چیرنی ہیں۔ موگری کی ہر ضرب پر اوندھے پڑے ہوئے آدمی کا بدن مٹھی کی طرح بند ہو جاتا، اُس کی ریڑھ کی ہڈی ٹیڑھی ہو جاتی، کوبڑ سا بن جاتا، مگر رسے کھینچ کر اُسے پھر سیدھا کر دیا جاتا۔ وہ زمین پر سر مارتا تو اُس کی دھمک آتی اور ساتھ ہی ایک بہت عجیب سی آواز سنائی دیتی۔ یہ کوئی چیخ، فریاد یا جاں کنی کی خرخراہٹ یا کسی بھی قسم کی انسانی آواز نہیں تھی۔ اذیت جھیلتا، کھنچا اور توڑا جاتا وہ بدن بس ایک چیں چیں سی آواز اور ٹکرانے کی دھمک پیدا کر سکتا تھا جسے سن کر لگتا تھا کہیں باڑ کے لیے لکڑی کا لٹھا چیرا جا رہا ہے۔ اب ہر ضرب کے بعد یووان اوندھے پڑے ہوئے آدمی کے پاس پہنچتا، اُس پر جھک کر اطمینان کر لیتا کہ کھمبا صحیح سمت میں جا رہا ہے یا نہیں، اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اعضائے رئیسہ میں سے کوئی زخمی نہ ہو گیا ہو، وہ اپنا کام پھر شروع کر دیتا۔ ایک لمحے کے لیے ضربیں لگانے کا کام روک دیا گیا۔ یووان نے نوٹ کیا تھا کہ دائیں شانے کے اُبھار پر بدن کے پٹھے کھنچ گئے ہیں اور بد نصیب آدمی کی کھال وہاں سے اُٹھ رہی ہے۔ وہ تیزی سے گیا اور اُس نے اپنے خنجر سے اُٹھی ہوئی جگہ پر کراس کی شکل میں دو قط لگا دیے۔ زردی مائل خون، پہلے ہلکے ہلکے، پھر اَور تیزی سے، اُبل کر بہنے لگا۔ اُس نے احتیاط اور آہستگی سے دو تین ضربیں اَور لگائیں اور کھمبے کی لوہا چڑھی نوک قط لگی جگہ سے نکل آئی۔ پھر اُس نے جسم کے کئی اَور ضربیں لگائیں، یہاں تک کہ کھمبے کی دھاردار شام آدمی کے دائیں کان کے لیول پر آ گئی۔ آدمی کو

Scanned with CamScanner

کھمبے میں ایسے پرو دیا گیا تھا جیسے باربی کیو کے لیے بَرّہ تیار کیا جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کھمبے کی شام اُس کے منھ سے نہیں، پیٹھ سے باہر آئی تھی اور یہ کہ اُس کی انتڑیاں، دل اور جگر کوئی بھی زیادہ زخمی نہ ہو پائے تھے۔ یووان نے موگری ایک طرف ڈال دی اور زمین پر پڑے ہوئے آدمی کے پاس گیا۔ کھمبے کے داخل ہونے کی جگہ سے خون ٹپکتا تھا جس کے چھوٹے چھوٹے ڈبرے بھر گئے تھے۔ ان سے جوتے کپڑے بچاتے ہوئے یووان نے بدن کا جائزہ لیا۔ ساتھ کے دو چیتنکوں نے اکڑے ہوئے بدن کو چت لٹا دیا اور کھمبے سے اُس کے ٹخنے باندھنا شروع کر دیے۔ اُس وقت یووان دیکھ کر چیک کر رہا تھا کہ آدمی کیا ابھی زندہ ہے۔ وہ اُس کا چہرہ دیکھ رہا تھا جو اچانک متورّم ہو کر اُبھر گیا تھا اور بڑا بڑا لگتا تھا۔ اُس کی آنکھیں بے چین اور پوری طرح کھُلی ہوئی تھیں لیکن پلکیں ساکت تھیں۔ ہونٹ ایک طرح کی اینٹھن میں کھنچ کر مُڑ گئے تھے جن کے عقب میں بھنچے ہوئے دانت چمکتے نظر آتے تھے۔ آدمی اپنے کچھ عُضلات کو قابو نہیں کر پا رہا تھا، یوں لگتا تھا جیسے وہ چہرہ نہیں کوئی نقاب ہے۔ اُس کے پھیپھڑے تیزی سے چھوٹے چھوٹے سانس لے رہے تھے۔ دونوں چیتنک اُسے ایسے اُٹھانے لگے جیسے گلنگ کے لیے تیار کیا گیا گوشت کا پارچہ اُٹھاتے ہوں۔ یووان اُن پر چیخ رہا تھا، خبردار کر رہا تھا کہ احتیاط سے اُٹھائیں، بدن کو ہلائیں جُلائیں نہیں، سادھ کے رکھیں۔ پھر وہ خود اُن کی مدد کو آ گیا۔ اُنھوں نے کھمبے کا نچلا، موٹا حصّہ زمین میں گاڑ دیا۔ سہارے کے لیے پیچھے ایک چھوٹی لکڑی لگا دی، اُسے کیل لگا کے کھمبے سے ٹھونک دیا۔

پھر تینوں چیتنک گئے اور جتھے کے باقی لوگوں میں شامل ہو گئے۔ خالی جگہ میں مصطفیٰ دُواڑیا، کمر تک ننگا، اپنی چھاتی نکالے ہوئے، زمین سے ایک میٹر بلندی پر، کھمبے پر، اکیلا رہ گیا۔ پُشت پر بندھے بازوؤں اور کھمبے سے بندھے ٹخنوں کے ساتھ، دور سے دیکھ کر کوئی مشکل ہی سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ کھمبا اُس کے بدن کے بیچ سے ہو کر گزرا ہے۔ اَب چیتنک اچھی طرح چیک کرتے ہوئے اذیت میں گرفتار اس آدمی کے پاس پہنچے۔ کھمبے پر سے خون کی پتلی، کم زور سی دھار بہہ رہی تھی۔ وہ زندہ تھا اور باخبر۔

سانس کے ساتھ اُس کے پہلو سکڑ اور پھیل رہے تھے۔ گردن کی نسیں دھڑک رہی تھیں۔ آنکھیں دھیرے دھیرے پھرتی جا رہی تھیں، مگر وہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ اپنے بھینچے ہوئے دانتوں سے چبا چبا کر غراہٹ جیسی آواز نکال رہا تھا جس کے صرف چند ہی لفظ سمجھ میں آتے تھے: "چیٹنکو! چیٹنکو!" وہ سسکی لے کر کہہ رہا تھا، "تمھیں کتّے کی موت نصیب ہو! کتّے کی موت!"

***

یہ ۱۱ جولائی سن ۱۹۹۲ ہے۔ دوبرینیا کے محاصرے کا سترھواں دن۔ ہم نے آسمان کا ایک حصہ دیکھا۔ ایک پہاڑی کا اگلی عمارت کا ایک حصہ دیکھا۔ دوبرینیا کے قریب ہی ہراس نیچا (Hrasnica) کی بستی میں چیٹنکوں نے کنڈرگارٹن پر شیل مار کر چار بچے ہلاک اور دس زخمی کر دیے۔

***

دوبرینیا کے محاصرے کا اٹھارواں دن:

آدم کہنے لگا: اپارٹمنٹ بلاکس پر پہلے وہ ٹینکوں، اینٹی ایر کرافٹ مشین گنوں اور توپوں سے حملہ کرتے ہیں۔ پھر وہ عمارت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جو پکڑے گئے وہ سمجھو مارے گئے۔ چیٹنک اُن کا گلا کاٹ دیتے ہیں، اپارٹمنٹ کو لُوٹتے ہیں، پھر وہ اسے آگ لگا دیتے ہیں۔ اس لیے: پکڑے مت جاؤ! اور آگے، دوبرینیا میں چلتے جاؤ۔ اپنے دوست کے پاس یا کسی پڑوسی کے پاس ٹھیر جاؤ۔ لیکن خیال رہے کہ چیٹنک تمھارے پیچھے ہیں۔ تہ خانے میں جا رہے ہو؟ یہ غلطی کر رہے ہو! اب تم آ گئے اُن کے قبضے میں۔ وہ شیل مارتے رہیں گے، تمھیں وہیں روکے رکھیں گے: نہ روشنی، نہ پانی، نہ کھانا۔ جب یہ سب کچھ تمھاری برداشت سے باہر ہو جائے گا، تم ڈینڈیلین کا ایک پتا توڑنے نکل پڑو گے، سلاد جو بنانا ہے۔ بس، کسی اوٹ سے تاک کر اسنائپر گولی چلا دے گا: تم مرتے نہیں، زخمی ہو جاتے ہو۔

دوبرینیا کا دفاع کرنے والے اسنائپرز کو پکڑتے ہیں۔ وہ اُسی کو پکڑ لیتے ہیں جس نے تم پر گولی چلائی تھی۔ پھر کیا ہوتا ہے؟ چیٹنک کہتے ہیں: لاؤ، اسنائپر کو واپس کر دو، بدلے میں ہم قریب کے ایک اسپتال تک ایک ایمبولینس لے جانے کی اجازت دے دیں گے۔ کیوں کہ دوبرینیا کے

Scanned with CamScanner

ساتھ ساتھ سرائیوو کا بقیہ شہر بھی ناکابندی میں ہے، اُس چیتنک اسنائپر کو-- اُسی کو جس نے گولی چلا کر تمھیں زخمی کیا تھا-- اُن کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اسی روز شہر کے دوسرے حصے میں، کجھوموٹیلو میں، دوسرا چیتنک اسنائپر ایک نرس کو ہلاک کر دیتا ہے۔ چناں چہ مرہم پٹی کے لیے جب تم اسپتال پہنچتے ہو تو نہ وہاں دوا ہے نہ کچھ کھانے کو ہے: ایک نرس بے چاری مری پڑی ہے۔ تمھیں دوسرے اسپتال میں، جہاں بہت بھیڑ ہے، منتقل کر دیا جاتا ہے۔ خنزیر کا روسٹ کیا ہوا گوشت کھانے، برانڈی پینے اور اپنے گیت گانے کے بعد، چیتنک آس پاس کی پہاڑیوں سے اس اسپتال پر شیلنگ شروع کر دیتے ہیں۔ بعد میں، جب وہ ایمبولینس جسے ناکابندی سے گزرنے کی اجازت دی گئی تھی، لوٹ رہی ہوتی ہے تو اُن میں سے (فرض کرو) مارشل ٹیٹو بیر کس کے چیتنک، ڈرائیور کو مار ڈالتے ہیں اور گاڑی ہتھیا لیتے ہیں۔ اسی دوران میں اُن زخموں کی وجہ سے جو اسنائپر کی گولی سے پہنچے تھے-- جسے پکڑ لیا گیا تھا مگر ایمبولینس کو گزارنے کی اجازت دینے کے بدلے میں چھوڑ دیا گیا تھا جو اَب چوری کر لی گئی ہے-- تم اسپتال میں دم توڑ دیتے ہو۔ لوگ تمھارے لیے قریب ترین پارک میں قبر کھودتے ہیں، مگر تمھارے تابوت پر، جنازہ پڑھنے والے امام پر، اور اُن بہت سے بہادر بھلے آدمیوں پر جو تمھیں دفن کرنا چاہتے ہیں، چیتنک گولیاں برساتے ہیں۔ اور جب رات ہو جاتی ہے تو پہاڑیوں پر سے شیل مار کر وہ تمھاری قبر ہی کو اُڑا دیتے ہیں۔

آپ اِس جنگ کو کیا کہیں گے؟

***

"حاجی طاہرووِچ کو ابھی تک اُس کے زخم تکلیف پہنچا رہے ہیں۔ اُس کا عذاب برداشت سے باہر ہے!" میں کہتا ہوں۔

"ہاں،" آدم رسان سے کہتا ہے، "مجھے معلوم ہے! اگرور سینیے کا معلّم، اس کے چار بیٹے، بیوی اور بیٹی، اور ان کے علاوہ جلتی ہوئی مسجد میں ۱۷۶ جانیں، ان سب کو بچا لیا گیا ہے۔"

میں کہتا ہوں: "ہاں۔"

آدم قہرمان کہتا ہے: "کل چیتنکوں نے روگاتیچا کے نزدیک ایک ہزار مکان جلا دیے۔ ایک ہزار تو بہت بڑی تعداد ہے!"

میں کہتا ہوں: "میرے ذہن کو جِلا بخشنے والے صرف پانچ الفاظ ہیں: بوسنیا اور ہرزگووینا کی فوج۔"

Scanned with CamScanner

***

دو بربنیا کے محاصرے کا انیسواں دن:

"میں نے تمہاری کتاب کا صرف شروع کا حصّہ پڑھا ہے، لیکن ابھی تک بہت سی چیزیں دیکھی نہیں جا سکتیں۔"

آدم پوچھتا ہے: "تم کیا نہیں دیکھ سکتے؟"

میں کہتا ہوں: "دو بربنیا نہیں دیکھا جا سکتا، اپارٹمنٹ بلاکس، لوگ، لان، کتّے — میں تو اُن تمام چیزوں کی تعداد بھی نہیں بتا سکتا جو نہیں دیکھی جا سکتیں۔"

آدم کہتا ہے: "یہ کتاب ہے، مُووی نہیں ہے۔" اور وہ مسکراتا ہے۔ "کتاب کتاب ہوتی ہے۔"

"مگر پڑھنے والے نے جلائی ہوئی مسجد میں وہ ۱۷۶ جانیں ابھی نہیں دیکھی ہیں۔" میں اپنی بات پر اڑ جاتا ہوں۔

آدم پوچھتا ہے: "تم میری کتاب لکھنا چاہو گے؟"

"نہیں۔ مگر جلتی ہوئی مسجد سے باہر آتے انھیں دیکھا تک نہیں جا سکتا۔ کیا تم یہ نہیں دکھا سکتے کہ وہ ۱۷۶ آدمی مسجد سے کس طرح نکل رہے ہیں؟"

آدم کہتا ہے: "وہ دھیرے دھیرے باہر آرہے ہیں۔"

"اچھا!" میں آخر کار کہتا ہوں۔ "اچھا!" کیوں کہ میں مصالحت کر لیتا ہوں۔ میرا خیال ہے اس سے میری تشفی ہو جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں: "ٹھیک ہے، جہاں تک میرا تعلق ہے میں ہر وقت یہ گواہی دے سکتا ہوں کہ میں نے ورسینیے کے معلّم، اس کے چاروں بیٹوں، بیوی اور بیٹی کو زندہ سلامت دیکھا ہے۔ یہ میں نے بہ ہر حال دیکھا ہے۔"

آدم کہتا ہے: "شکریہ۔"

***

یہ ۱۷ جولائی ۱۹۹۲ ہے۔ یہ وہی دن ہے کہ ویشے گراد کے نزدیک ووچینے (Vucine) کی بستی میں چیتنکوں نے اسّی مردوں عورتوں کو ایک مکان کے تہ خانے میں ٹھیل دیا اور زندہ جلا دیا۔ میں اِن اسّی کا ذکر آدم قہرمان سے نہیں کرتا، حالاں کہ مجھے خبر ہے کہ اُسے معلوم ہے۔

Scanned with CamScanner

جب آدم دوبرینیا کے ۱۸۳ آدمیوں کو بچا سکتا ہے تو میں اسی کو کیوں نہیں بچا سکتا؟ مگر یہ محض میرا خیال ہے۔ میں نہیں بچا سکتا! میں اُنھیں نہیں بچا سکتا، مگر نہ یوروپ ہی انھیں بچا سکتا ہے۔ یا ہو سکتا ہے اُس کی مرضی نہ ہو۔ اور نہ ہی امریکا بچا سکتا ہے۔ یا ہو سکتا ہے وہ بچانا نہیں چاہتا۔ میں نہیں بچا سکتا، مگر نہ ہی ساری دنیا اُنھیں بچا سکتی ہے۔ یا ہو سکتا ہے دنیا اُنھیں بچانا ہی نہ چاہتی ہو۔

**

اسد محمد خاں

کی کہانیوں کا مجموعہ

رُکے ہوے ساون

جلد شائع ہو رہا ہے

عرفان ہوروزووِچ : بوسنیا کا بجار

اے ایس بایٹ : اژدہے کا سانس

جولین بارنز : ہملٹ وائلڈ ویسٹ میں

کلاڈیو ماگرِیس : غلطی

بورا کوشیک : بامسون کو پڑھنا

شہرزاد ۲۰۰۱

جنوری ۱۹۹۴ میں ہالینڈ کے شہر ایمسٹرڈیم میں Artists for Sarajevo کے ایک اجلاس میں تھیٹر کے بوسنیائی ہدایت کار اور سرائیوو کے بین الاقوامی تھیٹر اور فلم فیسٹول کے منتظم حارث پاشووِچ (Haris Pasovoc) نے تجویز پیش کی کہ بوسنیائی عوام کے موقف سے ہم دردی رکھنے مختلف ملکوں کے ادیب کہانیاں لکھنے اور سنانے کے ایک سلسلے آغاز کریں اور ان کہانیوں کو سرائیوو کے ساتھ ساتھ یوروپ کے دوسرے شہروں میں پڑھ کر سنایا جائے۔ قصہ گوئی کے اس سلسلے کا نام "شہرزاد ۲۰۰۱" رکھا گیا، کیوں کہ "الف لیلہ و لیلہ" میں شہرزاد نے قصہ گوئی ہی کے ذریعے سفّاک بادشاہ کو اس کے جنون سے باز رکھا تھا اور آخر کار خود کو اور شہر کی دوسری نوجوان لڑکیوں کو دیوانگی کا شکار بننے سے بچا لیا تھا۔ اس طرح اس نے اپنے ارد گرد برپا تشدد اور موت کی حکمرانی کا خاتمہ کیا۔

"شہرزاد ۲۰۰۱" کی کہانیوں کا مقصد ایک جانب سرائیوو کے شہریوں کا ساتھ دینا تھا اور دوسری طرف یوروپ کی رائے عامہ کو تحریک دینا تھا۔ قصہ گوئی کے اس سلسلے میں بوسنیا اور سابق یوگوسلاویا کی دوسری ریاستوں کے ادیبوں کے علاوہ برطانیہ، فرانس، اٹلی، ترکی، ہالینڈ، ہنگری وغیرہ کے بعض ممتاز لکھنےوالے حصہ لے رہے ہیں۔ جولین بارنز (Julian Barnes)، اے ایس بایٹ (A S Byatt)، جون برجر (John Berger)، ندیم گُرسل (Nedim Gursel)، پیٹر ناڈاس (Peter Nadas)، جیانی چیلاتی (Giani Celati)، کلاڈیو ماگریس (Claudio Magris)، دُبراوکا اگریشِک (Dubravka Ugresic)، مارگریٹ ڈی مُور (Margriet de Moor) اور بورا کوشِک (Bora Kosik) ان ادیبوں میں شامل ہیں۔

ہر جمعے کی شام کو محصور سرائیوو اور بوسنیا کے دوسرے شہروں میں لوگ جمع ہو کر "شہرزاد ۲۰۰۱" کی کہانیاں سنتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہالینڈ، بلجیئم، جرمنی، بلغاریہ، اسپین اور روس کے پچاس سے زیادہ تھیٹروں میں معمول کا کھیل ختم ہونے کے بعد حاضرین کو ذرا دیر رک کر قصہ گوئی اس سلسلے میں حصہ لینے کی دعوت دی جاتی ہے۔ یہ کہانیاں یوروپ کے مختلف رسالوں میں شائع کی جاتی ہیں اور ریڈیو اسٹیشنوں سے براڈکاسٹ کی جاتی ہیں۔

ہر ہفتے سرائیوو سے فیکس کے ذریعے ایمسٹرڈیم کے ڈی بالی (De Balie) تھیٹر کو، جو "شہرزاد ۲۰۰۱" کا انتظامی مرکز ہے، شہر کی تازہ صورتِ حال کی اطلاع دی جاتی ہے۔ یہ متون، جنھیں "آج کی کہانیاں" (stories of the day) کا نام دیا گیا ہے، ترجمہ کر کے اس سرگرمی میں حصہ لینے والوں کو سنائے جاتے ہیں۔

۱۵ اپریل ۱۹۹۴ کو سرائیوو میں "شہرزاد ۲۰۰۱" کے منتظم میرزا حلیلووِچ (Mirza Halilovic) نے لکھا:

Scanned with CamScanner

مجھے آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ ۸ اپریل کو سرائیو، زینیچا (Zenica) اور تُزلہ (Tuzla) میں "شہرزاد ۲۰۰۱" کا کامیاب آغاز ہوا۔ یہ ایک زبردست واقعہ تھا۔ وہ ایک ایسی رات تھی جب یوروپ کے فن کار، ادیب اور سامعین کا ہمارے ساتھ ایک قریبی رشتہ قائم ہوا۔ اس عمل سے آرٹ کی زخموں کو مندمل کرنے والی قوت کا ایک بار پھر اظہار ہوا۔

("شہرزاد ۲۰۰۱" کا یہ تعارف ولندیزی ادیب ایلونکا ورڈرمان (Ilonka Verdurman) کی تحریر سے ماخوذ ہے جو ...One more night کے عنوان سے برطانوی دوماہی جریدے *Index on Censorship* کے ستمبر اکتوبر ۱۹۹۴ کے شمارے میں شائع ہوئی۔)

***

عرفان ہوروزووچ (Irfan Horozovic) ایک بوسنیائی ادیب ہیں جو آج کل زگرب، کروشیا، میں مقیم ہیں۔ ان کی کہانیوں کا تازہ ترین مجموعہ *The Refugee City* ۱۹۹۴ میں شائع ہوا ہے۔

***

اے ایس بایٹ (A S Byatt) برطانیہ کی معروف فکشن نگار ہیں جنھوں نے اپنی کتاب *Possession* پر بُکر پرائز حاصل کیا۔ بایٹ کی دوسری کتابوں میں *The Shadow of the Sun*، *The Game*، *The Virgin in the Garden*، *Still Life* اور *Sugar and Other Stories* شامل ہیں۔ بایٹ کی کہانیوں کا تازہ مجموعہ *The Djinn in the Nightingale's Eye* نومبر ۱۹۹۴ میں شائع ہوا ہے جس میں Dragon's Breath بھی شامل ہے جس کا ترجمہ موجودہ انتخاب میں پیش کیا جارہا ہے۔

***

کلاڈیو ماگرِیس (Claudio Magris) اٹلی کے ادیب اور تریِست یونیورسٹی کی ادب اور فلسفے کی فیکلٹی میں استاد ہیں۔ ان کی کتاب *Danube* کا ترجمہ تمام بڑی یوروپی زبانوں میں ہو چکا ہے۔

Scanned with CamScanner

جولین بارنز (Julien Barnes)، معروف برطانوی ناول نگار، ۱۹۴۶ میں لائسٹر میں پیدا ہوئے اور لندن اور آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی۔ بارنز کے مشہور ناولوں میں Flaubert's Parrot، A History of the World in 10 1/2 Chapters، Staring at the Sun اور Talking It Over شامل ہیں۔ اوّل الذکر ناول ("فلوبیر کا توتا") کے ایک باب کا اردو ترجمہ "ایما بوواری کی آنکھیں" کے عنوان سے محمد عمر میمن نے کیا تھا جو "آج" (خزاں ۱۹۹۰) میں شائع ہوا۔ میمن نے بارنز کے ایک مضمون Once in Love with Emma کا ترجمہ "تبصرہ" کے عنوان سے کیا جو "آوارگی" (آج کی کتابیں، ۱۹۸۷) میں شامل ہے۔ (یہ مضمون پیرو کے ادیب ماریو برگس یوسا کی "مادام بوواری" کے تخلیقی مطالعے پر مبنی کتاب The Perpetual Orgy پر تبصرہ ہے۔) بارنز کا تازہ ترین ناول Porcupine، جو ۱۹۹۳ میں شائع ہوا ہے، مشرقی یوروپ کے ایک ملک میں کمیونزم کے خاتمے کے بعد کی کہانی ہے۔ فہمیدہ ریاض کا کیا ہوا اس ناول کا اردو ترجمہ "آج" میں جلد شائع ہوگا۔

***

بورا کوشِک (Bora Cosic) بلغراد کے رہنے والے ایک معروف ادیب ہیں جو آج کل کروشیا میں مقیم ہیں۔ کوشک کی مختصر کہانی Reading Hamsun کا ترجمہ موجودہ انتخاب میں شامل ہے۔

کوشِک کی کہانی میں ناروے کے مشہور ادیب کنوٹ ہامسون (Knut Hamsun) کا ذکر آیا ہے جن کی کتاب "بھوک" دنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ ہامسون (۱۸۵۹-۱۹۵۲) کی دوسری کتابوں میں The Growth of the Soil، Mystries، Victoria، Pan، Vegabond، August، The Road Leads On وغیرہ شامل ہیں۔ ۱۹۲۰ میں انھیں ادب کا نوبیل انعام ملا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران ناروے پر نازی فوجوں کے تسلّط کے دنوں میں ہامسون نے قابضوں کی مذمّت کرنے سے انکار کر دیا اور اُن کا خیر مقدم کیا۔ ناروے کے شہریوں نے اس پر احتجاج کرتے ہوئے ان کی کتابوں خصوصاً "بھوک" کے نسخے ڈاک کے ذریعے ہامسون کو لوٹانے شروع کر دیے۔ جنگ کے خاتمے پر ہامسون کو گرفتار کر کے مقدمہ چلایا گیا، لیکن ذہنی مریض قرار دے کر سزا سے معاف رکھا گیا۔ اپنی آخری تصنیف میں ہامسون نے غداری کے الزام کی تردید کی اور ذہنی مریض ہونے کا بھی انکار کیا۔

***

عرفان ہوروزووچ

ترجمہ: اسد محمد خاں

بوسنیا کا بجار

اُس نے قسائی کو آتے نہیں دیکھا۔ دکھائی دیتی دنیا کی شبیہیں اُس کی نیند بھری آنکھوں میں دھندلی شکلیں اختیار کرنے لگیں۔ اُس پر کیا گیا وار اس بات سے کچھ اور زیادہ بھیانک بن گیا۔ اُس نے اپنا سر اچانک باقی بدن سے الگ ہوتا محسوس کیا۔ لگا کہ اُس کی زرخیزی کسی خوفِ آئندہ سے کٹ گئی ہے۔ اور یوں لگا کہ اُس کی دُم اب ماضی کی اور مستقبل کی سب جونکوں کے مقابل بے طاقت ہے۔

بڑھتی ہوئی تکلیف کی سنگت میں اُس چھوٹے بجار نے خود کو پہلے کبھی اتنا بڑا محسوس نہیں کیا تھا۔

وہ مَرا نہیں۔ اُس کے گھٹا ٹوپ تاریک حواس اُس وقت جاگ اٹھے جب فولاد کے جبڑوں نے کاٹنا، چیرنا اور چبانا شروع کیا اور اُس کا گوشت، اُس کی جان غذا بن گئی: نہ سیر ہونے والے دندان و شکم کے لیے ایسی غذا جو خود کو کھایا جاتا ہوا دیکھتی تھی! اُس نے وہ قصبے دیکھے جن کے بیچ سے اُس کا گوشت کھینچ کر لے جایا جا رہا تھا۔ اُس نے ریپ کی ہوئی گڈرنیوں کی آنکھوں میں اپنے دیہات دیکھے۔ اُس نے تباہ کیے ہوئے مکانات دیکھے اور بوڑھے آدمی دیکھے۔ وہ سوختہ درختوں کے اُن ٹھنٹھوں سے مشابہ تھے جو رات میں دہکتے ہیں۔ اُس نے ہجوموں کو ریلا بنائے جلاوطنی میں نکلتے دیکھا۔ یوں لگا جیسے اُس کا خون تُٹاریوں میں بہہ رہا ہو۔

اُس نے دیکھا۔ اور اُس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔

مگر کھیل تو اَب شروع ہوا تھا۔

عین مین قربانی کے اسپینی تھیئٹر کی طرح اُس کا چھوٹا سا مَرغ زار مبصروں، حامیوں اور مشیروں سے آباد ہو گیا۔ بلند چیخ کے بعد اچانک سناٹا چھا گیا۔ دوا کی تاثیر والی بُوٹی اُس نے بے دھیانی میں چَر لی تھی اور اس کے رَس خون میں شامل ہو گئے تھے، سو اُس کی توجہ اُن

Scanned with CamScanner

نیزے بازوں کی طرف سے ہٹ گئی جو مشقت میں تھر تھراتے پٹھوں کے ساتھ اُس کی نبض، اُس کی شریانوں، اُس کے دل پر نشانہ سادھ رہے تھے۔ لوہے کے گینڈے اُس کے معدے کی طرف اور شانوں کی ہڈیوں کی طرف چلے۔ اُن کے سواروں کے پاس بَیل کے گوشت کے چارٹ موجود تھے جن کی نقلیں "عظیم دکانِ قصاباں" سے حاصل کی گئی تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ چانپیں کون لے گا، دَست کس کے حصے میں آئے گا، پائے کس کے ہوں گے، دُم کس کو ملے گی، دل، آنکھیں، مغز، کلّہ اور زبان: یہ کون کون لے گا۔ وہ جانتے تھے، اور جھگڑتے تھے۔

ضیاع سے بچ جانے والی یادداشت سے طاقت حاصل کرتا ہوا بچار اپنی ٹانگوں کے بل اُٹھا۔ ٹھیک اُسی وقت لوہے کے دندانوں والے سینگ نے اُسے زمین پر گرادیا اور روندی ہوئی پوشیدہ گھاس پر رگید کر داب لیا۔ اب وہ ایک جیتی جاگتی یادگار کے مشابہ تھا جو فولادی پرندوں کے لیے ہدف کا کام دے رہی تھی، کہ پرندے اسی آسمان سے اُس پر اپنے بُخارات کے خدنگ مارتے تھے۔ اُسے اب کچھ بھی سنائی نہ دیتا تھا: نہ خوشی کے نعرے، نہ ہی خفگی کے آوازے۔ اُس نے تو یہ بھی نہیں دیکھا کہ جس دوران میں فولاد کے پرندوں کا کرتب جاری رہا، کس طرح لوہے کے گینڈوں کو ایک طرف سرکا دیا گیا تھا تاکہ منظر کے سامنے کوئی رکاوٹ نہ رہے۔ بس ایک گینڈا جو اُسے دبوچے ہوئے تھا وہیں رہا، باقی موقعے کے انتظار میں دائرہ وار گردش کرتے رہے۔

آخر کار اُس نے سر ڈال دیا۔ اُس کا سینہ، اُس کی ٹانگیں ڈھے گئیں۔

قصاب ٹکڑوں پر جھگڑ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو اپنے دانتوں اور دندانے دار سینگوں سے دھمکاتے اور اُن وعدوں اور خفیہ معاہدوں کے حوالے دیتے جو عظیم دکانِ قصاباں میں طے پائے تھے۔ مبصر جھگڑے میں کود پڑے۔ حامیوں نے وہ ناقابلِ برداشت چیخم دھاڑ مچائی کہ بچار کے کٹے ہوئے سر، اُس کے چِرے ہوئے حلق سے جو تاریک صدا نکلتی تھی، حامیوں کے غوغائے اُسے پوری طرح دبا دیا۔ حلقوم سے نکلتی ہوئی وہ آواز نزع کی خرخراہٹ تھی جس میں یادداشت کی پرچھائیاں چلتی محسوس ہوتی تھیں: کچھ ایسا لگتا تھا کہ ایک متوازی دنیا کی نفیری پھونکی جارہی ہے، نئی پیدائش جیسی۔

ٹکڑوں میں قتل کیا ہوا بچار اٹھا، اپنے قامت سے کھڑا ہوگیا۔

وہ اُسی طرح کھڑا ہوگیا: کچھ ٹیڑھا، بے ڈھب، مگر بے جگری سے، اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے۔

ابتدائی حیرت کے بعد جب چونکے تو سب قصاب، لوہا گینڈوں کے مالک، فولادی پرندے ہنکانے والے اور مبصرین، سب جھپٹ پڑے۔ قسائیوں نے جُدا کیے ہوئے ٹکڑوں کو، جو اُس کے

Scanned with CamScanner

بدن سے ابھی تک چپکے تھے، پیش اندیشگی ہی میں پھر قتل کیا۔ اپنے چاقوؤں کو عین پیش اندیشگی تک پہنچاتے ہوے انھوں نے ہڈیاں اور اعصاب کاٹ دیے۔

بچار کھڑا تھا اور چیخ مارتا تھا۔

مبصر، حامی اور مشیر جنگلے کے پیچھے دوبارہ اپنی جگہوں پر جا بیٹھے اور تماشا دیکھنے لگے جس میں ہر قاعدے ضابطے پر تھوکا جا رہا تھا۔ انھوں نے قتل دیکھا جس کا ظہور قتل سے ہوا تھا، اور قتل کا مشاہدہ کیا جو اگلے قتل پر منتج ہو رہا تھا۔ انھوں نے سادہ قتل، اور چھانٹ چھانٹ کر اور قرعہ ڈال کر مارنے کا عمل، اور ٹکڑوں ٹکڑوں میں شکار کرنے کی کارروائی ملاحظہ کی۔ وہ دیکھتے رہے اور انتظار کرتے رہے۔ وقت تھم گیا۔ جنگلے کے پیچھے تھم گیا۔ درد کی نبض چلتی رہی۔ ہر ایک انتظار کرنے لگا کہ ٹکڑوں ٹکڑوں میں قتل کیا جاتا چھوٹا بچار کب مغلوب ہوتا ہے، ایک سبزی خور اپنے پُرشکوہ سینگ فلک کی جانب اُٹھائے کب گھٹنوں کے بل آتا ہے۔

**

Scanned with CamScanner

اے ایس بایٹ

ترجمہ: محمد سلیم الرحمن

اژدہے کا سانس

کسی زمانے کا ذکر ہے اونچے اونچے پہاڑوں میں گھری کسی وادی کے ایک گاؤں میں ایک کنبہ آباد تھا، دو بیٹے اور ایک بیٹی، جن کے نام تھے بیری، جیک اور ایوا۔ گاؤں پہاڑوں کے نچلے ڈھلانوں پر واقع تھا اور وادی کے گہرے کٹورے میں جھیل تھی، کناروں کناروں پر بلور کی طرح شفاف اور اپنے ناپیمودہ مرکز میں روشنائی کی طرح کالی۔ پہاڑی ڈھانگوں کے سائے میں چیڑ کے گھنے جنگل کھڑے تھے لیکن گاؤں گلپوش سبزہ زاروں اور ثمرستانوں اور اناج کے کھیتوں کے درمیان بسا ہوا تھا۔ پھل اور غلہ بہت مزے کا نہ تھا لیکن پیداوار جتنی بھی تھی گاؤں والوں کی ضروریات کے لیے کافی تھی۔ برف کے نیلگوں سایوں اور جگمگاتے برف زاروں سے عبارت کوہی چوٹیوں تک رسائی ناممکن تھی۔ پہاڑ کے پہلوؤں پر نیچے کی طرف آتی آب راہوں کے نشان تھے جیسے کسی دیوہیکل پُل سے بننے والی ریگھاریاں۔ انگلستان میں بعض پہاڑیوں کے گردا گرد پڑے ہوئے مدوّر نشانات کو قدیم اژدہوں کی بل پر بل کھاتی گرفت سے منسوب کیا جاتا ہے اور اسی ملک میں یہ کہانی بھی سننے میں آتی ہے کہ کسی اوائلی دور میں چٹانوں سے دیوزاد کیڑے اُترے تھے اور ان کی رگڑ سے یہ آب راہیں بن گئی تھیں۔ والدین رات کو آگ کے پاس بیٹھ کر اژدہوں کے شعلہ بار، کدکتے نزول کے قصے مزے مزے سے سنا کر بچوں کو ڈراتے تھے۔

بیری، جیک اور ایوا کو اژدہوں سے تو ڈر نہ لگتا تھا لیکن وہ اپنے اپنے طور پر بیزاری سے خائف تھے۔ اس گاؤں میں زندگی نسل بعد نسل خود کو دُہراتی آئی تھی۔ لوگ پیدا ہوتے، پیار محبت اور صحبت کرتے، ماں باپ کہلاتے، نانا دادا بنتے، مرجاتے۔ گاؤں والے ہتھ کرگھوں پر، خاص طرح کے گنے چنے رنگوں میں، خاص وضع کا روایتی غالیچہ بناتے۔ رنگ نباتات سے حاصل ہونے والی ڈائیوں سے تیار کیے جاتے: خون کی طرح لال، گہرا نیلا جس میں یوں ہی سی جھلک سبز کی، ریتلا زرد، چارکول جیسا کالا۔ چند ایک روایتی ڈِزائن تھے جن میں شاذونادر ہی فرق آتا: شاخ در شاخ پھیلا درخت

Scanned with CamScanner

جس پر انار نما پھل لگے ہوتے، اور بسیرا کرتے پرند، کچھ کچھ مثالوں سے مشابہ؛ یا زیادہ تجریدی ہندسیاتی ڈزائن جن میں ایک رنگ کی زمین پر کسی اَور رنگ کا آڑی ترچھی لکیروں کا جال اور جال پر ایک اَور رنگ کے دھاگوں سے بنے ہوئے دائرے۔ غالیچے بالعموم عورتیں تیار کرتیں۔ کھانا بھی وہی پکاتیں، کپڑے بھی وہی دھوتیں۔ مرد مویشیوں کو دیکھتے بھالتے، کھیتی باڑی کرتے اور گاتے بجاتے۔ اُن کا ایک اپنا ساز تھا: ایک شیون کناں نَے جو کہیں اَور دیکھنے میں نہ آتی تھی۔ مگر اکثر گاؤں والوں کو گھربار سے دور جانے کا اتفاق ہی نہ ہوا تھا، اس لیے وہ بے خبر تھے کہ اُن کا ساز اپنی مثال آپ ہے۔

بیری کے ذمے تھا سوَر چرانا، اور جیک کھیت کماتا، بیج بوتا اور فصل کاٹتا۔ سوَروں میں سے ایک کے ساتھ بیری کا خاص یارانہ تھا: بورِس نام کا پٹھورا، سیانا جناور جو بڑی چالاکی سے فرار ہو جاتا اور ایسی جگہوں سے ٹروفل کھود نکالتا جہاں ان کے ملنے کی کوئی توقع نہ ہوتی۔ لیکن بیری پر جو اکتاہٹ طاری رہتی تھی اُسے بورِس کا کھلنڈراپن بھی کم کرنے سے قاصر تھا۔ بیری بڑے بڑے شہروں کے خواب دیکھتا جو پہاڑ سے پرے واقع تھے، جہاں عجلت پسند لوگوں کی بِیڑ بھاڑ رہتی تھی، سب کے سب مختلف، سب کے سب مصروف۔ جیک کو اناج اُگتا دیکھنا اچھا لگتا، کالی مٹی سے نکلتی ہری نوکیں۔ اور اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ سیپ نامی خوردنی فنگس اور جنگلی شہد کو کہاں جا کر تلاش کرنا چاہیے، لیکن اُس پر جو اکتاہٹ طاری رہتی تھی یہ دل بہلاوے بھی اسے کم کرنے سے قاصر تھے۔ وہ خواب دیکھتا کہ ہر طرف سے بلند دیواروں میں گھرے عظیم الشان محل ہیں جن میں آرائشی باغ ہیں۔ وہ ایسے لطیف ذائقوں، مسالوں اور تُند شرابوں کے خواب دیکھتا جن سے وادی ناآشنا تھی۔ وہ ایسے خواب بھی دیکھتا کہ ایسے سازوں کی دُھن پر جن کے اس نے صرف نام سن رکھے تھے -- جیسے زِتھر، بونگوڈرم، گرینڈ پیانو، نلکی نما گھنٹیاں -- وحشیانہ ناچ جاری ہے اور جسم بلاروک ٹوک اُچھل کود میں مصروف ہیں۔

ایوا غالیچے بُنتی۔ اس کا خیال تھا کہ بُنائی کا کیا ہے، یہ کام تو وہ سوتے سوتے بھی کر سکتی ہے، اور اکثر کرتی بھی رہتی؛ جاگتی تو پتا چلتا کہ ذہن میں ایک سی کڑھت، اَدلتی بدلتی کڑھت، بھانجے ہوئے دھاگے اور تانوں بانوں کا اُتار چڑھاو گھوم رہا ہے۔ وہ انجانے رنگوں کے خواب دیکھتی: ارغوانی، شنگرفی، فیروزی اور نارنجی۔ سمندر کے خواب دیکھتی جس کا کوئی تصوّر اُس کے پاس نہیں تھا۔ کھارے پانی کے خواب دیکھتی اور اپنے ہی بے صبر آنسوؤں کو چکھتی۔ بُنائی اسے اچھی طرح نہ آتی تھی۔ ٹکواں بُنائی بہت اینٹھ جاتی اور طرازوں میں جھتے پڑ جاتے۔ لیکن اُس کے ذمے یہی کام تھا۔

Scanned with CamScanner

پہلی علامت شاید یہ اطلاع ہو کہ اونچے پہاڑوں پر خلافِ معمول برف کے تودوں کے تودے کھسک کر نیچے آ گرے ہیں۔ یہ خبریں کسی شکاری نے دیں۔ یا شاید اوّلین علامات یہ ہوں، جیسا کہ اُن میں سے بعض نے دعویٰ کیا، کہ صبحوں کا رنگ بہت تپا ہوا گلابی نظر آنے لگا اور غروبِ آفتاب کے رنگ بھڑک کر بہت زیادہ قرمزی ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد یہ بات مکمل کر سامنے آ گئی کہ گاؤں کے ٹھیک اوپر جو پہاڑ تھا اس کی لگر پر، دن کو بھی اور رات کو بھی، ایک طرح کی آتشی دھند، زردی مائل گلابی اور دھوانسی دھند، لرزتی اور ناچتی رہتی ہے، جیسے جہاں تہاں قرمزی اور سنہری انار چھٹ رہے ہوں۔ اس آتشیں لگر کے نیچے برف کی سفیدی کے معدوم ہونے سے رسیلی چٹان کا اُجاڑ خاکستری رنگ اور نئے پانی کی جھلمل ۔۔ اور ہاں، بھاپ ۔۔ اُجاگر ہو چلی تھی۔

اُن پر ضرور پہلے دن سے دہشت طاری ہو گئی ہو گی۔ انہیں صاف صاف دکھائی دے رہا تھا کہ بڑی بڑی تبدیلیاں ظہور میں آنے کو ہیں اور یہ کہ خاک و باد، آتش و آب، سب حرکت میں ہیں۔ لیکن خوف کے ساتھ شوق آمیز دل چسپی بھی بہت تھی اور یہ دونوں کیفیتیں مکمل مل گئی تھیں۔ جو نئی نئی باتیں دیکھنے کو مل رہی تھیں اُن سے ایک طرح کا حظ بھی حاصل ہوتا تھا اور جمالیاتی حظ کا پہلو بھی تھا، جس پر اُن میں سے بہت سوں کو بعد میں شرم آئی۔ جدھر یہ واقعات پیش آ رہے تھے اُس طرف شکاریوں کی ٹولیاں گئیں۔ انھوں نے واپس آ کر بتایا کہ پہاڑ کا پہلو جنبش کرتا ہوا جل اور اُبل رہا ہے۔ چناں چہ وہاں راکھ اور دھوئیں اور بھاپ کے جو گھرے بادل تنے ہوئے تھے اُن کے آرپار دیکھنا مشکل تھا اور پتا نہ چلتا تھا کہ جنبش کی نوعیت کیا ہے۔ جہاں تک گاؤں والوں کو معلوم تھا پہاڑ آتش فشانی قسم کے نہ تھے لیکن چٹانوں اور پتھروں کی تاریخ کے مقابلے میں انسانوں کی زندگیاں مختصر ہیں۔ سو وہ حیران ہوتے اور بحث مباحثہ کرتے رہے۔

تھوڑی مدت بعد انھوں نے دیکھا کہ خطِ آسمان پر، جہاں پہلے کچھ بھی نہ تھا، گومڑ، چھ گومڑ، نظر آنے لگے ہیں جیسے کسی دیوزاد مٹھی پر انگلیوں کے اُبھرے ہوئے جوڑ۔ فاصلہ چوں کہ بہت تھا اس لیے یہ گومڑ بڑے بڑے شیڈ یا چھوٹے موٹے مکان ہونے کا تاثر دیتے تھے۔ اور اگلے چند ہفتوں کے دوران میں گومڑ، دھوپ اور اُڑتی چنگاریوں میں لپٹے، باقاعدگی اور سست رفتاری سے، پہلو بہ پہلو، بلاپس و پیش، دائیں بائیں مڑے بغیر، پہاڑ کے پہلو میں اُترتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ ہر گومڑ کے پیچھے ایک لمبی، بے لچک ٹیوب گھسٹتی آ رہی تھی۔

چند ایک جی دار آدمی دیکھ بھال کی غرض سے باہر نکلے لیکن جھلس دینے والی بھاپ اور جلتی کنکریوں کی بوچھاروں نے اُنہیں پیچھے دھکیل دیا۔ دو دوست، دونوں جیوٹ شکاری، باہر گئے اور کبھی لوٹ کر نہ آئے۔

Scanned with CamScanner

ایک دن کسی عورت نے اپنے باغ میں کہا: "یہ مٹی کے تودے کھسک کر نیچے نہیں آرہے بلکہ مجھے تو قریب قریب ایسا لگتا ہے کہ جان دار چیزیں ہیں، بڑے بڑے کیڑے، کپّوں جیسے سروں والے، جو رینگ رینگ کر اُترتے ہوئے ہماری طرف رواں ہیں۔ بہت بڑے بڑے، پھول کر کپّا، دائیں بائیں ہلتے گنجے سر، گھنڈیوں اور ٹونٹیوں اور اُبھری لکیروں اور بھنوروں سے بھرے، اور گارے جیسے گوشت پوست میں بنے بڑے بڑے غاروں میں خباثت آمیز، جلتی بلتی گیلی آنکھیں، لہو کی طرح لال، چمکتی ہوئی بارہ آنکھیں۔ تمھیں دکھائی دے رہی ہیں کیا؟ اور مٹیالے کیچڑ سے ڈھلی ہوئی پچکی تھوتھنیوں میں بارہ بالوں بھرے نتھنے۔" اور آپس میں گفتگو ہونے، موازنہ کرنے، انگلیاں اُٹھانے اور حلیہ کشی کے بعد وہ تمام لوگوں کو نظر آنے لگے، اور تھے بھی ہُو بہو ویسے ہی جیسا عورت نے بیان کیا تھا: چھ موٹے، لنگواں، گھناونے سر، اپنے پیچھے بھاری بھر کم دھڑ گھسیٹتے ہوئے، اتنے لمبے جتنی ان کے گاؤں سے اگلے گاؤں تک جانے والی سڑک۔ دھڑ وہ اس طرح گھسیٹ رہے تھے جیسے ایسا کرتے ہوئے اُنھیں نہ صرف دقت بلکہ تکلیف بھی ہو رہی ہو، لیکن اڑیل اور بے انتہا سست رفتار۔

جب وہ زیادہ قریب آپہنچے -- اور وہ خواب آسا، غیر حقیقی سست رفتاری سے آگے بڑھتے تھے -- تو اُن کے بڑے بڑے جبڑے نظر آنے لگے، وہیل مچھلیوں جتنے چوڑے جبڑے، اور درانتی نما سینگ جیسی یا چقماقی دھار سے مسلّح، جیسے کوئی ڈراونی چونچ۔ اس چونچ سے وہ زمین کے پورے پورے پرت کھود کر نگل جاتے۔ اس پرت پر جو کچھ ہوتا -- جھاڑیاں، باڑیاں، کٹی ہوئی گھاس کے ڈھیر، پھلوں کے درخت، ایک دو بکریاں، کوئی چتکبری گاے، بطخوں کی تلیا اور اس میں پائی جانے والی زندہ چیزیں -- سب ان کے اندر چلا جاتا۔ وہ نزدیک آتے تو راکھ کا بادل ان کے آنے سے پہلے ہی چھا جاتا۔ مکانوں اور باغوں پر راکھ ہی راکھ پڑی نظر آتی۔ راکھ کی تہ کھڑکیوں پر جم اور راکھ کی جھلّی کنووں پر تن جاتی۔ راکھ سے بدبو آتی تھی۔ وہ ناقابلِ بیان حد تک غلیظ تھی۔ پہلے پہل تو لوگ بڑبڑ کرتے ہوئے راکھ جھاڑتے رہے۔ بعد ازاں وہ راکھ جھاڑنے سے باز آگئے کہ اس کا کچھ حاصل نہ تھا، اور اُن پر خوف طاری ہونے لگا۔ یہ سب کچھ انتہائی آہستگی سے ہو رہا تھا، اتنی آہستگی سے کہ پہلے ایک غیر حقیقی، جی کو کچھ گدگدانے والے خوف کا دور آتا اور اس کے بعد حقیقی، مریضانہ، مفلوج کر دینے والا خوف غالب آجاتا۔ یہ اُس وقت ہوتا جب وہ مخلوق اتنے قریب آ پہنچتی کہ مردوں عورتوں کو ان کی آنکھیں اور آتشی زبانیں نظر آنے لگتیں۔ آنکھوں کے گرد چپچپا مواد تھُپا ہوتا، جیسے پگھلتی ربڑ۔ یہ واضح نہیں کہ اس مخلوق کی نظر انسانوں پر واقعی پڑی ہو گی۔ اُن کے جثوں کا پیمانہ اور تھا، انسانوں کا اور۔ بعینہٖ جیسے وہ ننھی منی مخلوق جو ہمارے سروں پر رہتی ہے یا

Scanned with CamScanner

سلاد کے پتوں میں، جو ہم کھاتے ہیں، گھس کر گھر بناتی ہے۔ وہ نہ تو ہمیں نظر آتی ہے نہ ہم اُسے کبھی خاطر میں لاتے ہیں۔

شعلے والی اِن زبانوں میں اُن اژدہوں کے شاندار سُرخ پھریروں والا کوئی پہلو نہ تھا جن کی تصویریں گرجوں میں بنی ہوتی ہیں۔ انھیں میر فرشتوں کی آتشیں شمشیروں سے بھی کوئی علاقہ نہ تھا۔ پگھلی ہوئی باہر کو لٹکتی زبانیں، چرٹیلی شفاف کھال سے ڈھکی، جن پر ہر طرف، کرم کلوں جتنے، قرمزی مسے اور سواد کلیاں، انگاروں کی طرح دہکتی ہوئیں۔ زبانوں سے کسی طرح کا گند ھکی چیپ رال کی طرح ٹپکتا ہوا، اور مایوسی اور کبھی نہ ختم ہونے والی بوسیدگی کی سڑاند پھوٹتی ہوئی، جو رہتی دنیا تک کبھی دور نہ ہو سکے گی، دھُل نہ سکے گی۔

جب وقت ہاتھ سے تقریباً نکل چلا تو گاؤں والے جھپٹے اور جو چیز بست ہاتھ لگی اُٹھالی، اور جا کر جنگل میں ڈیرے ڈال دیے۔ وہاں زندگی پھر یکسانیت میں ڈھل گئی، بلکہ دُوبھر ہو چلی، کیوں کہ مشقت اور دہشت کے مابین آنے والے اکتاہٹ کے وقفوں میں بھی انسانوں کا بیزار ہو جانا ممکن ہے۔

***

آخر کار ہیری اور جیک چند اَور نوجوانوں کی معیت میں قریے کی طرف گئے تاکہ پاس سے جا کر دیکھیں کہ کس قسم کی اور کتنی تباہی ہوئی ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ جدھر وہ جا رہے ہیں وہاں بدبودار دھوئیں اور آگ کی پوری دیوار کھڑی ہے۔ ایک سوّر، ہانپتا اور چلچلاتا ہوا، سرپٹ دوڑتا دھوئیں سے اچانک باہر آیا اور ہیری نے آواز دی: "بورِس!"، اور اپنے سوّر کے پیچھے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔ جیک کو پہلے تو سوّر اور آدمی کی کالک بھری سیاہ پرچھائیں نظر آئی اور پھر ایک مہیب سرّاٹا سنائی دیا اور گرم بخارات اور بھاری، دم گھونٹنے والے، آتشیں سانس کا ایسا بھپکا آیا کہ وہ لڑکھڑاتا، غش کھاتا ہوا پیچھے جا پڑا۔ جب ہوش بحال ہوے تو دیکھا کہ جسم پر ڈھیروں ڈھیر راکھ چپکی ہوئی ہے اور ایسا لگا جیسے اس مخلوق کے پیٹ میں جلتے، کھُدبُد کرتے سیال مادّوں کی آواز سنائی دے رہی ہو۔

لمحے بھر کے لیے اُس نے سوچا کہ بس یہیں، اِس جبڑے کے رستے میں، پڑاربوں اور اناج کے کھیت اور جھاڑیوں والی باڑ کے ساتھ مجھے بھی منہ مار کر اُٹھا لیا جائے گا۔ پھر اُسے پتا چلا کہ اس نے لوٹ لگا کر کھسک جانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور یوں تھوڑا تھوڑا لڑھک کر، رینگ کر، چاروں ہاتھ پیروں پر چل کر خود کو اس مخلوق کی پہنچ سے بتدریج دور لے گیا۔ پھر بے دم اور بیمار، کئی گھنٹے

Scanned with CamScanner

ایک خاردار جھاڑ کے سائے میں پڑا رہا- پھر کراہتا ہوا، رو رو کر، وہاں سے اُٹھا اور جنگل میں واقع پڑاؤ کار ستا لیا- اُسے امید تھی کہ بیری بھی واپس آجائے گا، لیکن جب وہ لوٹ کر نہ آیا تو تعجب نہ ہوا، واقعی کوئی تعجب نہ ہوا-

***

اور یوں یہ سلسلہ، ہفتوں، مہینوں پر پھیل کر، طویل ہوتا چلا گیا- فضا راکھ اور برستے انگاروں سے معمور رہتی- وہ ہولناک بُو ان کے کپڑوں اور تن بدن میں سرایت کر گئی؛ حتیٰ کہ وہ لمبے، گھناؤنے جسم خود کو تھوڑا تھوڑا گھسیٹتے ہوئے میدانوں اور چراگاہوں پر سے گزرے اور اپنے پیچھے وہی چٹانی سطح جیسی ریگھاریاں چھوڑ گئے جن میں زندگی اور افزائش کی کوئی رمق باقی نہ بچی تھی- اور پہاڑی پر ایک جگہ کھڑے ہو کر گاؤں والوں نے دیکھا کہ وہ دیو ہیکل جاندار، پہلو بہ پہلو، جھیل کے ریتلے کنارے طے کر رہے ہیں اور پھر انھوں نے بلا پس وپیش، رفتار میں کوئی تبدیلی لائے بغیر، اُتھلے پانی کو عبور کیا- لگتا تھا کوئی میکانکی احتیاج اُنھیں کشاں کشاں لیے جا رہی ہے یا کوئی نامیاتی طلب ہے، جیسے مینڈک یا کچھوے نپے تُلے وقفوں سے، انڈے بچے دینے کے لیے، آبی دنیا کا رُخ کرتے ہیں- وہ بڑے بڑے سر جھیل کی سطح کو چھونے کے لیے جھکے، اور سر مَس ہوتے ہی پانی کھَولنے، بھاپ بن کر اُڑنے اور کسی عظیم دیگ کی طرح چھینٹے اُڑانے لگا- اور پھر سر سطحِ آب سے نیچے چلے گئے- سطح پر پانی بدستور اُبلتا، جھریاتا اور کھدبُداتا رہا اور ادھر روز بہ روز اُن طویل جسموں کی سُست لمبائیاں، ڈھیر پر ڈھیر ہو کر، جھیل کی گہرائیوں کی طرف پھسلتی رہیں، یہاں تک کہ آخر اُتھلے پانیوں میں صرف سپاٹ، بھونڈے، کُند پچھائے نظر آئے- اور پھر ایک دن، اُتنی ہی بے یقینی سے جس سے ان کی آمد کا تعین ہوا تھا، یہ واضح ہو گیا کہ اُن کے خروج کا خاتمہ ہو چکا ہے- وہ جسیم جاندار غوطہ لگا کر جھیل میں بیٹھ گئے تھے، جھیل کے آرپار یا کہیں نیچے جا چکے تھے اور اپنے پیچھے، پامال اور پژمردہ، مٹی میں، چٹانوں پر، عالمِ نباتات میں، اپنے جسموں کے بوجھ اور جھُلس دینے والے تنفّس کے بس کرخت نشانات چھوڑ گئے تھے-

***

جب گاؤں والے واپس آئے کہ دور کھڑے ہو کر گاؤں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوا کہ سب کچھ یکساں طور پر تباہ ہو چکا ہے- مکان زمیں بوس ہو چکے تھے- درخت جڑ سے اکھڑے پڑے تھے- زمین

Scanned with CamScanner

پر خراشیں اور لمبے لمبے گڑھے، جیسے ندی نالوں کے آثار، راکھ ہی راکھ جس سے دھواں اُٹھتا ہوا۔ وہ کھنڈروں میں گھومتے اور اینٹوں اور لکڑی کے تختوں کو الٹتے پلٹتے رہے۔ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے، بعض لوگوں کو راکھ میں گم شدہ خزانے اور بیکار کی چیزیں مل گئیں: کوئی سکہ، آدھی کتاب، پچکی ہوئی ہنڈیا۔ اور بعض لوگ جو افراتفری پھیلتے ہی غائب ہو گئے تھے لوٹ آئے، بھنویں جھلسی ہوئیں، چہرے لو کا لگے۔ اور بعض واپس نہیں آئے۔ جیک اور ایوا ساتھ ساتھ گاؤں کو پلٹے اور لحظہ بھر کے لیے اُن کی سمجھ میں نہ آسکا کہ اُس کھنڈر کو تلاش کرنے کے لیے کدھر دیکھیں جو کبھی اُن کا گھر تھا۔ اور پھر گرے ملبے کے ایک ڈھیر کا چکر کاٹتے ہوئے اُنہیں اپنا گھر نظر آ گیا جس کی اینٹ تک نہ ہلی تھی۔ جیک نے وہ پتھر اُٹھایا چابی ہمیشہ جس کے نیچے رکھ دی جاتی تھی، اور چابی وہیں رکھی ملی جہاں ہمیشہ رکھی ملتی تھی۔ اور جیک اور ایوا نے گھر میں قدم رکھا اور وہاں میزیں اور کرسیاں تھیں، آتش دان اور کتابوں کی الماری تھی اور گھر کے پچھلے حصے میں ایوا کا کرگھا اُسی کھڑکی میں رکھا تھا جس میں سے پہاڑ کے ڈھلان دکھائی دیتے تھے اور آنکھ اُٹھا کر دیکھنے پر پہاڑ کی چوٹیاں نظر آتی تھیں۔ پچھلے دروازے سے کسی جسم کے ٹکرانے کا بھاری شور تھا۔ جیک نے دروازہ کھولا۔ اور دروازہ کھُلنے پر وہاں بورس سوّر نظر آیا جس نے سر ذرا جھکایا ہوا تھا۔ اس کے جسم میں سے بھُنے ہوئے گوشت کی بُو آ رہی تھی اور جلی ہوئی کھال پر ایک بھی سخت رونگٹا سلامت نہ تھا، لیکن اُس کی دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ خوشی محسوس کر رہا ہے اور اُنہیں پہچان چکا ہے۔

جب اُنھوں نے دیکھا کہ سوّر کراماتی طور پر یا قسمت کی مہربانی سے اژدہوں کے سانسوں اور آتشیں زبانوں سے جان بچا لایا ہے تو، ظاہر ہے، یہ امید کی کہ بیری بھی واپس آ جائے گا۔ اُس کی واپسی کی امید دنوں اور مہینوں بلکہ، تمام معقول سوچ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، برسوں قائم رہی۔ لیکن وہ نہ لوٹا۔

***

ایوا نے اپنا غالیچہ جھاڑا جس پر راکھ کی ہلکی تہہ جمی ہوئی تھی؛ ہلکی اس لیے کہ غالیچہ گھر کے پچھلے حصے میں تھا اور کھڑکیاں اچھی ساخت کی تھیں۔ ایوا نے سُرخ، نیلے، زرد، کالے رنگوں کو ایسے دیکھا جیسے پہلے کبھی کوئی رنگ نہ دیکھا ہو، اور اس کے باوجود ان کے مانوس معلوم ہونے پر متحمل سی لذت محسوس کی۔ فرض کیجیے اگر دو ہزار سال بعد کسی آثاریات داں کو یہ کمرہ اور راچھ پر چڑھا یہ غالیچہ مل جائے تو شاید ان چیزوں کے سلامت رہ جانے پر، جس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا، وہ شدید

Scanned with CamScanner

جوش محسوس کرے اور اس صناعی کے حوالے سے شدید تجسس سے دوچار ہو جائے اور روزمرہ کی اس زندگی کے بارے میں بھی بہت کچھ جاننا چاہے جسے ان یافتہ ہنرپاروں کے ارد گرد جزوی طور پر تصور میں لایا جا سکتا ہو۔ کچھ اسی طرح کی حیرانی اب ایوا کو اپنے کام اور لکڑی اور اُون اور ہڈی کی بنی ہوئی دھڑکی کی اَڑیل استواری کے بارے میں محسوس ہوئی اور اس نامکمل درخت پر بھی جس پر مثال بیٹھے بچے اور گدرانار لگے ہوئے تھے۔ جیک کو بھی فرحت اور حیرت کا احساس ہوا۔ وہ گھر میں بار بار چل کر کبھی اُن کھڑکیوں کی طرف جاتا جو سلگتی بربادی پر کھلتی تھیں اور کبھی اُن کھڑکیوں کی جانب جن میں سے کبھی نہ بدلنے والے پہاڑوں کو دیکھا جا سکتا تھا۔ دونوں نے بورس کے گرد بانہیں ڈالیں جو بچ بچا کر اُنھیں واپس مل گیا تھا، اور اُس کی گیلی تھوتھنی اور گرم پہلوؤں کو محسوس کیا۔ ایسی حیرت، ایسا اچنبھا، بیزاری کا اُلٹ ہیں، بالکل اُلٹ، اور بہت سے لوگ اس حیرت اور اچنبھے سے صرف خوف اور زیاں کے بعد شناسا ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ ان سے شناسائی ہو جائے تو، میرا خیال ہے، انھیں کبھی پوری طرح بھلایا نہیں جا سکتا: یہ عجیب جگہوں کو اور عجیب موقعوں کو فردوسی نور کے کوندوں اور طغیانیوں میں نہلا دیتے ہیں۔

***

گاؤں والوں نے اپنا گاؤں دوبارہ تعمیر کیا اور بچے ہوئے گھر میں بچی ہوئی چیزیں نئے گھروں کے درمیان قائم نظر آئیں جن کے باغوں میں نئے پھول کھلتے، نئی ترکاریاں اگتیں اور نئے پودے لگائے جاتے۔ اژدہے کس طرح پہاڑ سے اُتر کر آئے تھے، لوگ اس بارے میں کہانیاں سنانے لگے، اور یہ کہانیاں بھی بیزاری کا اُلٹ تھیں۔ بعض باتوں کو لوگوں نے کہانیوں کا روپ دے دیا اور بعض باتیں ایسی تھیں جنھیں وہ کبھی زبان پر نہ لائے۔ جیک ہیری کی اندھی بہادری کا ذکر کرتا جو اپنے سوّر کو بچانے کے لیے دوڑ کر گھمنڈتے دھویں میں جا گھسا تھا۔ یہ کسی نے نہ کہا کہ ہیری کی واپسی کی امید جو آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی ہے تو اس وجہ سے ہر روز کتنا دکھ ہوتا ہے۔ سوّر کی سوجھ بوجھ اور دوبارہ گھر آ جانے کے گُن گائے گئے لیکن اُس کے ناگزیر انجام کا چرچا نہ ہوا کہ وہ زمانہ گاؤں والوں پر بہت بھاری تھا۔ اور وہ کہانیاں جو اُن لوگوں نے اپنے بچ رہنے پر حیران ہو کر گھڑی تھیں وقت آنے پر ان کے بچوں اور پوتوں کے حق میں بیزاری کو دور رکھنے کے لیے طلسمی حصار ثابت ہوئیں کہ ان کہانیوں میں امن اور حسن اور دہشت کے مابین حقیقی تعلق کے بارے میں پہیلیوں والے سارے اشارے کنائے موجود تھے۔

**

Scanned with CamScanner

جولین بارنز

ترجمہ: اسد محمد خاں

ہملٹ وائلڈ ویسٹ میں

امریکا میں سول وار ختم ہونے کے کچھ برس بعد انگریزوں کا ایک تھیٹریکل ٹروپ مغربی مزوری کے ایک چھوٹے قصبے میں پہنچا۔ وہ اس ڈھب کا قصبہ تھا کہ وہاں کے بیشتر لوگوں نے دو دو پیشے اختیار کر رکھے تھے: مے خانہ چلانے والے نے ایک اصطبل بھی کھول رکھا تھا، قصبے کا شیرف بندوق سازی بھی کرتا تھا، جب کہ اسکول کی اُستانی بھلے مانس مسافروں کو پے اِنگ گیسٹ ٹھیرا لیتی تھی بشرطے کہ وہ ستھری عادتوں کے ہوں اور کھلے ہاتھ سے خرچ کرتے ہوں۔ ان سب باتوں میں انگریز ایکٹروں نے بڑی اپنائیت محسوس کی ہوگی، بالکل گھر جیسا لگا ہوگا۔ وہ خود کیوں کہ تعداد میں کم تھے اس لیے ہر آدمی کو مستقل دو دو پارٹ کرنے پڑتے تھے۔ جیسے ہی ولن گولی کھا کر مرتا، وہ پادری بن کر خود کو دفن کرنے چلا آتا۔ مجبوری تھی۔ خواہ وہ ٹریجڈی کر رہے ہوں، کوئی میلوڈراما یا کامیڈی، یہ ایکٹر خود کو اتنی بار کاسٹیوم اور لہجے بدلتے ہوئے پاتے تھے کہ لگتا تھا جیسے وہ فرنچ زبان کا مزاحیہ ناٹک کھیل رہے ہوں۔

جس رات کی یہ کہانی ہے، انگریزوں کا یہ ٹروپ "ہملٹ" کھیلنے والا تھا۔ اس کھیل کی وجہ سے منڈلی پر مستقل ایک فالتو بوجھ پڑ رہا تھا کیوں کہ اٹلانٹک پار کرتے ہوئے اُن کی سُپر اسٹار یعنی اوفیلیا کھیلنے والی لڑکی کو جہاز کے کپتان نے گھر بسانے پر آمادہ کرنا شروع کر دیا تھا اور بالالتزام امریکا کے خطّے مڈویسٹ کے بارے میں ایسی ایسی بھیانک کہانیاں سنائی تھیں کہ اوفیلیا کھیلنے والی نے شادی کی پیشکش فوراً قبول کر لی تھی۔ کپتان نے روایت کے مطابق اپنا بحری حق استعمال کرتے ہوئے شادی کی یہ تقریب بھی خود ہی سرانجام دینے کا فیصلہ کیا۔ گویا اس بار اُس نے بھی ڈبل رول کیا: ایک سویلین اتھارٹی کا، دوسرا دولھے کا۔ ٹروپ کے دوسرے ممبر اپنے جذبات کو دوچند کرتے ہوئے کپتان کی کیبن کو گھیر کر کھڑے ہو گئے تھے۔ سب ظاہر کر رہے تھے جیسے خوش ہیں۔ بعض واقعی سچے دل سے اس نوعمر ایکٹریس کی خوشی میں شریک تھے مگر ساتھ ہی بے حد

Scanned with CamScanner

ناراض بھی تھے کہ اوفیلیا کا رول اب پچاس پچاس برس کی دو بہنوں میں سے ایک کو کرنا پڑے گا۔

بہ ہر حال، جیسے جیسے وہ نیویارک سے دور ہوتے گئے مسئلہ ختم ہوتا گیا، کیوں کہ اُن کے کچھ ہی ناظرین نے پہلے کبھی کھیل "ہملٹ" دیکھا ہوگا۔ بہت سوں نے تو کبھی تھیئٹر ہی نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے ہر چیز اُنھیں معجزاتی طور پر انوکھی اور بالکل نارمل لگتی تھی: یعنی شیکسپیئر کی زبان، حد سے زیادہ حیران کن ملبوسات، ناموجود سینری۔ یہ بھی انوکھا اور معمول کے مطابق لگتا تھا کہ کھیل کا دورانیہ اب ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں رہا تھا۔ اُسے اتنا مختصر کر دیا گیا تھا کہ بس بنیادی سین رہنے دیے گئے تھے: ہملٹ کے باپ کے بھوت کا ظاہر ہونا، پولونیئس کا قتل، ایک ادھیڑ عمر اوفیلیا کا پاگل ہو جانا، کلوڈیئس کی سازش، قبر کھودنے والا منظر اور آخری ڈوئل۔

مزوری کے قصبے کا تھیئٹر بہت کچھ اسی تھیئٹر جیسا تھا، سوائے اس کے کہ دن میں وہ مے کشی کا سے لُون بن جاتا تھا: سیٹیں آپ کی ان سیٹوں کی طرح تھیں، سوائے اس کے کہ وہ تکلیف دہ تھیں اور ناکافی تعداد میں تھیں۔ حاضرین آپ ہی جیسے تھے، سوائے اس کے کہ بعض اپنی بیلٹ میں گنیں لگائے ہوئے تھے اور اُن میں سے کسی ایک کو بھی "ہملٹ" ڈرامے کا پلاٹ نہیں معلوم تھا۔ تین مہینے کے دورے میں انگریز ایکٹر اچھی طرح جان گئے تھے کہ کھیل کے کن حصّوں پر زور دینا ہے، کن کو دھیما رکھنا ہے، کس کس حصّے کو نکال باہر کرنا ہے۔ اُنھیں اس بات کی بھی عادت ہو گئی تھی کہ ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھی ہوئی آج کی کسی فیملی کی طرح، حاضرین بلند آواز سے کھیل کے بارے میں مسلسل اپنا ردِعمل ظاہر کرتے رہتے تھے۔ "ہملٹ" کی کہانی -- ٹریجڈی جسے چھیل کر انھوں نے میلوڈراما بنا دیا تھا -- اپنی سادہ ترین شکل میں بھی حاضرین کو پُرجوش اور مشتعل کر سکتی تھی، طیش میں لا سکتی تھی، اُنھیں غم زدہ اور گداز بنا سکتی تھی۔ ہملٹ کے باپ کا بے سر کا بھوت اپنی کھوپڑی خود اپنے ہاتھ میں اُٹھائے ادھر سے اُدھر جاتا ہوا ہمیشہ زبردست کامیابی سے ہم کنار ہوتا تھا۔ پردے کے پیچھے پولونیئس کے ہلاک کر دیے جانے پر بعضے تو اس ناانصافی کا اتنا اثر لیتے کہ شور مچانے لگتے اور بعض اپنی بھرّائی ہوئی آواز میں خوب ہنستے۔ ہملٹ کا شاہ کلوڈیئس کے قتل سے اُس وقت باز رہنا کہ جب بادشاہ دعا کر رہا ہوتا، بعضوں کو تو بہت پسند آتا اور بعضے اتنا اچھا موقع کھو دینے پر غرقِ حیرت ہو جاتے۔ شمشیروں کی آخری جنگ اور جدال و قتال پر شور و شغب اور بڑھاوے کے نعرے، احتجاج اور ہمت شکنی کی آوازیں، سبھی اپنے عروج پر ہوتی تھیں۔

***

اُس رات سے لُون میں بڑی گرمی تھی۔ حاضرین معمول سے کچھ زیادہ ہی موڈ میں تھے اور خوب شور کرتے تھے۔ اوفیلیا کی موت کا حال بیان کیا گیا تو حاضرین نے اتنی خاموشی سے سُنا جیسے سب سکتے میں ہوں۔ کلوڈیئس کی سازش پر معمول سے زیادہ خفگی ظاہر کی گئی۔ کلوڈیئس نوجوان لیئرٹس کی تلوار کی نوک نامعقول حد تک دکھا دکھا کے زہر آلود کرتا تھا اور حاضرین کی ہُوٹنگ سے شہ پا کر اُس نے اپنی حرکات میں کچھ زیادہ ہی خباثت ڈال دی تھی۔ تلوار بازی شروع ہوئی اور اُس مرحلے پر پہنچی کہ جب ہملٹ کو زخم لگنے والا ہے جس سے وہ جاں بر نہ ہوسکے گا۔ خود لیئرٹس پر زہر اثر کر چکا ہے، وہ بے مدافعت شہزادے کو چرکا لگانے ہی والا ہے، کہ ناگاہ حاضرین میں سے ایک کاؤبوائے اٹھا اور اُس نے "دھت تیری!" کرکے لیئرٹس کو گولی مار دی۔ ٹس پر اُس کے قریب بیٹھے دوسرے کاؤبوائے نے اٹھ کر احتجاج کیا اور کہا کہ میرے دوست نے غلط بدمعاش کو جہنم واصل کیا ہے، سو اُس نے شاہ کلوڈیئس کو، جو تختِ شاہی پر پڑا اینڈ رہا تھا، تُرنت گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ شیرف نے، جو بندوق ساز بھی تھا، کاؤبوائے صاحبان کو غیر مسلح کر دیا اور سرجن کو بُلالیا۔ انگریز ایکٹروں کے نصیب اچھے تھے جو پستول اُس زمانے میں زیادہ درست نشانے کے نہیں ہوتے تھے جیسا کہ بعد کو بالی وُڈ میں ہونے لگے۔ اس لیے ماحول جب ذرا پُرسکون ہوا تو لیئرٹس نے، جو کئی منٹ سے مُردہ پڑا تھا، ایک آنکھ کھول کر جائزہ لیا، پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کلوڈیئس بھی مُردے سے زندہ ہو گیا، اگرچہ اُس کے بازو کے پُرگوشت حصے میں گولی لگی تھی۔ سو گرم لوہے سے داغنے اور پٹی کرنے کے لیے سرجن کی خدمات حاصل کی گئیں۔ بعدہٗ کلوڈیئس نے اس صورتِ حال کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یہ پارٹ کرتے ہوئے وہ بادشاہ کو ایسا آزمودہ کار سپاہی بنا کر پیش کرنے لگا جسے ایک زخم نے اب بھی پریشان کر رکھا ہے۔

کیوں کہ انصاف کی فراہمی اُن دنوں تیزی سے ہوتی تھی اس لیے پانچ آدمیوں کا مقدمہ اگلے ہی دن پیش ہوا۔ کاؤبوائے صاحبان پر اقدامِ قتل اور بلوے کی فردِ جرم لگائی گئی جب کہ تین ایکٹروں -- کلوڈیئس، لیئرٹس اور خود ہملٹ -- کا جرم یہ بیان کیا گیا کہ انھوں نے بلوے کی ترغیب دی ہے۔ پانچوں آدمی کٹہرے میں بیٹھے جس کا پہرہ شیرف دے رہا تھا، جو بندوق ساز بھی تھا۔

شہادتیں گزاری گئیں کہ کاؤبوائے پچھلی رات بالکل نشے میں نہیں تھے، باہوش تھے؛ اور یہ کہ اُنھوں نے پہلے کبھی ناٹک ہوتے نہیں دیکھا تھا؛ اور یہ کہ وہ پوری سچائی کے ساتھ سمجھ رہے تھے کہ وہ ہملٹ کی جان بچا رہے ہیں۔ گواہوں نے صاف صاف یہ بیان دیا کہ کاؤبوائے بہت پہلے سے اچھے کردار کے مالک ہیں۔ دوسرے تین مدّعاعلیہان کے بارے میں، ایکٹر ہونے کی بنا پر، یہ قیاس

Scanned with CamScanner

کیا گیا کہ وہ پہلے ہی سے بُرے کردار کے لوگ ہوں گے۔

جج، جو سرجن بھی تھا، امریکی سِوِل وار کا آزمودہ کار سپاہی تھا۔ وہ اُن دانش مندوں میں سے تھا جو اپنی قانون کی کتابوں سے بار بار رجوع نہیں کرتے۔ وہ جانتا تھا کہ حقیقت کا مستقل پیچھا کرنے کے مقابلے میں تصوّر کی ایک ٹھیک ٹھاک جست لگا کر اکثر و بیشتر بہت ہی خوبی سے انصاف حاصل کیا جا سکتا ہے۔ وہ انسانی فطرت کے دُہرے پن کو بھی سمجھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ممکن ہے ہمارے آج کے دوست کبھی ہمارے دشمن بن جائیں، تو اس کا منطقی جواب یہ ہوگا کہ ہمارے دشمن کبھی ہمارے دوست بھی بن سکتے ہیں، چناں چہ بنی نوعِ انسان کی حیثیت سے یہ ہمارا آخری سہارا ہے۔ جج کا فیصلہ مزُوری کی ریاستی حدود میں نافذ قانون سے ایک اعتبار سے ٹھیک ٹھیک مطابقت نہیں رکھتا تھا (تاہم فیصلہ تھا)۔ جج نے دونوں کاؤبوائز کو اس بنیاد پر بے قصور ٹھیراتے ہوئے کلوڈیئس اور لیئرٹس کے قتل کے الزام سے بَری کر دیا کہ کلوڈیئس اور لیئرٹس تصوّر کی پیداوار، خیالی مخلوق ہیں، اُنھیں کوئی قتل نہیں کر سکتا، ماسوا اُس کے جو خود خیالی مخلوق ہو۔ اُس نے بلوے کے الزام میں کاؤبوائز کو مجرم گردانا: اُنھیں قصبہ بدر کیے جانے کا حکم دیا۔ مزید برآں یہ کہا کہ جب وہ ایک بار قصبے کی حدود سے باہر ہو جائیں تو واپس لائے جائیں اور اُن کے جیالے پن اور عوام دوست رویّے پر اُنھیں میونسپلٹی کے فنڈ سے انعام دیا جائے۔ اس فیصلے میں ہملٹ، کلوڈیئس اور لیئرٹس کو بلوے پر اُکسانے کا مجرم قرار دیا گیا: اُنھیں میونسپلٹی کے فنڈ سے پہلے کچھ انعام دیے جانے کا حکم ہوا کیوں کہ انھوں نے تحمّل کیا تھا، یعنی جب اُن پر گولی چلائی گئی تھی تو خود کو جواباً لڑنے سے روکے رکھا تھا۔ پھر حکم ہوا کہ انعام کے بعد سزا کے طور پر اُنھیں قصبے سے نکال باہر کیا جائے اور اُس سمت میں ہنکا دیا جائے جدھر وہ اپنا اگلا کھیل پیش کریں گے۔

جج، جو سرجن بھی تھا، اِس اصول پر ایمان رکھتا تھا کہ انصاف کے تقاضے نہ صرف پورے کیے جائیں بلکہ پورے ہوتے دکھائی بھی دیں۔ اس لیے اُس نے نہ صرف دوسرا بلکہ تیسرا پیشہ بھی اختیار کر رکھا تھا اور وہ پیشہ تھا ایک مقامی اخبار کے مالک کا، جس کا اگلے روز ایک خصوصی ایڈیشن شائع ہوا۔ اخبار کے کرائم رپورٹر نے، جو صرف اس اشاعت کے لیے ڈبل رول کر رہا تھا اور تھیٹر کا تبصرہ نگار بنا ہوا تھا، واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہوئے کہ گویا وہ بھی وہیں موجود تھا، خاص طور پر سرجن کی پیشہ ورانہ مہارت اور جج کے عدل و دانش کو باری باری زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔ قصبے سے دوڑا دیے جانے سے قبل انگریز ایکٹروں نے اخبار کی بہت سی کاپیاں خرید لی تھیں۔

اور چوں کہ ہملٹ میرے پردادے تھے، جبھی میں آج رات یہ کہانی آپ کو سنا رہا ہوں۔

**

Scanned with CamScanner

کلادیو ماگریس

ترجمہ: اجمل کمال

غلطی

اگست کے آخر ہوتے ہوتے ہم قصبے وِیلادیل نیووسو کے مقام ایلرسکا بِستریچا میں پروفیسر صاحب کے پاس جانے کے عادی ہو چکے تھے۔ یہ دو جنگوں کے اُس درمیانی وقفے کی بات ہے جب اطالیہ کی مشرقی سرحد زمین کے اُس ٹکڑے سے گزرتی تھی، یعنی یوگوسلاویا سے ملنے والی سرحد سے، جو اَب سلووینیا اور کروشیا کی سرحد ہو گئی ہے۔ پروفیسر صاحب کوہِ نیووسو کے، جو سلووینیا کے قصبے سنیژنک کے پاس سے اُٹھتا ہے، اصلی مالک اور وفادار نوکر دونوں ہی ہیں۔ پہاڑ کی ڈھلانوں پر بے تحاشا گھنے بَن ہیں، اور بیچ بیچ میں پیڑ کاٹ کر صاف کی ہوئی زمین کے قطعے جہاں سے منہ اندھیرے کوئی ہرن یا بھیڑیا کبھی کبھی نکل آتا ہے۔ کوہِ نیووسو کی گزاری ہوئی عمر کے نشان بڑے بڑے دائروں میں اُگے ہوئے پیڑوں کی شکل میں درج ہیں اور ان دائروں سے نہ صرف جنگلی پگڈنڈیوں کی بلکہ ہماری زندگی کے برسوں کی بھی شکل بنتی ہے۔ ہمیں لگتا تھا کہ اُس بَن میں ہمارا آنا جانا چھٹیوں کی کبھی کبھار کی سیر نہیں بلکہ سدا چلتی رہنے والی موسیقی، کبھی نہ ٹوٹنے والا تسلسل ہے، جو پیڑوں کے اگنے، تناور جوان بننے، رفتہ رفتہ رنگ بدلنے اور آخر مٹ کر غائب ہونے کے عمل میں ظاہر ہو رہا ہے۔

پہاڑی بن کی ان سَیروں میں پروفیسر صاحب ہمارے لیے چمڑے کے اونچے جوتوں کی طرح لازمی تھے۔ وہی ہمیں جانوروں کے چھپے ہوئے غار اور ان کے استعمال میں آنے والے پوشیدہ راستے بتاتے، کسی قدیم، عمررسیدہ درخت کے دھیرے دھیرے موت کے چُنگل میں سرکنے، گھُل کر فطری حالت پر لوٹنے کا سست رو، شاہانہ منظر دکھانے لے جاتے اور شکاریوں، بارہ سنگھوں اور ریچھوں کی پُرانی کہانیاں سناتے، انسان اور حیوان کی زندگی اور تقدیر کی کہانیاں جن میں اُن تمام قبیلوں اور سلطنتوں کی تاریخیں، ایک آخری گونج کی طرح، بہہ کر جذب ہو جاتی تھیں جو کبھی ان بَنوں سے گزرے تھے۔ پروفیسر صاحب کا جنگل سے عشق سورج کے اُبھرنے اور ڈوبنے کے

Scanned with CamScanner

جادوئی منظروں کو تکنے، کسی زخم خوردہ بھیڑیے کو پاس سے دیکھنے کی پُر خطر مہم پر نکلنے، ہوا میں پہلی برف باری کی خوشبو کو محسوس کرنے سے کہیں بڑھ کر تھا۔ ان کے عشق میں چھوٹی چھوٹی روزمرہ کی چیزوں کی ایک ایک تفصیل کی ایسی دیکھ ریکھ، جنگل کی ذرا ذرا سی چیز پر ایسی توجہ شامل تھی جیسے کوئی عورت اپنے گھر کو جھاڑتے بُہارتے ہوئے چوکنے پن سے دیکھتی جاتی ہو کہ کہاں گرد جمی ہوئی ہے، کس چیز کو مرمّت کی ضرورت ہے۔

پروفیسر صاحب کی عمر اُس وقت اسّی سے اوپر تھی جب ماریتسا ماد ہری نے اُن کا خاکہ کھینچا تھا کہ کوہ نیووسو کا چکر لگا رہے ہیں؛ جہاں پگڈنڈیاں ایک دوسرے کو کاٹتی ہیں اُس جگہ لگی ہوئی ہدایتی تختی کے رنگ کو اُجلا کر رہے ہیں؛ نقشوں کو پھر سے درست کر رہے ہیں؛ عجیب عجیب شکلوں والی جڑیں چُن رہے ہیں، اور اگر کہیں بن میں چلتے چلتے کسی غلط پگڈنڈی پر مڑ جاتے ہیں تو انہیں غصّے کا دورہ سا پڑ جاتا ہے۔ (ایسے موقعوں پر، جو بہت کھسیا دینے والے ہوتے تھے مگر خوش قسمتی سے شاذونادر ہی پیش آتے تھے، وہ جھنجھلا کر اپنی میٹھی طبیعت کی اور پٹر پٹر بتیانے والی بیوی کو تنبیہ کرتے کہ وہ اپنی رائے اپنے ہی تک رکھیں۔)

پروفیسر صاحب سلووینیا کے رہنے والے تھے، پرانے ہابسبرگ آسٹریا میں تعلیم پائی تھی اور مجھ سے بات کرتے ہوئے ہمیشہ ایک بڑی پُر تکلف اور قدیم جرمن بولتے جس میں سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے لیے بھی غائب کی ضمیریں استعمال کرنے کا رنگ غالب تھا۔ مثلاً ایک روز، جب ہم پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے ایک ایسے قطعے میں داخل ہو رہے تھے جو جنگلی سوروں کی گزرگاہ تھا، مجھ سے بولے: "میں نے اپنی بیوی سے کہا: معزز مہمان سے دریافت کیجیے گا کہ آیا انہیں علم ہے کہ ان کی خوش اطوار بیگم اپنے گوبانیزا کے پکوان میں گراپا شامل کرتی ہیں یا وہ انہیں اس کے بغیر مرغوب ہے۔۔۔"

ان کے ساتھ سیر کرتے ہوئے آدمی جنگل کے دل تک اُتر جاتا تھا، ورنہ وہ ایسا جنگل تھا جہاں بالکل بیچ میں پہنچ کر بھی اپنا راستا جاننا مایوس کن حد تک مشکل ہوتا تھا کیوں کہ اکثر اوقات دکھائی نہ دینے والی ناگزار رکاوٹیں راہ روک لیتی تھیں اور جنگل اتنے آس پاس، بلکہ ارد گرد چاروں طرف، ہوتے ہوئے بھی رسائی کے باہر ہو جاتا تھا۔

چند مہینے پہلے ہم ایک بار پھر پروفیسر صاحب سے ملنے گئے، ایک تو اس وجہ سے کہ نیووسو کا پھیرا لگائے اور ان سے ملاقات کا لطف اٹھائے بغیر گرمیوں کا موسم گزار دینا ہمارے تصوّر سے باہر کی بات تھی، لیکن اس لیے بھی کہ میں نیووسو اور اس میں پائے جانے والے جنگلی ریچھ پر ایک کہانی لکھنے کی سوچ رہا تھا اور اس کے لیے مجھے واقعاتی تفصیلیں درکار تھیں، کچھ بنیادی باتیں اور نام

Scanned with CamScanner

وغیرہ: ایسی چیزیں جو یوں تو اپنے اندر کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں مگر پھر بھی ضروری ہوتی ہیں، جیسے آہنگ پیدا کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی ردیف چننی پڑتی ہے، تاکہ جس حقیقت کو آپ بیان کرنا چاہ رہے ہیں اُسے کہانی میں منقلب کر سکیں یا نئے سرے سے وضع کر سکیں۔ خاص طور پر اگر آپ یہ ماننے میں اتالو سویو (Italo Svevo) کے ساتھ ہوں کہ زندگی، اپنی بے حد خفی تفصیلوں تک میں، بےپناہ اور جنل ہے، اکثر اوقات افسانہ نگار کے تصوّر سے بھی کہیں زیادہ اور جنل، اور یہ کہ عمدہ قصہ گوئی کے لیے آدمیوں اور چیزوں کی سچائی پر پوری توجہ دینا اور اس کا مکمّل احترام کرنا پہلی شرط ہے۔

پروفیسر صاحب، جن کی عمر اب بانوے برس کی تھی، دورانِ خون کے کسی خلل کی وجہ سے کئی ہفتوں سے بیمار پڑے تھے اور اس بیماری کے باعث انھیں بولنے میں دقت ہونے لگی تھی۔ انھیں تیز بخار تھا اور پسینا آ رہا تھا، ان کی حرکات سے تکان ظاہر ہو رہی تھی، لیکن اُن کی آنکھیں ویسی ہی زندہ اور پُررونق تھیں اور اس چہرے کو، جسے دسیوں برس کے استادانہ تحکم نے کسی مجسمے کے سے سخت خدوخال میں ڈھال دیا تھا، بےپناہ ملائمت بخش رہی تھیں۔ ان کی مسہری کے پاس فرش پر جابجا چھوٹے بڑے ڈبے اور کھوکھے پڑے تھے جن میں ان کی بیوی -- پروفیسر صاحب کی رکتی ہوئی آواز مگر اُسی تعمیل کرانے والے لہجے میں کی ہوئی درخواست کے مطابق -- اُن کی چیزیں ترتیب سے جمع کرتی جا رہی تھیں: اُن کی کتابیں، نادر شکلوں والی جڑوں کے ذخیرے، ہرن کا سر، بُھس بھرا ہوا جنگلی بلّا، پہاڑ کے خاکے اور تصویریں، خطوط، دستاویزات اور قسم قسم کے عجائب۔ ڈبوں میں رکھے جانے کے بعد ان تمام چیزوں کو مختلف پتوں پر بھیج دیا جانا تھا۔ پروفیسر صاحب اپنی زندگی کی صفائی کر رہے تھے، اسے اُن تمام چیزوں سے خالی کر رہے تھے جن سے انھوں نے محبت کی تھی اور جنھیں جنون کی حد تک پہنچے ہوئے شوق کے ساتھ ایک ایک کر کے جمع کیا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں ترتیب لاتے ہوئے اُن چیزوں کو الگ کر رہے تھے جنھوں نے آج تک اسے آراستہ رکھا تھا۔ ان کا یہ عمل کچھ کچھ بیروک دور کے ہابسبرگ شہنشاہوں کی یاد دلاتا تھا جنھیں کاپوچین راہبوں کی زیرزمین خانقاہ میں داخل ہونے سے پہلے اپنے تمام اعزاز اور تمغے، جاہ و جلال کی ساری نشانیاں اُتار دینی پڑتی تھیں۔

میری دریافت کی ہوئی ایک ایک تفصیل بڑی نکتہ سنجی کے ساتھ فراہم کرنے کے بعد پروفیسر صاحب نے کوہِ نیوسو کی تصویر والا ایک پوسٹ کارڈ مجھے دیا۔ کارڈ کی پُشت پر ایک نظم کے کچھ مصرعے -- ظاہر ہے سلووینی زبان میں -- چھپے ہوئے تھے۔ (وہ شاعر بھی تھے اور سرسراتے ہوئے جنگلوں اور دور سے دکھائی دیتی چوٹیوں کے بارے میں انیسویں صدی کے

اسلوب میں نظمیں لکھا کرتے تھے۔) تکیے کا سہارا لے کر خود کو اپنی بیوی کی مدد سے دقت کے ساتھ اُٹھاتے ہوئے انھوں نے موٹے شیشوں والا چشمہ لگایا اور اپنے جلی مگر کپکپاتے ہوئے حروف میں ان مصرعوں کو جرمن ترجمے میں لکھا۔

جب ہم ان سے آخرکار رخصت ہوئے تو چھوٹے سے کارڈ کی پشت پر لکھے ہوئے یہ چار جرمن مصرعے ہمیں ایک طرح کا آخری عہدنامہ، ایک حتمی مُہر معلوم ہو رہے تھے۔ لیکن نوے سالہ لوگ بھی دوسروں کی حیرت میں ڈال دینے اور ڈاکٹروں کی پیش گوئیوں کو جھٹلانے کی کیسی صلاحیت رکھتے ہیں! دو یا تین ہفتے پہلے کی بات ہے، جرمن میں لکھا ہوا ایک خط موصول ہوا۔ لفافے پر لکھے بڑے بڑے لرزتے ہوئے حروف کو دیکھ کر میں فوراً پہچان گیا کہ یہ کس کا خط ہے، لیکن اس پر نظر ڈالنے سے مجھے اُس واضح مگر دردمندانہ نفسِ مضمون کا گمان تک نہ ہوا جو لفافے میں بند تھا۔ کہنہ مشق اور جمے ہوئے خط میں لکھی گئی تحریر، لرزیدہ ہونے کے باوجود، منطقی اور لفظی ترتیب، اوقاف کی علامات، لفظوں کے ہجوں اور درمیانی وقفوں اور پیروں کی ساخت کے اعتبار سے بڑی مستحکم تھی۔ "میرے عزیز پروفیسر، جب آپ پچھلی بار ہمارے گھر تشریف لائے تھے، میں نے آپ کو اپنے چند مصرعے پیش کیے تھے، اور آپ کی خاطر انھیں جرمن زبان میں منتقل کیا تھا۔ میری بیگم نے، جو اس ترجمے کے تحریر کیے جانے کے وقت میرے پاس موجود تھیں، اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ایک مصرعے میں، پہاڑ کے لفظ سے پہلے، جرمن حرف نکرہ das کے بجائے، سہواً، میرے قلم سے der لکھا گیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ اس افسوس ناک غلطی کو درست فرما لیں، اور یہ بھی کہ اس نادانستہ سہو کے لیے مجھے معاف کر دیں۔ دورانِ خون میں خرابی کے پرانے مرض کے باعث، مَیں بعض اوقات یادداشت کی کمزوری کا شکار ہو جاتا ہوں، اور اگر مجھ سے یہ سہو ہوا ہے تو اس میں غالباً میری اس معذوری کا دخل رہا ہو گا۔ اب میری کیفیت قدرے بہتر ہے۔ میں بستر سے اٹھنے کے قابل ہو گیا ہوں، اور آج صبح میں نے جنگل میں مختصر سی سیر بھی کی ہے۔"

پروفیسر صاحب کے لیے یہ بات ناقابلِ تصور تھی کہ اس غلطی کو درست کیے بغیر، اور اس معاملے سے پیدا ہونے والے شُبہے کو اپنے اور پوری دنیا کے سامنے سے دور کیے بغیر، خود کو جہاں سے گزر جانے دیں۔ میں جانتا تھا کہ انھوں نے ایک آدھ مہینا اپنے ذہن میں اُس لمحے کو دُہرا دُہرا کر یاد کرنے کی کوشش کی ہو گی کہ آیا واقعی ان کے قلم سے das کے بجائے der لکھا گیا تھا یا اُن کی بیوی نے غلط گمان کیا۔ (غالباً اس نیک دل خاتون نے بھی اس واقعے کے بعد کے دو مہینوں میں کئی بار ان کو یہ بات یاد دلا کر پریشان کیا ہو گا۔) انسانی جذبہ زندگی سے لگاؤ کے باعث پیدا ہوتا

Scanned with CamScanner

ہے لیکن زندگی سے لگاؤ کو گہرا بھی کرتا ہے، چناں چہ قواعد کی اس غلطی سے محسوس ہونے والی جھنجلاہٹ اور اسے درست کرنے کی شدید خواہش نے پروفیسر صاحب کی جسمانی توانائی بحال کر دی ہوگی۔ اس جذبے نے انھیں بستر سے اٹھا کر کھڑا کر دیا اور اپنے جنگل، اپنی دنیا اور اپنی زندگی سے ٹوٹا ہوا تعلق بحال کرنے کے قابل بنا دیا۔

زبان کی درستی اخلاقی صراحت اور دیانت داری کے لیے بنیادی شرط ہے۔ جیسا کہ ویانا کا عارف ادیب کارل کراوس کہتے نہ تھکتا تھا، جب لوگ زبان کی قواعد اور صرف و نحو سے کھیلنے لگتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ بے ایمانی اور عہد شکنی کی صورت میں نکلتا ہے۔ قواعد کو تاش کے پتوں کی طرح پھینٹنے، فاعل اور مفعول کے مقام بے پروائی سے تبدیل کر دینے کے نتیجے میں ظالم اور مظلوم کے کردار اُلٹ پلٹ ہو جاتے ہیں، چیزوں اور واقعات کی ترتیب بگڑ جاتی ہے اور نتائج کو ایسے اسباب یا محرکات سے جوڑا جانے لگتا ہے جو درحقیقت اُن سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ اصل اسباب اور محرکات کے اوجھل ہو جانے سے امتیازات اور حفظِ مراتب درہم برہم ہو جاتے ہیں اور خیالوں اور جذبوں کا گمراہ کن انتشار سچ کو مسخ کر دیتا ہے۔

زبان غیر عقلیت کی گہری اندھی کھائیوں کے اوپر بنا ہوا ایک پُل ہے، اور ہماری نازک زندگیوں کا تقریباً تمام تر انحصار اسی پر ہے۔ اس لیے غلط مقام پر لگایا گیا ایک کاما بھی تباہی لے آنے پر قادر ہے، ایسی آگ بھڑکا سکتا ہے جو دنیا بھر کے جنگلوں کو جلا کر راکھ کر دے۔ لیکن پروفیسر صاحب کا واقعہ یہ بھی بتاتا ہے کہ زبان، گویا سچ، کا احترام کر کے آدمی اپنی زندگی کو زیادہ بامعنی بنا سکتا ہے، اپنے پیروں پر زیادہ مضبوطی سے کھڑا ہو سکتا ہے، دنیا میں نکل کر ایک مختصر سی سیر کا لطف اٹھا سکتا ہے اور زندگی سے اس کا حسیاتی لگاؤ خودفریبی اور مردم فریبی سے آزاد ہو کر کھلی ہوا میں سانس لے سکتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کتنی چیزیں، ہماری کتنی مسرتیں اور خوشیاں، ہمارے محسوس کیے بغیر، اُس تصحیح کی مرہونِ منت ہیں جو مدرسے میں استادوں نے ہماری کاپیوں پر سُرخ پنسل سے کی تھی؟

**

Scanned with CamScanner

بورا کوشیک

ترجمہ: محمد سلیم الرحمن

ہامسون کو پڑھنا

ابھی کی بات ہے۔ اطالیہ کے سفر کے دوران میں نے نوٹس کیا کہ میرے اطالوی ساتھیوں نے مجھے صرف اس لیے شک کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا کہ میرے ہاتھ میں ایک عجیب کتاب تھی۔ میرے اطالوی دوست پوچھنے لگے کہ مجھے یہ خیال کہاں سے آیا کہ اِس وقت ہامسون کی پُرانی کتاب کو پڑھنے کا فیصلہ کیا جائے جو شاید اپنی معنویت کھو چکی ہے۔ میں نے اُنھیں بتایا کہ ایسی کوئی بات نہیں اور بے احتیاط انداز میں وضاحت کی کہ کتاب میں انسانی بھوک کو عالم گیر مظہر قرار دیا گیا ہے۔ بہرحال، میرا موضوع میرے ساتھیوں کے پلّے نہیں پڑتا اور وہ مجھے کامپو دئی فیوری لے جاتے ہیں۔ یہ اٹاآٹ بھری ایک منڈی ہے جہاں کئی سو سال سے پھول اور کھاجا ایک ساتھ بکتے آرہے ہیں۔

مزید وضاحت کرنے سے گو طبیعت اُلجھتی ہے تاہم آج بڑی ممنت سے لکھتا ہوں کہ مجھے اِس کتاب کی کتنی طلب تھی۔ یہ کتاب اُس مکان میں جو کبھی میرا گھر تھا، کتابوں کی الماری میں پڑی تھی اور میں یہ بھی نوٹ کرتا ہوں کہ آخر کار کس طرح یہ پُرانی کتاب میں نے ایک بہت قابلِ قدر ہستی کے ہاتھوں منگوالی۔ سفر کے دوران کوئی نہ کوئی کتاب پڑھ کر میں اپنے ساتھیوں کو دِق کرتا ہوں، خاص طور پر اس لحاظ سے کہ کتاب کا میرے سفر سے مشکل سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔ میری مت ضرور خاص طور سے اُلٹی ہی ہو گی کیوں کہ ہر مظہر کو انتہائی مسخ انداز سے دیکھتا ہوں، اور مجھ جیسے لوگوں کو شاید کبھی سفر نہیں کرنا چاہیے۔ درحقیقت اگر وہ بس گھر بیٹھے رہیں تو یہ اُن کے حق میں بھی سب سے بہتر ہو اور دوسروں کے حق میں بھی۔ بات صرف اتنی ہے کہ مجھے ٹھیک طرح سے معلوم نہیں کہ میرا گھر ہے کہاں اور گھر بیٹھنا چاہوں تو کہاں جاؤں۔

***

میں اگرچہ یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ مجھے معلوم ہے اپنی پُرانی کتاب میں، جسے مدّتوں پہلے پڑھا تھا، کیا ملے گا، لیکن یہ اعتراف ضروری ہے کہ یہی مجھے معلوم نہ تھا۔ ایک طرح کے وجدان نے مجھے کتاب کے عنوان "بھوک" (Sult) کی طرف کھینچا تھا اور اس عنوان نے جس طرح کے ہیجانات کو جنم دیا وہ غیر مانوس نہ تھے۔ اب، آخر کار، میں کرستانیا کے شہر میں بھوک کی یہ کہانی پڑھ رہا ہوں جس کا تعلق پچھلی صدی کے آخری برسوں سے ہے لیکن اس میں ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے میری ایک دوست محصور سرائیوو میں دوچار ہو چکی ہے۔ جو کتاب پڑھ رہا ہوں اس کا ہیرو سڑک سے لکڑی کی چھپٹی اُٹھا کر چوسنے لگتا ہے تاکہ کوئی چیز تو منھ میں ہو۔ میں دوبارہ یہ کہتا ہوں کہ اس کتاب کا موضوع صرف بھوک نہیں، اور باتیں بھی ہیں جو اس کے بنیادی موضوع سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ اور اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ محاصرے سے آنے والی میری دوست وہاں کی بھوک کے بارے میں مشکل سے کچھ کہتی ہے لیکن، کتنی عجیب بات ہے، بالکل ہامسون کے مانند، طرح طرح کے دوسرے معاملوں کا ذکر کرتی رہتی ہے۔ مثلاً یہ کہ لوگ کس طرح گھر گھر جاتے ہیں جیسے وہاں جا کر کوئی کام نمٹانا چاہتے ہوں جب کہ اُن گھروں میں نہ تو کرنے کے لیے کچھ ہوتا ہے نہ کوئی آدمی جس سے ملا جائے۔ شہر کوئی سا بھی ہو، یہ مسئلہ ہمیشہ درپیش رہتا ہے کہ ہمیں پتا نہیں ہوتا کہ فلاں فلاں لمحے ہم کیا کر گزریں گے لیکن پھر کبھی ایسی صورتِ حال کے سامنے آتے ہی، جو تمام کیفیتوں کا نچوڑ معلوم ہوتی ہے، وہ تمام سوال بحرانی انداز میں سر اُٹھانے لگتے ہیں جن میں زندگی کو ناقابلِ فہم شے سمجھ لیا گیا ہو۔ چناں چہ میری دوست بتاتی ہے کہ محصور شہر میں اسے کیا کیا کام کرنے پڑتے ہیں اور یہ کام ایسے ہیں جن کا عام حالات میں لوگوں کو خیال بھی نہ آئے گا۔ اس کے باوجود وہ کہتی ہے کہ دیوانگی وہاں زندگی کا معمول نہیں۔ تو گویا یہ اُن لوگوں کا قصّہ ہے جو اگر پاگل ہو جائیں تو ہر اعتبار سے حق بجانب ہوں گے، اور اس کے باوجود دیوانگی میں مبتلا نہیں۔ کچھ ایسا ہے کہ دیوانگی سے بھی صرف وہی لوگ فیض یاب ہو سکتے ہیں جو نارمل حالات میں زندگی بسر کر رہے ہوں۔ لیکن جب خود حالات ہی دیوانگی کا شکار ہو جائیں تو آدمی کے پاس اپنے نارمل پن کے سوا کچھ نہیں بچتا۔ میری دوست نے، جو محصور سرائیوو سے نکل آئی ہے، ان سب باتوں کو ملا جلا کر ایک رہنمائے سرائیوو مرتب کیا ہے جس میں سرائیوو میں زندگی بسر کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے مِشےلِن نے بہت سے شہروں کے لیے رہنما کتابیں تیار کی ہیں۔ میں اب اپنے عالمِ دیوانگی میں اس کی کتاب کو، جس میں سرائیوو میں جان بچائے رکھنے کی تدابیر دی گئی ہیں، ہامسون کی کتاب "بھوک" کے ساتھ پیوند کر رہا ہوں جو میرے زیرِ مطالعہ ہے۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ روزمرہ کی اُن چھوٹی چھوٹی چیزوں کا کیا بنا جنھیں میری دوست اپنے سرائیوو والے

Scanned with CamScanner

گھر میں چھوڑ آئی ہے، لیکن پھر مجھ پر انکشاف ہوتا ہے کہ میں اُس شخص سے سوال کر رہا ہوں جو اپنی ہر چیز کسی پان شاپ میں ہمیشہ کے لیے گروی رکھ آیا ہے۔ ہمارا پُرانا قصہ گو کہتا ہے: "میری گھڑی میگلسن نامی اداکار کے پاس ہے۔ کیلنڈر جس میں میری شعر گوئی کے ابتدائی نمونے شائع ہوئے تھے اسے ایک واقف کار نے خرید لیا۔ میرا لبادہ ایک فوٹوگرافر کے ہاتھ آ گیا۔" گُم ایک بھی شے نہ ہوئی، بس سب کے مالکان، قطعی طور پر، بدل گئے۔ یہ میں اطالیہ میں اپنے دوستوں کو بتاتا ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ ہولناک باتیں ہیں، ہولناک۔ لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب میں یہاں، محفوظ علاقے میں ہوں اور مجھے زندگی کے لوازم کی کمی نہیں تو ایسی باتوں پر سر کھپانے کی ضرورت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں کھرا یورپی شریف زادہ ہوں اور شاید مجھ جیسے لوگوں کو ایسی ہولناک باتوں کے بارے میں سوچ بچار کرنے سے احتراز کرتے رہنا چاہیے۔ لیکن میں انھیں بتاتا ہوں کہ ایک محصور شہر میں میرے جو واقف اور ناواقف ہم وطن ہیں اُن میں سے بھی زیادہ تر کا شمار یورپی شرفا میں ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ان اشیا اور چیزوں کو جو یورپ کے ہونے کی گواہی دے سکتی تھیں، گروی رکھنے پر، ایک سیاروی پان شاپ میں گروی رکھنے پر، مجبور ہو چکے ہیں۔ اور میں اُنھیں بتاتا ہوں کہ کوئی شہر ایسا نہیں، یورپی یا کہیں اور کا، جو اپنی نفیس ترین جزئیات کو ایسی پان شاپ کے شکنجے چڑھنے سے بچا سکتا ہو۔ اب کہ وہ روم میں میری شائستہ مزاجی کو سوالوں کا نشانہ بنا رہے ہیں تو ذرا اس بارے میں بھی غور و خوض کر لیں۔ پھر اس کتاب کے پیچھے پڑ کر جو میرے زیرِ مطالعہ ہے، وہ گفتگو آگے بڑھاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ آیا باموں وہی ادیب ہے جسے خود اپنوں نے غدّاری کا مجرم قرار دیا تھا، اور میں کہتا ہوں کہ باموں وہی ادیب ہے اور یہ کہ اصل میں اُس نے غدّاری کا ارتکاب نہیں کیا تھا، بلکہ یوں کہیے کہ اُس کے دماغ میں ایک غدّارانہ تصوّر تھا اور وہ یہ کہ ایک غیر ملکی قرابت دار، وہی جو ملک پر قابض تھا، اُسے اپنوں سے زیادہ اہم معلوم ہوتا تھا۔ اس وجہ سے اپنوں نے اُسے گالیاں دیں، لعنت ملامت کی، اور قارئین نے اس کی کتابیں، پُلندوں کی شکل میں، اُسے لوٹا دیں۔ ان میں وہ کتاب بھی شامل تھی جو میرے ہاتھ میں ہے۔ بہرحال، مَیں بھی اپنوں کی نظر میں حقارت کے قابل ہوں اور انھوں نے مجھے برادری سے باہر نکال دیا ہے حالاں کہ میں نے کسی غیر ملکی طاقت کے حق میں برملا کچھ نہیں کہا۔ میں صرف یہ سمجھتا ہوں کہ اُس قبیلے نے، جو کبھی میرا تھا، اپنے آپ کو غلام بنا لیا ہے اور یوں خود کو ایک طرح کے خود تسلط میں دے رکھا ہے۔ ہر وہ ملک جسے مفتوح ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو، اپنا کچھ علم اور بعض اقدار چھپا لیتا ہے تاکہ بعد میں وہ اس کے پاس موجود ہوں۔ البتہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ وہ ملک اپنی روحانی اقدار کو کہاں چھپائے گا جسے خود اپنے لوگ فتح کرنے کا تہیّہ کر چکے ہوں اور ایسی غیر روحانی فتح

Scanned with CamScanner

کے زور پر دیر تک وہاں اپنا قبضہ آپ رکھنا چاہتے ہوں۔ میرے دوست کہتے ہیں کہ خیر، اگر یہی بات ہے تو اُن لوگوں کو خود اپنے ہی قبضے میں کیوں نہ رہنے دیا جائے، اور میں کہتا ہوں کہ یہی کچھ تو میں کر رہا ہوں۔ میری طرف سے اجازت ہے کہ وہ خود ہی اپنے اوپر قبضہ جمائے رہیں۔ بس میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے ایسے خود تسلط سے الگ کر لیا ہے۔

***

شاید اب یہ سمجھنا زیادہ آسان ہے کہ میں یہاں روم میں کیوں اپنے ہامسون کو پڑھ رہا ہوں اور دل ہی دل میں اس کی غدّاری پر خوش ہوں۔

**

Scanned with CamScanner

۸

سلوبودان بلاگویےوچ : میں حاضر ہوں!

دراگو یانچار : آگسبرگ

سلوبودان بلاگویےوچ (Slobodan Blagojevic) ۱۹۵۱ میں سرائیوو میں پیدا ہوئے اور ۱۹۸۶ میں بلغراد منتقل ہوئے۔ وہ ایک ادبی رسالے Delo کے مدیر رہے۔ ان کی تصانیف میں شاعری کے پانچ مجموعے، مضامین کا ایک مجموعہ، ایمیلی ڈکنسن اور کونستنتین کوافی کے پورے کلام کا سربو کروشین زبان میں ترجمہ، کہانیوں کا ایک مجموعہ، ایک منظوم طنزیہ کھیل اور ایک ناول Letters to the Metropolis شامل ہیں۔ انھوں نے آرستید دیمیرووچ (Aristid Dimirovic) کے قلمی نام سے بھی لکھا ہے۔ ۱۹۹۳ میں بلاگویےوچ ایمسٹرڈیم، ہالینڈ، آ گئے اور وہاں، حمدیا دیمیرووچ (Hamdija Demirovic) اور پریدراگ دوئچینووچ (Predrag Dojcinovic) کے ساتھ مل کر سابق یوگوسلاویا کے بےوطن ادیبوں کی تنظیم PEN قائم کی۔

***

دراگو یانچار (Drago Jancar) ۱۹۴۸ میں سلووینیا کے شہر ماریبور میں پیدا ہوئے۔ وہ نثرنگار، ڈراما نگار، مدیر اور مترجم کے طور پر معروف ہیں اور ایک سے زائد انعامات حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی تصانیف میں The Norhtern Gleam ,The Pilgrimage of Mr Houzvicke اور Death at Mary of the Snows شامل ہیں۔

سلوبودان بلاگویے وِچ

ترجمہ: عطا صدیقی

میں حاضر ہوں!

ماہ گزیدہ

چند شب اُدھر گرمیوں کی ایک رات، مَیں اپنی سسرال میں شب باش ہوا۔ (گلہریاں باغ میں کدکڑے لگا رہی تھیں۔) میں نے ایک حیرت ناک خواب دیکھا۔

تمام کے تمام مردود کروٹ اور دنیا کی دیگر اقوام نیست و نابود ہو چکی ہیں، بس صرف اور صرف ہم سرب لوگ باقی رہ گئے ہیں۔ پورا کرہ ہمارے ہاتھوں میں آگیا ہے۔ یورینس: غیر آباد۔ مریخ: لق و دق ویرانہ۔ زہرہ و زحل: خالی خولی۔ کُل مردود کائنات میں نہ کوئی بندہ نہ بندے کی ذات۔ کرہَ ارض: سربیائی ملکیت۔ ساری ناپید نوعِ انسانی کی نمائندگی کو باقی رہ گئے تو بس ہم! بالکل اسی طرح جیسے کہ در حقیقت ہم اُن اگلے وقتوں میں تھے جب پہلا بُوزنہ راسخ سربیائی قومی جذبات لیے ایک سرب بشر کے روپ میں آیا تھا۔

آمازون کے سربیائی جنگلات، سربیائی صحرائے گوبی اور سرب بحرالکاہل کا عظیم و وسیع ساحل دیکھ دیکھ کر مَیں مارے شان کے پھولا نہیں سما رہا تھا، اور دنیا بھر میں یہاں سے وہاں تک سربیائی بچے سربیائی شکاری کتّوں، سربیائی گینڈوں اور سربیائی کرگسوں میں گھرے کھیل رہے تھے اور سربیائی عوام دُھومیں مچا رہے تھے۔ یہاں تک کہ وحشی شیروں نے بھی سربیت اختیار کر لی تھی۔

سربیائی جذبات کے اس تُند ریلے کے سامنے جو فریق ڈٹا ہوا تھا وہ سربیائی آنکھ سے نظر نہ آنے والے خطرناک افریقی جرثوموں کا ایک قبیلہ تھا۔ دیگر اقوام کے ناپید ہو جانے کے ساتھ ہی ساتھ مائیکروسکوپ سمیت کُل ٹیکنولوجی بھی فنا ہو چکی تھی۔ ایک بے چین قومی شاعر نے ان جرثوموں کے خلاف "استیصالی جنگ" کرنے کے لیے اپنے پُراثر خطاب سے جوش دلایا: جو یہ مہم کسی اور طرح سر نہ ہو سکے تو ہم کالے کلوٹے افریقا کو بارودی سرنگوں اور ڈائنامائٹ سے اُڑا دیں اور اُس کو بالکل اُسی طرح غرق کر دیں جس طرح ہم نے نافرمان اٹلانٹس کو دریا بُرد کیا تھا۔ بارودی

Scanned with CamScanner

سرنگیں اور ڈائنامائٹ: شکر ہے یہ چیزیں ہمارے پاس افراط تھیں! پس ہم نے کالے کلوٹے افریقا کو بڑے جاہ و جلال سے غرق کر دیا۔ یہ مہم سر ہوئی نہیں کہ ایک مورخ نے مطالبہ کر دیا کہ ہم اپنے قدیم ہم نبرد، فاتح اور خون بہانے والے ایشیا کے خلاف "استیصالی جنگ" کریں۔ مورخ نے ہمارے اجتماعی حافظے کو تازہ کیا تو ہم نے ایشیا کو بھی سپردِ آب کر دیا۔ ہماری مسلح طاقت میں اضافہ ہوتا گیا تو تباہ کرنے کے لیے کئی بدبخت براعظم موجود تھے۔ سب سے پہلے ہم نے اپنے پرانے حریف مغربی نصف کرّے کا دونوں امریکاؤں سمیت صفایا کیا (یہ ہم نے اپنی اکیڈمی آف آرٹس اینڈ سائنسز کی خصوصی فرمائش پر کیا)۔ بد قسمتی کہ ساحلی ملک روس تمام کا تمام ترخ کر الگ ہو گیا اور امریکاؤں کی مثل کھسکتا ہوا قطبی سمندروں میں گم ہو گیا۔ جس دوران ہم تمام مظلوموں کے نام پر ایک منظم قہر کے مانند سب سے انتقام لینے میں مصروف تھے، کرۂ ارض کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی اور سب کچھ سیدھا جہنم رسید ہوا۔

صرف سربیا سلامت رہ گیا۔

جب ہم ان کارگزاریوں سے بامُراد نکل آئے تو آخر کار ہم ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ ہم نے ایک دوسرے کو تقریباً آخری آدمی تک تہِ تیغ کیا۔ ایک قومی راہب نے عالمِ بالا سے دعا کی کہ جو بچ رہے ہیں اُنھیں اپنے پاس بلا لے، اور یوں ہم کرۂ ارض کو چھوڑ کر غیبی سلامتی کی تلاش میں نکل گئے۔

عالمِ بالا میں وہی پُرانی ناانصافیاں ہماری منتظر تھیں، بس یہ کہ اب وہ آسمانی تھیں۔ فوراً ہی ہم نے فرشتوں میں ٹھنوا دی جس کے نتیجے میں فرشتوں اور جہنم کے ہیبت ناکوں دونوں سے نجات حاصل ہو گئی تو ہم نے قادرِ مطلق کی طرف پرواز کی۔ جب اُس نے ہم کو آتے دیکھا تو فوراً اقرار کر لیا کہ وہ بھی سرب ہے۔ اُس نے کہا: "مگر مجھ سے زبان مت چلاؤ۔"

بے لڑے جھگڑے بسر کرنا ہم سربوں کے لیے نہایت بیزار کن تھا اور وہاں اُس کے سوا کوئی دوسرا تھا نہیں جس سے ہم بھِڑتے، چناں چہ ہم نے اُس سے منہ زوری شروع کر دی۔ اُس نے ہمیں شکست فاش دی (آخر وہ قادرِ مطلق جو ہوا)۔ اُس نے ہمیں زمین پر دے پٹخا، اصلی جیتے جاگتے سربیا میں، جو کہ آپ جانتے ہی ہیں اُن چند در چند حریفوں میں گھِرا ہوا ہے جو موقعے کی تاک میں بیٹھے ہیں۔۔۔

***

مشہور ادیب پروفیسر کے حضور

ہم ادیب پروفیسر کے آفس میں پیش کر دیے گئے: ادیب پروفیسر کا شناسا میرا ایک دوست اور میں۔

ادیب پروفیسر نے ہماری پذیرائی اپنی تازہ ترین ناول کی شان میں رطب اللسان اخباری تراشوں سے فرمائی اور ہم کو ایک فوٹو البم دکھانے لگے جو کبھی نیویارک کے مشہور ناشر مسٹر الفریڈ اے ناف کی ملکیت رہا تھا۔ مسٹر ناف نے سائنس داں البرٹ آئنسٹائن سے لے کر ٹامس مان جیسے ادیبوں تک اپنے تمام مشہور دوستوں کے پورٹریٹ اس میں لگا رکھے تھے۔ البم کے آخر میں--- ایک خالی صفحہ تھا۔ ادیب پروفیسر نے معنی خیز نظروں سے ہماری طرف دیکھا اور ہم نے موصوف کے اَن کہے خیالات کو خود ہی مکمل کر لیا۔ پھر آپ نے گوناگوں مطبوعات ہمارے سامنے پھیلا دیں۔ اپنی کتابوں اور دھڑادھڑ بکنے والی ناولوں کے تازہ اور پُرانے نسخے۔ موصوف کی ہم سے توقع تھی کہ ہم صفحات پر ٹھٹھکیں، غور سے مطالعہ کریں، آہستہ آہستہ ورق پلٹیں، چھپائی کی تعریف کریں، اعلیٰ چکنے کاغذ کی عمدگی سے لطف اندوز ہوں--- پھر اُنھوں نے نقرئی پنّی میں بند میوہ بھری چاکلیٹ مرحمت فرمائی جس پر موصوف کی شبیہ نقش تھی (اس کے حقوق بھی آپ نے نہ جانے کس کس کو جانے کہاں کہاں فروخت فرما رکھے تھے)۔ آخر میں آپ نے ہم میں سے ہر ایک کو تحفہ عنایت کیا: پہلے موصوف کے نام سے مزیّن ایک ایک قلم، اور پھر ایک پل ہچکچانے کے بعد ایک ایک ٹی شرٹ جس پر آپ کی ایک ناول کا پہلا فقرہ چھپا تھا جو عہد نامہ عتیق کے پہلے فقرے سے ٹکرا گیا تھا، مگر ادیب پروفیسر نے حقِ تحریر قبول کرتے ہوئے نیچے اپنے دستخط ثبت کر رکھے تھے۔ چلتے چلتے موصوف نے پیرس ٹی وی کے تیار کیے ہوئے اپنے وڈیو ٹیپس دیکھنے کا مشورہ دیتے ہوئے اپنی شان دار مونچھوں کو ایک ایسے ٹشو سے پونچھا جس پر موصوف کا نامِ نامی نقش تھا۔

ہم نے کوئی ایک گھنٹا ادیب پروفیسر کی تعریف و توصیف میں گزارا۔ پھر ہم کو نرم بھرائی والے دروازوں سے باہر لے جایا گیا تاکہ ادیب پروفیسر کی اپنی شان میں خود کلامی کو، جو وہ رہ رہ کر گلا صاف کر کر کے اسی خوب صورت لہجے میں بہ آوازِ بلند فرما رہے تھے، کہیں ہم سن نہ لیں۔

***

Scanned with CamScanner

آخر میں ہوں کون؟

(1)
I am Serbo Serbich Serbovich from Serbia.
And I am Serbius Serboyevich from Serbian Serbs.
I am Serbissimus Serbissimich Serboserbissimich from the
Serbest Serbdom.
And I, Serbentius Serboserbich Serbinsky from Serbiancy.
I, however, Serbonopalus Serbander Serboleon.
And we are Serbonosors, Serbolomons, Serbokrishnans,
Serbiikes and Serblings,
Serboslavs, Serbophiles, Serbomaniacs,
Serbostafarians, Serbumlocutionists, and
Serbs, Serbs, Serbs...

(2)
I am Croatus Croatich Croatiyevich from Croatnik.
And I am Croaimir Croatovich Croatichek from Croatowitse.
I am Croatin Croat Croatinich from Croatian Croatburg.
And I am Croatlaff Croatlaffson from Croatisk Croatholm.
I, however, of Croatianist Croatiandom am Croat, from Croatian
Croatia.
And we are Croationalists, Croatoids, Croatopedes,
Craotocentric Turbocroats from Croatosphere,
Croats,.Croatarchists, Archcroats...

***

پھر دیر ہو گئی

میں تیز تیز گھر سے باہر آتا ہوں (ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں) اور ہاتھ ہلا کر ٹیکسی بلاتا ہوں۔ میرے سامنے ایک ٹینک آکھڑا ہوتا ہے۔ بھنبھناہٹ کے ساتھ اس عفریت کا گنبد کھلتا ہے اور ڈرائیور کا باچھوں تک کھلا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔

کہاں کو، دوست؟"

"نمائش گاہ۔"

Scanned with CamScanner

"آجاؤ!"

میں اندر کود جاتا ہوں اور پوچھتا ہوں: "یہ کب سے ٹیکسی ہو گیا؟"

"کل رات سے۔"

"اچھا!" میں چکراتے ہوئے کہتا ہوں۔ "کوئی نئی قسم کی ٹیکسی سروس ہو گی۔"

وہ جواب نہیں دیتا، الٹا پوچھتا ہے: تم نمائش کیوں جا رہے ہو؟"

"ایک عالمی کتب میلہ لگا ہے،" میں بتاتا ہوں۔

"ایسا؟" وہ تجسس کو چھپاتے ہوئے پوچھتا ہے۔ "آج کل کون سی بیسٹ سیلرز چل رہی ہیں؟"

"The Years of the Gordian Knot"، میں اسے بتاتا ہوں۔ "کسی مدمغ سیاست داں نے لکھی ہے۔ اور میلورا و پاویچ کا Paris Match والے معمّوں کا نسخہ۔"

"مدمغ کیا؟"

"بھئی--- گھمنڈی۔"

"اوہ--- اور عسکری ادب؟"

میں اُچھل پڑتا ہوں جیسے جھٹکا لگا ہو۔ "ارے وہ کوئی پڑھنے والی چیز ہے؟ وہ تو تم اپنے چاروں طرف دیکھ سکتے ہو۔ فوج رمنوں پارکوں کے بجائے جگہ بے جگہ ہرے پیڑ لگا رہی ہے۔ اُس نے سڑکوں کو برباد کر دیا ہے اور اب تو وہ سواری بھی ٹیکسی کے بجائے ٹینکوں میں کروا رہی ہے!"

ٹیکسی ڈرائیور مشکل سے "سوری، دوست!" کہہ پاتا ہے کہ ہماری ٹیکسی پر گولیوں کی بوچھاڑ پڑتی ہے۔ جواب میں میرے ڈرائیور نے بھی پے در پے مارٹر داغ دیے ہیں۔

"یہ کیا ہوا؟" میں مارے خوف کے بَولا کر چلّاتا ہوں۔

"اپنے دھندے کا ساتھی تھا۔ ہیلو بول رہا تھا۔" اس نے شانِ بے نیازی سے کہا۔

"تمھارا ساتھی بھی ٹیکسی ڈرائیور ہے؟" میں نے پُرسکون ہونے کی کوشش کی۔

"نہ۔ وہ پرٹنالیہ ہے۔"

"پرٹنالیہ؟"

"پرٹنالیہ تم لوگوں کی پڑتال کے لیے ہوتا ہے، تم پر نظر رکھتا ہے، تاک میں رہتا ہے کہ کب تم کو دبوچے اور اندر کروائے۔ وہ تمھارا سب سے خطرناک دشمن ہے۔ وہ تو تار پہ بیٹھی چڑیا کو بھی بند کروا سکتا ہے!" یہ دیکھتے ہوئے کہ میں پرٹنالیے کا سماجی مصرف سمجھ نہیں پایا ہوں، وہ پوچھتا ہے: "کیا اب تک تم کبھی پکڑے نہیں گئے؟"

Scanned with CamScanner

میں نے فوراً موضوع بدلا۔ "اجازت ہے، سگریٹ جلالوں؟"

"بالکل نہیں۔ ماچسیں وہ پڑی ہیں، فیوز یہ رہے، اور اُس کمپارٹمنٹ میں تم کو ایک دو بم اور کچھ مولوٹوف کاک ٹیل بھی مل جائیں گے۔"

"نہیں بھائی، میں صرف سگریٹ جلانا چاہتا ہوں۔"

"اچھی بات، دوست۔ اگر کبھی تمھارا دل بم مارنے یا کاک ٹیل جلانے کو مچل ہی جائے تو تمھیں معلوم ہے وہ کہاں رکھے ہیں۔"

"بم بھلا میں کس پر پھینکوں گا؟" میں حیرت میں ڈوبا ہوا ہوں۔

"کس پر کیا معنی؟ شہری ہیں، معصوم تماش بین ہیں، بے فکرے ہیں، عاشق معشوق ہیں،" وہ غراتا ہے۔ اس کی آنکھیں لال لال ہیں۔

"پلیز رک جاؤ! یہیں رک جاؤ، اسی جگہ!" میں چلاتا ہوں اور سواری سے جتنی جلدی ممکن ہو نکل جانا چاہتا ہوں۔

"یہ جگہ ہے جہاں تم کو جانا ہے؟"

"ہاں، بالکل یہی۔ روکو یہیں!"

"جہاں میں چاہوں گا وہاں رُکیں گے۔ ہم اب دوسری جگہ چل رہے ہیں۔"

"مگر کس جگہ؟" میں گھبرا کر چلاتا ہوں۔ "تم مجھے کدھر لے جا رہے ہو؟"

"ارے پریشان کیوں ہوتے ہو، میں تم کو اصل منزل پر لے جا رہا ہوں، اسلحہ اور مہلک ہتھیاروں کا بین الاقوامی میلہ۔ تمھارا کتابوں والا میلہ کینسل ہو گیا۔"

جس بیضوی ہال میں ہم داخل ہوئے اُس میں کتابیں واقعی نہیں تھیں، صرف جدید ماڈل کے ٹینک، مارٹر، بزوکا اور ایسی دیگر اشیا تھیں۔ نمائش گاہ کے شیشے والے بڑے سے گنبد پر یہاں سے وہاں تک ایک اشتہاری جملہ درج تھا: "اس جگہ ہم نے وقت کی طنابیں کھینچ لی ہیں!"

میں یہ شعبدہ سمجھ نہیں سکا۔ کل ہی مَیں اس نمائش گاہ میں آیا تھا اور ہر جگہ ٹینک نہیں کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ "راتوں رات یہ کیا ہو گیا؟" میں نے بہ آوازِ بلند حیرت کا اظہار کیا۔

"بھیا نوکرشاہی مخالف انقلاب! اپنے پیارے قدامت پسند عناصر (دراصل سارے ہی عوام) نے آخرکار معاملات کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے اور جیسا کہ تم دیکھ سکتے ہو، ہم یہاں اپنے سرکاری ادب کے صرف پنجر کی نمائش کر رہے ہیں۔ آؤ شروع سے دیکھیں۔ سمجھ لو کہ میں تمھارا ورجل ہوں۔ تم پوچھو گے کہ میں ورجل کو کیسے جانتا ہوں؟ میرے دادا کا نام ورجل تھا اور میرا پردادا ماقبلِ ورجل تھا۔ ہمارے خاندان میں دو عدد آرک ورجل بھی تھے اور دونوں ہی چیف آف

Scanned with CamScanner

جنرل اسٹاف بنے۔"

"اور یہ دیگر نمائشی اشیا کیسی ہیں؟"

"یہ رتھ اور اس کے اصلی بھُس بھرے دونوں گھوڑے The Age of Death میں سے آئے ہیں۔ رائفلیں Far Off Is the Sun والی ہیں۔ اسلحہ Roots کا ہے۔ وہ دو عدد بندوقیں جو وہاں رکھی ہیں The Confidant سے تعلق رکھتی ہیں۔ گفتگو سننے والے آلات The Sinner سے ہیں۔ وہ توپیں The Outlaw والی ہیں۔ چاقو The Executioner سے لیا گیا ہے اور مارٹر The Avenger سے۔۔۔"

میں قطع کلام کرتا ہوں۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے، مگر یہ مردود ہوائی جہاز کہاں سے نکالے؟"

"جرح چھوڑو، سمجھے؟ وہ جو کلہاڑی دیکھ رہے ہو وہ Love on the Landslide سے ہے۔ سنگینیں Morlaks والی ہیں اور یہ پستولیں Kurlans کی۔ مشین گن Getaway سے آئی ہے۔ جہاں تک بموں کا تعلق ہے وہ The Three Vigilantes میں سے ہیں جو ہمارے چار ادیب بمباروں کی مشترکہ تصنیف تھی۔"

میرا اورجل بولتا چلا گیا بولتا چلا گیا یہاں تک کہ ہم نے اپنے آپ کو شعبۂ غیر آتشیں اسلحہ برائے سیکنڈری اسکول (لازمی مطالعہ) میں پایا۔ اس جگہ تو پورا کا پورا مہلک ہتھیار خانہ تھا: تلواریں، خنجر، کُلاب، درانتیاں، ہتھوڑے، خود، زنجیریں، گیس مار اور قینچیاں۔ ہر شے کا تعلق ہمارے کسی نہ کسی قومی کلاسیکی اور ہم عصر ادب سے تھا۔

"اِدھر کوئی ایسا ہال بھی ہے جہاں نمائش کا عنوان The Eternal Bachelor یا Miss Sabine ہو؟" میں بدلحاظی سے پوچھتا ہوں۔

"کیوں؟ کس لیے؟ تجرد اور گھٹیا ذوقِ لطیف کی حوصلہ افزائی کے لیے؟"

میں نے مزید سوال نہ کرنے کا فیصلہ کیا، اور جس دوران میرا اورجل کسی ادب والی نیم خودکار رائفل کے بارے میں رطب اللسان تھا، میں موقع غنیمت جان کر وہاں سے کھسک لیا اور فوراً ہی دو بڑے بڑے جنگی جہازوں کی اوٹ میں تھا۔

باہر نکل کر سڑک پر آتے ہی میں نے فوراً ایک بکتر بند سواری پکڑی اور سیدھا زار دُوشاں ریستوران پہنچا۔ وہاں ٹیکسی اڈے پر میں نے کوئی سو کے قریب ٹینک کھڑے دیکھے۔ اڈے پر کھڑے وہ بالکل اُن خارپشتوں کی طرح نظر آ رہے تھے جو سانپوں کی تاک میں ہوں، اپنے مسافروں کی۔

آخر میں موسکوا ہوٹل میں تھا جہاں میں نے ایسپریسو کے ساتھ بسکٹ کھا کر آدھ ایک گھنٹا

Scanned with CamScanner

گزارنے کا ارادہ باندھا۔ میرے پہلے ہی گھونٹ اور پہلے ہی تھے کے درمیان بد حواس شہریوں کا ایک ہجوم کھڑکیوں کو پھلانگتا، میزوں کو پلٹتا، کرسیوں کو اُلٹتا کیفے میں گُھس پڑا۔ پیچھے پیچھے آگ بگولا پولیس والے (میں نے اُنھیں اس قدر غصے میں کبھی نہیں دیکھا تھا) بندوقیں اور ڈنڈے تانے لپکے چلے آرہے تھے۔

میں نے سگریٹیں اٹھائیں اور دو چھلانگوں میں کمرے کے دوسری طرف پہنچ گیا اور ایک کھڑکی کے سخت شیشے کو توڑتا ہوا نکل گیا۔ بلقان اسٹریٹ میں فوجی اور رضاکار فوجی ہر مہیا کردہ ذریعے سے اژدہام کو منتشر کرنے میں مصروف تھے۔ ایک ہیلی کاپٹر سروں پر اتنا نیچا اُڑ رہا تھا کہ چھوا جا سکتا تھا، چناں چہ میں نے نِنجا کی سی پھرتی سے اس کے ہینڈلوں کو پکڑلیا۔ جیسے ہی چا پر اوپر اٹھا میں پورا منظر دیکھ سکتا تھا۔ بڑا گھمسان کا رن پڑا تھا۔ سنٹرل ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارموں پر بھی کارروائی جاری تھی جہاں مظاہرین آئی ہوئی ریل گاڑیوں سے اُتر رہے تھے اور فائرمین اُن پر پانی کے دھارے مار رہے تھے۔

ہیلی کاپٹر وہاں سے ڈولتا ہوا ہٹا اور آسمانوں میں بلند ہوتا چلا گیا۔ میں ساوا دریا میں جنگی جہاز دیکھ سکتا تھا۔ ہوائی جہازوں کا ایک بڑا پرشنگ میزائلوں سے لیس آسمانوں میں اِدھر سے اُدھر اڑتا پھر رہا تھا۔ میرا ہیلی کاپٹر قلعہ میدان پارک میں فتح کی لاٹ کے پاس اترا۔ میں چپ چاپ اتر کر رات کے انتظار میں جھاڑیوں میں جا چھپا۔

دن کے ساتھ جب دن بھر کے ہنگامے اپنے اختتام کو پہنچے تو میں رات کی تاریکی میں اپنی پناہ گاہ سے نکلا اور اس امید پر ایک ڈونگے میں سوار ہو کر دریا میں نکل گیا کہ وہ مجھے دور بحرِاسود اور خوب صورت شہر اوڈیسا تک لے جائے گا! لوگ کہتے ہیں کہ اینٹی آئزنسٹین نامی ایک شخص وہاں پر "عظیم انقلاب کا خاتمہ" کے نام سے ایک فلم بنانے والا ہے۔ امن و آشتی کی خواہش ابھارنے والی ایک نئی فلم جس میں کوئی سپاہی اور کوئی فوجی نہیں ہو گا۔

پھر مجھے اپنے نتھنوں میں نیپام کی دھانس پیدا کرنے والی بُو محسوس ہوئی اور میں نے آسمان میں ایک دیوقامت مشروم سا بادل اُٹھتے دیکھا۔

اِس مُلک میں جب وہ لگام دینے پر آتے ہیں تو آخری حد تک جاتے ہیں، یہ تھی وہ آخری بات جو میں نے سوچی۔

***

ریڈیائی لہروں کے فراز پر

کل رات میں نے ریڈیو کھولا تو یہ گفتگو سنی:

"میں اپنے سامعین کو آج شام اسٹوڈیو میں آئے ہوئے مہمانوں سے متعارف کرانا چاہتا ہوں۔ آپ ہیں ہماری قوم میں مشہور ادیب مسٹر یووان چچک اور مسٹر بوگولیوب پلاوچک۔"

"اول ہم۔ جی میں یووان نہیں ہوں۔ مجھے سویتا کہتے ہیں۔ یووان تو روسی اور سرکیشین زبانوں کے بہت عمدہ مترجم ہیں۔ اگر وہ سن رہے ہیں تو موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں ان کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہوں۔ ہائی یووان، حال چال کیسے ہیں؟ کون کون سی نئی چیزیں ہمارے لیے تیار کر رہے ہو؟ گھر میں سب خیریت تو ہے نا؟"

"معافی چاہتا ہوں مسٹر سویتا چچک، زبان اُلجھ گئی تھی۔ ہم اپنے سامعین سے بھی معذرت خواہ ہیں۔ ذاتی طور پر آپ سے اور مترجم مسٹر سویتا چچک سے میں اپنی اس لغزش۔۔۔"

"نہیں نہیں صاحبزادے، میں ہوں سویتا اور وہ ہیں یووان۔"

"معافی چاہتا ہوں، وہ ہیں یووان اور آپ ہیں سویتا۔۔۔"

"اور میں بھی بوگولیوب پلاوچک نہیں ہوں بلکہ بوگولیوب آئی پلاوچک ہوں۔ دیکھیے اصل میں تین عدد بوگولیوب پلاوچک میرے علاوہ اور ہیں: بوگولیوب ای پلاوچک، بوگولیوب او پلاوچک اور بوگولیوب یو پلاوچک۔"

"میں آپ سے بھی معذرت خواہ ہوں مسٹر پلاوچک۔ اچھا تو اپنے سامعین کی خاطر ایک مرتبہ دُہرا دوں: بوگولیوب اے پلاوچک، نہیں، بوگولیوب آئی پلاوچک۔ میری معذرت آپ سے بھی مسٹر پلاوچک، اور باقی کے ان تمام بوگولیوب پلاوچک صاحبان سے بھی۔۔۔"

یہاں پہنچ کر میں کلچرل نشریات سننا بند کر دیتا ہوں۔

***

عروس البلاد کے ایک روزنامے کے نام خطوط

"ایک جدید ڈیموس تھینیز":

ڈیر سر، زندگی بھر میری یہ تمنا رہی ہے کہ میں ایک لاکھ کے مجمعے سے خطاب کروں۔ بڑے سے بڑا مجمع جس سے مجھے اب تک خطاب کرنے کا موقع ملا سو افراد پر مشتمل تھا۔ یہ خطاب میری اپنی آجروا جیر کاؤنسل سے کیا گیا تھا۔ میں نے میونسپل کاؤنسل میں بھی تقریر کی ہے مگر وہاں پچاس

سے زیادہ افراد نہیں تھے۔

کسی نہ کسی مقام پر تقریر کرنے کا اعزاز حاصل کرنے کی سالہا سال کی جدوجہد کے بعد آخر کار مجھے اپنی مقررانہ صلاحیت کو پرکھنے کا ایک موقع ملا (گو وہ اصل میں مائیکروفون کی جانچ تھی)۔ مقامی اسٹیڈیم میں ایتھلیٹک مقابلوں کے دوران منتظمین میں سے کسی نے مجھ سے آواز چیک کرنے کو کہا۔ اس نے بتایا کہ میں دو تین بار "ایک دو، ایک دو" کہوں تو درستی کا پتا چل جائے گا۔ بہر کیف، اپنے سامنے سات ہزار تماشائیوں کا مجمع دیکھ کر ان سے مخاطب ہونے کی خواہش کو میں دبا نہیں سکا، اور جس وقت تک میری آواز دبا نہ دی گئی گنتا چلا گیا۔ گنتے گنتے میں بانوے تک پہنچ گیا تھا۔ اگر ریموٹ کنٹرول والے ٹاور میں بیٹھے الیکٹریشین مائیکروفون بند نہ کر دیتے تو میں گنتا گنتا دو سو سے بھی اوپر نکل جاتا اور آس پاس والے جو میرے ہاتھ سے مائیکروفون چھیننے کی کوشش کر رہے تھے اپنی کوشش میں آسانی سے کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔

میں نے اپنی چند بہترین تقریریں شکاریوں کی یونین اور مچھیروں کے نیٹ ورک میں کی ہیں، مگر جیسے ہی میں جنگل کی دنیا کے مسائل کا ذکر چھیڑتا وہ لوگ مجھے لات مار کر بھگا دیتے۔ بہر کیف، میں فائر بریگیڈ کا ایک مختصر جامِ صحت پیش کرنے میں کامیاب رہا۔ اس کی سال گرہ کے جشن میں بغیر رکاوٹ پانچ منٹ تک بولا۔ تا ایں دم یہی میرا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس کے بعد سے ہر سال گرہ کے موقعے پر فائر بریگیڈ والے مجھے تقریر کرنے کا موقع دیتے ہیں۔

میں اپنا سارا وقت تقریریں لکھ کر تیار کرنے اور بولنے کی مشق کرنے میں گزارتا ہوں۔ اُس عظیم الشان اجتماع سے خطاب کرنے کا موقع مجھے کبھی نہ کبھی ضرور ملے گا۔ میں اپنا تلفظ، طرزِ بیان، آواز اور ڈھب سنوارنے کے لیے بہت محنت کرتا ہوں۔

"اینٹی کرول":

ڈیر سر، بندے کو ملٹری سروس کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ طلاق شدہ جوڑے کی اولاد (میری والدہ سوئٹزرلینڈ میں رہتی ہیں اور والد جرمنی میں) ہونے کے سبب میں بہت خوش قسمت تھا کہ مجھے ان دونوں ملکوں میں فوجی خدمت کا موقع مل گیا۔ فرانس کے اسپیشل یونٹ میں گھس جانے میں بھی میں کامیاب ہو گیا تھا، مگر جلد ہی میں نے خود کو فلسطین کے اطراف پایا۔ انھوں نے مجھے فِن لینڈ میں جا پکڑا، مگر میں نے اس کا ازالہ یوگوسلاویا کی عوامی فوج میں دو مرتبہ اپنی خدمات پیش کر کے کر دیا۔ دونوں مرتبہ غلط بیانی سے کام لے کر۔ ایک مرتبہ بحیثیت سرب اور دوسری بار بحیثیت کروٹ۔

Scanned with CamScanner

جب اس کام کے لیے قوی جواب دے جائیں گے تو میرا منصوبہ ہے کہ جنگی نامہ نگار بن جاؤں۔ مگر میں "عالمی امن"، "فوجوں کی تخفیف"، "ابدی صلح" جیسی خبروں کو دیکھ دیکھ کر قدرے پریشان ہوں۔ ہم ایسی دنیا میں بھلا گزارا کر سکتے ہیں جہاں جنگ نہ ہو، خون خرابا نہ ہو؟ نوجوان نسل کا لہو گرم رکھنے کے لیے کیا رہ جائے گا؟ میرا کیا بنے گا جس نے پوری زندگی فوجی خدمت میں گزار دی؟ میرے لیے آپ نے کیا سوچا ہے؟

"وقت کاٹنا":

ڈیر سر، نو سال ہوئے میری بیوی مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ ایک شرابی کے ساتھ چلی گئی جس نے اینجلز، بیبل اور ہلمٹ شمٹ کے سیاسی نظریات پر پی ایچ ڈی کر رکھا ہے۔ وہ برسوں اُس کو جرمن یونیورسٹیوں میں ایک کانفرنس سے دوسری کانفرنس میں گھسیٹے پھرا ہے۔ وہ بولی: "رادمن، میں تم سے نہیں بولتی"، اور چلی گئی۔ آپ یقین کر سکتے ہیں بھلا؟ وہ اور مجھ سے بات نہیں کر سکتی! یقیناً اس میں میری ساس کا ہاتھ ہو گا — وہ مجھ سے چڑتی تھی اور ہمیشہ میرے خلاف سازشیں کیا کرتی تھی۔ کیا ہوا جو میں نے اس کے سامنے کے دو دانت توڑ دیے تھے؟ اس کو بھی زمانہ بیت گیا۔ لوگوں کو آخر معاف کر دینا اور بھلا دینا چاہیے نہ کہ خچر کی طرح بات کو پلّے سے باندھ لینا چاہیے۔ "میں تم کو اپنے دانتوں کے لیے تو معاف کر سکتی ہوں کہ میرے ڈینٹسٹ نے سنبھال لیے لیکن ان بلوری گلاسوں کا کیا کروں جو تم نے اپنے ریچھ والے پنجوں سے چکنا چور کر دیے؟" میرے منانے پر اس نے مجھ کو یہ جواب دیا تھا۔ انھیں ریچھ جیسے پنجوں سے میں شوپیں بجایا کرتا تھا، یعنی عظیم لینن کا پسندیدہ پولکا۔ ایک مرتبہ میری ساس نے بڑی حقارت سے طعن کیا: "تم چلتے ہو تو زمین یوں دھمکتی ہے کہ ریکٹر اسکیل بھی اپنی حد سے گزر جائے!" وہ سیکنڈوں میں میرا منھ بند کر سکتی تھی۔ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ آگے وہ کیا کہنے والی ہے، میرے خلاف کون سی دلیل لانے والی ہے۔ چناں چہ میں نے پلٹ کر جواب نہیں دیا، جو کہ میرے خیال میں قاعدے کی بات تھی۔ میرے خیال میں آپ کے قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میری کتنی بجلی منابہت تھی کہ میں پی جاتا تھا۔ ظاہر ہے اس میں اخلاقی فتح میری تھی۔ گو میں نے اپنا منھ بند رکھا مگر میری پولیس یونیفارم والی بیلٹ خود بخود کھل گئی اور اس کے ساتھ لگا ہوا ربر کا ڈنڈا آزاد ہو گیا، اور میں نے اس کو ایسا جواب دیا جس کے وہ لائق تھی۔ اس واقعے کے بعد اس نے مجھ سے بول چال ترک کر دی تھی۔ اور تھوڑے دن نہیں گزرے تھے کہ میری بیوی نے اسباب سمیٹا اور نکل گئی (جیسی ماں ویسی بیٹی) اور بغیر کسی پتے نشان کے اُس پی ایچ ڈی کے ساتھ غائب ہو گئی۔ پہلے بھی وہ چلی جایا

Scanned with CamScanner

کرتی تھی مگر میں نے کبھی بھی پوری طرح اس کا سراغ گم نہیں کیا تھا۔ اور اب دیکھیے -- نو برس گزر گئے ہیں اور میں اُسے پکڑ نہیں سکا ہوں۔ وقت کاٹنے کے لیے خود میں نے اینجلز، بیبل اور بلمٹ شمٹ کے نظریات کا مطالعہ اس امید پر کرنا شروع کر دیا کہ شاید کوئی اشارہ، کوئی حوالہ، کوئی حاشیہ ایسا دستیاب ہو جائے کہ میں اُس تک پہنچ سکوں۔ میں جرمنی جا کر کئی ناشروں سے بھی ملا (اس کے لیے مجھ کو بھانت بھانت کے مضحک سکیورٹی گارڈز سے لڑجھگڑ کر راہ داری حاصل کرنا پڑی) مگر ان میں سے کوئی بھی میری بیوی کا اتاپتا نہ بتا سکا۔ حد یہ کہ میں نے "ابتدائی فعلی ارادیت" کے کچھ مخصوص کورس بھی کر ڈالے اور آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ سے نکلنے والے ماحولیاتی، تبلیغی، امن پسند رسالے، پرچے اور خبرنامے بھی اپنے نام جاری کروا لیے مگر افسوس کہ میں اپنی بیوی کا سراغ لگانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ہو سکتا ہے وہ شخص پی ایچ ڈی بالکل نہ ہو۔ شاید وہ کوئی رجعت پسند دائیں بازو کا انتہا پسند ہو جس نے بائیں بازو کی لفظیات کی اوٹ لے رکھی ہو۔ یقیناً وہ کوئی جعلیا ہو گا! پتا نہیں میری بیوی کس آدمی کے چنگل میں پھنس گئی۔ میں نے ہر اُس دستاویز اور فائل کو بھی کھنگال ڈالا جو میرے ہاتھ لگی، مگر میری بیوی کو نہ ملنا تھا نہ ملی۔ ٹھیک ہے، اس کی بات تو سمجھ میں آتی ہے مگر اُس کی ماں کا آخر کیا بنا؟ وہ کدھر غائب ہو گئی؟ کبھی خیال آتا ہے کہ زمین پھٹی اور دونوں کو نگل گئی۔

میں یہ سب اس امید پر لکھ رہا ہوں کہ شاید کوئی مل جائے جو وقت کاٹنے میں میرا ساتھ دے۔ کیا ایسے کوئی قلمی دوست ہیں جو میرے ساتھ مل کر اینجلز، بیبل اور بلمٹ شمٹ پر کام کریں اور یوں مل جل کر عظیم نصب العین کو اپنا خراج ادا کریں؟ کیا ایسے سیاسی اور ثقافتی مواقع ہیں جن کو میری علمی خدمات کی ضرورت ہو (کہ اب میں ثقافت سے پوری طرح آگاہ ہوں)؟ کیا پی ایچ ڈی کرنے کے لیے میری عمر تو نہیں نکل گئی؟

ایڈیٹر کا نوٹ: اگر آپ اینجلز، بیبل اور بلمٹ شمٹ پر کام کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں تو ہم آپ کو آگاہ کر دیں کہ صرف آخرالذکر ہنوز بقیدِ حیات ہیں۔

"آئیڈیالوجی":

ڈیر سر، میں ایک ایسے شخص کی بیوی ہوں جس کا دماغ سیاست نے نچوڑ ڈالا ہے۔ وہ فلسفے میں پی ایچ ڈی ہے اور دو بچوں کا باپ ہے۔ اور اب تو اس نے بلانوشی شروع کر دی ہے۔ آپ اس سے ٹھکانے کی بات نہیں کر سکتے، خاص طور پر رات کے وقت جب اُس پر اس "ذہنی کرب"

کا دورہ پڑتا ہے جس کا ذکر اس ڈینش فلسفی نے کیا تھا جس کے حوالے میرا شوہر اکثر دیتا رہتا ہے۔ وہ انٹ سنٹ شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی باتیں کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتیں اور سمجھنے کے لیے ہوتا ہی کون ہے سوائے میرے۔ وہ غیر ملکی زبانیں بولنے لگتا ہے اور ایسے ایسے فقرے بول جاتا ہے کہ اس کی ذہنی حالت پر حیرت ہوتی ہے۔ فوراً ہی وہ چند "مظہریات" کے عالموں سے الجھنے لگتا ہے اور بڑھتے بڑھتے بات اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ انہیں "قبائلی مابعدالطبیعیاتی" کا نام دیتا ہے۔ اس کے بعد یوں لگتا ہے کہ ایک بڑے وفد کی شکل میں "عوامیت پسند" اس سے ملنے آگئے ہوں، اور جتنی دیر میں وہ جاتے ہیں میری نیند بھی جا چکی ہوتی ہے۔ اُن کے ساتھ تو بات اتنی بڑھتی ہے کہ وہ ہاتھا پائی پر اتر آتا ہے۔ آپے سے باہر ہو کر اتنے زور سے چلّاتا ہے کہ رات کے تین بجے سب کو سنائی دے جائے۔ "تمھارے فاشی نظریات اور اعمال جہنم میں جائیں!" اوپر والی مسز شیوچ بار بار اپنی کھڑکی کھول کر کھانستی کھنکھارتی ہے۔ بعض اوقات تو صرف گلا صاف کر کے رہ جاتی ہے لیکن بعض اوقات جب وہ اندازہ نہیں لگا پاتی کہ ہم سن رہے ہیں یا نہیں تو وہ کھانس کھانس کر اپنے پھیپھڑے پھاڑ ڈالتی ہے، اور ادھر میں پریشان ہوتی رہتی ہوں کہ دکھیاری کہیں کھڑکی سے لڑھک کر سڑک پر نہ آ پڑے۔ مگر میرا شوہر دن نکلنے تک جاری رہتا ہے۔ سماجی سائنس دانوں، قانون سازوں، سیاست دانوں، حتیٰ کہ تالے بنانے والوں اور مزدور طبقے کے دیگر نمائندوں کے ساتھ اس کی بحث و تکرار مسلسل چلتی رہتی ہے۔۔۔ جیسا کہ ایسے موقعوں پر ہونا چاہیے، مجمع تتر بتر کرنے کے لیے پولیس بھی آتی جاتی ہے، پیچھے پیچھے سرکاری افسروں، میڈیا نظریہ بازوں اور ٹی وی شخصیات کی آوک جاوک لگی رہتی ہے۔ سب سے آخر میں فائر بریگیڈ کا ایک فائرمین آتا ہے جو "گنجا سُوپرانو" کہلاتا ہے۔ اب مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔ شادی شدہ زندگی کے میرے سارے خواب چکنا چور ہو چکے ہیں۔ آئیڈیالوجی ہر چیز میں سرایت کر گئی ہے۔

"اُن کے لیے جو کبھی کامیاب نہیں ہوئے، مگر ہمہ وقت حاضر رہے کہ شاید کبھی":

ڈیر سر، میں جمہوری اصولوں پر چلنے والا آدمی ہوں پر آج کل آپ کو عملی بھی ہونا چاہیے۔ اجازت دیجیے کہ میں اپنی بات کو ایک سبق آموز مثال سے واضح کروں۔

ایک روز میں سڑک پر جا رہا تھا کہ مجھے اپنے نزدیک سے گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ آواز کی طرف دیکھا تو کوڑے دانوں اور پارکنگ میٹر کے پاس میں نے انتہا پسندوں کی ایک ٹولی کو اپنا راستا روکے دیکھا۔ جعلی وائلن کے ڈبے، ٹرمپٹ کے کیس اور ایک بڑی سی ڈبل باس اٹھائے وہ سر سے پیر تک مسلح تھے۔ معصوم راہ گیروں کے چہروں پر سراسیمگی نظر آ رہی تھی اور بعض تو

Scanned with CamScanner

بالکل بدحواس تھے۔ مگر اُنھوں نے مجھ "موسیقار" کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ میں فوراً ہی اُچک کر ایک کھڑی کار پر چڑھ گیا اور ہوا میں ہی ان پر بندوق تان لی۔ جب میں سڑک پر اترا ہوں تو وہیں کے وہیں پورے گروہ کا صفایا ہو چکا تھا۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان کو ختم کر دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر میں پھر کہوں گا کہ اگر میں ان کا صفایا نہ کرتا تو یقیناً کسی اَور نے ان کو ٹھکانے لگا دیا ہوتا۔

"چوبیس گھنٹے بلغراد سے (شناخت کا بحران)":

ڈیر سر، جی ہاں، میں مانتا ہوں کہ میں اپنے من پسند ریڈیو اسٹیشن کا دیوانہ تھا مگر چند دن پہلے تک۔ پہلے میں اس کو دن رات لگاتار سنتا رہتا تھا، روزانہ چوبیس گھنٹے۔ سوتے وقت بھی میں اسے بند نہیں کرتا تھا۔

اب سنا ہے کہ اُنھوں نے اسے بند کر دیا۔ خود آپ کے اخبار نے بھی ایک مضمون میں بتایا تھا کہ وہ ریڈیو اسٹیشن اپنے "تباہ کن سامعین" کی وجہ سے بند کر دیا گیا۔

اس خبر نے مجھے ایک بھیانک شناختی بحران میں مبتلا کر دیا۔ جلد ہی دوسری نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ مگر تکلیف کے اصل ماخذ کا کڑوا سامنا جو کیا تو میں اس بحران سے بہت توانا اور پُرعزم ہو کر نکل آیا۔ میں نے اپنی فطرت سے بغاوت کر دی۔

چناں چہ، میں معذرت کرنا چاہوں گا اُن تمام افراد سے جو اس اسٹیشن کے سامعین سے خوف زدہ ہوے اور جن کے جذبات کو ٹھیس پہنچی۔ خود ایک "تباہ کن سامع" ہونے کی حیثیت سے مَیں اپنی خطا مانتا ہوں اور تہہ دل سے اُن تمام عرق ریز کمیٹیوں، ڈپٹیوں، نمائندوں وغیرہ کا شکر گزار ہوں جنھوں نے ایک اہم حقیقت کی نشان دہی فرمائی۔ اپنے ضمیر سے رجوع کرنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ عدالت کے سامنے پیش ہو جاؤں اور درخواست کروں کہ میرے خلاف جتنی جلدی ممکن ہو فردِ جرم عائد کر دی جائے۔ میرا مطالبہ ہے کہ میرے لیے کڑی سے کڑی سزا تجویز کی جائے۔ میں اپنی برّیت کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ میں تعجب سے سوچتا ہوں کہ اگر مَیں اور میری طرح کے دوسرے تباہ کن سامعین کوئی دوسرے ریڈیو اسٹیشن سننے لگے تو کیا ہو گا۔ کیا وہ سب بھی بند کر دیے جائیں گے؟

***

Scanned with CamScanner

میں حاضر ہوں

بذریعہٗ ہذا میں آگاہ کرتا ہوں کہ میں کسی بھی رضاکار دستے میں شامل ہونے کا متمنی ہوں۔ ملک میں آئے ہوئے چوں کہ مجھے زیادہ دن نہیں ہوے ہیں، اس لیے مجھے علم نہیں ہے کہ ملک کو کہاں کہاں لوگوں کی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی ضرورت کے لیے رضاکار بھرتی کیے جا رہے ہیں اور میں اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ کسی بھی اتھارٹی کے حضور، چاہے جس کام کے لیے اُسے میری ضرورت ہو، میری خدمات حاضر ہیں۔

**

Scanned with CamScanner

ترجمہ: عطا صدیقی

آگسبرگ

آگسبرگ یہاں سے بہت دور ہے۔ میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ کہتے ہیں کہ وہاں ساٹھ ہزار نفوس بستے ہیں اور وہ بے حد خوش حال شہر ہے۔ آگسبرگ جرمنی کا سب سے بڑا شہر ہے اور لوگ وہاں رہنا پسند کرتے ہیں۔

اگست۔ تین دن سے میں اپنے اس اندھیرے فلیٹ میں ادھر سے اُدھر چکر لگا رہا ہوں۔ باہر اگست کی دھوپ جگمگا رہی ہے۔ ریڈیو غیر ملکی سیاحوں کو یہ باور کرانے کی سر توڑ کوشش کر رہا ہے کہ سلووینیا میں ہر طرف امن و امان ہے۔ جنگ تو کہیں اور ہو رہی ہے۔ جنگ اُس کونے میں رکھے ٹیلی وژن میں ہو رہی ہے۔ دنیا کے اُس روزن میں جو میرے سامنے روز نئی نئی لاشیں پیش کر دیتا ہے۔ اُس ڈبے میں جہاں پروپیگنڈے کا دیوانہ پن کسی مبتذل تخیل سے نکلی ہوئی تصویروں کو اُلٹتا بدلتا رہتا ہے۔ بولنے والے بیشتر بونگے ہوتے ہیں۔ جب بولنے والے ذہین ہوتے ہیں تو وہ باغباں کو خوش اور صیاد کو راضی رکھنے والی کہتے ہیں۔ ہر شے سپاٹ اور بے جان ہے۔ سیاسی اُتھل پتھل سے کایا پلٹ تک۔ اُتھل پتھل؟ کایا پلٹ؟ اتھل پتھل، صحیح، مگر کس طرح کی؟ کایا پلٹ، بجا، مگر کس قسم کی؟

وقت تو وہ آنے والا ہے جب میں خوش ہونے کی ترکیب سے بھی نابلد ہو جاؤں گا۔

خوش تو ہم جی بھر کے ہو چکے۔ دو طویل برسوں تک ہم نے خوب بغلیں بجائی ہیں۔ اب ہم بد ذائقہ، ٹوٹتے خُمار کے بعد ہوش میں آ رہے ہیں۔ خواب جیسی تصویریں آئے چلی جا رہی ہیں۔ راستوں کے مناظر۔ ہمارے سفر کی نرالی تصویریں۔

میں نے ایک مرغی کا خواب دیکھا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ ذبح کی جا رہی تھی۔ آگسبرگ کے سفر پر روانگی سے قبل ہم مرغیاں ذبح کیا کرتے تھے۔ مرغیاں ذبح کرتے تھے اور جمالیات پر بحثتے تھے۔

Scanned with CamScanner

لیوبلیانا شہر میں تھیٹر کے ایک کھیل میں اداکار اسٹیج پر مرغی کی قربانی کی رسم ادا کیا کرتے تھے۔ وہ اُس کی گردن اڑاتے، پھر ایک خوب صورت بالوں والا اداکار اُس کو ٹانگوں سے پکڑ کر اٹھا لیتا۔ کچھ دیر تڑپتی اور پھڑپھڑاتی، اور پھر مر جاتی کیوں کہ اُس کا سارا خون بہہ چکا ہوتا۔ صرف تھوڑا بہت ایک سفید برتن میں ٹپکتا رہ جاتا۔ اُس وقت تھیٹر میں بیٹھے ایک نوجوان ادیب کی طبیعت مالش کرنے لگتی، گو اُس وقت وہ اپنی اس ناسازیِ طبع کا قائل نہیں تھا بلکہ اس کو اپنے زودِ حس مزاج کی کم زوری سمجھتا تھا۔ وہ تو "فن" اور "کلام" کا قائل تھا جن کا چرچا عام طور پر فن کار بطور نوجوان والے بھرپور ٹریٹ میں ہوتا ہے اور جو خون یا طبیعت کی لمحاتی مالش سے کہیں بڑھ کر اہم سمجھے جاتے ہیں۔ وہ قائل تھا "فن" کا جو اس بات کا حامی تھا کہ مرغی کا ذبیحہ "قربانی کی رسم کی بوطیقا" ہے۔ وہ قائل تھا "کلام" کا جو یہ اضافہ کرتا تھا کہ ایک نخچیر سفید مرغی کی موت "سلووینیا کے اکلوتے ادبی، جمالیاتی فنکشنل تھیٹر کی موت" کے بھی مترادف ہے۔

یہ بہت پُرانے وقتوں کی بات ہے۔ تب بحث بھی جمالیاتی ہی ہوتی تھی۔

جب سلووینی یوتھ تھیٹر اپنا کھیل "حسن اور حیوان" لے کر بلغراد پہنچا تو وہاں ایک واردات ہو گئی۔ بحث اب نظریاتی ہو گئی تھی۔

انھیں فن کاروں نے "قربانی کی رسم والی سیاست" کو ایک اَور فن پارے کے ساتھ جوڑ دیا۔ ایک سال قبل آسٹریا کے پری کہانی جیسے شہر پر زنندارف میں ہرمن نِتش (سلووینی زبان میں "نِتش" کے معنی ہیں: کچھ نہیں، عدم) کے آرگیں مسٹیرین تھیٹر میں مویشی ذبح کیے گئے تھے۔ بہر حال سلووینی فن کاروں نے مرغیاں ہی ذبح کیں۔ اور جب قربانی کی رسم کی بوطیقا کے مطابق مرغی کا خون بہنے لگا تو بلغراد کا ایک مشہور ڈراما نگار ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ممکن ہے اُس نے بھی طبیعت کو مالش کرتے محسوس کیا ہو، بالکل اُس اگلے وقتوں کے نوجوان ادیب کی طرح جس کے زمانے میں اس بوطیقائی ذبیحے کے گرد جمالیاتی مباحث ہوا کرتے تھے۔ مگر اب طبیعت کی مالش یا اخلاقی بحث کا زمانہ نہیں رہا تھا۔ اب دور ہی کچھ اَور تھا۔

فاشسٹ! ڈراما نگار بہت ہی ذمہ داری کے ساتھ چیخا اور فُوں فاں کرتا آڈیٹوریم سے نکل گیا۔ اُف، فاشسٹ! فاشزم مردہ باد! (۱)

یہ تھی سات سال پہلے کی بات، اور مباحث نظریاتی تھے۔ آگسبرگ روانگی سے پہلے ہم نظریاتی بحثیں کیا کرتے تھے۔ قوموں کے درمیان ہونے والی کج بحثیاں۔ اب بھی ہم مرغیاں ہی ذبح کر رہے تھے، کچھ صنعتی پیمانے پر اور کچھ قربانی کی رسم کی بوطیقا کے نام پر۔

اس کے بعد آگسبرگ کے راستے میں کسی ڈرامائی لمحے پر آ کر ہم نے سرحدوں پر لگے خاردار

Scanned with CamScanner

تار کاٹ ڈالے۔

میری ڈیسک پر آسٹریا ہنگری کی سرحد پر لگے خاردار تار کا ایک ٹکڑا پڑا ہے۔ یہی تو اصل نکتہ تھا، تھا کہ نہیں؟ کہ خاردار تاروں کے ٹکڑے ہماری ڈیسکوں پر پڑے ہوں نہ کہ وہ ہمارے میدانوں کے آرپار تنے ہوں۔

بوداپسٹ میں ایک سابق سرحدی گارڈ اب اپنی سرحدوں کی حفاظت کرنے والے خاردار تار سے سیاحوں کے لیے سوونیر تیار کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے تار اصلی ہے، گو ثبوت کوئی نہیں۔ پر میرے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ کہتا ہے، کیا میں ثبوت نہیں ہوں؟

بوداپسٹ کی ایک سڑک ہے، جو میرے خیال میں باجیسی زلنسکی کہلاتی ہے، آپ ایک تنگ راہ داری سے گزر کر ایک احاطے میں داخل ہوتے ہیں جو چاروں سمت سے اونچے اونچے قدیم مکانوں سے گھرا ہوا ہے۔ میں نے اکثر اس احاطے کو خواب میں دیکھا ہے۔ کوئی شخص سڑک کی طرف سے بھاگتا ہوا آتا ہے جہاں گولیاں چل رہی ہیں، اور جان جوکھوں میں ڈال کر چاروں طرف پناہ کے لیے کسی کھلے در کو تلاش کرتا ہے۔ مگر تمام دروازے بند ہیں اور دیواریں کسی جیل کی دیواروں کی طرح آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ یہ سن ۱۹۵۶ تھا۔ اب اسی احاطے میں خاردار تاروں کے ڈھیر لگے ہیں۔ ایک مشین کھٹاکھٹ چل رہی ہے۔ ایک بڑی عمر کا آدمی تار کے ٹکڑے کاٹ رہا ہے۔ ایک کم عمر کا آدمی ان کو صاف ستھرے ڈبوں میں پیک کر رہا ہے۔ دونوں انہماک سے کام میں جتے ہیں۔ کیسا پُرسکون منظر ہے۔ آسٹریا ہنگری کی سرحد کا یہ خاردار تار اب امریکا اور مغربی یوروپ کے سیاحوں کے لیے حقیر سا سوونیر ہے۔ کچھ مدّت تک یہ بہت چلتا ہوا کاروبار رہا، بالکل دیوار برلن کے ٹکڑوں کی طرح۔ اب کاروبار ٹھپ ہے۔ جتنی دیر نوجوان دل ہارنے کے انداز میں احاطے میں بکھرے خاردار تار کے ڈھیروں کی طرف اشارے کرتا ہے، بوڑھا اطمینان سے اپنے ہاتھ صافی سے پونچھتا رہتا ہے۔

جی نہ چھوڑو برخوردار، وہ کہتا ہے۔ جو مجھ سے پوچھو تو ہم اس مال کو ضرور ٹھکانے لگالیں گے، اچھے داموں۔ کلومیٹروں کے حساب سے۔ تھوک کے بھاو۔

باپ بڑا جہاں دیدہ ہے۔ اور اس قسم کا تار ہمیشہ ہی سرحدوں اور کیمپوں کے گرد تنا ہوتا ہے۔ یہ تو واضح نہیں کہ وہ خود اُس وقت کیا سوچ رہا تھا۔ شاید وہ اس تار کو کہیں اَور فروخت کر دیں۔ برآمد کر دیں۔ شاید تھوک کے حساب سے اپنی کسی اَور سرحد پر مقامی استعمال کے لیے دے دیں۔ شاید چیک ماہرین کو دے دیں جن کے پاس سرحدوں پر بچھائی جانے والی بارودی سُرنگوں کا مزید کام آ گیا ہو۔

Scanned with CamScanner

اس بات سے تو سولژے نتسن بھی واقف ہو گا۔ جہاں تک مجھے علم ہے، وہ اب بھی ورمونٹ میں ہے۔ اپنی اراضی پر خاردار تاروں کے اندر احاطہ بند۔ الارموں اور محافظوں میں گھرا ہوا۔

آگسبرگ کے راستے میں ہم نے بہت ہی تزک و احتشام اور خوش دلی سے اپنی دیواریں ڈھا دیں۔

میرے پاس دیوار برلن کا بھی ایک ٹکڑا ہے۔ کیا خوب سوونیر ہے! ایک زمانہ تھا کہ لوگوں کے کارنسوں پر وینس کے گونڈولوں کے چھوٹے چھوٹے ماڈل، ننھی منی طلاکاری کی اشیا، اور "ماما" کہنے والی بولتی گڑیاں ہوا کرتی تھیں۔

آگسبرگ کے راستے میں ہم اُتھل پُتھل سے کایا پلٹ کی سمت بڑھے، خواب سے حقیقت کی طرف۔

آگسبرگ کے راستے میں نسلی اور مذہبی جنگیں پھوٹ پڑیں۔ نسلی اور مذہبی جنگوں کی لپیٹ میں سب سے پہلے سؤر آتے ہیں۔ آگسبرگ کے راستے میں ہم سؤر مارتے رہے ہیں۔ کچھ کھانے کے لیے، کچھ کھیل تماشے کے لیے۔ اب قربانی کی رسم کی بوطیقا کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاتا۔ نہ اس فعل کی علامتی پُراسراریت کا ذکر ہوتا ہے۔

ایک شخص نے، جو وُوکوور کے محاصرے سے صحیح سلامت نکل آیا تھا، بتایا کہ وہ لوگ روزانہ اپنے تہہ خانے کی کھڑکی میں سے ایک لحیم شحیم سؤر کو دیکھا کرتے تھے جو اُس چوک میں پھیرے لگاتا رہتا تھا۔

لوگ یا تو مر چکے تھے اور سڑکوں پر پڑے تھے، یا زندہ تھے اور خوف سے تہہ خانوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ مگر حیوانوں کو کوئی عقل نہیں تھی، وہ سڑکوں پر لاشوں کے درمیان شیلوں کی زد پر کھلے گھومتے پھرتے تھے۔ مگر یہ والا سؤر تھوڑا سیانا تھا۔ وہ یوں ہی منہ اٹھائے نہیں پھرتا تھا بلکہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا چوک پار کیا کرتا۔ جوں جوں وقت گزرا، ان لوگوں نے جان لیا کہ جتنی دیر یہ پُرسکون پشتا چوک میں ہوتا ہے کوئی بھی شیل نہیں گرتا۔ پتا نہیں کوئی قدرتی دوراندیشی تھی یا انسانی سمجھ سے بالاتر کوئی حیوانی سیانا پن، مگر صورت حال تھی بہت حیرت انگیز۔ ہوتے ہوتے وہ لوگ اس سؤر سے اتنا مانوس ہو گئے کہ جس دن وہ نہ آتا یہ اُس کی کمی محسوس کرتے۔ مگر دن لامحدود اور طویل تھے، بعض اوقات راتوں سے بھی زیادہ لمبے۔ پھر غذا ختم ہو گئی اور انھوں نے اس سؤر کو کھا ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ نہ صرف یہ کہ ان کے تہہ خانے میں کھانے کو کچھ نہیں بچا تھا بلکہ گولا بارود بھی ناپید تھا۔ شہر والے خاردار تار کے ٹکڑے ہی داغ دیتے تھے جن سے عام طور پر کوئی مرتا نہیں تھا، البتہ کچھ لوگ زخمی ضرور ہو جاتے تھے۔ بچ جانے والے بتاتے کہ بلغراد

کے فوجی اسپتال میں ان کے سروں سے تار کھینچ کھینچ کر نکالے گئے۔ چناں چہ انھوں نے بھی ایک دن مکمل خاموشی کا فائدہ اٹھاتے ہوے پوری سہ پہر اس سوّر پر خاردار تاروں کی باڑھ مارتے گزاری۔ ظاہر ہے اُس وقت شیل نہیں گر رہے تھے اور وہ پوری توجہ سے شکار کر سکتے تھے۔ وہ سوّر بہت کھایا پیا تھا اس لیے اس کی کھال موٹی تھی اور ہر نشانہ اُس کی چربی میں دھنس جاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ یقیناً اُچکتا اور دوڑ لگا دیتا تھا مگر پھر گھوم پھر کر چوک میں عین تہ خانے کے روزن کے سامنے آ جاتا تھا۔ آخر کار ایک نشانہ اُس کے سر میں لگ ہی گیا، مگر اُسی لمحے آس پاس کے مکانوں پر شیل گرنے لگے۔ ان لوگوں نے رسّی کا پھندا بنایا کہ اس کی مدد سے سوّر کو اندر گھسیٹ لیں۔ انھوں نے تھوڑے بہت قہقہے بھی لگائے کہ رسّی والا سوّر کو پھندے میں پھنسا نہیں پا رہا تھا۔ پھر کسی نے ہمّت کی اور اسی گولا باری میں دوڑتا ہوا چوک میں چلا گیا اور اس لحیم شحیم سوّر کے گلے میں پھندا پھنسا آیا۔ پھر سب لوگ مل جل کر جیسے تیسے اس کو کھڑکی میں سے اندر کھینچ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ تو وُوکوور میں ایک حیوان کے ساتھ یہ ماجرا گزرا۔

اُس نے ان لوگوں کو ایسا تفریح کا سامان مہیا کیا جس نے حملوں کے درمیانی وقفوں کو مختصر کر دیا۔ ان دھماکوں کے درمیانی وقفوں کو جو لاشوں کے انبار چھوڑ جاتے تھے۔ سڑکوں پر، ملبے کے نیچے۔ احتجاج کسی نے نہ کیا۔

اور مرغیاں؟ قاری پوچھتا ہے۔ اب اس کہانی میں مرغیاں کہاں ہیں؟ وہ تو گئیں، مدّت ہوئی کاٹ کوٹ کر چٹ کر لی گئیں، کہانی کی شروعات کے تھوڑی دیر بعد ہی۔

چلو چلو آگسبرگ چلو۔ ہم سب کو آگسبرگ چلنا چاہیے۔

دنوں تک ہم نے حیوانوں کے ساتھ اس فسطائی سلوک پر اپنے بلغرادی ساتھیوں کی طرف سے احتجاج کا انتظار کیا۔ سوّر جو اپنی جان سے گیا اکیلا نہ تھا۔ بہتیروں نے اسی قسم کے غیر حیوانی طریقے سے اپنی جانیں گنوائیں، گھوڑوں نے بھی اور گایوں نے بھی۔ مگر کسی نے احتجاج نہ کیا۔ حالاں کہ کوئی نہ کوئی کر سکتا تھا۔ حیوانوں سے متعلق عالمی اعلامیے کا حوالہ دیا جا سکتا تھا۔ دفعہ ۱۰: کسی حیوان کو انسان اپنی تفریح کے لیے، یا کسی ایسے کھیل تماشے کے لیے جو حیوانوں کے وقار کے منافی ہو، استعمال نہیں کر سکتے۔ نہ کسی نے فاشزم کے بارے میں کوئی اور بات کہی۔ جہاں تک معلوم ہے، کسی نے کچھ بھی نہیں کہا، جو شاید زیادہ معقول بات ہوئی۔

جہاں تک علم میں ہے، وُوکوور کے محاصرے کے دوران حیوانوں کے مارے جانے پر احتجاج صرف ویانا سے آیا۔ انھیں دنوں سلووینیا کے کسی مقام پر بغیر کسی وجہ اور سبب کے، شاید "قربانی کی رسم کی بوطیقا" کی خاطر، چیتنک نام بے موسوم لوگوں نے سفید گھوڑوں کے ایک گلے

Scanned with CamScanner

کو مار ڈالا تو ویانا کا ایک دھڑادھڑ بکنے والا اخبار اپنے پہلے صفحے پر پھٹ پڑا۔ یہ تو حد ہو گئی! اس نے موٹے موٹے حروف میں چھاپا۔ پیلی پیلی نائٹ شرٹس پہنے ایرانی، اخباروں کے بنڈل اٹھائے کاروں کے درمیان چلانے لگے: یہ تو حد ہو گئی!

آگسبرگ کے راستے میں ہم نے ایک نیا شہر بسانے کی ٹھانی۔

اب منظر پر ایک اور ادیب نمودار ہوا۔ یہ عالمی شہرت کا مالک ادیب بازنطینیات کا ماہر پروفیسر تھا۔ جس وقت سرب فوجیں اُس کروشیائی شہر کے کھنڈروں کو آزاد کرا رہی تھیں اور اپنے کالے جھنڈوں پر مُردہ کھوپڑی سجائے اس میں داخل ہو رہی تھیں؛ جس وقت اس شان دار فاتحانہ منظر کو، جس میں آزاد کرانے والے گا رہے تھے: "سلاد دو، گوشت ہے، ہم کروٹوں کو کھائیں گے"، بلغراد ٹیلی وژن کے کیمرے لافانی بنا رہے تھے اور نتیجتاً امریکن ٹیلی وژن ایسوسی ایشن سے سال کی بہترین ڈاکیومنٹری کا انعام پا رہے تھے، اُس وقت اِس عالمی شہرت یافتہ ادیب اور ممتاز ماہر بازنطینیات کی آواز سنائی دی: اس شہر کو اب پوری طرح ڈھا دیا جائے اور بازنطینی طرز پر از سرِ نو تعمیر کیا جائے۔ اور فوراً ہی پوری بات آشکار ہو گئی: یقیناً کوئی شے اگر اہم ہے تو وہ ہے ادب، ڈراما، ادبی بصیرت۔۔۔

انھوں نے ہمیں بتایا تھا کہ آگسبرگ ایک امن اور خوش حالی کا مقام ہے۔ اس کے ارد گرد مذہبی جنگیں پھیلتی رہتی ہیں، انسانوں کے غول کے غول نئے نئے پرچم لہراتے ہوئے، کھیتیوں کو روندتے، لوگوں کو لُوٹتے مارتے اور زنا بالجبر کرتے پھرتے ہیں۔ تاہم آگسبرگ میں لوگ اُسی ایک ڈھب سے، اپنی آگسبرگی فطرت کے مطابق، جیتے اور مرتے ہیں، یعنی یہ کہ وہ محبت بھی کرتے ہیں، کام بھی کرتے ہیں، کاروبار بھی کرتے ہیں اور سٹی کاؤنسل کے لیے اپنے ممبر کو ووٹ بھی دیتے ہیں۔ آگسبرگ کے آسمان میں سنہری گنبد ہی گنبد ہیں اور گرجاؤں میں بیروک اور گوتھک آلٹر ہیں۔ آگسبرگ میں ایک بہت سجی سجائی مارکیٹ اور ایک ریپرٹری تھیئٹر بھی ہے۔

اب جو ہم نزدیک آ گئے ہیں تو دیکھ سکتے ہیں: ہمارے چہار جانب انقلابات آ رہے ہیں، تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اتھل پتھل سے لے کر کایا پلٹ تک۔ آگسبرگ جاتے ہوئے ہم بیونس آئرس میں رکتے ہیں۔ ارجنٹینا میں ایک خاتون فرماتی ہیں کہ یہ فری میسنوں کی کارستانی ہے۔ وہ تمام کمیونسٹ جو فری میسن نہیں تھے، اب خفیہ لاجوں میں شامل ہو چکے ہیں۔ ہم رومِ سوم میں بھی ٹھیکی لیتے ہیں۔ ماسکو کی ایک روسی خاتون پروفیسر فرماتی ہیں کہ سب یہودیوں کا کیا دھرا ہے۔ کمیونزم میں وہ اپنا کام اندر بیٹھ کر کیا کرتے تھے، اب وہ یہ کام "کیتھولک ازم" کے لبادے میں کر رہے ہیں۔ خاتون نے قتل کیے ہوئے سرب بچوں کی تصویریں دیکھی ہیں۔ ان بچوں کے

Scanned with CamScanner

شانوں پر جسم کے خاص خاص حصّوں پر خنجروں کے زخم ہیں۔ یہودی، فری میسن، ویٹیکن۔ خاص طور پر ویٹیکن۔ پاگل پن کی خاصی مقدار براعظم کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔

آگسبرگ کے راستے میں ہر جگہ نت نئی تصویریں ہماری ہم سفر ہیں۔ خواب تصویریں بار بار آتی ہیں۔ یقیناً اتھل پتھل ہوئی۔ ہم کو صاف نظر آتا ہے، یقیناً ہوئی۔ اب باری کایاپلٹ کی ہے۔ آگسبرگ کے راستے میں ہم سلووینیا سے گزرتے ہیں۔ رات کا سماں ہے۔ ریل گاڑی گونگی رات میں دھڑدھڑاتی چلی جا رہی ہے۔ فاصلے پر گھن گرج ہے۔ کھیت جلے پڑے ہیں۔ مُردے دریائے ساوا میں تیر رہے ہیں۔ ایک تنہا گارڈ ہمیں اپنی آنکھوں سے تاڑ رہا ہے۔ پُتلیاں اس کی سرخ سرخ ہیں۔ حقیقت بدل رہی ہے۔ خواب حقیقت بن رہے ہیں۔ نرالی انوکھی کہانیاں ہماری ہم سفر ہیں۔ دریا کے کنارے پھُولا ہوا سوَر تیر رہا ہے اور ایک مرغی، کسی الوہی پرند کی طرح، اس کے اوپر اپنے پَر پھڑپھڑا رہی ہے۔

بوداپسٹ میں ایک کیمیاگر کی ورکشاپ ہے۔ بلغراد میں ایک بڑے کارخانے کے ہال میں لوگوں کا ہجوم لہرا لہرا کر آگے سرک رہا ہے۔ بازنطینیات کا ایک ماہر کھوپڑی اور ہڈیوں والا نشان لیے میدان پار کر جاتا ہے۔ "چلو بوسنیا! بوسنیا چلو!" ہنگری کی ورکشاپ میں جہاں سوونیر تیار کیے جاتے ہیں، جلد ہی رکاوٹیں کھڑی کرنے کے لیے اصل خاردار تاروں کا آرڈر آئے گا۔ چیک ماہرین کو بارودی سرنگوں کے آرڈر ملیں گے، اور روسیوں کو کنسنٹریشن کیمپوں کے۔ گولی اوتوک (۲) پر سیاحت کا کاروبار چمک اٹھے گا۔ آزادی، تحریک۔ اتھل پتھل، کایاپلٹ۔

بوسنیا میں اناٹومی تھیئٹر۔ اور فٹ بال۔ ادب کا ایک مورّخ انسانی کھوپڑی سے فٹ بال کھیلتا ہوا۔ فٹ بال ٹاپ فیورٹ۔۔۔ ایک شاعر پستول اٹھائے۔۔ شاعر ایک کنسنٹریشن کیمپ کا کمانڈانٹ۔

پیارے اللہ میاں، یہ سب سچ ہے۔

کل جو کچھ کروشیا میں ہوا اور آج جو بوسنیا میں ہو رہا ہے، اس کے مقابلے میں کسی برمن نتش کا حد سے تجاوز اور ایہام بالکل بچوں کا کھیل لگتے ہیں۔

یوروپ بھر میں پناہ گزیں ادھر سے اُدھر چکراتے پھرتے ہیں۔ ان کے درمیان آپ کو گم شدہ حیوانوں کی تھکی تھکی خرخراہٹ سنائی دیتی ہے۔ براعظم کی دوسری جانب لاکھوں پناہ گزیں آگسبرگ جانے کے لیے پَر تول رہے ہیں۔

مگر آگسبرگ پہنچنا اتنا آسان نہیں، یہ بات اب ہم جانتے ہیں۔

آگسبرگ کے راستے میں مَیں ابھی تک اپنے فلیٹ میں بند ہوں جہاں تین دن سے اندھیرا

Scanned with CamScanner

ہے۔ باہر اگست کی دھوپ چمک رہی ہے۔ ٹی وی پر جنگ جاری ہے۔ اتھل پتھل سے کایاپلٹ تک۔ کایاپلٹ سے۔۔۔ اتھل پتھل تک؟ اتھل پتھل۔۔۔ کایاپلٹ؟ کایاپلٹ، اتھل پتھل؟ بلقان میں دیوانگی؛ واکلاو ہاویل (Vaclav Havel) کی ریاست کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ پولینڈ میں افراتفری ہے۔ "نئی فیڈرل ریاست" میں (جیسا کہ وہ اب جرمن ڈیموکریٹک ریپبلک کو کہتے ہیں) سب خفیہ پولیس کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے ہیں۔

خواب اور بیداری کے درمیان نرالی تصویریں نظر آتی ہیں۔ خواب تصویریں۔ جھلسی ہوئی کھیتیاں۔ ویران ویران آنکھوں والے لوگ ویران ویران سڑکوں پر آتے جاتے۔ تہ خانوں کے اسپتالوں میں کٹے پٹے بازو، کھوپڑیوں میں سوراخ۔ دور کے دھماکوں کی گھن گرج۔ پہاڑیوں پر چکاچوند۔ یہ سب کیا ہے۔ کسی ناقابلِ برداشت حد تک اکتائے ہوئے شیطان کا کوئی ڈراونا خواب۔ آگسبرگ۔ آگسبرگ۔

کیا یہ خواب ہے؟ میں نے دیکھا کسی مغربی یوروپی ملک کی وزارت داخلہ کا ایک ماہر ساری رات جاگ رہا ہے۔ اس کی میز کے اوپر بتی روشن ہے اور وہ ساری رات کتابوں کی ورق گردانی میں منہمک ہے۔ ایک کتاب کا نام پڑھا جا سکتا ہے: مونتین کا **Montaigne:** ***Journal de Voyage*** ۔**The Way to Augsburg** پھر دوسرا نام: **Delumeau:** ***Fear in the West*** ۔ صبح ہوتے ہی جب پھیکی پھیکی دھوپ ڈیسک کے اوپر لگی بجلی کی روشنی سے گلے ملتی ہے تو وہ اپنی آنکھیں ملتا ہے، جمائی لے کر سگریٹ سلگاتا ہے۔ یقیناً حل ہے، یقیناً ہے: آگسبرگ۔

تو اب ہم خود کو آگسبرگ کی دہلیز پر پاتے ہیں۔

مسافروں کو سب سے پہلے اپنے سامنے ایک آہنی پھاٹک نظر آتا ہے۔ کوئی سو قدم کے فاصلے پر ایک کمرے میں بیٹھا ہوا گارڈ اس پھاٹک کو ایک آہنی زنجیر کی مدد سے کھولتا ہے۔ وہ زنجیر کو "کافی بل دیتا اور گھماتا" ہے تو کنڈا کھل جاتا ہے۔ جوں ہی مسافر اندر داخل ہوتا ہے پیچھے پھاٹک اچانک بند ہو جاتا ہے۔ اب مسافر خندق کا پُل پار کرتا ہے اور ایک تنگ جگہ پہنچ کر اپنے کاغذات دکھاتا ہے اور آگسبرگ میں اپنی جائے قیام کا پتا بتاتا ہے۔ پہلا گارڈ گھنٹی بجا کر دوسرے گارڈ کو آگاہ کرتا ہے جو اپنی پوسٹ کے پاس لگے کھانچے میں پھنسی ایک کمانی کو حرکت دیتا ہے۔ یہ کمانی پہلے ایک رکاوٹ ہٹاتی ہے۔۔ یہ بھی لوہے کی بنی ہوئی ہے۔۔ پھر ایک بڑے سے پہیے کو گھما کر متحرک پُل کو اٹھاتی ہے۔ مگر یہ سب کچھ یوں ہوتا ہے کہ "اس تمام عمل کو دیکھنا ممکن نہیں کیوں کہ یہ دیوار اور پھاٹک کے روزن میں سے ہوتا ہے اور پھر فوراً ہی ایک زوردار آواز کے ساتھ بند ہو جاتا ہے۔" متحرک پُل سے گزر جائیں تو ایک بڑا سا چوبی پھاٹک، جس پر لوہے کی پٹیاں جڑی

Scanned with CamScanner

ہیں، کھلتا ہے۔ اجنبی ایک جگہ داخل ہوتا ہے جو اچانک نیم تاریک لگتی ہے مگر تھوڑی ہی دیر بعد پہلی طرح کے ایک دوسرے پھاٹک سے گزر کر وہ ایسی جگہ پہنچتا ہے جہاں "کچھ روشنی" ہے۔ اس جگہ بیچوں بیچ ایک دھاتی کٹورا زنجیر سے لٹک رہا ہے۔ مسافر اس کٹورے میں شہر میں داخلے کے لیے کچھ رقم ڈالتا ہے۔ ایک پورٹر زنجیر کو کھینچ لیتا ہے اور مسافر کی ڈالی ہوئی رقم کو گنتا ہے۔ اگر یہ رقم مقررہ رقم کے برابر نہیں تو پورٹر مسافر کو صبح تک وہیں ٹھہرائے رکھتا ہے۔ لیکن رقم سے مطمئن ہونے کی صورت میں وہ اُس کے لیے "اسی پہلے طریقہ کار سے دوسرے پھاٹک کی وضع کا ایک پھاٹک وا کر دیتا ہے"، جو حسبِ سابق اجنبی کے داخل ہوتے ہی اس کے پیچھے اچانک بند ہو جاتا ہے۔ اور اب اجنبی خود کو شہر کے اندر پاتا ہے۔

ایک اور اہم تفصیل اس پیچیدہ، سادہ سی منصوبہ بندی کو مکمل کرتی ہے: تمام پھاٹکوں اور ان کی درمیانی جگہ کے نیچے "ایک بڑا سا تہہ خانہ ہے جس میں پانچ سو مسلح سوار مع اپنے رہوار کسی بھی ناگہانی صورت حال کے مقابلے کے لیے ہمہ وقت کیل کانٹوں سے لیس موجود رہتے ہیں۔"

اب ہم آگسبرگ میں ہیں۔ سن ۱۵۸۰ میں۔

جب ہماری نیند پوری ہو جائے گی تو پھر سے خواب دیکھنے میں لگ جائیں گے۔

**

(۱) "فاشزم مردہ باد!" یہ جملہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران کمیونسٹ نعرے اور استقبالیہ کلمے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ۱۹۵۰ کے دوران یہ سرکاری مراسلوں کے آخر میں چھپا ہوتا تھا۔

(۲) گولی اوتوک (Naked Island): یہ ایڈریاٹک ساحل کے قریب واقع ہے۔ ٹیٹو اسے سیاسی قیدیوں کے مزدور کیمپ کے طور پر استعمال کرتا تھا۔

Scanned with CamScanner

۹

ژاں بیرز فیلد: ڈُو گوور کی تباہی

ژاں ہیزفیلد (Jean Hetzfeld) ایک فرانسیسی اخبار نویس اور پیرس کے اخبار *Liberation* کے بیرونی وقائع نگار ہیں۔ کروشیا کے شہر وُوکوور کے محاصرے اور قریب قریب مکمل تباہی کے موضوع پر ان کی یہ تحریر انگریزی میں برطانوی سہ ماہی جریدے *Granta* کے شمارہ ۴۷ میں شائع ہوئی تھی۔ اس تحریر کے شائع ہونے کے بعد ہیزفیلد دوبارہ سابق یوگوسلاویا گئے اور جون ۱۹۹۲ میں فائرنگ کی زد میں آ کر شدید زخمی ہوئے۔

ژاں ہیرزفیلد

ترجمہ: تنویر انجم

وُوکوور کی تباہی

میں ایک گلی کے سرے پر ایک اپارٹمنٹ بلاک کی عمارت کے سامنے پلستر اور ملبے کے ڈھیر پر بیٹھا تھا۔ ووکوور شہر کا یہ حصہ زیادہ تر لیموں جیسے سبز رنگ کے مکانوں پر مشتمل تھا جس کا یہ پورا شہر دل دادہ تھا۔ میں ایک بوڑھے سے دوسری جنگِ عظیم کے دنوں کے قصے سن رہا تھا۔ بادل گھرے ہو گئے تھے اور نومبر کی اس سہ پہر کو اَور زیادہ افسردہ بنا رہے تھے، جیسے ان کا واحد ارادہ روشنی کو ماند کر دینا ہو۔ بوڑھا، جو کسی کا دادا ہو گا، پھٹی پرانی گرم سُوتی جیکٹ میں لپٹا ہوا تھا اور فوجی ٹوپی اس کے سر پر دھری تھی۔ وہ بند گوبھی کے ڈبے کو ہلا رہا تھا جو کوئلے کے اس چولھے پر رکھا تھا جسے اس نے کسی زنگ آلود ڈرم سے بنایا تھا۔ ہمارے سامنے گلی کے کوڑے کرکٹ اور فٹ پاتھ پر پھیلے ملبے کے درمیان سے گزرنے والے راستے پر مٹیالی پوستین والے کئی کتوں اور پھٹے پیٹ والے دو سوروں کی لاشیں پڑی سڑ رہی تھیں۔ کیچڑ اور ٹوٹی ہوئی ٹائلوں کی تہہ سڑک پر اتنی دبیز ہو چکی تھی کہ یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ کبھی اس پر تارکول کی ہموار سطح رہی ہو گی۔

سامنے والے مکان میں مِلیشیا کے کچھ سپاہی پرانی طرز کے خاکی اور سرمئی دھاریوں والے گدّوں پر دراز تھے جنھیں انھوں نے کسی تہہ خانے میں سے کھوج نکالا تھا۔ وہ خوراک کے منتظر تھے۔ بندوقوں کا شور بھیمانہ اور سماعت کُش تھا۔ گولوں کی سیٹیاں اور سنسناتی آوازیں ہمارے سروں کے اوپر ہی گونج رہی تھیں۔ یہ گولے ایک ہی قوس پر سفر کرتے ہوئے متعیّن مقامات پر گر رہے تھے اور دھماکے کر رہے تھے۔

پانی کے ٹینکوں کے قریب، عجائب گھر کے پاس، مرکزِ شہر کے اوپر، دھوئیں کے مرغولے گرداب بناتے ہوئے اُٹھ رہے تھے۔ پہلے سرمئی، پھر سفید اور دوبارہ سرمئی۔ اگر آپ کسی قریبی عمارت کی تیسری منزل تک رینگ کر جا سکتے تو کسی دیوار کے شگاف سے اُس مقام کا اندازہ کر سکتے تھے جہاں دَنائو ہوٹل، شاپنگ سنٹر اور پُل ہوا کرتا تھا۔ اب یہ سب سیاہی مائل دھوئیں کا لبادہ اوڑھے

Scanned with CamScanner

تھے۔

مجھے افسوس ہوا کہ میں وو کوور کے مرکز میں نہیں ٹھہرا رہا، محض اُن لوگوں کی خاطر نہیں جو وہاں محصور رہ گئے تھے، اس سے بھی کم اُس مسرت کے لیے جو ان آخری چند گھنٹوں کی داستان قلم بند کرنے میں حاصل ہو سکتی تھی، بلکہ خود اس شہر کی خاطر، اس ہمدردی اور محبت کے لیے جو میں اس کے لیے محسوس کرتا تھا۔ میں اس کے آخری لحات کی قربت کا شریک بننا چاہتا تھا۔

کچھ عرصے بعد میں کئی دوسرے محصور شہروں میں بھی وقت گزارنے والا تھا، لیکن کسی دوسرے مقام کو اس قسم کی شیطنت کے شکنجے میں نہیں پھنسنا تھا جس نے وو کوور کو تباہ کیا، کسی اور جگہ کو توپ خانے کی اتنی پرخچے اڑا دینے والی اور ایسی منظم گولاباری کا شکار نہیں بننا تھا جو وو کوور کے حصے میں آئی۔۔ نہ اوشیک کو، نہ سریبرنیکا یا گورازدے کو اور نہ ایک سال بعد سرائیوو کو۔ گولے بغیر لحہ بھر توقف کے برستے تھے اور اس وقت جب جوار کے کھیتوں سے گزرنے والی اس شہر کی زندگی کی آخری رگ کٹ چکی تھی، شہر پر گرنے والے سیسے کا محض وزن ہی اتنا تھا کہ اس نے اس کے دل کی حرکت کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔

سربوں نے جو ترکیب استعمال کی وہ بچکانہ حد تک سادہ تھی۔ ہم اس عمارت کی چھت سے اس کا مشاہدہ کر سکتے تھے۔ (یہ وہی ترکیب تھی جو وہ اپنی ساری فتوحات میں، پہلے کروشیا اور پھر بوسنیا میں، استعمال کرنے والے تھے۔) اگست میں وفاقی فوج نے وو کوور پر حملہ کیا اور اس کے مرکز میں گولے برسانا شروع کر دیے۔ شہر کے باشندوں اور محافظوں نے تہ خانوں میں پناہ لی۔ دو ماہ بعد سرب ملیشیا بھی فوج کے ساتھ آملی جس کے سپاہی شہر کے جنوب اور مشرق میں، یعنی سرب اکثریت والے نواحی علاقوں میں، دندناتے پھرنے لگے۔ انھوں نے کلاشنکوف کے زور پر مکانوں کے ایک ایک بلاک کو فتح کرتے ہوئے پیش قدمی کی، اور کلاشنکوف سے مسلح کروٹوں نے ہر عمارت کا دفاع کیا۔ ہر بار کروٹوں کے پسپا ہونے پر سرب پوری عمارت کو گرینیڈوں اور بزوکاؤں کے ذریعے تباہ کر ڈالتے۔ جب گرد بیٹھ جاتی تو وہ تہ خانوں کی تلاشی لیتے، زندہ بچ جانے والوں کو نکالتے، زخمیوں کو لے جاتے اور اگلی عمارت پر حملہ کرنے کی تیاری کرتے۔

ملیشیا والوں کے پیچھے پیچھے آنے والے محکمۂ رسد کے لوگ ان کھنڈروں میں پھیل جاتے۔ تمام سپاہی۔۔رضاکار اور جبری بھرتی والے، نان کمیشنڈ آفیسرز، دوسری جنگ عظیم کے آزمودہ کار سپاہی جنھوں نے اپنی رائفلیں اٹاریوں میں سے پھر کھود نکالی تھیں۔۔ سب خالی کرائی ہوئی عمارتوں پر قبضہ کرتے، ٹیلی وژن سیٹ اور بطخوں کے پروں سے بنے نرم لحاف جمع کرتے اور باورچی خانوں کو قابلِ استعمال بنا لیتے۔ ایک کے بعد ایک عمارت، ایک کے بعد ایک بلاک پر

قبضہ کرتے ہوئے یہ لوگ بھی ملیشیا والوں کے پیچھے پیچھے قدم بڑھاتے رہے۔
بندوق بردار اکثر صبح دیر گئے عارضی جنگ بندی پر عمل کرتے۔ تہ خانوں میں چھپے لوگ اس کا فائدہ اٹھا کر گلیوں میں نکل آتے۔ وہ اپنی ٹانگیں سیدھی کرنے کے لیے کسی باغ کے قطعے یا اپنی کام کے مقام کی حالت کا جائزہ لینے جاتے، بشرطے کہ وہ زیادہ دور نہ ہوتا، یا پھر کسی ہم سائے سے تھوڑی بہت گفتگو کر لیتے۔ نوجوان جو شہر میں باقی رہ گئے تھے، اپنی دوستیوں کو ازسرِ نو تازہ کرنے کی کوشش کرتے۔ اس عارضی التوائے جنگ کا مقصد میرے لیے معمّا تھا۔ یہ ضبط کیوں؟ نہایت احتیاط سے تیار کیے ہوئے تباہی کے منصوبے پر عمل کرنے میں تاخیر کیوں؟ کیا یہ چوہے بلی کا کھیل تھا، ایک محصور آبادی کو زیادہ آسانی سے مغلوب کر لینے کے لیے، ان کے درو دیوار کو زمیں بوس کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیتوں کو بھی ریزہ ریزہ کرنے کے لیے؟ یا اس کے متضاد کوئی بات تھی؟ کیا شہر کے مکمل طور پر مسمار ہو جانے سے پہلے اس کے باشندوں کو ثابت و سالم نکل جانے کا موقع دیا جا رہا تھا؟ میرا اندازہ ہے کہ یہ عارضی جنگ بندیاں، محاصرے میں آئے ہوئے کسی دوسرے شہر کی طرح ووکوور میں بھی، جارحین ہی کو فائدہ پہنچاتی تھیں۔ جنگ بندی کا یہ وقفہ ایک طرح کا انسانیت کا انجکشن تھا، گولاباری کی جنونی کیفیت کے خلاف ایک طرح کا حفظِ ماتقدم، جو ہر ایک کو آنے والے خطرے سے دہشت میں مبتلا کرتا تھا۔

ہم وہ کھانا کھانا شروع کرنے ہی والے تھے جو فوجی ٹوپی والے بوڑھے نے ہمارے لیے گرم کیا تھا (وہ ملبے کے ڈھیر پر دونوں جانب ٹانگیں پھیلائے ایک ایسے آدمی کے سے پُرسکون انداز میں بیٹھا تھا جس کی تمام زندگی زمین پر کام کرتے گزری ہو) کہ بمباری دوبارہ شروع ہو گئی، دریا کے کناروں پر گولے برسنے لگے جن کا نشانہ اسپتال اور اس سے ملحق بیرکیں تھیں۔ پچھلے روز ہمارا میدانِ جنگ کا باورچی خانہ ایک مختلف گوشے میں، مرکزِ شہر سے تھوڑی دور ایک ذرا بلند چبوترے پر واقع تھا۔ اب ہم اپنے نئے مقام سے گولاباری کے درمیانی وقفوں میں مشین گنوں سے فائرنگ کی مسلسل آواز سن رہے تھے۔ کبھی چیخیں اور بھاگنے کی آوازیں سنائی دیتیں۔ جب بندوق کی آواز ختم ہوتی تو اس کی جگہ بزوکاؤں کے چلنے کی آوازیں آنے لگتیں۔ کل یہ میدانی باورچی خانہ پہاڑی کے بالکل نیچے کسی نئے چبوترے پر دوبارہ کھڑا کیا جائے گا۔

سرب ہمیں خوشی سے اپنے طعام میں شرکت کی دعوت دیتے جیسا کہ وہ اِدھر اُدھر کھنڈروں میں سے اٹھائی ہوئی نشانیاں اور یادگاریں ہمیں پیش کرتے ہوئے خوش ہوتے تھے۔ بے خواب راتوں اور وحشیانہ جنگ کی تھکن اور اُس دن کی پیش بینی کا خوش گوار تاثر جب انھیں فوجی خدمت سے سبک دوش کیا جانا تھا، ان کے وجود سے عیاں تھا۔ وہ مکمل طور پر اپنے خوابوں میں غلطاں تھے،

Scanned with CamScanner

علاقوں کو آزاد کرانے کے رنگین اور بدہیئت خوابوں میں۔

بوڑھے نے، جو وو کوور سے دس کلومیٹر دور سوتن (Sotin) نامی گاؤں کا کسان تھا، ہماری پلیٹوں میں کھانا نکالا اور بتایا کہ وہ ہر ہفتے زرعی کوآپریٹو وِوپک کے دفتر میں اپنی فصل فروخت کرنے آیا کرتا تھا اور اس کے بعد صنعتی تھوک فروش وو ٹیکس سے خریداری کر کے دناو ہوٹل کے ٹیریس کے مقابل کی پہاڑیوں سے آنے والی تازہ وائن ترامیاج کی بوتلیں پیتا تھا۔ وہ قدیم زمانوں کا ایک قدیم انسان تھا۔ وہ اُن یادوں کو دہرا رہا تھا جو چھ ماہ سے بھی کم پرانی تھیں اور یوں بات کرتے ہوئے جیسے سب کچھ کل دوبارہ شروع ہو جانے والا ہو، وہ اپنے سامنے پھیلے شہر کو دیکھنا بند کر چکا تھا۔

***

مجھے ایک ماہ پہلے کی ایک شام یاد آئی۔ وو کوور میں ایک دشوار دن گزارنے کے بعد میں اور میرا ایک دوست بلغراد میں موسکوا ہوٹل کے ویران ریستوراں میں واپس آئے۔ قریب کی میز پر ایک مرد اور ایک عورت نے ہماری فرانسیسی میں گفتگو سننے کے بعد استفسار کیا کہ آیا وہ ہماری گفتگو میں شریک ہو سکتے ہیں۔ عورت بلغراد میں بہبودِ انسانی کی ایک تنظیم کی سربراہ تھی۔ وہ کھوئی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ یہ تخمینہ لگانے کی کوشش کر رہی ہے کہ وو کوور کے باشندوں کو رسد میں کس کس شے کی ضرورت ہے لیکن وہاں قدم نہ رکھ سکتی تھی۔ (اپنی لاعلمی کے مداوے کے لیے اس نے وہ ساری باتیں اپنی نوٹ بک میں درج کر لیں جو کھانے کے دوران کی گئیں۔) اس کا خوش وضع ساتھی، جو سلاو بولنے والا اور سلاو نواز (Slavophile) تھا، فرانسیسی وزارتِ خارجہ میں سابق یوگوسلاویا کے اسپیشلسٹ کے طور پر کام کرتا تھا۔ اسے سلاوینیا میں ہونے والی جنگ کے بارے میں رپورٹ تیار کرنے کا کام سونپا گیا تھا۔ وہ وزیرِ خارجہ کے قریب ترین مشیروں میں سے تھا، چناں چہ بلغراد میں فرانسیسی سفیر کے بھی خاصا قریب تھا۔

میں اور میرا دوست جلد ہی فرانسیسی اور یوروپی پالیسی کے اندھے پن پر (منافقت کا لفظ ابھی زبانوں پر نہ آیا تھا) اپنے اشتعال کا اظہار کرنے لگے۔ سفارت کار صاحب کی حسِ مزاح ان کا ساتھ چھوڑنے لگی اور انھوں نے ہمارے احتجاج کو درمیان میں روک دیا۔ "آپ کو ہر بات میں مبالغہ نہیں کرنا چاہیے، خاص طور پر وو کوور کی تقدیر کے معاملے میں۔ ایک ہی تیمی سوارا (Timisoara) کافی ہے۔ خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، فرانسیسی دفترِ خارجہ اور ایوانِ صدر

Scanned with CamScanner

اس جنگ کا اس سے زیادہ توجہ سے جائزہ لے رہے ہیں جتنی آپ کے تصوّر میں معلوم ہوتی ہے۔ اگر مرنے والوں کی تعداد ہزار سے بڑھی یا ووکوور کے مرکزی علاقے کو توپ خانے کے حملے کا سامنا ہوا تو فرانس اور یوروپی برادری اپنے فرض سے غافل نہیں رہیں گے۔ ہم لفظ یوروپ کا مطلب جانتے ہیں!"

اس لغو اعلان کے وقت تک پندرہ ہزار لوگ صرف اس موسمِ گرما کے دوران کروشیا میں ہلاک ہو چکے تھے اور ان میں سے کم از کم چار ہزار ووکوور شہر کے رہنے والے تھے۔ ووکوور خود کم و بیش تباہ ہو چکا تھا۔ اس سے چند کلومیٹر دور وِنکووِچی (Vinkovici) بھی اسی قسم کی بے حسی کی فضا میں اسی قسم کی تقدیر کا سامنا کر رہا تھا۔ سفارت کار صاحب البتہ اس ساری خرافات پر جوان کے منھ سے ادا ہو رہی تھی، دل سے یقین کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

***

کھانا کھانے کے بعد جب ہم بوڑھے کو گلی کے باورچی خانے میں چھوڑ کر جانے لگے تو اُس نے ایک چاندی کا سکّہ دوستی کی علامت کے طور پر میرے ہاتھ میں سرکا دیا۔ ملیشیا کے سپاہیوں نے ہمیں کاندھوں پر تھپتھپایا۔ ان میں سے ایک نے شرمساری کے ساتھ ہم سے بلغراد میں اپنی ماں کے گھر تک لفٹ مانگی۔ اس کی ماں ایک ڈاکیا (postwoman) تھی اور پریشان تھی کہ اسے اپنے بیٹے کی کوئی خبر نہ ملی تھی۔ وہ دبلا پتلا اور لمبے قد کا تھا اور اس کا انداز خوش گوار، تقریباً سادہ تھا۔ زمانۂ امن میں وہ بھی باسکٹ بال کے یوگوسلاوی جنون کا شریک رہا ہوگا۔ جنگ سے پہلے وہ ریلوے ورکشاپ میں کام کرتا تھا لیکن اپنی مکینک والی ملازمت سے بیزار ہو چکا تھا۔ عام فوجی ملازمت کے نشیب و فراز سے وہ خوف کھاتا تھا؛ وہ میدانِ کارزار کو دیکھنے کا شوقین تھا۔ چناں چہ ستمبر ۱۹۹۱ میں اس نے اپنا مکینکوں والا اوور آل اتار پھینکا اور ووکوور کے محاذ پر خصوصی ملیشیا میں شامل ہونے چل دیا۔ اس کی تنخواہ برقرار تھی اور اسے عام فوجی خدمت سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔

اُس نے بتایا کہ کس طرح شہر کے نواحی علاقوں میں خالی کردہ اپارٹمنٹ بلاکوں میں وہ اس انتظار میں راتیں گزارتا رہا تھا کہ کب اسے گھر گھر ہونے والی دست بدست لڑائی میں حصّہ لینے کا موقع دیا جائے گا۔ اس نے بڑی خوش دلی کے ساتھ اُن کرتوتوں کے بارے میں بات کی جن کا وہ جنگی دوربینوں سے مشاہدہ کرتے تھے اور پھر بزوکاؤں سے بھون ڈالتے تھے۔ اس نے اُن لاشوں کو بیان کیا جنھیں وہ حملے کے بعد دیکھنے اور لُوٹنے جایا کرتے تھے۔ اس نے ہتھیار ڈالنے والوں کا ذکر

"دشمن" نہیں بلکہ "اُستاشا" کہہ کر کیا؛ یہ وہ لوگ تھے جنھیں ہتھیار ڈالنے کے فوراً بعد گولی مار کر یا حلق کاٹ کر ہلاک کر دیا جاتا تھا تاکہ ملیشیا کو انھیں فوج کے حوالے نہ کرنا پڑے جو یا تو انھیں قید میں رکھتی یا اپنے قیدیوں کے تبادلے کے لیے استعمال کرتی۔ اس کی باتوں میں صرف ایک بار جذبے کا اظہار ہوا، اُس وقت جب وہ اپنے ساتھیوں کی اموات کا ذکر کر رہا تھا۔

ہم اب شِید (Sid) جانے والے راستے پر پہنچ چکے تھے مگر ٹریفک میں پھنسے ہوئے تھے۔ نوجوان نے اپنے اردگرد کی پروا کیے بغیر اپنی گفتگو جاری رکھی۔ اذیت دینے کے لیے وہ باورچی خانے کی سلاخ کو آگ پر سُرخ کر کے استعمال کرتے تھے، کبھی مورچوں کے بارے میں معلومات اگلوانے کے لیے اور کبھی بغیر کسی سبب کے بھی۔ اب ہم آگے بڑھنے لگے تھے اور میدانی علاقے پر تاریکی چھا رہی تھی۔ میں نے سوچا، یا تو وہ ہمیں اپنی مضمون آفرینی سے حیرت زدہ کرنے کی توقع میں ہے یا پھر خود پورے خلوص کے ساتھ ان باتوں پر یقین رکھتا ہے۔ میں نے قیدیوں کی تفصیلات دریافت کیں۔ اس نے بتایا کہ ان میں کروٹ ملیشیا کے سپاہی اور عام شہری دونوں شامل تھے۔ پھر وہ ان کی اس دہشت کو بیان کرنے لگا جو اس کے ساتھیوں کے بلیڈ نکال کر لہرانے سے اُن پر طاری ہو جاتی تھی اور وہ رحم کی بھیک مانگنے لگتے تھے۔ اس نے وضاحت کے ساتھ بتایا کہ کس طرح ان کے مسلح دستے میں (جس کا نام کسی پہاڑ میں پائی جانے والی جنگلی بلّی کے نام پر رکھا گیا تھا) باضابطہ شمولیت کا امتحان یہ تھا کہ کسی قیدی کو گھٹنوں کے بل بٹھا دیا جاتا اور شمولیت کے خواہش مند سے کہا جاتا کہ وہ آہستہ آہستہ اُس کی گردن جسم سے علیحدہ کرے۔ جو کوئی اس میں ضرورت سے زیادہ ہچکچاہٹ دکھاتا اسے دوبارہ یہی عمل کرنے پر مجبور کیا جاتا۔ کم ہی لوگ اس سے انکار کرتے تھے، اور اگر کرتے بھی تو جلد ہی دستے کو چھوڑ جاتے تھے۔ اس نے بتایا کہ پہلی بار یقیناً یہ عمل عجیب سا لگتا تھا لیکن رفتہ رفتہ ساری ہچکچاہٹ غائب ہو جاتی اور بالکل بھی عجیب نہیں لگتا تھا۔

ہم نے پوری گرمیوں کے دوران یہاں وہاں بربریت کی ناقابلِ تردید کارگزاریاں دیکھی تھیں اور اس سے ہمارا ردِعمل کند ہو چکا تھا۔ جہاں دھواں ہے وہاں آگ ضرور ہو گی، یہ کہاوت کسی اور موقعے کے نسبت جنگ کے دنوں میں زیادہ درست بیٹھتی ہے۔ البتہ اس بار یہ باتیں سنتے ہوئے میں ایسی تشکیک میں تھا کہ مجھے ڈرائیونگ اپنے دوست آئیوو کے حوالے کر کے اپنی نوٹ بک نکالنے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ مجھ میں اس قسم کے یوگوسلاوی مبالغے کے خلاف خاصی مزاحمت موجود ہے۔ اور میں نے اس نوجوان کے نام، یووِچا، اور اس کی عمر، ۲۲ سال، کے سوا قریب قریب کچھ بھی نوٹ نہیں کیا۔ اس کی شہادت میں سے، جو دیہی سڑکوں اور پھر موٹروے پر ہمارے دو گھنٹے سے زیادہ کے سفر کے دوران مسلسل چلتی رہی، میں

Scanned with CamScanner

نے صرف ایک جملہ لکھا: "ایک ماہ سے میرے دستے کے کمانڈوز نے کسی کو قید نہیں کیا ہے۔" اپنے گلے کے نیچے انگوٹھے کی تیز حرکت کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے کچھ مسکراہٹ اور کچھ شرمساری کے ملے جلے تاثر کے ساتھ اضافہ کیا: "یہ خانہ جنگی ہے۔۔۔"

لیکن آٹھ مہینے بعد، زخموں کی مرہم پٹی کرتے اور اسپتالوں کا دورہ کرتے ہوئے، سرب ملیشیا کی قید سے بھاگے ہوئے بوسنیائی قیدیوں، یا بوسنیائی اور کروشیائی قیدخانوں سے بھاگے ہوئے سرب قیدیوں کی باتیں سنتے ہوئے، مجھے یووبچا کی یاد آئی: اس کی لڑکھڑاتی چال، اس کی سنائی ہوئی کہانیاں، اس کی سادہ لوحی۔ آج مجھے یقین ہے کہ وہ تمام قتل و غارت جس کا اُس نے تذکرہ کیا تھا واقعی پیش آئی تھی۔ میری تشکیک غالباً میرے اس یقین کی پیداوار تھی کہ کہانیاں گھڑنے کا یوگوسلاوی کلچر سے ویسا ہی تعلق ہے جیسا سارنگی (fiddle) کا روس سے یا سورج کے رقص کا انکا سے۔ عوامی یادداشت دوسری جنگ عظیم کی چوٹ کھائے ہوئے تھی، لیکن مجھے یہ خیال نہ گزرا تھا کہ یہ چوٹ، آج، یوں اپنے نتائج کا عملی اظہار کرنے لگے گی۔

***

بعد میں جب اس موسمِ سرما میں محاصرہ ختم ہوا اور وُو کوور کا سقوط ہو گیا تو ہم ۔۔ میرا دوست پیٹرک، مَیں اور ترجمان آرسا۔۔ شہر کے برف پوش کھنڈروں میں چکر لگاتے پھرے۔ جب ہم گرادسکی میوزیم کے دروازے پر پہنچے تو نوجوانوں کے ایک گروہ کی نقل و حرکت نے ہماری توجہ اپنی جانب کھینچی۔ عجائب گھر کی اٹھارویں صدی کی عمارت، جو پرانے مکھن کے رنگ کے پتھروں سے بنی تھی، ایک عظیم الشان باغ کے وسط میں تھی جو بلوط کے خوب صورت درختوں اور اونچی گھاس سے بھرا ہوا تھا۔ عجائب گھر کا پیش رُخ اور اس کے اطراف ٹوٹے ہوئے درخت اُس درندگی کی گواہی دے رہے تھے جس کا شکار یہ پُرامن مقام وفاقی توپوں کے ہاتھوں ہوا تھا۔ عجائب گھر، گرجا گھر (اور بعد میں، بوسنیا ہرزگووینا میں، مسجدیں بھی)، فیکٹریاں اور پانی کی اونچی ٹنکیاں دیکھ کر شاید سربوں کا جذبۂ تخریب مشتعل ہو جاتا تھا۔

ایک نوجوان سرب طالب علم نے، جو مڑے ہوئے گلے والے پُل اوور پر ایک لمبا پارکا کوٹ پہنے تھا اور جس کے سر سے خشکی کے ذرّات جھڑ رہے تھے، ہمیں عجائب گھر کے اندر آنے کی دعوت دی۔ یہ انہدام کا جانا پہچانا منظر تھا: اکھڑا ہوا پلستر، شیشے کی کرچیاں، چوپٹ کھڑکیاں۔ لیکن ملبے میں کچھ اَور اشیا بھی تھیں: گلٹ کے چمکدار فریموں کے ٹکڑے، پھٹے کینوس، قدیم کتابوں

سے پھاڑے گئے ہزاروں مڑے تڑے اوراق، پتھر کے زمانے کے ڈھانچوں کی ٹوٹی ہوئی ہڈیاں، کہیں کسی شکستہ زرہ بکتر کا کوئی ساق، کسی گلدان کا نچلا حصہ۔ مقامی سرب، کروٹ ملیشیا کو الزام دے رہے تھے کہ اس نے شہر سے بھاگنے سے پہلے اس عمارت کو تاراج کیا۔ یہ ناممکن بات معلوم ہوتی تھی۔ اس بربادی کا بڑا حصہ اُس گولاباری سے انجام پایا تھا جس نے عمارت کی دیواروں اور چھتوں کو تباہ کیا۔

طلبا ہمیں نیچے تہہ خانوں میں لے گئے۔ سیڑھیوں کے نیچے جن پر پھٹی ہوئی کتابوں کا ایک قالین سا بچھا تھا، ایک ایسا منظر دکھائی دیا جو ہمیں کچھ غیر حقیقی سا معلوم ہوا۔ زمین پر ایک ہراول میڈیکل یونٹ اور ایک کروٹ اسلحہ خانے کا ملبہ کوڑے کرکٹ کی طرح بکھرا ہوا تھا۔ طلبا نے کلاشنکوفوں، گرینیڈوں اور سرنبوں کو اٹھا اٹھا کر لہرایا۔ اس سامانِ حرب کی موجودگی ان کی نظر میں سرب ٹینکوں کے ذریعے عجائب گھر کی منظم تباہی کا مناسب جواز پیش کرتی تھی۔

وہ نوجوان اور اس کے دوست بلغراد کے آرٹ اسکول سے تعلق رکھتے تھے۔ زم و نازک چہرے اور نفاست سے بنے ہوئے سفید بالوں والا ایک پروفیسر ان کا نگراں تھا۔ اس کی آنکھوں پر گول شیشوں اور دھاتی فریم کا چشمہ تھا۔ اس کی ٹھوڑی سفید نوکدار داڑھی کی وجہ سے آگے کو نکلی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور وہ باتیں کرنے کے دوران اسے شہوانی سے انداز میں چھیڑتا جاتا تھا۔ وہ اور اس کے شاگرد اس غرض سے وہاں آئے تھے کہ ملبے کے ٹکڑوں کو کھنگالیں اور ان میں سے جو چیزیں منتقل کیے جانے کے قابل ہوں انھیں بلغراد لے جائیں۔ جس وقت یہ نجات دہندگان ان اشیا کو لے جانے کے عمل میں مصروف تھے، پروفیسر بے حد احتیاط سے ان کی فہرست تیار کرتا جا رہا تھا۔ وہ ہر گزرنے والی چیز کو تھپتھپاتا اور اس سے کھیلتا جاتا، اور کبھی کبھی کسی داغ دار موتی یا کسی پُرانی دستاویز کے پھٹے ہوئے ٹکڑے کے لیے تسلّی کے الفاظ بھی کہتا جاتا۔ اس نے بڑی پُرتکلف فرانسیسی میں بتایا کہ وہ عجائب گھر اور اس کے ذخائر کی تعمیرِ نو کی ابتدا کے لیے یونیسکو کے فنڈ کے اجرا کا انتظار کر رہا ہے تاکہ شہر کی کاسموپولیٹن ثقافت کو (جو تاریخ کی ابتدا جتنی قدیم تھی) محفوظ کیا جا سکے۔ میں جانتا تھا کہ گفتگو اب ایک دردناک موڑ مڑنے والی ہے۔ یہ پروفیسر کسی اور زمانے میں سرب دانش ور طبقے کا ایک دل چسپ نمائندہ سمجھا جا سکتا ہوگا جس کے باعث بلغراد کی کشش دو صدیوں سے زائد عرصے سے قائم تھی۔ مگر اب نہیں۔ ہم نے ایک دوسرے سے وعدہ کیا کہ دوسرے دن بلغراد میں گفتگو کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں گے، اور میں وہاں سے بھاگ نکلا، باہر ایسی فضا میں جسے موسم سرما کی شفق نے افسردہ تر بنا دیا تھا۔

شہر سے باہر نکلتے ہوئے ہم ایک دومنزلہ مکان کے سامنے رکے جو حال ہی میں قائم شدہ

Scanned with CamScanner

ریڈیو وُوکوور کا مرکز تھا۔ اس گرم اور روشن مکان میں صحافی، مجاہدین اور منتظمین، جن کا تعلق مختلف النوع انجمنوں سے تھا اور جو سب کے سب سرب تھے، جمع ہوتے اور شہر کے مستقبل کے بارے میں بحث کرتے تھے۔ ماحولیات کی تحریک کا ایک کارکن، جو ایک "سبز سرب" تھا اور جسے نیوکلیئر مخالف لابی کے پیلے نشان سے پہچانا جا سکتا تھا، دھوئیں سے بھرے کمرے کے بیچ میں کھڑا تھا۔ (اس کے گھنگھریالے بال سر کے پیچھے پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے اور اس نے اُودی پینٹ اور کلائی میں ہاتھی کی کھال کا کڑا پہن رکھا تھا۔) اس کے خیال میں یہ وقت فی الحقیقت نتیجہ خیز ماحولیاتی تجربات کا سلسلہ قائم کرنے کے لیے نہایت موزوں تھا۔ وُوکوور شہر کی تعمیرِ نو کی بنیاد ایک زیادہ فطری، اور ماحول کی بابت زیادہ دوستانہ، طرزِ زندگی پر ہونی چاہیے۔ میں نے مفسدانہ انداز میں اُن ہزاروں لاکھوں کروٹوں کے احیا کے بارے میں سوال اٹھایا جنھوں نے اس سے پیشتر اس جگہ کو آباد کر رکھا تھا۔ ہماری ترجمان آرسا، اس کے جواب کے ترجمہ کیے بغیر جس میں مَیں "فسطائی" اور "دہشت گرد" کے الفاظ سمجھ گیا تھا، ہمیں دھکیلتی ہوئی کمرے کے باہر لے آئی اور ایک بوکھلائے ہوئے ملیشیا کے جوان کے تحفظ میں ہمیں سفید اوپل کار میں سوار کرا دیا۔ ملیشیا کا جوان سیڑھیوں پر کھڑا بار بار معذرت کا اظہار کر رہا تھا۔

مئی ۱۹۹۲ میں، وُوکوور کی جنگ کے چھ ماہ بعد، بلغراد میں شعبۂ سیاحت کا مرکزی دفتر شہید کردہ شہر کی سیروں کی پیش کش کر رہا تھا۔ کھنڈروں میں جھٹکے کھا کھا کر چلتی بس میں ایک گائیڈ مائیکروفون پر اس خونی رزمیے اور نسل کُشی کی داستان سنا رہا تھا جس کا ارتکاب "اُستاشوں کی فوج" نے کیا تھا۔

ایک شام مَیں بلغراد کے ایک انتہائی وسیع المشرب ریستوراں میں اپنے ایک سرب دوست سے رات کے کھانے پر ملا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی، نمایاں اور پُرکشش سلاو انداز کی حامل عورت، بچوں جیسے چہرے والی، جس کی آنکھوں میں ایک خفیف سا، دلفریب ترچھا پن تھا۔ ریستوراں، سوائے ایک سوئس وفد کے جس میں کسی دوسری بہبودِ انسانی کی تنظیم کی ایک تنہا نرس شامل ہو گئی تھی، بالکل خالی تھا۔

ہوٹل کی مالکہ نیلی یونیفارم پہنے تھی اور پانچ زبانیں بولتی تھی۔ اس کی مشفقانہ مسکراہٹ ڈائننگ روم کی حالتِ زار کی بابت اس کی فکرمندی پر پردہ ڈالنے میں ناکام تھی۔ اس جگہ کی ویران فضا ہمارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی، ہم وہاں باتیں کرنے اور ایک کامیابی کا جشن منانے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ میرا دوست اور اس کی بیوی (جو دور دراز کے مضافاتی علاقے کی کسی کمیونٹی تنظیم میں شہری منصوبہ ساز کے طور پر کام کرتی تھی) اپنے بچوں کو شہری اسکولوں کی

جنگجویانہ اور وطن پرستانہ فضا سے ہٹا کر بلغراد کے ایک فرانسیسی اسکول میں داخلہ دلوانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ اپنی راحت اور اطمینان میں انھوں نے ایک مشہور اسٹیک کو (جو افراطِ زر کے دباو کا مقابلہ کر چکی تھی) موستار کی تیز سُرخ وائن زلاوکا کے ساتھ اعزاز بخشنے کا فیصلہ کیا۔ انھیں لطف اندوز کرنے کی خاطر میں کہانیاں سنانے لگا جن میں میری ووکوور کی خواب ناک سی سیر کی داستان بھی شامل تھی۔ میرے دوست کی بیوی نے سفر کی کچھ واقعاتی تفصیلات دریافت کیں اور پھر اعلان کیا کہ وہ اپنے بچوں کو وہاں لے جانے کا ارادہ رکھتی ہے تاکہ وہ اس نسل کشی کے بارے میں جان سکیں جو اُستاشوں نے کیا ہے۔ اس نے کروٹوں، اپنے سابقہ ہم وطنوں، کی خوں خوار اور بگڑی ہوئی عادتوں کے بارے میں کچھ گڈمڈ "حقائق" بیان کرنے شروع کر دیے۔ اس کی آواز پاٹ دار تھی اور وہ شان دار انگریزی بولتی تھی۔

میں نے وائن کا پہلا گلاس نگلا اور شرمندہ سی نظروں سے اس کے شوہر کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی اُن کھنڈروں کی سیر کر چکا تھا اور تائید میں سر ہلاتے ہوئے، دہشت ناکیوں کے اپنے بیان سے اپنی بیوی کی گفتگو میں اضافہ کر رہا تھا۔ میں نے دوسرا گلاس بھی ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

سربیائی توپیں پورے تین مہینے تک بغیر کسی وقفے کے ووکوور شہر پر ہر روز پانچ ہزار گولے برساتی رہی تھیں۔ بمباری کے بعد سے اب تک میں آرٹ کی تاریخ کے طلبا، آثارِ قدیمہ کے ایک معروف ماہر، ایک ماحولیاتی مجاہد اور شعبۂ سیاحت کے ایک دفتر کو آسیبِ خوف کے مارے ہوئے اسی سربیائی توپ کی تکرار کرتے سن چکا تھا۔ اور اب میرے دو دوست بھی نہایت خوشی سے اسی تکرار میں مصروف تھے۔ سرب عجیب لوگ ہیں: دوست نواز، مہمان نواز اور دلیر -- لیکن دلیر احمق اور ضدّی کے معنوں میں بھی۔ ان کی حماقت، جو ان کی بے بصری کے برابر ہی تھی، انھیں سیدھے ایک خیالی واہمے کی اقلیم میں لے جاتی تھی۔ کروٹوں، مسلمانوں یا البانویوں کے محض تذکرے ہی پر وہ خود کو نشیب میں جاتے ہوئے، خون کے پیاسے، خودکشی پر مائل چکر دار میں کھو بیٹھتے تھے۔

***

میری نوٹ بک سے:

محاصرے کے اٹھائیسویں دن طلوعِ آفتاب سے ایک تعمیراتی واہمہ اُبھرتا ہے: دریاے ڈینیوب کی غیر متحرک سطح پر اس کا عکس سپاٹ دکھائی دیتا

ہے۔ ڈریسڈن، بیروت، تصوّرات گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ ماتی کھنڈر،
وو کوور، جس کے دل سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا ہے، بے شک ان
دونوں مقامات سے بد تر ہے۔۔۔

کسی چیز نے میرے تخیل کو اس منظر کے لیے تیار نہیں کیا تھا جو ہم نے ۱۸ نومبر ۱۹۹۱ کو دیکھا۔

صبح اپنے ہمراہ خزاں کا بے رونق آفتاب لے کر آئی جب ہم نیگوسلاوچی روڈ سے وو کوور شہر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک روز پہلے ہم نے ہزاروں قیدیوں کے ہتھیار ڈالنے کا منظر دیکھا تھا: انھیں قافلوں کی طویل قطار میں کھڑے ٹرکوں میں سوار کرایا جا رہا تھا جو اندھیرے میں نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے تھے۔ ہم ایمبولینسوں کے پہلے جلوسوں کے پاس سے گزرے جو اُن زخمیوں اور مُردوں کو لے جا رہی تھیں جن تک طبی امداد کے رضاکار جنگ کے باعث اس سے پہلے پہنچ نہیں پائے تھے۔ شہر ہتھیار ڈال چکا تھا، توپیں جو ایک عرصے سے افق پر گرجتی رہی تھیں اب خاموش تھیں۔

اُس روشن خاموش دن، طلوعِ آفتاب کے وقت، یہ سناٹا ہی سب سے زیادہ توجہ انگیز بات تھی۔

شِید روڈ پر شاداں ہجوم وو کوور کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ٹریکٹروں پر سوار کھیت مزدور اپنی ٹوپیاں لہرا لہرا کر بکتر بند گاڑیوں کے بونٹوں پر کھڑے سرب فوجیوں اور بوجھ سے جھکتی گولف گاڑیوں پر بیٹھے ملیشیا کے سپاہیوں کو سلام کر رہے تھے۔ بجتے ہوئے ہارن، لہراتی ہوئی بوتلیں اور اسلحے کے ذریعے کیے جانے والے فتح کے بے لگام اشارے مل کر ایک شکستہ حال گارڈ آف آنر کا منظر پیش کر رہے تھے۔ سربیائی فتح کا جشن شام تک دریا کے کنارے شہر کے دور ترین مضافات تک جاری رہا۔ نئے آنے والوں کو، یعنی ریڈ کراس کے وفود اور سفید کوٹوں میں ملبوس یوروپی مبصروں کو، شہر جانے والوں کی قطار سے نکال کر ایک ایک کر کے ویلی پرونیت (Velepronet) کے مال خانے کے احاطے میں بھیجا جاتا رہا جہاں فتح مند افسر اُن کے خیر مقدم کے لیے موجود تھے۔ وہاں تقریریں ہوئی تھیں اور مشروبات پیش کیے جانے تھے۔ یہ خیال آنا ناگزیر تھا کہ وہاں مبارک باد بھی دی جائیں گی۔

ایک چھوٹی گلی ہمارے سامنے آئی جسے دو ٹرکوں نے آدھا گھیر رکھا تھا اور ان پر تلاشی میں برآمد ہونے والا فرنیچر ممکنہ سرعت کے ساتھ لادا جا رہا تھا۔ ایک کاغذ کے پُرزے کی مدد سے، جس پر لِیلے (Lille) کے ایک سابق فٹ بالر کے دستخط ثبت تھے (جو اب شِید میں کمانڈو دستے کا سالار

تھا)، ہم ملیشیا کے جوانوں کے پاس سے گزرے اور ایک تنگ گلی میں نکلے جہاں ملبے کے ڈھیر جگہ جگہ پڑے تھے۔ ہم کوارٹر کے ملبے کے درمیان سے آہستہ رفتار سے نکلے۔ کوارٹر وفاقی سپاہیوں سے بھرا ہوا تھا جو کلاشنکوفوں اور اسلحے کی بیلٹوں سے لیس تھے۔ ہاتھوں میں بیلچے اٹھائے وہ اپنے پیروں کو ان جوتوں میں گھسیٹ رہے تھے جو اُن کے ناپ سے بڑے تھے۔ ملبے کے ڈھیروں نے آخر کار ہمیں گاڑی وہیں چھوڑ کر ان سپاہیوں کے پیچھے پیچھے پیدل شہر تک جانے پر مجبور کر دیا۔ چہار اطراف درختوں کے تنے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے پڑے تھے، درخت جن کی چھال اُتر چکی تھی، جو جل گئے تھے، جو جڑ سے اکھڑ گئے تھے اور جن کی شاخیں کچلی گئی تھیں۔ اس چھوٹے سے پارک میں جو شہر میں داخل ہوتے ہوئے مسافروں کو خوش آمدید کہتا تھا، ایک بھی درخت سلامت نہ بچا تھا، کوئی جھاڑی تک باقی نہیں رہی تھی۔ ایک قریبی گرجا گھر کے کلس پر ایک صلیب کو دھات کے ایک مڑے ہوئے ٹکڑے سے اٹکا دیا گیا تھا، لیکن یہ اُلٹی لٹک رہی تھی اور تراشیدہ سفید پتھر کی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر آواز پیدا کر رہی تھی۔ اگلے روز جب فوٹو گرافر آئے تو یہ صلیب ان کے مشاہدے میں آئے بغیر نہ رہی: اس شہر کی شہادت کی ایک دست یاب اور طنز آمیز علامت!

گرجا گھر کے قریب گلی کا موڑ آیا جس سے گزر کر ہم شہر کے اندر پہنچ گئے، ایک ایسی جگہ جو اس حد تک ماورائے حقیقت معلوم ہو رہی تھی کہ اسے بھیانک خواب تک نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہاں سڑک پر تین اطلاعی تختیاں ساتھ ساتھ لگی ہوئی تھیں: ایک میں بتایا گیا تھا کہ آگے چل کر سڑک تنگ ہو جاتی ہے، دوسری سے پتا چلتا تھا کہ آگے سڑک کی مرمت کا کام جاری ہے، اور تیسری تختی کے ذریعے رفتار کم کرنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ دو میٹر دور ایک لاش کا اوپری دھڑ چمکدار جیکٹ میں لکڑیوں کے ایک ڈھیر کے پاس پڑا تھا اور اس کی اکڑی ہوئی انگلی آگے بڑھتے ہوئے راستے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ بمباری سے تباہ شدہ مکانوں کی قطار، جن کی چھتیں دھنس گئی تھیں اور فرش پر ملبے کے ٹیلے جا بجا بکھرے ہوئے تھے، سڑک کے آخری سرے تک چلتی رہی۔ ہم نے اوپر نگاہ کی اور مرکز شہر کی اولیں بلند عمارتوں کے جلے ہوئے ڈھانچے دیکھے جن کے تاریک ہیولے گھونگے کے رنگ کے نیلے آسمان کے پس منظر میں نمایاں تھے۔ ملبے کے ڈھیروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے، جو کہیں کہیں تو ہماری چھوڑی ہوئی کاروں کے بونٹوں سے بھی اونچے ہو جاتے تھے، ہم ان سیاہ شدہ کنکریٹ کے ڈھانچوں کی طرف یوں بڑھتے رہے گویا وُوکوور کے محاصرے کے اسرار کی کنجی اُنھیں میں پوشیدہ ہو۔

ریپبلک اسکوائر اس سڑک کے اختتام پر تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں کبھی اس ساحلی شہر کی شاندار ترین دکانیں ہلکے بادامی اور پستئی رنگ کی دیواروں اور محرابی چھتوں والی گزرگاہ کے پہلو میں

Scanned with CamScanner

صف آرا تھیں۔ یہاں لوگوں نے ملبے کی صفائی کا آغاز کر دیا تھا۔ ملیشیا کے کچھ سپاہی کسی عورت کے خون آلود جسم کو ایک ٹرالی پر ڈال رہے تھے۔ اس کا چہرہ تکلیف سے مسخ اور پلستر کی گرد سے سفید ہو چکا تھا۔ اسے انھوں نے ابھی ابھی ملبے کے ایک گرے ہوئے تودے کے نیچے سے گھسیٹ کر نکالا تھا۔ دوسرے لوگ قطار اندر قطار پارک کیے ہوئے ٹینکوں پر بیٹھے گیت گانے میں مصروف تھے اور ایک دوسرے کو آلوچوں کی شراب کے جام پیش کر رہے تھے جو معمول سے کچھ زیادہ سبز دکھائی دے رہی تھی۔ خالی بوتلیں سڑک پر ٹینکوں کے چلنے سے پڑے ہوئے نشانوں کے آس پاس جابجا بکھری ہوئی تھیں۔ ملیشیا کے ان سپاہیوں کے بال دھول سے اٹے، لباس اوپر سے نیچے تک درجنوں شریکِ جنگ قبائل کے بلّوں اور تمغوں سے ڈھکے، اور ہتھیار ان کے پہلوؤں میں پڑے تھے، اور ان کے جسموں سے تھکن اور بدمستی کی بُو اٹھ رہی تھی۔ وہ ہمیں دیکھ کر متجسس ہوئے اور ایک بچگانہ خوش مزاجی کے ساتھ ہمیں اپنی محفلِ نشاط میں شریک ہونے کی دعوت دینے لگے۔

جگہ جگہ میں نے پیچھے رہ جانے والی لاشیں دیکھیں۔ ایک نوجوان ماں، جو چھوٹے بُوٹ پہنے تھی اور سخت موسم کے باوجود جس کی ٹانگیں عریاں تھیں، ابھی تک اپنا خریداری کا تھیلا بغل میں دبائے ہوئے تھی اور سر پر بندھا ہوا اسکارف اسے گلی کی دُھول سے بچائے ہوئے تھا۔ کروٹ سپاہی، جو اُسی یونیفارم میں ملبوس تھے جو فاتحین نے پہن رکھی تھی اور بیشتر اوقات ویسی ہی کالی ٹوپیاں پہنے تھے، زمین پر ادھر اُدھر پڑے تھے۔ کچھ سپاہیوں کی جیکٹوں کے اندر سے طلائی صلیب باہر کو نکال دی گئی تھی تاکہ اس کے پہننے والے کی شناخت ہو سکے۔ ان میں کچھ پتھرائے ہوئے معلوم ہوتے تھے کچھ محض سوئے ہوئے۔ ایک عورت اور اس کا بچہ زاویہ قائمہ بناتے ہوئے پڑے تھے۔ ان کے ہاتھ پھیلے ہوئے تھے اور ان کی انگلیوں کی پوریں ایک دوسرے کو چھُونے کی کوشش کرتی معلوم ہوتی تھیں۔ میں سوچنے لگا کہ کیا ان میں سے کسی ایک نے دوسرے کو مرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ ایک آدمی جس کے ماتھے پر اس کی ہلمٹ کا سفید نشان موجود تھا قریب ہی مارا گیا تھا۔ احساس سے عاری مُردے ایکسٹرا اداکاروں کا رول کرتے معلوم ہوتے تھے جیسے اس چھوارے پر کسی سنیمائی خواب غفلت کا غلبہ ہو گیا ہو۔

کچھ اَور آگے، شاپنگ مال کے قریب، ایک شخص اپنی موٹرسائیکل سے لگا ہوا پڑا تھا۔ موٹرسائیکل نے مجھے اس کی طرف متوجہ کیا۔ وہ فربہ اندام تھا اور فر والی جیکٹ اور کانوں کو ڈھانکنے والی پُرانی چرمی ٹوپی پہنے تھا۔ وہ اپنی دو اسٹروک اور ایک سلنڈر والی موٹرسائیکل کے ساتھ لگا ہوا تھا جو زنگ آلود اور مٹی میں سَنی ہوئی تھی۔ کبھی اس کا رنگ سیاہ رہا ہوگا اور اس کی پٹرول کی ٹنکی پر اس کا میک "جاوا" لکھا ہوگا۔

Scanned with CamScanner

میں بہت دیر موٹر سائیکل والے کے پاس اکڑوں بیٹھا اس کے نقوش پر غور کرتا، اس چھوٹی سی پہیلی کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ کروٹ تھا یا سرب؟ ہنگیرین یا رومانیائی؟ کیا وہ وو کوور کا پرانا باشندہ تھا یا کوئی مہاجر؟ وو پک فیکٹری کا مزدور یا کوئی ریٹائرڈ ٹیچر؟ کوئی سرب جو کروٹوں کے ہاتھوں اپنے گھر میں قید رہا تھا یا اس شہر کا دفاع کرنے والوں میں سے ایک؟ کوئی خانہ نشیں بوڑھا یا دو زیرِ زمین پناہ گاہوں کے درمیان رابطہ رکھنے والا ایجنٹ؟ گولوں کے دھماکوں سے سیاہ شدہ آسمان تلے، خاتمے سے اتنی ذرا سی دیر پہلے وہ کیا دیوانگی تھی جس نے اسے موٹر سائیکل پر سوار ہونے پر اکسایا؟ کیا وہ بمباری میں دوپہر کے کھانے کے وقفے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خود کو اور اپنی محبوب موٹر سائیکل کو ہوا کھلانے نکلا تھا؟ کیا وہ کسی ڈیوٹی پر تھا؟ کیا ملبے میں اسے کوئی حادثہ پیش آگیا تھا اور وہ امداد سے محروم وہیں پڑا رہ گیا تھا یہاں تک کہ کسی دھماکے نے اپنا مہلک وار کر ڈالا؟ کیا کال کوٹھری میں جبری قید نے اسے قدرے پاگل کر دیا تھا یا وہ اپنی موٹر سائیکل کو کسی محفوظ مقام تک پہنچانا چاہتا تھا؟ کیا وہ کوئی بری خبر پا کر مضطرب ہو اٹھا تھا اور اپنے کسی عزیز، مثلاً اپنی اولاد، کے پاس پہنچنا چاہتا تھا؟ یا وہ بوڑھوں کے اس دل پذیر فرقے سے تعلق رکھتا تھا جو ہمیشہ جہاں جی چاہتا ہے وہاں جاتے ہیں جیسے کچھ بھی نہ ہو رہا ہو؟ ان سے ہر میدانِ جنگ میں ملاقات ہوتی ہے: خطرے سے بے نیاز، بقولِ خود اپنی عادتوں کو بدلنے کے لحاظ سے ضرورت سے زیادہ عمر رسیدہ، حادثاتی موت سے خوف زدہ نہ ہونے کے لیے زندگی سے سخت دلی کا سبق سیکھے ہوئے، اپنے فلسفیانہ مزاج کی بدولت جنگ سے ماورا۔ اس ٹکڑے ٹکڑے شہر کی روزمرہ زندگی کی دھجیاں ایک ایک کرکے روشنی میں آتی رہیں اور دلدلی بو، جو پہلے پہل ناقابلِ ادراک تھی، سرد ہوا میں تیرنے لگی۔

ہم کنکریٹ کے اس ہموار پل تک پہنچے جو وُوکا (Vuka) کے اوپر پھیلا ہوا تھا۔ ابھی پچھلی ہی گرمیوں میں یہ جگہ شہر کے نوجوانوں کی ملاقات کا مقام تھی جہاں سے وہ دوسری طرف کے قہوہ خانوں کے برآمدوں یا ڈسکو کلبوں کی طرف نکل جاتے تھے یا دریا کے کنارے چہل قدمی کرنے لگتے تھے جو پورے شہر سے گزرتا ہوا دناؤ ہوٹل کے سامنے دریائے ڈینیوب میں جا گرتا تھا۔

پانی اب غیر متحرک تھا۔ اسے ملبے اور تہہ خانوں کے باسیوں کے پھینکے ہوئے کوڑے کرکٹ نے چوس لیا تھا اور اس کا راستا ٹوٹی ہوئی کشتیوں، مڑے تڑے دھاتی سامان اور بلوط کے گرے ہوئے پتوں سے ڈھکی حیوانی اور انسانی لاشوں کے انبار نے روک دیا تھا۔

***

Scanned with CamScanner

بعد میں، جنگ کے دوران کئی موقعوں پر میں نے اُس صبح کا گواہ بننے پر خود کو مبارک باد دی- یہ ایک اعزاز تھا جو مجھے اپنے ہم پیشہ صحافیوں کے مقابلے میں حاصل ہوا جو اُس دن شہر میں داخل نہیں ہوے- یہ خصوصی دورہ دہشت کے خلاف حفاظتی ٹیکا نہیں تھا- یہ اس کا متضاد تھا- اپنی مریضانہ جذباتیت کے باوجود یہ کسی متعدی مرض کی طرح بھی نہیں تھا- بلکہ یہ جنگ کی ناقابلِ یقین کیفیت سے آشنا ہونے کا تجربہ تھا- اس کے نظارے نے مجھے اس قابل کر دیا کہ میں بلقانیوں کی تصوراتی کہانیوں کی توضیح کر سکوں اور اُن شہادتوں کے معنی کھوج سکوں جو ہمیشہ ہی حقیقت سے ماورا محسوس ہوتی تھیں- اسی سے مجھے بعد میں یہ حوصلہ بھی ملا کہ اس خطّے کے دوسرے وُوکووروں کو بوسنیا کے پہاڑوں اور سلاوونیا کے جنگلوں میں تلاش کروں اور پہچانوں- مجھے ایک مستند تجربہ حاصل تھا: میں نے خود دیکھ لیا تھا کہ کیا کچھ ممکن ہے، جس کا مطلب تھا کہ اب سب کچھ ممکن ہے، یہاں تک کہ کسی عام دیہی سڑک کے کنارے بسے ہوے گاؤں کے تمام باشندوں کا منظّم قتلِ عام بھی-

پُل کے دوسری جانب ہم کاروں کے ایک وسیع و عریض قبرستان کے کنارے کنارے چلتے رہے جو محاصرے کے پہلے دو مہینوں میں بمباری سے تباہ ہوئی تھیں اور جنھیں مقامی انتظامیہ کے کارکنوں نے یہاں ڈھیر کر دیا تھا- میری نگاہ کچھ سایوں پر پڑی جو کوئی اسٹارٹر موٹر یا کاربوریٹر تلاش کرنے کے لیے انجنوں کو ٹٹول رہے تھے- ہم شہر کے مرکز سے اس سڑک پر آ گئے جو اسپتال کو جاتی تھی- محاصرے کے آخری دو ہفتوں میں کنکریٹ کی یہ عظیم الجثہ، بےدریچہ عمارت فوجی کارروائی کے شدید ارتکاز کی شاہد رہی تھی اور اب مکمل طور پر پامال ہو چکی تھی- یہ شہر کی واحد عمارت تھی جس کی نگرانی قبضہ کرتے ہوے سربوں نے جاری رکھی، جیسے کہ جنگ کی آگ کسی بھی لمحے یہاں سے دوبارہ بھڑک سکتی ہو- بکتربند گاڑیوں اور ایک فوجی دستے کے گھیرے نے اس عمارت تک رسائی کی ممانعت کر رکھی تھی- ریڈ کراس کے نمائندے، جنھیں یوروپی مبصرین حوصلہ دلا رہے تھے، کئی سوئس لہجوں میں سربیائی افسروں کے طنزآمیز، پُرنخوت اور (جیسا کہ بعد میں ثابت ہو گیا) حسبِ عادت بےاعتنائی پر احتجاج کر رہے تھے-

افسروں کا دعویٰ تھا کہ سیکڑوں زخمیوں کو اسپتال کی زیرِزمین منزل سے باہر نکالا جا رہا ہے اور اس عمل کے لیے سخت فوجی کنٹرول کی ضرورت ہے- جو بات میرے لیے حیران کن تھی وہ یہ کہ بہت سے غیرملکی مبصرین کو یہ وضاحت قابلِ قبول معلوم ہوتی تھی- بالکل واضح تھا کہ کیا ہونے والا ہے- اسپتال پولیس کی بیرکوں سے ملحق تھا جو محاصرے کے دوران کروٹ ملیشیا کا ہیڈکوارٹر بنی رہی تھیں- دونوں عمارتوں کے قرب کی وجہ سے کروٹ سپاہی اسپتال کو بیرکوں کی اینکسی کے طور پر استعمال کرتے تھے، نہ صرف اپنے زخمیوں کی دیکھ بھال کے لیے بلکہ گولاباری

سے محفوظ رہنے کے لیے بھی۔ یہ زمانۂ جنگ کی ایک پرانی روایت تھی۔ ضرورت پڑنے پر وہ اپنی موٹر بیٹریاں بھی وہیں رکھ لیتے۔ سرب توپچیوں کے لیے یہ بات اس عمارت کو حملے کا خاص ہدف بنا لینے کا خاصا بڑا جواز تھی۔

شہر کے فاتحین وہاں موجود تمام لوگوں کی نظروں کے سامنے ہر اس شخص کو ایمبولینسوں کے قافلے میں سوار کراتے رہے جو اس عمارت کی تلاشی میں ان کے ہاتھ آیا۔ ان میں زیرِ زمین چھپے ہوئے دشمن سپاہی بھی شامل تھے۔ ان تمام لوگوں کی صورتیں اجتماعی قبروں کی دریافت سے پہلے کسی کو دوبارہ نظر نہیں آئیں۔

***

درختوں سے گھری سڑک کے دوسری طرف ایک چھوٹے سے خودرو باغ سے گزر کر ہم کشت و خون کے ایک عجائب گھر میں داخل ہوئے۔ درجنوں لاشیں زمین پر ترتیب سے قطاروں میں رکھی ہوئی تھیں جن میں سے چند کو کمبل یا چادر میں لپیٹ دیا گیا تھا۔ اکثر کے جبڑوں کو رومال سے کس کر باندھ دیا گیا تھا جیسے دانت کے درد میں مبتلا افراد کارٹونوں میں دکھائے جاتے ہیں۔ گزرتے وقت اور سرد موسم نے مردہ چہروں کو موم کا سا بنا دیا تھا: آنکھیں بند، ہر چیز کو دیکھتے ہوئے، لاتعلق، وہ معمول سے دکھائی دیتے تھے۔ ایک عورت کے چہرے پر تنفر کی تضحیک آمیز مسکراہٹ تھی، ایک داڑھی والے نے اپنے کھلے منہ سے زبان باہر نکال رکھی تھی۔ کیا یہ زندوں کے آخری تاثرات تھے یا مردوں کے اولین تاثرات؟ چند لاشوں کے سینوں پر لگے ہوئے نمبروں (مثلاً ۳۰ ،۴۳۰، ۸، ۶۷۸) سے پہچانا جا سکتا تھا کہ انھیں اسپتال سے لایا گیا ہے۔ دو سروں کو سڑک پر مارے جانے کے بعد ان کے گھر والوں یا راہ گیروں نے یہاں پہنچایا تھا۔ مسلسل گولا باری کے باعث لوگ قطعہ باغ میں ان کے لیے گڑھا بھی نہ کھود سکے تھے۔ یہ جگہ ایک طرح کا گودام بن گئی تھی۔ لوگوں کا خیال ہو گا کہ محاصرہ ختم ہونے کے بعد، اگر ممکن ہوا، یہاں آ کر لاشوں کو مناسب طریقے سے دفن کریں گے۔ اب ان لاشوں کے اجتماعی قبروں تک لے جائے جانے سے پہلے سرب ملیشیا کے سپاہی فاتحانہ چال چلتے اور قطاروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ان کے معائنے کے لیے پہنچے۔ انھوں نے مردوں کو حقارت سے گھورا، بل فائٹروں کی طرح ان پر برتری کی نگاہ ڈالی۔ پھر سر کو تیزی سے جھٹکا دے کر انھوں نے منھ پھیر لیا، جیسے اب بھی مردوں پر، یا خود پر، کچھ ثابت کرنا چاہ رہے ہوں۔ مردے ایسی موٹے اونی موزوں میں پڑے رہ گئے، جوتے اتنے قیمتی تھے کہ ان کے

پاس نہیں چھوڑے جا سکتے تھے۔

بلوط کے درختوں کی قطار کے خاتمے پر یہ سڑک بورووو سیلو کی فیکٹری کے بچے کھچے آثار تک جاتی تھی: ملبے اور شکستہ دیواروں اور آگ سے ٹیڑھے ہو جانے والے شہتیروں پر مشتمل ایک وسیع و عریض میدان۔ یہ ایک ایسا منظر تھا جو مجھے پندرہ دن بعد اوسیئک شہر کی وو کووارسکا بولوار کے کنارے ایک بار پھر دیکھنا تھا جہاں بڑے بڑے کارخانوں کے ناموں کی دھاتی تختیاں جلی ہوئی عمارتوں کے کھنڈروں میں زنگ کھاتی ہوئی پڑی تھیں۔ اور پھر مجھے یہ منظر بار بار ونکووچی، تزلہ اور شیشاک کے صنعتی علاقوں اور سرائیوو کی طویل رادومیر اپوتنیک میں نظر آنے والا تھا۔

بورووو سیلو کے مسمار شدہ مقام پر، جو ووکوور شہر کی معیشت کا اہم ترین حصہ تھا اور جس کی کشش اطراف کے علاقوں سے بیس ہزار مزدوروں کو وہاں کھینچ لاتی تھی، ملیشیا کے سپاہیوں کا جمِ غفیر برباد شدہ گوداموں میں چیونٹیوں کی طرح مالِ غنیمت کی تلاش میں ملبے کو الٹ پلٹ کرتا پھر رہا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ وہ ابھی تک بچ نکلنے والوں کو شکار کر رہے ہیں، مگر پھر دیکھا کہ ایک آدمی فاتحانہ انداز میں جوتوں کا جوڑا اٹھائے ہوئے ہے۔ بورووو سیلو کی فیکٹری جوتوں کی صنعت کے لیے مشہور تھی۔ ان مصنوعات میں سے ایک اونچے بوٹ تھے جن کے زرد یا سیاہی مائل پٹا ٹخنوں سے اوپر باندھا جاتا تھا اور تلا ہاتھ کا بنا ہوا اور دندانے دار ہوتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ یہ جوتا اتنا ہی واٹر پروف اور آرام دہ ہے جتنا ایگلز یا ٹمبر لینڈ کا بنا ہوا جوتا۔ یہ جوتے مقامی باشندوں کو دستیاب نہیں ہوتے تھے بلکہ زرِ مبادلہ شہر میں لانے کے لیے جرمنی اور آسٹریا کو برآمد کیے جاتے تھے۔ ملیشیا کے جوان فیکٹری کے ملبے میں آخری تیار شدہ جوڑوں کا شکار کرتے پھر رہے تھے۔ سہ پہر کے خاتمے پر ماند پڑتی روشنی میں وفاقی فوج اور ملیشیا دستوں کی وردی میں تمیز کرنا ناممکن تھا۔ گردن میں لٹکا ہوا جوتوں کا جوڑا ہی وہ واحد شے رہ گیا جس سے یہ امتیاز کیا جا سکتا تھا، کیوں کہ ملیشیا والے ہی وہ جنگجو تھے جنھیں جنگ کا مالِ غنیمت جمع کرنے کی اجازت تھی۔ مجھے خیال آیا کہ ایک جوتا اپنے ساتھ یادگار کے طور پر لے چلوں، مگر ملیشیا کے سپاہیوں کے اکھڑپن نے مجھے اس ارادے سے باز رکھا۔

اگلے سال اپریل میں مجھے سرائیوو شہر کی ایک جوتوں کی دکان میں بورووو سیلو کا نشان دکھائی دیا۔ یہ پورے ملک میں اس فیکٹری کے آخری دو جوڑوں میں سے ایک تھے، دکان دار نے مجھے بتایا۔ میں نے یہ جوڑا خرید لیا اور ہوٹل کے کمرے میں گدے کے نیچے چھپا دیا۔ اسی دوپہر ایک راکٹ کے حملے میں وہ دکان تباہ ہو گئی۔ جوتوں کا یہ جوڑا ان یادگاروں میں شامل ہے جنھیں میں نے اس جنگ کے دوران جمع کیا ہے۔ دوسری چیزوں میں ٹیٹو کی ایک فریم شدہ تصویر ہے جسے

میری دوست جین نے وو کوور میں ملبے کے ایک ڈھیر سے اٹھایا تھا، تین گولیاں ہیں جو اس عرصے میں میری چلائی ہوئی دو کاروں میں سے نکال کر محفوظ کی گئی ہیں، اور ایک توپ کے گولے کا ٹکڑا ہے جو ایک خون آلود شادی کی تقریب میں ایک کاغذی گل دستے اور میری ٹانگوں کے درمیان آ کر گرا تھا۔

جوتوں کے گوداموں سے آگے بورووو نسیلیے گاؤں کے شروع کے مکانات تھے جہاں تنازعے کی شروعات ۱۹۹۱ کے موسمِ بہار میں ہوئی تھی۔ اس گاؤں کے پیچھے کھیت اور چراگاہیں تھیں۔ وہاں کھڑے ہو کر مجھے اٹھارہ میل دور ونکووچی میں ہونے والی متواتر گولاباری کی دبی دبی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ دائیں طرف کچھ فاصلے پر دریائے ڈینیوب خم کھا کر ساکت کھڑے ہوئے سارسوں کے عقب میں غائب ہو جاتا تھا۔

مرکزِ شہر میں واپس آ کر میں دریا کی سمت چلا۔ دناو ہوٹل کا جو کچھ سلامت بچا تھا اس تک پہنچنے کے لیے مجھے ملبے کے ایک چھوٹے سے پہاڑ پر چڑھنا پڑا۔ اس کی چوٹی پر ایک فربہ بلی اپنے پنجوں سے کرید رہی تھی؛ یہ پہلا زندہ جانور تھا جس پر یہاں پہنچنے کے بعد سے میری نظر پڑی۔ ہوٹل میں سپاہی کیمپ لگانا شروع کر چکے تھے (یہی وہ جگہ تھی جہاں وہ آنے والے دنوں میں غیر ملکی سیاحوں کی آلو کے گاڑھے سُوپ سے تواضع کرنے والے تھے)۔ ہوٹل کے جلے ہوئے ٹیرس پر اچانک میرا سامنا زوران سے ہوا جو بلغراد کا صحافی تھا، ایک بے باک اور نیم جنونی شخص جو ہمیشہ حیرتناک ترین خبروں کی کھوج میں رہتا تھا۔ برسوں پہلے پولینڈ کے شہر گڈانسک میں ہم دونوں نے "سولیڈیریٹی" کے ابتدائی پُرجوش اور مسرّت سے سرشار دن اکٹھے گزارے تھے۔ اب وہ یہاں سربیائی فوجی افسروں کے حلقے میں کھڑا ان کی فتح کا جام تجویز کر رہا تھا۔ اپنی بات درمیان میں روک کر اس نے مجھے ارکن سے متعارف کرایا جو لمبا، قوی ہیکل اور شہرۂ آفاق عامیانہ پن کا حامل شخص تھا۔ وہ اپنے دستے کے ضرورت سے زیادہ جوشیلے غنڈوں کے ناگزیر گروہ ("ارکنووچی") میں گھرا کھڑا تھا جو ریمبو سیریز کی کسی فلم کے ایکسٹرا اداکاروں کا ٹولا معلوم ہو رہا تھا: شیخی خورے، متکبر، بے ڈھنگے اور بدلحاظ۔ ارکن اپنے بلند طنزیہ انداز کی وجہ سے اس گروہ میں ممتاز دکھائی دیتا تھا۔ اُس روز اس نے ایک اپنے سیاہ ٹوپیوں والے باڈی گارڈز کی شبیہوں سے ڈھکے ٹینک کی نال کے نیچے کھڑے ہو کر، ایک ہاتھ میں بزوکا کو اپنی ٹوپی میں رکھ کر اور دوسری طرف ایک جنگلی بلّے کو بغل میں لے کر، تصویریں اتروانے کے لیے پوز بنائے۔ فضا بوجھل تھی اور اس میں بہت عیاں طور پر نحوست کا اشارہ تھا۔ میں نے کوئی بہانہ بنایا اور وہاں سے چل دیا۔ مئی میں، سرائیوو کے محاصرے کے قریہ بہ قریہ جنگ میں بدل جانے سے ذرا پہلے، الیدزا کے مقام پر ارکن سے میری دوبارہ ملاقات

ہوئی۔ اور ایک بار پھر جون میں زوورنِک شہر میں، جہاں مشرقی بوسنیا کے دیہات میں خوں ریزی کی شدت اور رفتار میں اضافہ ہو رہا تھا۔

باہر زرد سے زرد تر ہوتے ہوئے سورج نے ڈینیوب کی طویل سطح پر شفاف روشنی کی تہ سی بچھا دی تھی۔ اس روشنی میں نیم غرقاب بجرے، ٹوٹے ہوئے مستولوں کے ڈھانچے، اور سیاہ چوبی کشتیوں کے شکستہ ٹکڑے نظر آ رہے تھے۔ فضا میں کسی جہاز یا بجرے کی آمد کی اطلاع دیتی ہوئی کسی سیٹی کی گونج نہیں تھی۔ اس ویران ساحل پر سناٹے کی حکمرانی میں خلل ڈالنے والی کوئی بھی شے موجود نہیں تھی۔ راستے میں کوڑے کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ پانی سے پھولی ہوئی، سبزی مائل چہروں والی لاشیں جھکی ہوئی شاخوں میں اٹکی سڑ رہی تھیں۔ دریا کے کنارے ایک چھوٹی سی پہاڑی پر پانی کی اونچی ٹنکی کسی روشنی کے مینار کی طرح ایستادہ تھی۔ بلاشبہ یہ سرب توپچیوں کا خاص ہدف رہی ہو گی جس پر انھوں نے دیوانگی میں بار بار راکٹ اور گولے برسائے تھے جن کی شہادت ہزاروں نشانوں کی صورت میں موجود تھی: یہ محاصرے کا ایک کرشمہ تھا۔

میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ اس کسمپرسی کے منظر میں سے وہ کون سی چیز ہے جس نے مجھ پر عمیق ترین تاثر چھوڑا۔ لامتناہی کھنڈر، ہر شے کا سیاہی مائل رنگ، ملبے کی گہرائی، بھاری ٹھوکروں میں آتی لاشیں، فتح مند ملیشیا میں میلے کا سماں، شہر کے ویران کردہ کوارٹروں کا پتھریلاپن؟ نہیں۔ ان سب سے زیادہ اثرانگیز عمارتوں کی چیچک رو سطحیں تھیں۔ برس کر، دیواروں اور چھتوں اور گلیوں کے کونے کونے کو چھیل کر، داغ اور سوراخ ڈال کر، جا چکے طوفان کی نشانیاں۔ اس بدنما، غازہ لگی کھال میں چھپا یہ شہر چیچک کی وبا کا شکار نظر آتا تھا۔

جب میرے بلغراد روانہ ہونے کا وقت آیا تو توپ کے گولوں کا بچا ہوا ذخیرہ ایک قریبی گاؤں پر دوبارہ برسنا شروع ہو گیا۔ محاصرے کے اٹھائیسویں دن کی شام وحشت بھری آنکھوں والے کروٹ جنگجو اپنی زندگیاں سرب سپاہیوں کے ہاتھ بے حد مہنگی قیمت پر فروخت کر رہے تھے جو اُن سے کم سودائی نہیں تھے۔

***

تین دن بعد وُوکوور میں مَیں اور میرا دوست آئیوو سڑک کے کنارے کھڑے بارہ نارنجی بسوں کے ایک قافلے کے برابر سے گزرے۔ ان کے ڈرائیور انھیں وہیں چھوڑ گئے تھے، دروازے مقفل اور کھڑکیاں بند تھیں۔ بسوں میں عورتوں، بچوں اور معمر لوگوں کے ہیولے بے رنگ کمبلوں

Scanned with CamScanner

کے نیچے سردی سے کپکپا رہے تھے۔ گرد آلود کھڑکیوں کے پیچھے عورتیں، آنکھوں میں آنسو بھرے، ہاتھوں میں خالی بوتلیں اٹھائے، پانی کے لیے گڑگڑا رہی تھیں۔ ان کے چہرے قطبی درجہ حرارت کے باوجود جھلسے ہوئے تھے۔ ہم نے کئی استعمال شدہ بوتلیں جمع کیں اور انھیں سڑک کے دوسری طرف واقع فارم سے بھر کر لانے کو تھے کہ ملیشیا کے پانچ یا چھ جوان ایک گھر میں سے برآمد ہوئے اور زور زور سے دھمکاتے ہوئے ہماری طرف دوڑے۔ اپنی کلاشنکوفوں کا رخ ہماری طرف کرتے ہوئے انھوں نے ہمیں گاڑی میں بیٹھنے اور وہاں سے دور ہو جانے کا حکم دیا۔ ان کے بوکھلائے ہوئے انداز کے سبب، جو کھلی دیہاتی فضا کے برفانی سناٹے میں حیرت انگیز لگتا تھا، کھڑی ہوئی بسوں کا قافلہ متعدی مرض میں مبتلا یا کسی لعنت کا شکار لگنے لگا۔ ہم کیچڑ بھری سڑک پر احتیاط سے گاڑی چلاتے ہوئے گاؤں تک پہنچے کیسے سید رومیں، جو ہمارے راستے میں آنے والی پہلی جگہ تھی، لوگوں کا ایک گروہ اپنے آپ کو گرم رکھنے کے لیے بیٹھا ترکی قہوے اور برانڈی کے گھونٹ لے رہا تھا۔ یہ قافلے کی بسوں کے ڈرائیور تھے۔

مسافروں میں عورتیں، بچے اور ستر سال سے اوپر کے مرد شامل تھے جو کبھی وو کوور کے کروشیائی شہری تھے۔ سربیائی فوجیوں نے انھیں ان کی زیرِ زمین پناہ گاہوں سے باہر نکالا تھا اور پانچ کلومیٹر دور ایک سربیائی گاؤں کو روانہ کر دیا تھا جہاں انھیں اجناس کے گودام میں رکھا گیا۔ ان سے دو دن تک پوچھ گچھ کی جاتی رہی اور ان کے سرب ہمسایوں نے، جو اپنے تہہ خانوں سے ان کے ساتھ نکال کر لائے گئے تھے، ان کو علانیہ مجرم ٹھہرایا۔۔ ان لوگوں نے جن کے ساتھ انھوں نے، جنگ سے پہلے کے زمانے کا ذکر چھوڑ کر بھی، محاصرے کے تین ماہ گزارے تھے۔ بہر حال، وہ اسلحہ رکھنے یا کروشیائی ملیشیا کی امداد کرنے کے مجرم نہیں ثابت ہوئے۔ معمر لوگوں میں سے کسی کا لڑکا کروشیائی آفیسرز کور میں شامل نہیں پایا گیا اور یوں وہ بطور یرغمال کسی مصرف کے نہ تھے۔ وہ بے وقعت لوگ تھے اور انھیں اپنی حراست کے علاقے سے اپنی منتخب کردہ کسی بھی منزل کی طرف جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ اس لیے ان لوگوں نے۔۔ جو اپنا سب کچھ، شوہر، گھر، ملازمت، سب سے قیمتی اثاثہ، بیشتر بچے، گنوا چکے تھے۔۔ زگرب کی سمت، اپنے رشتے داروں یا بین الاقوامی امداد کی تلاش میں، یا محض اپنی جلاوطنی کی زندگی شروع کرنے کے لیے، کروشیا جانے کی درخواست کی تھی۔

اس طرح قافلہ بن گیا تھا اور چار دن کے انتظار کے بعد، گاؤں سے دو ہی دن پہلے روانہ ہوا تھا۔ مسافروں کو صبح کے وقت پانی، گوشت کا پیسٹ اور روٹی کا ٹکڑا، اور شام کو سوپ کا ایک پیالہ دیا گیا تھا۔ بسیں چالیس کلومیٹر دور واقع شِید کی سمت بغیر کسی حفاظتی دستے کے روانہ کی گئیں جہاں فوجی

انتظامیہ نے انھیں تقریباً چوبیس گھنٹوں تک، ہنگوسلاوچی اور بلغراد کے بیدمکوا ور مرز سے لاحاصل پیغامات کے تبادلے کی غرض سے، روکے رکھا۔ پھر یہ بسیں ایک کروشیائی قصبے سلاوونسکی برود کے لیے چلیں جہاں عام طور پر مقامی حکام ایسے پناہ گزینوں کو وصول کرتے اور ان کی ذمے داری لیتے تھے۔ سرحد پر انھیں مزید ایک رات کی تاخیر کرائی گئی۔ صبح کو آخرکار بسیں کروشیائی علاقے میں داخل ہوئیں۔ اور عین اس لمحے، جب مسافروں نے سمجھا کہ انھیں ان کے ڈراونے خواب سے نجات مل گئی ہے، ان کے سفر نے اچانک ایک بدترین رخ اختیار کر لیا، بدانتظمی کا دوسرا دور شروع کرتے ہوئے ڈرائیوروں نے بتایا۔

سرحد کے دوسری طرف واقع پہلے کروشیائی گاؤں کیپووانچ کے نواح میں یہ بسیں فائرنگ کی زد میں آ گئیں۔ بسوں کے رکتے ہی اسنائپروں نے اپنی گولیوں کی بارش روک دی۔ سرب ڈرائیوروں نے یہی سمجھا کہ وہ اپنے ہم وطنوں کی غلط فہمی کا نشانہ بنے ہیں۔ انھوں نے بسیں موڑیں اور پھر سرحد تک آئے جہاں سرب فوج نے انھیں یقین دلایا کہ یہ علاقہ گزشتہ موسم بہار سے فائرنگ زون نہیں رہا ہے۔ تمام ڈرائیور تربیت یافتہ افراد تھے، وہ واپس ہوئے اور پھر خود کو اسی جگہ پر چھپے ہوئے بندوق برداروں کی گولیوں کی زد میں پایا۔ وہ مڑے اور ایک بار پھر سربیا آئے: گاؤں میں موجود حکام نے انھیں اس شرط پر اپنی بسیں (جن کے پاس سے ہم گزر کر آئے تھے) سڑک کے کنارے روکنے کی اجازت دی تھی کہ کوئی مسافر نیچے نہیں اترے گا، نہ تو پانی کی بوتلیں بھرنے کے لیے اور نہ ہی -- ایک عمدہ سربیائی جنگی منطق کے مطابق -- حوائج ضروری کے لیے۔ دو دن اور دو راتوں سے بسوں کے مسافروں کے پاس پانی کا ایک قطرہ تک نہیں تھا۔ کھڑکیوں سے لگے کچھ چہرے ایسے نظر آ رہے تھے جیسے مٹی کے بنے ہوئے ہوں۔

یہ آسیوو تھا جس نے اس ماورائے حقیقت صورت حال کی وضاحت کی۔ وو کوور پر وفاقی فوج اور سرب ملیشیا کے قبضے کے تین روز بعد بھی زگرب میں کروشیائی حکومت اس بات کی تردید کر رہی تھی کہ شہر کا سقوط ہو چکا ہے۔ اور چوں کہ ہتھیار نہیں ڈالے گئے تھے اس لیے نہ تو پناہ گزین ممکن تھے اور نہ زگرب کی جانب پیاس سے جاں بلب لوگوں سے بھری ہوئی بسیں۔ اس بات کی تصدیق کے طور پر اُس شام زگرب ٹیلی وژن کی خبروں میں وو کوور کے کروشیائی جنگجوؤں کی بلند حوصلگی اور کبھی کم نہ ہونے والی مزاحمت کو بیان کیا گیا۔ تبصرے میں بموں کی بوچھار کا ایک مونتاژ دکھایا گیا جو کم از کم تین ہفتے قبل، یعنی زگرب ٹیلی وژن کے رپورٹروں کے شہر چھوڑنے سے پہلے، فلمایا گیا تھا۔ پھر میں نے بلغراد ٹیلی وژن سے رجوع کیا جو بچوں کی مسخ شدہ لاشوں کی ایک قطار اس دعوے کے ساتھ براڈکاسٹ کر رہا تھا کہ انھیں کروشیائی فوجوں نے مسخ کیا ہے۔ یہ لاشیں

کہیں اَور سے جمع کی گئی تھیں اور انھیں سرب بچوں کے وسیع پیمانے پر قتلِ عام کا تاثر دینے کے لیے وو کوور کے سرب علاقے کے ایک تہہ خانے میں رکھا گیا تھا۔ اس طرح ایک دوسرے سے ساڑھے تین سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع مخالف چینلوں کے خبرناموں کے مدیر ایک دوسرے سے مقابلے میں مصروف تھے۔ ایک نے اُس جنگ میں شجاعت کا ادّعا کیا جو ہاری جا چکی تھی اور دوسرے نے لاشوں کے خودساختہ مجموعے کو نمائش پر رکھا۔ جیسے جیسے سفاکیوں میں اضافہ ہوا، آخرکار کھیلوں کے مقابلوں اور کامیڈی فلموں نے جنگ کے ابتدائی دنوں کی ہولناک فلموں کی جگہ لے لی۔

تشنہ دہن قافلے کی دربدری دو گھنٹے بعد ختم ہوئی جب گاؤں کے کمانڈر نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈرائیوروں کو (جو اپنے ساتھ ایک بوتل تک نہ لے جاسکنے پر سخت مایوس تھے) ان کی بسوں میں واپس بھیج دیا۔ وہ کہر آلود رات میں اپنے مسافروں کو لے کر ریڈ کراس کی ایک لینڈ کروزر کے پیچھے اس تنگ سڑک پر روانہ ہوگئے جو شہریوں کے استعمال کے لیے ممنوع تھی اور جس پر چقندروں سے لدے ٹریلروں سے ٹپکنے والے پانی کی وجہ سے پھسلن ہو رہی تھی۔

***

محاصرے کے آخری دنوں سے سقوط کے بعد والے دن تک، انسانی کوڑے کرکٹ کی صفائی اور زندہ انسانوں کی بڑے پیمانے پر منتقلی کے خفیہ منصوبے پر عمل جاری رہا۔ اس معمّے کے بارے میں مَیں نے اس وقت سوچا جب میں پیرس واپس آیا اور دوستوں نے مجھ سے بجا طور پر یہ سوال کیا کہ وو کوور کے ساٹھ ہزار باشندے کہاں گئے۔ بیس ہزار عورتیں اور بچے ۱۹۹۱ کی گرمیوں میں شہر کا محاصرہ سخت ہونے سے پہلے نکل گئے تھے۔ پھر سات یا آٹھ ہزار افراد کو بلغراد، نووی ساد یا مونتے نیگرو کے قصبوں میں منتقل کیا گیا تھا۔ تین یا چار ہزار افراد کروشیائی سرحد کی طرف روانہ کیے گئے تھے۔ باقی لوگوں کا کیا ہوا؟ کم از کم پندرہ ہزار افراد، جن میں زیادہ تر مرد تھے، اس شمار سے غائب تھے۔ ڈینیوب کے کنارے اس بجے سجائے، خوش حال شہر کی مرد آبادی کس طرح نابود ہو گئی؟ وہ سب کہاں چلے گئے؟ اس سوال کا درست اور مکمل جواب دینا ممکن نہیں، اور نہ ایک طویل عرصے تک ممکن ہو سکے گا۔ ۱۹۹۳ کے خاتمے پر، ان سطور کو لکھتے وقت، وو کوور کے نواحی دیہات میں اجتماعی قبریں نمودار ہونے لگی ہیں۔ آج میں خود سے کہتا ہوں کہ سب سے محیرالعقول بات یہ نہیں ہے کہ اس سوال کا جواب نہیں دیا جاسکتا، بلکہ یہ ہے کہ ہر شخص نے یہ

Scanned with CamScanner

سوال پوچھنا بند کر دیا ہے۔ گویا سرائیوو شہر کی ڈرامائی صورتِ حال نے ان کے حافظے سے وو کوور کے باشندوں کی گم شدگی کو محو کر دیا ہے۔

***

لوگ کس طرح تین مہینے تک زیرِ زمین رہنے کے بعد بھی زندہ رہ گئے؟ اس سوال کا جواب پانے کے لیے ہم اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر اس سڑک پر آ گئے جو ہمیں شِید لے گئی۔ جیپوں اور ٹرکوں نے اندھادھند چلتے ہوئے ہماری طرف رخ کیا۔ صبح کی سرشار دھند میں ڈوبے ان کے ڈرائیور ہمیں بچنے کے لیے اچانک مڑ جانے پر مجبور کرتے۔ آخر کار سڑک ہمیں بل ڈوزروں اور کھدائی کی مشینوں کے ختم نہ ہونے والے دھارے سے دور لے گئی: واپس مڑنے اور رخصت ہونے سے پہلے یہ مشینیں وو کوور کے نواح میں رکھی رہی تھیں۔ اپنی ذاتی منطق کی بنا پر وو کوور کے فوجی حکام نے ملبے کو جوں کا توں رہنے دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس بات سے بازاروں میں ہونے والی تیز سرگرمیاں بند نہیں ہوئیں۔ سپاہیوں نے پھاوڑوں کی مدد سے ملبے کو تباہ شدہ مکانوں کے اندر پھینکنا اور سڑتے ہوئے کوڑے کو ڈھیریوں میں جمع کرتے ہوئے، جنھیں موسمِ سرما کی ٹھنڈک محفوظ رکھے گی، فٹ پاتھوں کی صفائی کرنا جاری رکھا۔ ملیشیا کے سپاہی، بلقان کے دیہاتی طریقے کے مطابق جس میں کلاشنکوفوں کے باقاعدہ استعمال کو ترجیح دی جاتی تھی، بارودی سرنگیں ہٹانے کا کام کرتے رہے۔ وہ اپنے میگزین عوامی مقامات، فوجی اعتبار سے اہم عمارتوں اور پارکوں پر خالی کرتے۔ اور جب فائرنگ کے کسی راؤنڈ میں کسی سرنگ کے پھٹنے کی آواز سے خلل پڑتا، ایک عام خوشی کی لہر دوڑ جاتی، قہقہے پھوٹ پڑتے، گن مین کو پیٹھ پر تھپکی دی جاتی، شراب کی بوتل کو گردش میں لایا جاتا اور پھر میلیشیا کے سپاہی اپنے کام پر واپس لوٹ جاتے۔

اُن کے اطراف، شہریوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں سہمے ہوئے قدموں سے ناہموار سڑک پر بڑھ رہی تھیں۔ یہ جلاوطنی سے لوٹنے والے پہلے سرب تھے۔ ان کی اکثریت گرمیوں کے آغاز میں کروٹ ملیشیا اور سرب پولیس کے درمیان پہلی جھڑپوں کے بعد چلی گئی تھی۔ چوبیس گھنٹے کا اجازت نامہ حاصل کیے ہوئے ان خاندانوں نے نقصانات کا اندازہ لگانے کے لیے کھنڈروں کا دورہ کیا۔ انھوں نے اپنے ٹوٹے ہوئے گھروں کا جائزہ لیا اور کچھ لوگوں نے بعض چیزوں، مثلاً ایک کمبل یا ایک میز، اور بعض خوش قسمتوں نے ایک ٹیلی وژن کو سلامت پا کر نکالنے کی کوشش کی۔

Scanned with CamScanner

ان کے گرد والنتے کی نظموں کے قرینے کا بالہ سا تھا جو تمام غم یا حسرت کا گلا گھونٹتا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ملیشیا اور فوج کے کمانڈوز نے تہہ خانوں، پاسپورڈ گس اور مشترکہ زمیں دوز ذخیرہ گاہوں میں تلاشی جاری رکھی تاکہ اطاعت پر مائل تتر بتر لوگوں کو باہر نکالا جاسکے۔ پھر وہ ان لوگوں کو قانونی کارروائی کے اسٹیشنوں کی طرف روانہ کر دیتے، ایک ایسا عمل جس پر انھیں کبھی کبھار شرمندگی بھی ہوتی۔

ہتھیار ڈالنے کے تین دن بعد تک ووکوور کے کچھ باشندے اپنے زیرزمین ٹھکانوں میں بند تھے۔ ان آخری آسیب نما بچ جانے والوں میں زیادہ تر عورتیں تھیں۔ ان کے قدرے میلے بال سرپوشوں سے ڈھکے ہوئے تھے اور وہ اپنے شیرخواروں اور چھوٹے بچوں کو اٹھائے ہوئے تھیں جن سے انھوں نے موسم گرما میں، جب کہ انھیں شہر سے باہر بھیج دینا ممکن تھا، جدا ہونا نہیں چاہا تھا۔ معمر لوگوں نے ایک دوسرے کو بازوؤں سے سہارا دے رکھا تھا۔ یہ لوگ لاغر نہیں تھے۔ ان کی قید کا اثر ان کے چہروں کی انتہائی بے رونقی اور فربہی کی ابتدا سے ظاہر ہوتا تھا۔ ان کی آنکھوں کے گرد حلقے تھے، جیسے انھیں کسی اوزار سے کھود کر گہرا اور کوئلے کی سلائیوں سے سیاہ کیا گیا ہو، جن سے ان کی نگاہ کی آسیب زدگی کچھ اور بڑھ جاتی تھی۔ بچ جانے والے اپنے زیرزمین ٹھکانوں سے ایک بے ہوشی کی سی حالت میں باہر نکلے۔ وہ گر جانے کے قریب تھے۔ پھر غیرمتوقع طور پر وہ بالکل سیدھے چلنے لگے۔ کھلی ہوا میں آ کر یہ "چوہے" (جیسا کہ سپاہی انھیں محبت سے پکارتے تھے) ایک نیا جنم لیتے معلوم ہوئے جیسے پنجروں سے آزاد ہونے والے جانور۔ انھوں نے اپنی پیٹھ سیدھی کی، کچھ کچھ کتوں کی طرح اپنے آپ کو ہلایا، اپنی جیکٹوں کی سلوٹیں مٹائیں اور سر گھما کر اپنے ارد گرد نظر ڈالی۔

دو عورتیں، جن کے بازو مضبوطی کے ساتھ ایک دوسرے سے پیوست تھے، اس دوپہر آمور جیو اسٹریٹ کی ایک عمارت کی زمیں دوز منزل کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئیں۔ دو متحمل مزاج سپاہیوں نے، جن کی مروت کا ماخذ ان کے اور بچ جانے والوں کے درمیان ایک بندھن کا احساس تھا، محتاط انداز میں ان کی مدد کی۔ عورتوں نے فٹ پاتھ پر تین قدم آگے بڑھائے اور گرد آلود فضا میں سانس لی۔ سپاہیوں نے ان میں سے ایک کو ہم سے انگریزی میں بات کرنے کی اجازت دے دی۔ وہ دونوں ایک جیسے انوراک پہنے تھیں اور ہم عمر دکھائی دیتی تھیں۔ ان کے جسموں سے تھکن کی تیز، مگر کم ناخوشگوار، بو آ رہی تھی۔ ان کے ناخن قطعی درست انداز میں ترشے ہوئے تھے۔ ہلینا ایک کروٹ گائنا کولوجسٹ تھی اور میریانا ایک سرب مزدور۔ ہلینا کے بال چھوٹے تھے اور پیچھے کی طرف بنے ہوئے تھے۔ اس انداز نے اس کے نازک نقوش والے چہرے اور

Scanned with CamScanner

سُتواں ناک کو مزید خوب صورت بنا دیا تھا۔ وہ لمبے قد کی تھی، مگر میریانا سے زیادہ نہیں، جس کے لمبے سنہری بال سپید ہو چکے تھے پڑے ہوئے تھے اور کپڑے کی دھجی سے گردن کے پاس بندھے تھے۔ میریانا کے نقوش گوشت کے ٹکڑوں کی خوراک کھاتے رہنے کی وجہ سے بھدے اور بوجھل سے تھے مگر کچھ متضاد طور پر نرم اور پرسکون بھی تھے۔

میں ان عورتوں کے وجود سے پھوٹتی ہوئی نرمی سے فوراً ہی متاثر ہو گیا۔ وہ تنازعے کی شروعات سے پہلے ایک دوسرے کو نہیں جانتی تھیں۔ ایک روز یلینا اپنے گھر سے کافی دور اپنی تین بیٹیوں کو، جو کئی دن سے لاپتا تھیں، اس عمارت کی راہ داریوں میں ڈھونڈتی پھر رہی تھی، اور اسی عمارت میں میریانا نے اپنے مکان کے تباہ ہو جانے کے بعد پناہ لے رکھی تھی۔ دو مہینے تک ان دونوں نے ایک ساتھ چقندر چھیلے تھے، پین کیک کے لیے آٹا گوندھا تھا، نگی کے پانی کو مل جل کر استعمال کیا تھا اور بال وے کے ٹائلوں والے فرش پر، جہاں وہ فلیٹوں کی نسبت زیادہ محفوظ تھیں، دوہرے کمبلوں میں لپٹ کر سوئی تھیں۔

جب تک ان کے ٹرانزسٹر کی بیٹریاں کام کرتی رہیں انھوں نے بلغراد، زگرب اور نووی ساد اسٹیشنوں کی نشریات سنی تھیں اور مسلسل مایوس ہوتی رہی تھیں۔ جب ٹرانزسٹر نے کام کرنا چھوڑ دیا تو وہ بمباری کی آوازیں سنتیں اور ایک دوسرے سے اپنے شوہر، اپنے بچوں اور اپنی زندگی کے بارے میں گفتگو کرتی رہیں۔ یلینا نے کہا، "ہم ہر رات ایک دوسرے سے باتیں کیا کرتے تھے، ہر چیز کے بارے میں اور کسی بھی چیز کے بارے میں نہیں۔" صبح ہوتے ہوتے اگر توپیں خاموش ہو جاتیں تو وہ باہر گلی میں نکلتیں۔ وہ اپنے چیمبر پاٹ قریبی باغ کے ویران مرغی خانے کے پیچھے جا کر خالی کرتیں۔ وہ اپنے برتن بلوط کے پتوں سے رگڑ کر صاف کرتیں اور ادھر ادھر اگی ہوئی گوبھیاں چن کر لاتیں۔ انھوں نے اپنی شکل صورت کو جہاں تک ہو سکا ڈھنگ سے رکھنے کی کوشش کی۔ چھوراہے پر لگے نلکے سے بالٹی اور جگ میں جمع کیے ہوئے پانی سے بال دھونے میں دونوں ایک دوسرے کی مدد کرتیں جیسے وہ چھٹیوں کے دوران کیمپنگ کر رہی ہوں۔ جب بارش ہوتی تو باغیچے میں بنے بڑے بڑے پیالے پانی سے بھر جاتے اور اگر گولاباری میں تھوڑا سا وقفہ آتا تو وہ اپنے زیرجامے اور جرابیں دھو لیتیں جنھیں وہ کبھی کبھی استعمال کرتی تھیں۔ رات کو وہ اپنے اسکرٹ اور سویٹر جہاں تک بن پڑتا صاف کرتیں اور اگر آسمان اجازت دیتا تو روٹیوں کی تقسیم کے ایک مرکز تک بھی ہو آتیں۔

یلینا اس خوف کے مارے اپنے خالی اپارٹمنٹ میں واپس نہیں گئی کہ اسے اپنی تینوں بیٹیوں کی گم شدگی کی حقیقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ میریانا کا بیٹا اور بیٹی بھی غائب تھے۔ اُس

دوپہر انھوں نے شہر کے عارضی مُردہ خانے جانے کی اجازت مانگی۔ "کم از کم یقین تو ہو جائے،" یلونا نے کہا۔ اجازت نہیں ملی۔ جس وقت یلونا انگریزی میں اپنی داستان سنا رہی تھی، میریانا روتی رہی حالاں کہ اس کی سمجھ میں ایک لفظ بھی نہیں آ رہا تھا۔ پھر وہ بولی۔ "شروع شروع میں کروٹ ملیشیا کے سپاہیوں نے بہت اچھا سلوک کیا، مگر خاتمے کے قریب آتے آتے ماحول بہت ہولناک ہو گیا۔ وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ وہ چلّاتے ہوئے آتے کہ سربیائی فوج کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے وہ تمام سربوں کو گولیوں سے اُڑا دیں گے۔ تین دن پہلے ایک نوعمر لڑکا یہیں کہیں آس پاس سے آیا۔ جنگ سے پہلے وہ ایک سیدھا سادہ نیک لڑکا رہا ہو گا۔ وہ ایک بوڑھے میاں بیوی کو، جن کا بیٹا سربیائی فوج میں تھا، کوڑے کے ایک ڈھیر کے پاس لے گیا اور انھیں گولی مار دی۔ اس نے اپنے ریوالور سے باری باری ان کے سر میں گولیاں ماریں، سڑتے ہوئے کوڑے کے ڈھیر پر، ہماری آنکھوں کے سامنے۔" وہ دونوں چپ ہو گئیں، شاید اس لیے کہ وہ اپنی بات کا اظہار کرنے سے قاصر تھیں۔

دوسرے دن وِیلی پرونیت کے قانونی کارروائی کے مرکز میں مَیں نے یلونا اور میریانا کو دوبارہ دیکھا۔ دونوں عورتیں جنھوں نے باہر برستے ہوئے گولوں کے دھماکوں میں ایک رہداری میں چھپ کر ایک ساتھ راتیں گزاری تھیں، ایک دوسرے کو اپنی زندگی کی کہانیاں سنائی تھیں، جنھوں نے کپڑے دھوتے ہوئے یکسانیت سے نجات پانے کے لیے ایک دوسرے سے بریزئیر بدل کر پہنی تھیں، اب ان میں سے ایک اس گروہ میں تھی جو کہیں لے جائے جانے کا انتظار کر رہا تھا، اور دوسری چند میٹر کے فاصلے پر ایک اَور گروہ میں۔ اب انھیں ایک دوسرے سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اُنھیں جدا کر کے نارنجی بسوں کے ان قافلوں میں شامل کیا جانے والا تھا جو متضاد سمتوں کو جا رہے تھے۔ وہ نگاہیں جمائے ایک دوسرے کو گھورتی رہیں، پھر نگاہیں ہٹا کر خلا میں تکنے لگیں اور پھر دوبارہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ آخر وہ اپنے اپنے گروہ سے الگ ہو کر ایک دوسرے کی طرف دوڑیں، ایک دوسرے کے سویٹروں کی آستینوں میں ہاتھ چھپا لیے اور لپٹ کر ایک دوسرے کو چومنے لگیں۔

***

نازوزراچ اسٹریٹ کی، جو گلاب کی جھاڑیوں کی قطاروں کے درمیان بچھی ایک خوبصورت سڑک تھی، فٹ پاتھ پر فوجی عدالت میں کام کرنے والی ایک سرب عورت ہمارے پاس آئی اور

بتایا کہ کس طرح اس کے شوہر کی لاش چار دن تک باورچی خانے کی میز پر پڑی رہی تھی اور وہ اور اس کے بچے لاش کی موجودگی میں رہتے رہے تھے۔ پھر وہ ہمت کر کے باہر نکلی اور جلدی جلدی اس کے شوہر کو "کسی کوٹ میں لپیٹے بغیر" ایک مشترک قبر میں دفن کر دیا گیا۔ وہ اس کے قاتل کو بخوبی جانتی تھی، گوران بوگدانووچ نامی اس شخص نے نشے کی حالت میں اپنے سٹنگ روم کی کھڑکی سے اس کے شوہر کو، جو کوڑا پھینکنے گھر سے باہر نکلا تھا، کسی خرگوش کی طرح گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ سقوط کے دن یہ گوران بوگدوانووچ خود بھی مقتول کے بھائیوں میں سے ایک کی گواہی پر اپنے گھر میں فاتحین کے ہاتھوں سر کی پُشت پر گولی کھا کر ہلاک ہوا۔ عورت نے محض اتنا کہا: "ایک ہفتہ پہلے، میں اُس کی بیوی گبریلا کے ساتھ خریداری کر رہی تھی۔" اس بے حد پُروقار عورت نے، جس نے آنسو نکل آنے کے خوف سے آگے ایک لفظ بھی کہنے کی جرأت نہیں کی، میری نوٹ بک اور قلم چھین لیا اور فرانسیسی میں لکھا: "رادمیلا اور نکولا کریور، عمر ۳۲ سال، ختم شد۔"

ایک خوش گفتار ہنگیرین عورت سائیکل پر سوار اپنے راستے پر جاتے جاتے ہمیں یہ بتانے کے لیے رکی کہ کس طرح کروشیائی پولیس کے ایک حکم نامے کے ذریعے اسے باورچن اور ملازمہ کی حیثیت سے کام کرنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ ہر روز صبح سے رات تک وہ ان کے لیے کھانا پکاتی تھی۔ ہم جہاں کہیں گئے، انوکھی سرگزشتوں کے تراشے ہمارے پاس جمع ہوتے گئے۔ ہم نے خود کو غریبوں کے تنگ محلّے میں پایا جو گولاباری سے پامال تھا اور ان کہانیوں سے مل کر بنا تھا جو اپنے راویوں کے کیمپوں میں منتقل ہونے کے ساتھ ساتھ معدوم ہوتی جا رہی تھیں۔

شہر میں آوارہ گردی کرتے ہوئے میں نے ہر واقعے کا بغور مشاہدہ کیا۔ ہر بار کسی خواب گاہ یا بیٹھک میں داخل ہوتے ہوئے یا کسی آرائش کی یا گھریلو استعمال کی چیز کو چھوتے ہوئے، میں ایسی نشانیوں کی تلاش میں رہا جن کی مدد سے وُو کوور شہر کی روزمرہ زندگی کو اپنے ذہن میں متشکل کر سکوں۔ ڈینیوب کے کنارے بنفشی ٹائلوں اور سبز محرابی گزرگاہوں والے اس شہر کے کھنڈروں میں، جوتے بنانے کی صنعت کے اس تباہ شدہ مرکز میں، نیلے بلغاروی جہازوں کے راستے میں پڑنے والی اس بندرگاہ میں، آخری بچے ہوئے انسانوں کا کھلی ہوا میں نکلنا ناقابلِ فراموش منظر تھا۔

میں نہیں سمجھ سکا کہ وُو کوور کے یہ باشندے تین ماہ تک ملبے میں قید، زمین دوز منزلوں میں پھنسے ہوئے، اپنی اسیری کے سبب تک سے ناواقف (اس کی میعاد کا تو کیا ذکر)، سوّر کے خشک گوشت کی خوراک پر، اپنے خاندانوں، عزیزوں، دوستوں، گھروں اور مال و متاع کو گنوا کر کس طرح زندہ رہ گئے، کس طرح ذہنی توازن کھوئے بغیر انتظار کے لامتناہی دور کو برداشت کر گئے۔ ایک ماہ بعد اوسیئک کی زیرِزمین گیلریوں میں، اور پھر اگلے موسمِ بہار میں سرائیوو کے تہ خانوں میں، مَیں

نے مصور آبادی کی روزمرہ زندگی میں لمحۂ موجود کی طاقت کو رفتہ رفتہ سمجھنا شروع غیر معمولی توانائی کا اندازہ کرنا شروع کیا جو ایسے لوگ جنگ کے دوران زندہ رہنے کے لیے بروئے کار لاتے ہیں۔

***

پس نوشت:

وُوکوور کے سقوط کے بعد سربیائی توپ خانے کی خاص فوج نے دوسرے مقامات پر اپنا کام جاری رکھنے کے لیے خیمے گاڑے۔

شمال مغرب میں سینتیس کلومیٹر دور اس فوج نے اپنے ٹینک اوسیک کے نواح میں ٹھہرائے، اٹھارہ کلومیٹر جنوب مغرب میں ونکووچی پر چڑھائی کی جہاں اگست سے بھاری توپیں میدان کو ہموار کرتی رہی تھیں۔ اس بھاری نقل مکانی کے تعاقب کی کوشش بے معنی تھی۔ فوجی حکام کی کثیر تعداد سامنے آ جاتی اور میرے اور میدان جنگ کے درمیان پہاڑ کی طرح حائل ہو جاتی، چناں چہ مجھے آسیو کو، جو سرب تھا، چھوڑ کر شمال کی طرف ایک طویل موڑ کاٹتے ہوئے، واپس وویوودینا کے علاقے کی طرف رخ کر کے قتل عام کے کنارے کنارے چلنا پڑا۔ پھر میں نے سوباک کے مقام پر فیری میں سوار ہو کر ڈینیوب پار کیا جس کے کنارے راج ہنسوں کے چھوٹے چھوٹے غول نقطوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ بوداپسٹ کے ایئرپورٹ کے اتنے قریب آ کر پیرس کا چکر لگانے کی ترغیب خاصی طاقت ور ثابت ہوئی۔

نومبر کے آخر میں پیرس جگمگا رہا تھا۔ لاٹھوں سے خالی دریائے سین کی گزرگاہ کے دونوں کنارے روشن تھے۔ ریستورانوں کی کھڑکیوں میں زوال خط میں لکھے مینو آویزاں تھے اور کتابوں کی دکانوں میں میزوں پر پبلشروں کے سرخ فیتوں میں لپٹے اس موسم کے ناولوں کے ڈھیر لگے تھے۔ میں اپنی موٹر سائیکل پر سڑکوں کو ناپتا پھرا۔ پیرس کی سڑکیں کرسمس کے خریداروں کے ہجوم سے بھری ہوئی تھیں، لیکن وُوکوور میں اتنی بہت سی تاریک اور ویران سڑکوں پر چلنے کے بعد میں سوچنے لگا کہ یہ روشن پیلے بلب اور شاہراہوں کے آرپار جھولتے ہوئے ہار سال گزر جانے کی ناگزیر اداسی میں مسرت کا ایک عنصر شامل کر رہے ہیں۔

مگر بہت ہی جلد پیرس کی یہ صلح جوئی ناگوار اور تکلیف دہ محسوس ہونے لگی۔ ہر چیز میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ تھی: وہاں (نیم تاریک حلاوونیا، بمباری، تہہ خانوں سے اٹھتی نگوبھیوں اور سوکھے ہوئے

پیشاب کی بُو) اور یہاں (خوش دلانہ ضیافتوں اور سیر و تفریح کے دائروں میں چکر لگاتی محفوظ دنیا) کا تضاد بہت ہی زیادہ تھا۔ تہہ خانے میں چقندر اور چربی بھرے خشک گوشت کے کھانے کے بعد بغیر لیبل کی بوتل سے پیے ہوئے پانی اور سفید میز پوش پر رکھے گلاس میں بارگو کے ریشمی یاقوت پر پڑتی لیمپ کی روشنی کی جھلملاہٹ کے درمیان ایک پوری کائنات حائل تھی۔ واپس آنے کے بعد پہلی ہی شام کو مجھے اس کہاوت کی سچائی کا احساس ہوا کہ جنگ سے لوٹتے ہوئے کسی شخص کے لیے اپنی محبوبہ سے جنگ کا ذکر کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ دوستوں نے ڈنر کے دوران وو کوور کے بارے میں --بڑی ہم دردی کے ساتھ-- بہت سی باتیں کیں، لیکن چاہے انھیں اس کے اظہار کی جرأت نہ ہوئی ہو، انھیں جنگ کی حقیقت کے بارے میں شک ہی رہا۔ وہ فکرمند ضرور تھے، لیکن کسی چیز کے بارے میں فکرمند ہونا اور اسے سمجھ پانا ایک ہی بات نہیں ہے۔ جلد ہی میں نے اُن کے اس علم میں جو انھیں اخبار پڑھ کر حاصل ہوا تھا، اضافہ کرنے کی کوشش ترک کر دی۔ مثال کے طور پر میں نے اس بات کی وضاحت کی کوشش چھوڑ دی کہ مجھے جنگ کے دوران لوگوں سے محبت کرنا زیادہ آسان محسوس ہوتا ہے۔ عادتوں کے تغیرات، خوف، حوصلہ، اذیت، بے یقینی جو ہمیں کم زور کرتے ہیں --یا، اس کے برعکس، ہمیں قوت بخشتے ہیں-- یہ سب اُس خلوص سے اتفاقی ملاقات کا پروانہ ہیں جو میں نے کہیں اور نہیں پایا۔

پیرس میں بیزاری اور تنہائی کا احساس روز بہ روز بڑھتا گیا۔ ممکن ہے یہ جنگل کا بلاوا ہو۔

**

سہ ماہی

سویرا

ترتیب: محمد سلیم الرحمٰن، سہیل احمد خاں

۱۵، سر کلر روڈ، لاہور

ادب اور فنونِ لطیفہ کا ترجمان

ذہنِ جدید

مرتب: زبیر رضوی

پوسٹ بکس ۷۰۴۲، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اردو ادب کا شش ماہی انتخاب

سوغات

مدیر: محمود ایاز

۸۴، تھرڈ مین، ڈیفنس کالونی، اندرا نگر، بنگلور ۵۶۰۰۳۸

ادبی ماہ نامہ

دریافت

مدیر: قمر جمیل

بی ۵، قمر پلازا، گلشنِ اقبال، بلاک ۳، کراچی ۷۵۳۰۰

Scanned with CamScanner

۱۰

بوگدان بوگدانووچ : شہر اور موت

بوگدان بوگدانووِچ (Bogdan Bogdanovic) ۱۹۲۲ میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک انعام یافتہ آرکیٹیکٹ ہیں اور یاسینوواچ، وُوکوور اور موستار کے شہروں میں فاشزم کا شکار ہونے والوں کی یادگاریں ڈزائن کرنے کے باعث خاص طور پر معروف ہیں۔ وہ اپنی ریٹائرمنٹ تک بلغراد یونیورسٹی میں پڑھاتے بھی رہے۔ بوگدانووِچ نے شہروں کے جوہر اور ان کی تقدیر، اور آرکیٹیکچر کی زبان اور علامتوں کی باطنی زیریں ساخت کے موضوعات پر متعدد مضامین تحریر کیے، جن میں سے بعض ان کے بنائے ہوئے خاکوں کے ساتھ شائع ہوئے۔ ۱۹۸۲ سے ۱۹۸۶ تک وہ بلغراد شہر کا میئر بھی رہے۔ ان کی کتابوں میں *Small Urbanism* (۱۹۵۸)، *The Futile Trowel* (۱۹۶۳) اور *Urbs and Logos* (۱۹۷۶) شامل ہیں۔

بوگدان بوگدانووِچ

ترجمہ: اجمل کمال

شہر اور موت

کیا ہم نے اس قیامت کی پیش گوئی کی تھی؟

جو پانچ مختصر پارے میں یہاں اپنے پڑھنے والوں کے سامنے پیش کر رہا ہوں، ان میں سے تین ایسے ہیں جن کو مطالعۂ شہریات (urban studies) کے موضوع پر لکھے گئے مضامین قرار دیا جاسکتا ہے، ایک کو سیاسی علامات کے لسانی علم کے بارے میں مضمون کہا جاسکتا ہے (اگر اس نام کا کوئی علم موجود ہے تو)، اور ایک کو ایک طرح کی کامک اسٹرپ (comic strip) سمجھا جاسکتا ہے جو پورا کا پورا خاکوں پر مشتمل ہے۔ یہ پانچ اجزا مل کر ایک تصوراتی شکل بناتے ہیں جو پُراسرار دھاگوں کے ذریعے خارجی واقعات سے منسلک ہے۔ میں ان دھاگوں کو پوری ممکنہ احتیاط کے ساتھ اپنی انگلیوں پر لپیٹ کر اس اسرار کی پردہ کشائی کی کوشش کروں گا۔

۱۹۷۷ میں سابق کروشیا کی سوشلسٹ جمہوریہ نے مجھے ووکوور شہر میں دُودیک (Dudik) کے مقام پر ایک یادگار کا ڈزائن تیار کرنے کا کام سونپا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں دوسری عالمی جنگ کے دوران اُستاشوں نے سربوں اور اپنے دوسرے سیاسی دشمنوں کو گولی کا نشانہ بنایا تھا، یعنی ہر اُس شخص کو جس نے مزاحمتی تحریک میں حصہ لیا تھا۔ جن دنوں مجھے یہ کام دیا گیا میں آرکیٹیکٹ کے طور پر اپنی فعال زندگی کے اختتام پر پہنچ رہا تھا اور مجھے ایک حد تک ناموری حاصل ہو چکی تھی۔ میں تمام سابق یوگوسلاویا میں اس قسم کی بہت سی یادگاریں ڈزائن کر چکا تھا۔ یہ ایک طرح کا اختصاص تھا جسے پروان چڑھانے کی میں نے اپنی پیشہ ورانہ جوانی کے دنوں سے شعوری کوشش کی تھی۔ میرے اس میلان کی وجہ یہ احساس تھا کہ مثلاً سماجی طور پر کارآمد کوئی بےرنگ ہاؤسنگ کالونی ڈزائن کرنے کے مقابلے میں، جن کا اُس دور میں بہت رواج تھا، اس میدان میں مجھے زیادہ تخلیقی آزادی حاصل رہے گی۔

یوگوسلاویا کی سرزمین پر لڑی جانے والی اُس جنگ کی ہولناک تاریخ اور دونوں فریقوں کی جھیلی ہوئی ناقابلِ بیان اذیت کا لحاظ کرتے ہوئے، میں نے باہم مخالف یادوں سے گریز کرنے کی

کوشش کی۔ میں نے سیاسی یا نظریاتی چھاپ سے ممکنہ حد تک دور رہنے کی کوشش میں ایسی علامتیں منتخب کیں جو میرے نزدیک نسلی یا مذہبی وابستگیوں سے ماورا تھیں۔ تخلیقی تحریک پانے کی جستجو میں اکثر اوقات میں قدیم آثار پر غور کر کے آرکی ٹائپل امیجری کے منطقے میں گہرا اترنے کی کوشش کیا کرتا۔ میری جستجو کا مقصد تخیل کے بنیادی، عنصری (primordial) نقطے تک جا پہنچنا تھا، جہاں پہنچ کر جنگ اور موت، فاتح اور مفتوح، اور سب سے بڑھ کر زندگی کی شکست ناپذیر مسرتوں کو (جن کے وجود پر مجھے تب یقین تھا) "بشریاتی یادداشت" کی اصطلاحوں میں بیان کیا جا سکے۔ میری ماورائے مذاہب تشکیلات ہر کسی کی پسند کے مطابق نہیں ہوتی تھیں، لیکن نفسِ موضوع کی پیچیدگی اور امکانی خطرانگیز نزاکت کے باعث اس کے سوا کوئی اور صورت ممکن بھی نہ ہوتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میرے کام میں عموماً مداخلت نہیں کی جاتی تھی۔

تاہم، انیس سو ستّر کی دہائی کے آخری برسوں میں ووکوور والے منصوبے پر کام کرتے ہوئے میں نے ایک مختلف راستا اختیار کیا۔ میں نے وُوچے دول (Vucedol) شہر کی مشہور اور قدیم یادگار، تین پیروں والی فاختہ، کی تلمیح کو کام میں لانے کی کوشش نہیں کی جو، دونوں شہروں کے جغرافیائی قرب کو دیکھتے ہوئے، ایک عمدہ بصری استعارہ بن سکتی تھی، بلکہ جس کو معنویاتی اعتبار سے مُرتعِش تعمیراتی تمثالوں کے ایک پورے سلسلے کا نقطۂ آغاز بھی بنایا جا سکتا تھا۔ اس ترغیب کے باوجود، معلوم نہیں کیوں، میں نے خود کو تعطّل کا شکار پایا: میں کتنی ہی خاکہ کشی کرتا (اور میں نے بے تحاشا خاکہ کشی کی)، کوئی چیز موجودہ منصوبے کے لیے موزوں محسوس نہ ہوتی۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ دراصل میں گوئٹے کی ایک تعمیراتی آزادہ روی کے اثر میں آ گیا تھا۔ اپنی بات کی وضاحت لیے مجھے گوئٹے کی زندگی کے اس واقعے کو ذرا تفصیل سے بیان کرنا ہوگا۔

اگر آپ گوئٹے کے مشہور سفرِ اٹلی کا غور سے مطالعہ کریں تو آپ کو ۱۸ اور ۲۲ مئی ۱۷۸۷ کی تاریخوں کے درمیان ایک خلا محسوس ہوگا۔ یہ تین دن، جو بیانیے کے باہر ہیں، گوئٹے نے پوزولی (Pozzuli) کے شہر میں ایک غیر معمولی مظہر کا مشاہدہ کرنے میں گزارے جو اُسے معبدِ سیراپید (Tempio di Serapide) کے کھنڈروں میں درج محسوس ہوا تھا۔ چند مبہم اشاروں کی بنیاد پر گوئٹے نے ایک جرأت مندانہ نظریہ وضع کر لیا جس کو منظرِ عام پر لانے کا فیصلہ اُس نے چار دہائیوں بعد کیا۔ اس نے فرض کیا کہ ماضی کے کسی لمحے میں -- غالباً ازمنۂ وسطیٰ کے اوائل میں -- کسی آتش فشاں کے لاوے نے اس لینڈسکیپ کی شکل بدل ڈالی تھی۔ معبد کے ستونوں کی نصف اونچائی کے اوپری حصے پر جلتی ہوئی راکھ کی بارش ہوئی تھی اور سامنے کے صحن میں تالاب کی شکل کا گڑھا پڑ گیا تھا، اور اس تالاب کو بعد کے زمانوں میں ایسے تکنیکی آبی طریقوں سے پُر کیا جاتا رہا

Scanned with CamScanner

جو قدیم زمانوں سے چلے آتے تھے اور جن میں آتش فشاں کے دھماکوں کے باعث شگاف پڑ گئے تھے۔ اس طرح اپنے تخیل کو آزاد چھوڑ کر گوئٹے نے معبد کی بحال شدہ باقیات سے حاصل ہونے والی کمزور شہادت کو ایک قابلِ یقین ارضیاتی اور تعمیراتی ناولا (novella) کی صورت دے دی۔ اس نے اس ناولا کو خاکوں سے مزین کر کے شائع کیا جنھیں ایک "معمارِ اعظم" سے منسوب کیا گیا جو "انتہائی ہُنر مند اور پُر تخیل ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد دل نواز بھی تھا"۔ اس شخص کا نام ہم تک نہیں پہنچا۔

نو کلاسیکی اسلوب میں بنائے گئے یہ خاکے معبد کو تین مرحلوں میں پیش کرتے ہیں۔ بغور مطالعہ کرنے سے مجھ پر ان خاکوں کے پیچھے ایک تلوّن پسند دماغ کی موجودگی کا انکشاف ہوا جو عرصے سے قائم ایک تعمیر کو کسی قدرتی مظہر کے طور پر پرکھنے اور اس کی تعمیری ساخت کے طول و عرض کو وقت کی تجرید کی مدد سے وسیع اور گہرا کرنے کی کوشش میں منہمک تھا۔ وو کوور شہر کی یادگار کے اوّلیں خاکے بناتے ہوئے میں غیر شعوری طور پر گوئٹے کے اسی تخئیلی طریقِ کار پر عمل کر رہا تھا: میں نے عمارتیں اور پورے پورے شہر بنائے، اور بعد میں انھیں آگ اور راکھ سے ڈھانپ کر صرف گوتھک طرز کی بلندیوں کے بالائی سرے اور زمین سے باہر نکلے ہوئے لنگرے باقی رہنے دیے۔ آرکیٹیکچر کی زبان میں بیان کی ہوئی اس عجیب تمثیل نے، جس کے معنی اُس وقت میری سمجھ میں نہیں آئے تھے، دو یا تین مہینوں تک مجھے اپنا اسیر رکھا۔ اس وقفے کے ختم ہونے تک مجھے اپنا کام مکمل کرنے میں اتنی دیر ہو چکی تھی کہ میں نے اپنے بنائے ہوئے بے شمار خاکوں میں سے یادگار کی حتمی صورت کو بس جیسے تیسے اخذ کر لیا۔ اگر آپ وو دک کے مقام پر بنی ہوئی اس یادگار میں گرینائٹ اور تانبے کے مخروطی مینار کا احتیاط سے مشاہدہ کرتے، تو آپ کو اس کے نیچے مدفون پورے شہر کو تصوّر کی آنکھ سے دیکھنے کا حق حاصل ہو جاتا۔

منصوبے کے نگرانوں پر گوئٹے والے طریقِ کار کا انکشاف کرنے کے بجائے، میں نے انھیں ایک قابلِ قبول متبادل پیش کیا۔ میں نے انھیں بتایا کہ یادگار کا یہ ڈزائن آرکیٹیکچر کی زبان میں طویل عمری کی علامت پیش کرتا ہے، گویا ماضی اور مستقبل کی کشمکش کو علامتی طور پر مجسم کرتا ہے اور مستقبل ایک ایسا اسمِ اعظم ہے جو سارے دروازوں کو کھول دیتا ہے۔ تقدیر کے ہاتھوں (جیسا کہ اب ہم سب جانتے ہیں) وہ یادگار، اور میری پیش کی ہوئی "عوامی" تعبیر، دونوں ہی تباہ ہو چکی ہیں اور میرے بنائے ہوئے خاکوں میں پوشیدہ المناک مفہوم کی تصدیق ہو گئی ہے۔ میں صرف اتنا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ میں نے ۱۹۸۲ میں، ان خاکوں کو ہنوز اپنے معصوم تخیل کے ثمر جانتے ہوئے، بغیر کسی ہچکچاہٹ کے، انھیں بلغراد، زگرب اور سوبوتیکا میں نمائش کے لیے پیش کیا تھا اور

Scanned with CamScanner

بعد میں (۱۹۸۳ میں بلغراد سے شائع ہونے والے *Arhitektura/Urbanizan* میں اور ۱۹۹۰ میں لندن سے نکلنے والے *World Architecture* میں) شائع بھی کرایا تھا۔ ۱۹۹۰ ہی میں سلووینیا کے آرکیٹیکچر کے جائزے *Arhitektov bilten* کے سرورق پر ووکوور کی اُس یادگار کی تصویر میرے بنائے ہوئے ایک ایسے ہی خاکے پر سُپر امپوز کر کے شائع کی گئی۔ دونوں کا مجموعی اثر ووکووار کی تباہی کے ایک دہشت ناک تصور کا تھا، اور یہ بات اُس شہر کی تباہی سے کم از کم ایک برس پہلے کی ہے۔ کیا کسی نہ کسی طرح آنے والے المیے کے بےحد مبہم، ماورائے نفسیات (parapsychological) اشاروں نے ہمارے لاشعور میں جگہ بنالی تھی؟

میں پیراسائیکولوجی کو نہیں مانتا۔ تاہم میرے پاس اس حقیقت کا ناقابلِ تردید ثبوت موجود ہے کہ کسی نہ کسی طرح کے غیر شعوری شہریاتی (urbanological) ارادے کا میرے اُن خاکوں میں دخل ضرور تھا۔ ۱۹۷۹ میں مَیں نے سرب اکیڈمی آف سائنس اینڈ آرٹس میں (جس سے میں اب مستعفی ہو چکا ہوں) ایک لیکچر دیا جس کا مضمون یہ تھا کہ کچھ لوگ شہر بنانے والے ہوتے ہیں اور کچھ شہر مٹانے والے، اور انسانی تہذیب کی پوری تاریخ میں شہر دوستی اور شہر دشمنی کے درمیان ایک ابدی، کم و بیش سِرّی کشمکش جاری رہی ہے۔ میرے یہ خیالات میرے بےحد معزز ساتھیوں کو پسند نہ آئے، بلکہ ایمانداری سے کہوں تو میں خود بھی اپنے آپ کو ان خیالات کی منطقی بنیاد پر عجیب و غریب نظریات وضع کرتے دیکھ کر حیرت زدہ سا رہ گیا۔ میں نے خود کو --دیوارِ برلن کے مسمار کیے جانے سے دس سال پہلے-- بڑے بڑے مغربی شہروں پر غربت کی ستائی ہوئی آبادیوں کی اجتماعی یلغاروں (Volkenwanderung) کی پیش گوئی کرتے ہوئے پایا۔ کچھ ہی عرصے بعد میرا یہ لیکچر بلغراد سے نکلنے والے ایک ماحولیاتی جریدے *(Covek i zivotna sredina, 6, 1979)* نے شائع کر دیا۔ حال ہی میں اسے فرانس کے ایک رسالے *Lettre Internationale* (۳۳، ۱۹۹۲) نے "تباہ شدہ شہر" (La ville ravagee) کے عنوان سے دوبارہ شائع کیا ہے۔ جب میں نے آخرالذکر رسالے کے مدیروں سے درخواست کی کہ اس کی پہلی اشاعت کی تاریخ بھی دے دی جائے تو انھوں نے انکار کر دیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ پڑھنے والے اسے مدیروں کے ذہن کی اختراع قرار دیں گے۔ یہ مضمون اگلے صفحات میں "شہر: دوستی یا دشمنی" کے عنوان کے تحت شامل ہے۔

اس سے اگلا مضمون، جس کا عنوان "شہر کی روایتی قربانی" ہے، "حلقۂ بلغراد" (Belgrade Circle) کے نازی مخالف ٹربیونل کے المناک حالات کے دوران لکھا گیا تھا اور پورے یوروپ اور امریکا میں مختلف رسالوں *(El Pais, Svenska Dogbladet, Il*

Manifesto, Die Zeit, Le Monde, The New York Review of Books) نے شائع کیا تھا۔ جیسا کہ پڑھنے والے کو احساس ہوگا، یہ پُراذیت مگر صاف گویانہ متن اپنے پیش تر آنے والے مضمون سے ناگزیر طور پر (اور خاکوں کے اس نامبارک سلسلے سے بے قاعدہ طور پر) پیوست ہے؛ بہر کیف، ان دونوں مضامین کے درمیانی عرصے میں میرے شہریاتی تخیل کے مفروضے نہایت ہولناک صورت میں حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔ پُر آشوب حالات میں ذہن کی منتشر حالت کی بابت اپنی ذاتی شہادت کو مکمل کرنے کی غرض سے میں نے دو مختصر مضامین کا اضافہ کرنا مناسب خیال کیا ہے جو اپنی غم ناکی کے باعث اس کُل کا حصّہ ہیں۔ ان میں سے ایک اُن لوگوں کے بارے میں ہے جو یادوں کو نیست و نابود کرتے ہیں، اور دوسرا ایک ایسی یاد کے بارے میں ہے جسے مٹا ڈالا گیا۔ کیوں کہ اب صرف ووکووار ہی نہیں بلکہ موستار اور سرائیوو بھی تاراج کیے جا چکے ہیں، اور میں ان تینوں شہروں کو "متوازی وطن" سمجھتا ہوں۔ میں نے "مشرقی" شہروں کے حسن اور دانش کی بابت انیس سو سٹر کی دہائی میں جو باتیں کہی تھیں، اُن کے درمیان جگہ جگہ سرائیوو شہر کے بارے میں اپنے مختصر تبصرے بھی شامل کر دیے ہیں، اور اب اپنے لکھے ہوئے کو کرب اور یاس کے ساتھ پڑھتا ہوں۔

***

شہر: دوستی یا دشمنی

معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تخیل کے قدیم ذخیرے شہر کی بابت لگاو یا احترام کے مقابلے میں اس کے متضاد جذبوں کے لیے زیادہ گنجائش رکھتے ہیں: تنفر، ناپسندیدگی، کینہ اور سب سے بڑھ کر خوف۔ اس تخیل کا جس قدر حصّہ آج ہماری دسترس میں ہے -- عظیم اساطیر، رزمیے، ساگا اور پری کہانیاں -- اس پر قیاس کیا جائے تو یہ سارے متن شہر کی تباہی کے حق میں دہشت ناک جوش و خروش سے لبریز محسوس ہوتے ہیں۔

اگر آپ بائبل کو غور سے پڑھیں تو اس غیظ و غضب کا احساس کیے بغیر نہیں رہیں گے جس کے ساتھ عہد نامۂ قدیم کے پیغمبر شہروں پر اپنی بددعا کی آگ برسایا کرتے ہیں۔ اپنی ڈرامائیت کے نقطۂ عروج پر یہ کتاب ایک ایسے یہوواہ کو سامنے لاتی ہے جو شہری فضا اور اس میں پوشیدہ قوتوں کو محض بے مصرف خیال کرتا ہے؛ بلکہ بنی نوعِ انسان پر سیلاب کا عذاب بھیجنے کے فیصلے کی تہ میں ایک خودسر اور خطرناک حد تک طاقت ور شہر کو تباہ کر ڈالنے کی شدید خواہش

Scanned with CamScanner

دکھائی دیتی ہے۔ قرآن بھی شہروں سے نفور کے معاملے میں بائبل سے کم نہیں ہے: اس میں بھی شہروں کے حق میں بددعائیں، آگ اور تلوار کی غضب ناک دھمکیاں اور تمام شہروں کے خاک اور راکھ میں تبدیل ہو جانے کی بے تابانہ وعیدیں جا بجا ملتی ہیں۔ اور اس سلسلے میں ہند یوروپی بھی سامیوں سے پیچھے نہیں ہیں: "رگ وید" سے لے کر "ایلیاد" تک اور وہاں سے اوائلی دور وسطیٰ کے جرمانی ساگاؤں تک، ہند یوروپی لوگوں کے تمام رزمیے۔۔اپنے شاعرانہ حسن کے باوصف۔۔ شہر کو تباہ کرنے کے جنگی نعروں سے بھرے پڑے ہیں۔

اس سے ہم صرف یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عہد نامۂ قدیم کے پیغمبروں کا غیظ و غضب ہو یا ہمارے اپنے آباواجداد کی تباہ کن قوت، دونوں کی تہہ میں سب سے بڑھ کر خوف۔۔شہر کا خوف۔۔ کارفرما رہا ہے۔ اگر ہم "ایلیاد" میں بیان کیے گئے ٹروجن گھوڑے کے قصے کی مقبولِ عام اور سادہ لوحانہ تعبیر کو نظرانداز کر کے اسے ذرا گہرائی میں جا کر سمجھنے کی کوشش کریں تو ہمیں احساس ہو گا کہ اودسیوس کی چالاکی اور اپےیوس کی ہنرمندی دراصل یونانی ردِ طلسم کی علامت ہیں جس کا بنیادی مقصد شہر کے اندرونی استحکام کو تباہ کرنا اور آخرکار آخائیہ کے (Achaean) گھوڑوں کو الیون (Ilion) کے خودسر شہر کی دیواروں کے پیچھے ہونے والے نامعلوم وقوعوں کے خوف سے نجات دلانا ہے۔

شہر خطرے میں نہیں ہیں

آج کل شہروں کو اس قدیم خوف سے کوئی خطرہ لاحق نہیں رہا۔ ہمارے زمانے میں کسی کے پاس کیا محرک ہو سکتا ہے کہ وہ خوابیدہ شہر دشمن قوتوں کو جگا کر مشتعل کرے؟ لیکن اب جب کہ لوگوں نے شہروں سے خوف کھانا چھوڑ دیا ہے۔۔یا کم از کم اس خوف کو ظاہر کرنا ترک کر دیا ہے۔۔ شہروں کو اُن کے جذباتی لگاؤ کی جانب سے خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ جزوی طور پر شہر کی سہولتوں سے لطف اندوز ہونے کی خواہش میں اور جزوی طور پر ناامیدی سے مجبور ہو کر، لوگوں کے علاقائی گروہ دنیا بھر کے مالدار، نیم مالدار اور نادار مہانگروں (Metropolises) کا رخ کر رہے ہیں۔ اس قسم کی ہر ہجرت انسانی تفصیلات کے لحاظ سے اُس ہجرت سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے جو یونان کے پہلے دورِ تاریک میں پیش آئی تھی، جب آخائیہ کے لوگ ایشیائے کوچک کے ساحلوں تک جا پہنچے تھے۔ اور ہجرتوں کی موجودہ لہر مستقبل قریب میں، جو ہنوز سطح کے نیچے پوشیدہ ہے، اُس عظیم اجتماعی ہجرت سے کہیں زیادہ شدید اور کہیں زیادہ طاقتور ہو جانے والی ہے جس نے ٹرائے کی تاراجی کے دو ہزار سال بعد روم کے شہر کو تباہ کر ڈالا تھا اور بحیرۂ روم کے ساحل پر آباد

Scanned with CamScanner

پوری ایک دنیا کو اُجاڑ کر رکھ دیا تھا۔

یہ سچ ہے کہ شہر کی جانب بے روک ٹوک کھنچے چلے جانے والے ہجوموں کا شہروں کو تباہ و برباد کرنے پر آمادہ ہو جانا بعید از قیاس ہے۔ لیکن بڑھتی، پھیلتی اور نارمل حدوں کو پار کر کے مریضانہ حجم اختیار کرتی ہوئی آبادی کا اندرونی دھماکا (implosion) بھی تو کسی شہر کی تباہی، یا کم سے کم اس کے زوال، کا باعث بن سکتا ہے۔ ہماری دنیا بہت جلد ورم زدہ اور تپ کے شکار شہروں، ناقابل اصلاح حد تک آلودہ شہری فضاؤں اور متواتر اصلاحی کوششوں کے باوجود مسلسل رو بہ زوال ماحول پر مشتمل ہو گی۔ سیمنٹ کے گدلے زرہ بکتر میں بری طرح جکڑی ہوئی دنیا ہمارا مقدر ہے، اور یہ بات گو اب بھی تصوّر میں لائی جا سکتی ہے لیکن کچھ ہی عرصے میں ہماری آنکھوں کے سامنے آ جائے گی۔

اور یہ ابھی صرف شروعات ہے۔ مستقبل کی پیش گوئی اس سے کہیں زیادہ بھیانک ہے۔ آبادی کے جس اندرونی دھماکے کا ہم آج تصوّر کر سکتے ہیں، وہ شہر کی تباہی کی کچھ ایسی مبہم اور کم قابلِ تصوّر شکلوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو شہری تانے بانے کی جسمانی تاراجی اور شہری رقبے پر قبضے کے لیے کیے جانے والے جارحانہ حملوں کے نتائج سے کہیں زیادہ ہولناک ہوں گی۔ میری مراد ابتری کے اُس ناگزیر مہلک رجحان سے ہے جو انسان اور اس کے ماحول کے درمیان ربط کے تیزی سے بڑھتے ہوئے فقدان سے پیدا ہوتا ہے۔

شہر کی تفہیم اور شہر سے محبت

شہر کو سمجھنا اور شہر سے محبت کرنا لازم و ملزوم ہیں: ہم اُس شے سے محبت کرتے ہیں جو ہماری سمجھ میں آتی ہے اور اُس شے سے خوف کھاتے ہیں جو ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ آج کے شہر میں نئے آنے والے -- اور پُرانے باشندے بھی -- شہر سے جذباتی تعلق پیدا کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں، لیکن اس کی وجہ ان میں نیک نیتی کی کمی نہیں ہے۔ وہ اپنے احساسات کس کو پیش کریں؟ ایک ایسی شے کو جس نے شہر ہونا اس حد تک ترک کر دیا ہے کہ وہ اسے صاف طور پر دیکھ بھی نہیں سکتے، اس کو ٹھیک طرح اپنے تصوّر میں بھی نہیں لا سکتے، اسے شہر کے طور پر پہچان بھی نہیں سکتے؟ ایک ایسی شے کو جسے اپنے ذہنوں میں دوبارہ متشکل کرنا اُنھیں زیادہ سے زیادہ دشوار محسوس ہونے لگا ہے؟

چند سال پہلے ایک چھوٹا سا تجربہ کیا گیا جس میں حصّہ لینے والے بیس افراد سے کہا گیا کہ وہ شہری حیات کے ایک حصّے کو -- جدید بلغراد کے بانووو بردو نامی علاقے کو -- اپنے تخیل کی مدد سے

خاکوں کی شکل میں پیش کریں۔ بیس کے بیس افراد نے اس علاقے کو اس درجہ مختلف صورت میں پیش کیا کہ ان میں تقریباً کوئی بھی بات مشترک نہیں تھی۔ اس تجربے میں شریک ہونے والے سب افراد آرکیٹیکچر کے طالب علم تھے اور اپنی تربیت کے اعتبار سے شہری مظاہر کے مشاہدے کی مہارت کے ساتھ ساتھ داخلی غور و فکر پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ ان افراد میں سے ہر ایک نے اپنے مرقعے کے لیے شہری حیات کے جو اجزا (عمارات کے "نمونے" اور شہری معمول کے "وقوعے") علامتوں کے طور پر منتخب کیے وہ دوسروں کی منتخب کی ہوئی علامتوں سے حیران کن حد تک مختلف تھے اور ہر ایک کا انتخاب مکمل طور پر ذاتی اور موضوعی تھا۔ ان تمام افراد کے پیش کیے ہوئے خاکوں کو ایک مجموعے کے طور پر دیکھنے سے ایک حد درجہ ژولیدہ جذباتی ردعمل سامنے آتا تھا۔ دورِ وسطیٰ کے نیورمبرگ یا نشاۃ الثانیہ کے دنوں کے فلورنس میں اُن جیسے افراد کی موجودگی کا تصوّر کرنا بہت دشوار ہے جو اپنے شہر کی ایک ذہنی تصویر پیش کرنے یا واضح طور پر یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ اپنے شہر سے ان کی محبت یا نفرت کی بنیاد کن چیزوں پر قائم ہے۔

تجربے میں شریک افراد کو شہر کا جو علاقہ تصویر کشی کے لیے دیا گیا وہ واضح خطوط پر بنایا ہوا ایک معروف علاقہ تھا جہاں سے اُن میں ہر شخص لاتعداد بار گزرا ہوگا۔ اگر اس سادہ سے علاقے کے بجائے اُن سے کسی ایسے علاقے کی تصویر کشی کو کہا جاتا جو حقیقت کے برابر پیچیدہ ہوتا تب کیا ہوتا؟ ذرا آج کے کسی مہانگر کی ہزاروں، لاکھوں جگہوں اور وقوعوں کا تصوّر کیجیے، ان جگہوں اور وقوعوں کا جو دانستہ نہیں بلکہ حادثاتی طور پر، محض ایک لمحے کے سیاق و سباق میں، وجود میں آجاتے ہیں اور جن کے مماثل کو شعوری طور پر وجود میں لانا ناممکن ہوتا ہے۔ ذرا اطلاعات کے اُس الجھے ہوئے، غیر اہم، بے مغز (لہٰذا نقصان رساں) اور باہم متصادم ذخیرے کو ذہن میں لانے کی کوشش کیجیے جو کسی بھی بڑے شہر کا ہر باشندہ اپنے روزمرّہ کے معمولات میں اپنے اردگرد بکھیرتا چلتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں کسی انسان سے، جو اپنے حواس اور حیاتیاتی خصائص کا اسیر ہے، واضح طور پر شہر کو دیکھنے کی توقع کیوں کر کی جاسکتی ہے؟ وہ جس غیر موجود شہر میں رہتا ہے اُس کی افسانوی فضا کی تفہیم اس کے لیے کس طرح ممکن ہے؟ اور اس تفہیم کی عدم موجودگی میں وہ کیوں کر شہر کے ساتھ اپنا جذباتی تعلق قائم کر کے اس سے محبت کر سکتا ہے؟

ماحول کی تفہیم (حیاتیاتی سرحدیں)

اپنے ماحول کو (جس میں شہری ماحول بھی شامل ہے) سمجھنے کی کوشش میں انسانی ذہن جن حیاتیاتی سرحدوں تک پہنچتا ہے وہ فرد کے مزاج (constitution) اور اس کے تناسبات کے

ہاتھوں ناقابلِ تغیر طور پر ہمیشہ کے لیے متعین ہو چکی ہوتی ہیں۔ ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کرنے کے میکانکی ذرائع، "میل فی گھنٹا" کی قسم کے مصنوعی اور خارجی تعینات، اور ٹی وی کیمروں کی مدد سے بنائی ہوئی شہر کی ناقابلِ اعتبار "مرئی" تصویر، یہ سب مل کر بھی اُس انسانی شعور کا بدل نہیں ہو سکتیں جو کسی شہر کے جغرافیے میں اُن لوگوں کی فی الواقع موجودگی سے جنم لیتا ہے جو اپنے شہر سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ ان حقیقی لوگوں کے لیے محض اپنے شہر کا وجود (جس سے میری مراد شہر کا روایتی، "ارسٹو کریٹک" اور احتیاط سے محفوظ رکھا گیا جوہر ہے) انھیں اس قابل بناتا ہے کہ وہ ابدی انسانی سوالوں کے ذمہ دارانہ جوابات وضع کر سکیں؛ مثلاً، میں کون ہوں؟ میں کیا ہوں؟ میں کہاں ہوں؟ اور میں جہاں ہوں وہاں کیوں ہوں؟

جدید شہر کے قیام نے انسان اور اس کے اردگرد کے ماحول کے درمیان رابطے کے نت نئے امکانات پیدا کیے ہیں۔ ان امکانات سے ایک بے حد پیچیدہ اور باثر epistemological نمونہ وجود میں آیا ہے جس کا باعثِ تخلیق نہ صرف یہ ہے کہ جدید شہر اپنے پیشرو کے مقابلے میں برتر ٹیکنولوجیکل آلہ ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ جدید شہر ایک واضح طور پر برتر "فکری آلہ" ہے۔ علم کا جدید تمثیلی (analogical) نمونہ اُس وقت وجود میں آیا جب شہر نے فرد کو اس قابل کیا کہ وہ اپنی ذات پر داخلی غور و فکر کر سکے اور اپنی تقدیر کے دورانیے کو واضح طور پر بالکل اس طرح محسوس کر سکے جیسے بڑھتے اور ترقی پاتے ہوئے شہر کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہے۔ جدید شہر کے قیام سے پہلے فرد غیر تاریخی وجود رکھتا تھا، اور اس کی محض یہ وجہ نہیں تھی کہ "شہر" اور "تحریر" کے تصورات اپنے مابین بہت کچھ مشترک رکھتے ہیں۔ شہر وجود میں آتے ہی، اپنی ذات میں ایک طاقتور، بالائے لسانی (supra-linguistic) تحریری نظام کی شکل اختیار کر لیتا ہے، ایک بامعنی متن (ideography) جسے جدید دور کا انسان تک انتہائی قدیم آثار کی باقیات کی مدد سے بغیر کسی غیر معمولی دقت کے پڑھ سکتا ہے۔

شہر تاراجی کے محرکات

شہر بطور مجموع، اور ہر شہر انفرادی طور پر، ایک پیچیدہ استعاراتی نظام کی حیثیت رکھتا ہے جس کی جڑیں انسانی تہذیب کے شعور میں ہوتی ہیں۔ مذکورہ بالا خیال ہمیں اس ناگزیر سوال کی طرف لے جاتا ہے: کیا ہم اُن لاعلاج نقصانات کا شعور، یا محض دھندلا سا احساس ہی، رکھتے ہیں جو شہر کے تباہ ہو جانے کا نتیجہ ہوں گے؟ میں شہر کو یادوں کے ایک بے مثل ذخیرے کے طور پر دیکھتا ہوں، جو کسی واحد قوم، نسل یا زبان کی مجموعی یادداشت سے کہیں بڑھ کر ہے۔ (ہم بلغراد

Scanned with CamScanner

کے باشندے اپنے وجود کے اندر سیلنک، رومن، مگیار اور ترک بلغراد کی زندہ یادیں تھامے ہوئے ہیں -- خواہ ان میں سے بعض یادیں کتنی ہی خفی کیوں نہ ہوں -- اور ان سب یادوں کو بجا طور پر اپنی ملکیت سمجھتے ہیں)۔ اگر "بشریاتی یادداشت" کا یہ بے نظیر، بیش بہا مجموعہ منتشر ہو جائے تو اس انتشار کے نتائج کیا ہوں گے؟ کیا یہ حادثہ انسانی وجود کے ایک اہم پہلو، شاید سب سے زیادہ نفیس پہلو، کو تباہ نہیں کر ڈالے گا؟

کس میں حوصلہ ہے کہ کسی بھیانک خواب جیسی خوفناک اور وسیع و عریض "شہری سلطنت" (urban empire) میں تہذیبوں کی رنگارنگی کو تصور میں لا سکے جب کہ حقیقی "شہر" (cities) مفقود ہو چکے ہوں؟ انسانوں اور ان کے ماحول کے درمیان (وہ ماحول جسے "دریافت کرنا" یا "پڑھنا" اب ان کے لیے ممکن نہیں رہا، اس لیے اسے "سمجھنا" بھی ممکن نہیں رہا) رابطے کے امکانات کا شدید فقدان یا ان کا مکمل خاتمہ بہت جلد "زبانی انتشار" (glossolalia) کی اس ہولناک تہذیب پر منتج ہونے والا ہے جس میں ذرائع ابلاغ (mass media) کے لیے گمراہ ہونا اور گمراہ کرنا بے حد آسان ہو جائے گا۔ صحت مند، نامیاتی اور بے لوث شہر ایک حقیقی تاریخیت رکھتے ہیں جسے انسانی حواس کی مدد سے دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ اس حقیقی تاریخیت کی جگہ منتشر، فرضی، من گھڑت اور خود پر بزور نافذ کی ہوئی "یادیں" لے لیں گی، یعنی انسانوں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کی محدود تہذیبوں، محدود اخلاقیات اور محدود آرٹ پر مبنی ناقص، کوتاہ اور غیر حقیقی "تاریخوں" کا انبار اس حقیقی تاریخیت پر غلبہ پا لے گا۔ اس میں -- "زبانوں کے عمومی انتشار" (general confusion of tongues) کے منطقی نتیجے کے طور پر -- تشدد کی مہذب یا کم مہذب شکلوں کا اور اضافہ کر لیجیے (یعنی اُس گروہی طرزِ عمل کا جو عمومی غنڈا گردی، ریڈ بریگیڈ یا خوں ریز شہری گریلا جنگوں کی صورت میں سامنے آتا ہے)، تو شہر تاراجی کے محرکات کے کافی سے زیادہ عناصر دستیاب ہو جائیں گے، جن سے انسان کے نجات پا لینے کی ہم قبل از وقت خوشی منا رہے تھے۔

جدید بربریت کے متنوع (گو خوش قسمتی سے ہنوز اکا دکا) مظاہروں میں شہر کے خوف کے منفی (اور کم منفی) نشانات جا بجا ملتے ہیں۔ شہروں کو تباہ کرنے والے جدید لوگ ایک ایسے ماحول کے خلاف مجنونانہ ردعمل کا اظہار کرتے ہیں جسے وہ ذہنی طور پر "متشکل" کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ عہد نامہ قدیم کے پیغمبروں کے اعلانِ جہاد، سلاطین کی گھڑسوار فوجوں کی تباہ کن یلغاروں کے عکس جا بجا پڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن جدید اور قدیم کی ان مماثلتوں سے قطعِ نظر، ان دونوں رویوں میں نمایاں اختلافات بھی موجود ہیں، اور یہ اختلافات جدید دور کے حق میں اور زیادہ مہلک ہیں۔ عہد نامے کے پیغمبر غیروں کے شہروں کو بددعا دیتے تھے، سلاطین غیروں کے شہروں پر یلغار

Scanned with CamScanner

کرتے تھے، جرمانی بربر (Vandals) غیروں کے شہروں کو تاراج کرتے تھے، اور جب کوئی شہر ان فاتحوں کے قبضے میں آکر ان کی ملکیت بن جاتا تھا تو وہ مفتوح شہر اپنے وجود کے پاکیزہ ترین عمل کے ذریعے اپنے حملہ آوروں کو اپنی مخصوص منطق کے زیرِ اثر لے آتا تھا اور چند نسلوں کے عرصے میں اُن کو پُرامن، مسرور اور دانا شہریوں میں منقلب کردیتا تھا۔ آج کے شہر اندرونی انتشار کا شکار ہیں اور یہ کہیں زیادہ دہشت انگیز، اور بدقسمتی سے کہیں زیادہ طاقت ور، عمل ہماری آنکھوں کے سامنے رونما ہو رہا ہے، اور جدید انسان اس عمل کے مقابل آکر منفی ردِعمل ظاہر کرتا ہے، خواہ وہ فلسفیانہ تسلیم ورضا کی صورت میں ہو یا غیر عقلی اور پست بربریت کے مظاہرے کی شکل میں۔ یہ متواتر انتشار شہروں کی اس پاکیزہ صلاحیت کو جلد یا بدیر سلب کرلے گا جس کی مدد سے وہ کسی فرد کو دانا اور مسرور شہری میں تبدیل کر لیا کرتا تھا۔

شہر کب پھیلتا ہے؟

جب کبھی میں اپنی زبان سے "شہر" کا لفظ ادا کرتا ہوں، تو اس لفظ کا حسین، کسی قدر ناوقت (anachronistic) صوتی تاثر ایک معقول حجم والے شہری رقبے کا تصور پیدا کرتا کرتا ہے جو انسانی نظر کے محیط میں آسکے، جس کو انسانی تخیل ایک قابلِ شناخت وجود کی صورت میں دیکھ سکے۔ شہر کی "نارمل" حدود کیا ہیں جن سے آگے بڑھ جانے پر اسے بڑا، یا ضرورت سے زیادہ بڑا، شہر قرار دیا جاسکے؟ یہ خیال تاریخ کے سفر میں بہت زیادہ تبدیل نہیں ہوا ہے۔ سقراط نے کلیون کے ایتھنز کی اس بنا پر مذمت کی تھی کہ وہ اپنے موزوں حجم تک پہنچنے کے بعد بھی پھیلتا چلا گیا اور اس متواتر پھیلاو کے باعث گلنے سڑنے اور بکھرنے لگا۔ سقراط کا یہ خیال اب بھی انتہائی معقول محسوس ہوتا ہے۔ اُس زمانے میں ایتھنز کی آبادی ایک لاکھ تیس ہزار اور ڈیڑھ لاکھ کے درمیان رہی ہوگی، اور شہر کا یہ حجم بیشتر یونانیوں کے نزدیک ایک شہری ریاست کے لیے قطعی طور پر موزوں تھا اور اس کا اس حد سے زیادہ پھیلنا شہری نظام کی بنیادوں کے لیے خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ اس کے مقابلے پر بابل کو دیکھیے جسے ارسطو نے "شہر" (polis) کے بجائے "قوم" (ethnos) قرار دیا تھا، اور "دیواروں سے گھری ہوئی قوم" کا لقب دیا تھا۔ موجودہ اندازوں کے مطابق بابل کے قدیم مہانگر کی آبادی تین لاکھ اور سات لاکھ کے درمیان تھی۔

یہ معاملہ قدیم زمانوں سے لے کر اب تک کم و بیش واضح رہا ہے۔ یونانیوں کے نزدیک کسی شہر کا موزوں حجم اس پر منحصر تھا کہ وہ شہر اپنے باشندوں کو اپنے ماحول کے ساتھ براہِ راست اور آزادانہ ربط قائم کرنے کے قابل بنا سکے۔ اس اصول کی بہترین مثال ارسطو کے اس معروف

Scanned with CamScanner

قول میں ملتی ہے جس کی رو سے شہر کو صرف اتنا بڑا ہونا چاہیے کہ انسان کی آواز اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ سکے۔ یہ ایک بہت واضح خیال ہے جسے ہم آج بھی کسی دقت کے بغیر سمجھ سکتے ہیں، اور جسے آج عمل میں لانے کی کوشش کی جائے تو وہ جدید تصور سامنے آتا ہے جو اتنا ہی واضح اور خاصا مقبول ہے، یعنی یہ کہ مہانگروں کو چھوٹے چھوٹے دسیوں بلکہ سیکڑوں جمہوری، خود مختار "شہری قصبوں" کے وفاق میں تبدیل کر دیا جائے، اور ان میں سے ہر شہری قصبہ ایسا ہو کہ انسان کی آواز اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ سکے تاکہ اس کے باشندوں میں یگانگت اور اتفاق کو فروغ ملے۔ یہ تصور، کم از کم اب تک سامنے آنے والا، واحد حل ہے جس پر عمل کر کے شہر کو مکمل انتشار اور خاتمے سے بچایا جا سکتا ہے۔

لیکن جدید شہری طرزِ عمل کی موجودہ حالت کو سامنے رکھتے ہوئے یہ تصور بھی ناقص ٹھہرتا ہے۔ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے: اگر "شہری قصبہ" ٹیکنولوجی اور عمرانیات کا اسٹیریوٹائپ نہیں بلکہ کلچر کی ایک شکل ہے تو اسے محض حکم کے ذریعے وجود میں نہیں لایا جا سکتا۔ اسے کھیل کے پیچیدہ، مخفی اور آزاد اصولوں کے تدریجی عمل کے نتیجے میں وجود میں آنا ہوگا، اور یہ اصول ایسے ہیں جن تک رسائی پانے سے معاصر شہری منصوبہ ساز اب تک قاصر رہے ہیں کیوں کہ ان کے ذہن مفصل منصوبوں کے مطابق بنائے ہوئے شہروں کے تصور کے قیدی ہیں۔

شہر کو پڑھنا

ایسے صحت مندانہ عوامل کو کیوں کر حرکت میں لایا جا سکتا ہے جو شہروں کو "انسانی آواز" والے معقول حجم پر واپس لا سکیں؟ ہم اس نتیجے تک پہنچ چکے ہیں کہ شہر کو درپیش بنیادی مسئلہ شہر کے باشندوں اور شہری ماحول کے درمیان ٹوٹتے ہوئے رابطے پر مبنی ہے، جسے ٹیلی فون کی ٹوٹی ہوئی لائنوں کے استعارے کی مدد سے بھی بیان کیا جا سکتا ہے (اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرا یہ خیال پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کا اندرونی دھماکا بھی درحقیقت عدم ابلاغ ہی کی ایک شکل ہے)، اور اس نتیجے تک پہنچنے کے بعد ہمیں شہر کے حجم کے مسئلے سے ابتدا کرنی چاہیے۔ اور اس کے لیے ہمارا پہلا قدم یہ ہوگا کہ آج کے مہانگر کو فطری، نامیاتی اور انسانی تناسب سے مطابقت رکھنے والے چھوٹے چھوٹے شہری قصبوں کے ایک مجموعے میں تبدیل کر دیں جو انسانوں کے ذہن میں سما سکیں اور اس طرح شہر کی بڑھتی ہوئی بربریت کو لگام دی جا سکے۔

ایک کہاوت ہے، جو مجھے بڑی دانائی کی حامل محسوس ہوتی ہے، کہ "گھر کی تعمیر ایک معاہدے پر ہوتی ہے۔" لیکن ہر معاہدے کے لیے ایک مشترک زبان کا ہونا لازمی ہے۔ اسی مشترک

Scanned with CamScanner

زبان کے ذریعے سے ہم یہ طے کر سکتے ہیں کہ ہم کس چیز کے خواہش مند ہیں، فیصلے کا موقع آنے پر اس زبان کی اصطلاحوں سے رجوع کر سکتے ہیں، اور ان اقدار کی بابت باہمی سمجھوتے پر پہنچ سکتے ہیں جو کسی شہر کی خوش گوار (اور ناخوش گوار) خصوصیتوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس باہمی سمجھوتے یا معاہدے تک پہنچنے کے لیے لازم ہے کہ ہمارے ذہنوں میں کچھ تمثالیں اور تصوراتی سیاق و سباق مشترک ہو۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے میں یہ تجویز کروں گا (جو میرے نزدیک ہنوز واحد قابلِ عمل طریقِ کار ہے) کہ لوگوں کو -- ہر مرد، عورت اور بچے کو -- "شہر کو پڑھنے" کا گم شدہ فن دوبارہ سکھایا جائے۔ کیوں کہ جب تک ہم اپنے شہروں کو پڑھنے کے قابل نہیں ہوں گے، تب تک انسانی سفر کی اگلی منزل کی طرف قدم نہیں بڑھا سکیں گے، اور وہ منزل ہے شہر کو لکھنے کا فن۔ یہ فن ایک زمانے میں ایک اجتماعی آرٹ اور ایک جائز انسانی حق رہ چکا ہے لیکن اب یہ بھی ہماری دسترس سے نکل گیا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ اسے دوبارہ زندہ کیا جائے۔

بہت سے لوگ یہ خیال کریں گے (اور بجا طور پر) کہ چھوٹے چھوٹے، انسانی تناسب کے حامل شہری یونٹوں کے تصوّر کی بحالی کا وقت شاید گزر چکا ہے۔ آخر آج کے بحرانی دور میں -- خاص کر شہری منصوبہ بندی کی موجودہ حالت اور آزادانہ اور سب کے لیے قابلِ قبول فیصلوں پر پہنچنے کی ہماری روز بروز ماند پڑتی ہوئی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے -- کس میں یہ احمقانہ جرأت ہو گی کہ "شہری قصبوں" کے تصوّر کو دوبارہ رائج کرنے کی کوشش کرے؟ اور اگر، بفرضِ محال، ہم نے "شہری قصبوں" کو دوبارہ وجود میں لانے میں کامیاب ہو بھی جائیں تو اُن کو موزوں اور نئے "شہریوں" سے آباد کرنا کیوں کر ممکن ہو گا؟ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے دریائے ٹیمز کو آلودگی سے پاک، نئی نویلی زندگی بخش کر اس کے شفاف پانی میں نئی مچھلیوں کو بسانے کی کوشش کی جائے۔

شہر کی حفاظت

یہ آخری مسئلہ ہے جس پر میں یہاں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ معاصر شہری منصوبہ ساز اپنا ریسکیو مشن (rescue mission) شروع کریں، لازم ہے کہ اُنھیں تمام حلقوں کی مکمل تائید حاصل ہو -- خواہ اس کے لیے استصوابِ رائے ہی کیوں نہ کرانا پڑے -- تاکہ اس اقدام کی ذمے داری میں تمام لوگ شریک ہوں۔ دوسرے لفظوں میں، ماہرین کے پاس اس واضح سوال کا عوام کی جانب سے واضح جواب موجود ہونا ضروری ہے: ہم شہر کو بچانا چاہتے ہیں یا نہیں؟ اگر ہمارے نزدیک شہر کا گل سڑ کر ختم ہو جانا ایک ناگزیر رجحان ہے جس کو روکا نہیں جا

سکتا، اگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ شہر اپنی افادیت کے دن پورے کر چکا ہے، اور اگر کسی مسخ "جدیدیت" کے نام پر ہم شہر کی حفاظت کرنے کی خواہش سے دست بردار ہو چکے ہیں، تو ہمیں صاف لفظوں میں بیان کرنا چاہیے کہ اس سے ہمیں کون سے فوائد حاصل ہوں گے، اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ اس سے ہمیں کیا نقصانات برداشت کرنے ہوں گے۔ میں اس امکان کو ہرگز مسترد نہیں کرتا کہ آنے والی نسلیں اس روایتی شہری ماحول سے باہر رہ کر زندگی بسر کریں جس سے ہم آج واقف ہیں، لیکن کنکریٹ میں جکڑے ہوئے اور توانائی سے محروم سابق شہر کے افق پر یہ آئندہ زندگی دیکھنے میں کیسی ہوگی اور ہماری داخلی دنیا کے حساس آئینے میں کس طرح منعکس ہو گی، یہ بات بتانا میرے لیے ناممکن ہے۔ میں اس تصور کو صرف انھیں الفاظ میں بیان کر سکتا ہوں جو میں نے اس سے پہلے استعمال کیے تھے، یعنی "زبانوں کے عمومی انتشار کی تہذیب"۔

***

شہر کی روایتی قربانی

اپنے خطّے کی حالیہ خانہ جنگی پر میں کتنا ہی غور و فکر کیوں نہ کروں، یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے کہ آخر اس جنگی منصوبے نے شہروں کی تباہی کو اپنا ایک بڑا مقصد -- شاید سب سے بڑا مقصد -- کیوں قرار دے لیا ہے۔ ایک دوسرے کو خاک میں ملا ڈالنے والی ہماری بربریت کو مہذب دنیا جلد یا بدیر کندھے اُچکا کر نظر انداز کر دے گی -- اس کے سوا کون سا ردِ عمل ممکن ہے؟ -- لیکن اس بات کو ہرگز فراموش نہیں کرے گی کہ ہم نے کس وحشیانہ طریقے سے اپنے شہروں کو تباہ کیا۔ ہمیں -- ہم سربوں کو -- شہر تباہ کرنے والوں، قدیم زمانے کے ہنوں (Huns) کے جانشینوں کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ ہمارے اس وحشت ناک عمل کو دیکھ کر مغربی دنیا کا ہیبت زدہ ہو جانا سمجھ میں آتا ہے: مغرب نے صدیوں سے "شہر" اور "تہذیب" کے تصورات کو ایک دوسرے سے منسلک سمجھا ہے، یہاں تک کہ دونوں تصورات کو بیان کرنے والے لفظ ایک ہی لسانی مادّے سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اس لیے مہذب دنیا کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہمارے وحشیانہ طرزِ عمل کو انسانی تہذیب کی اعلیٰ ترین قدروں کی علانیہ اور بے لگام مخالفت پر محمول کرے۔

جو بات صورتِ حال کو اور زیادہ بھیانک بنا دیتی ہے وہ یہ ہے کہ تباہ کیے جانے والے شہر -- اوسییک، وُوکوور، زادار -- بے حد حسین اور شان دار شہر تھے، اور موستار اور سرائیوو اپنی باری کے منتظر ہیں۔ دُبراوِنک پر کیا جانے والا حملہ -- میں یہ کہتے ہوئے کانپ اٹھتا ہوں، لیکن یہ بات

مجھے واضح الفاظ میں کہنی ہے۔۔ دراصل ایک غیر معمولی بلکہ مثالی حُسن کی حامل ایک شے پر دانستہ کیا جانے والا وار تھا۔ اس کی مثال صرف اُس جنونی کے طرزِ عمل سے دی جا سکتی ہے جو کسی حسین عورت کے چہرے کو تیزاب پھینک کر جلا ڈالے اور اس کے عوض میں اُسے ایک اَور حسین چہرہ دینے کا وعدہ کرے۔ لیکن ڈُبراونک کو تباہ کرنے کا عمل کسی جنونی کے بے اختیار رویّے کا مظہر نہیں تھا، اور یہ بات اس حالیہ منصوبے سے پوری طرح کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ بیروک طرزِ تعمیر والے وُوکوور شہر کو نئے سرے سے، ایک ناموجود سر بوباز نطینی اسلوب میں، تعمیر کیا جائے گا۔ یہ فرضی تعمیراتی اسلوب درحقیقت آرکیٹیکچر کی دنیا میں ہونے والے بدترین فراڈ کے سوا کچھ نہیں، اور انتہائی مذموم محرکات پر مبنی ہے۔

اگر ہمارے دینی عالم (theologians) ذرا زیادہ پُرتخیل ہوتے تو مَیں ان کے سربوباز نطینی ووکوور شہر کے تصوّر کی تعبیر ایک ایسے آسمانی شہر کے طور پر کر سکتا تھا جس نے آنے والی سربیائی بہشت کی جھلک دکھانے کے لیے عارضی طور پر زمین پر ظہور کیا ہو۔ لیکن ووکوور شہر کی دانستہ تباہی اور اس کے بعد اس کے چہرے کو تبدیل کرنے کے منصوبے کو اُسی طرح دیکھنا چاہیے جیسا کہ وہ ہے، اور یہ پورا عمل دراصل ایک وحشیانہ عسکری فینٹسی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے وارسا کے پُرانے شہر کو جلا کر اس کی راکھ سے ایک نیا، ٹیوٹونک (Teutonic)وارسا تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا جائے۔

میں نے اپنی زندگی کے بہت سال اس نظریے کو پروان چڑھانے میں صَرف کیے ہیں کہ تہذیبوں کے عروج اور زوال کی پُشت پر ایک ہی تحریکی قوت موجود رہی ہے، اور وہ قوت شہر دوستی اور شہر دشمنی کے رجحانات کے مابین ایک مسلسل، ابدی اور ثنوی (Manichean) --جی ہاں، ثنوی-- جنگ پر مبنی ہے۔ میرے نزدیک شہر دوستی اور شہر دشمنی کی یہ کشمکش ہر قوم، ہر نسل اور ہر فرد کے اندر مسلسل جاری رہی ہے۔ یہ نظریہ رفتہ رفتہ میرے ذہن پر بُری طرح مسلط ہو چکا ہے۔ جب کبھی میں کلاس میں اس نظریے کا ذکر چھیڑتا ہوں، میرے طالب علم اس سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے بھی ہیں، جیسے کہہ رہے ہوں: "لیجیے، پھر وہی بات!" اور پھر ایک لمحہ ایسا آیا جب مجھے احساس ہوا کہ یہ جنگ محض میرے تخیل کی پیداوار نہیں بلکہ ہمارے زمانے کی روزمرّہ حقیقت ہے۔

قدیم روایتی قربان گاہ پر کسی شہر کا قتل، میرے نزدیک کسی انسان کی قربانی ہی کی توسیع ہے، اور مجھے شہر کے قاتل گوشت پوست کے افراد کے روپ میں باقاعدہ دکھائی دے رہے ہیں۔ کلاس میں لیکچر دیتے ہوئے میں جو قصّے سنایا کرتا تھا، یہ قاتل افراد اُن قصّوں کو کس قدر بھیانک

Scanned with CamScanner

درستی کے ساتھ عملی شکل دے رہے ہیں: بھلے چرواہے اور بدی کے شہر کی کہانی، سدوم اور عمورہ کی تباہی اور اریحا کی فصیل کے مسمار کیے جانے کی حکایتیں، اپیسوس اور اُس کے ٹروجن گھوڑے کی داستان، قرآن کی خوفناک وعیدیں کہ اس دنیا کے تمام شہر تباہ ہو جائیں گے اور ان کے بے راہ رو باشندے بندروں کا روپ اختیار کر لیں گے۔ شہروں کی تباہی کے حالیہ گرینڈ ماسٹر اپنے عمل کے محرکات کو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں اور ان پر فخر کرتے ہیں۔ آخر تاریخ کے آغاز سے اب تک ان قاتلوں کے پیشرو بھی تو خالص ترین اعتقادات، بلند ترین اور سخت گیر اخلاقی، مذہبی، طبقاتی اور نسلی اصولوں ہی کی بنیاد پر شہروں کو تاراج کرتے چلے آئے ہیں۔

شہر سے نفرت کرنے والے اور شہر کو تباہ کرنے والے لوگ صرف ہماری کتابوں میں موجود نہیں، بلکہ ہماری زندگیوں پر مسلط ہیں۔ وہ کس گمراہ، قوم پرستانہ جذبے سے سرشار ہو کر نکلتے ہیں اور کس منزل کی طرف رواں ہیں؟ انھوں نے اپنے نظریات کی بنیاد کن ژولیدہ اصولوں پر رکھی ہے؟ ان کے ذہنوں پر کون سے تصوّرات مسلط ہیں اور یہ تصوّرات اُنھیں کن کتابوں میں ملے ہیں؟ ظاہر ہے وہ ایسی کتابیں ہوں گی جن کا تاریخ سے کوئی سروکار نہیں ہو گا۔ کیوں کہ کسی وحشی کے لیے یہ تسلیم کرنا ہی دشوار ہے کہ اس کی پیدائش سے پہلے بھی کسی چیز کا وجود تھا۔ سبب اور نتیجے کی بابت وحشیوں کا تصوّر نہایت بتدیانہ اور یک رنگ ہوتا ہے، خاص کر جب اس تصوّر کی تشکیل قہوہ خانوں کی بے مغز بحثوں میں کی گئی ہو۔

جس بات کو میں بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، عین ممکن ہے وہ آخر کار ناقابلِ بیان ثابت ہو۔ اس لیے پڑھنے والوں سے میری درخواست ہے کہ میرے ان خیالات کو محض علم اور وجدان کو یکجا کر کے وحشی ذہن میں شہر کے قدیم، آرکی ٹائپل خوف کو سمجھنے کی ایک کوتاہ کوشش سمجھیں۔ لیکن قدیم زمانے میں یہ خوف ایک "مقدّس خوف" کی حیثیت رکھتا تھا، چناں چہ اصول و ضوابط اور نظم و ضبط کا پابند تھا، جب کہ آج یہ بدترین ذہنیت کی بے لگام خواہشات کا ایک وحشیانہ اظہار ہے۔ شہر تباہ کرنے والوں کی مضطرب روحوں کی گہرائی میں مجھے جو شے دکھائی دیتی ہے وہ ہر شہری چیز، ہر تہذیب یافتہ چیز، یعنی روحانیت، اخلاق، زبان، ذوق اور اسلوب کے تمام تر معنوی ذخیرے، کے خلاف کینہ ور دشمنی کا رویّہ ہے۔ چودھویں صدی کے بعد سے اکثر یورپی زبانوں میں شہریت (urbanity) کا لفظ وقار، نفاست، اور فکر اور لفظ کی، لفظ اور احساس کی، احساس اور عمل کی، ہم آہنگی کا مظہر رہا ہے۔ جو لوگ اس لفظ کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر ہوتے ہیں انھیں اس کو یکسر ترک کر دینا ہی زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے۔

ووکوور اور موستار کے شہروں، اور سرائیوو کے قدیم تُرک علاقے باشچارشیا کو جس بدقسمت

انجام سے دوچار ہونا پڑا، وہ بلغراد شہر کے لیے بھی ایک بھیانک پیش گوئی کر رہا ہے۔ جی نہیں، مجھے یہ اندیشہ نہیں ہے کہ بلغراد کے قلعہ میدان کی فصیلوں کے نیچے غیروں کے غول جمع ہو جائیں گے۔ میرے غمناک خوف کا باعث ہمارے اپنے پروان چڑھائے ہوئے تباہی کے پروردگار ہیں۔ شہر صرف بیرونی حملوں سے، جسمانی طور پر، تباہ نہیں ہوتے؛ وہ اندرونی بگاڑ کے نتیجے میں روحانی طور پر بھی ملیامیٹ ہو جاتے ہیں۔ بلکہ آخرالذکر صورت زیادہ دیکھنے میں آتی ہے۔ ہمارے نئے فاتحین ہم سے خود کو بندوق کے زور پر تسلیم کرائیں گے۔ جیسا کہ بلقان کی تاریخ اجتماعی ہجرتوں سے واقف رہی ہے، خطرہ بالکل واضح ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر وجود میں آنے والی نیشنل لبریشن موومنٹ کم از کم جزوی طور پر ایک اجتماعی ہجرت تھی، جس میں دیہی آبادی کو جبراً، بندوق کے زور پر، شہروں کی طرف ہانکا گیا۔ "شہروں کو نئی زندگی دینے" کے اس عمل کے ہولناک نتائج بہت سے لوگوں کو اب تک یاد ہیں، اور ایسے ہی ایک اور منظر نامے کا تصور کرنا زیادہ دشوار نہیں ہے۔

اگر سرب دیہات کا دفاع کرنے والے سورماؤں اور کروشیائی شہروں کو زیر کرنے والے فاتحین نے واقعی ہم سے خود کو جبراً ہم وطن تسلیم کرا لیا تو ہم واضح طور پر جانتے ہیں کہ آگے کیا ہو گا۔ پارٹیزن فوجیوں نے شہر کی زوال آمادگی کی مذمت کرتے ہوئے ہم سے اس کی معاشرتی تنظیمِ نو کرنے کا عہد کیا تھا؛ ہمارے نئے نازی پارٹیزن سربیا کے سدوم اور عمورہ کو قوم کے تمام غداروں سے پاک کرنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔ ایک بار پھر، اعلیٰ ترین اور معزز ترین مقاصد کے نام پر شہروں کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ بہت جلد کوئی نہ کوئی اس فیصلے پر بھی پہنچ جائے گا کہ بلغراد کو بھی نسلی طور پر خالص کر لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ اور اس فیصلے کی تائید میں اگر عظیم قوم پرستانہ اقدامات کا کوئی نظریہ درکار ہو —— بشرطے کہ ہمارے کلچر کے نئے محافظ، نئے سماجی رہنما، ہنوز کسی نظریے کی ضرورت محسوس کرتے ہوں —— تو ایسا نظریہ ہمیشہ پایا جا سکتا ہے۔ آخر ہماری قوم کے جدِ اعلیٰ ووک کراجک (Vuk Karadzic) ہی نے تو ہمیں یہ تعلیم دی تھی کہ سربوں کو ہمیشہ شہروں سے باہر رہنا چاہیے کیوں کہ شہر درحقیقت والاخیوں (Wallachians)، جرمنوں اور اسی طرح کے دوسرے حقیر اور ذلیل شہری باشندوں کی آماج گاہ ہوتے ہیں!

اور اگر یہ دلیر لوگ ہم جیسوں کو بزدل، اگلے وقتوں کے لوگ اور "ناکافی سرب" قرار دیں، اگر وہ یہ ٹھان لیں کہ ہمارے شہروں کو نسلی اور قومی تنظیمِ نو کی ضرورت ہے، تو ہم میں سے جن کو وہ ڈرا کر بھگانے میں ناکام رہیں گے (وہ اس وقت بھی ہمیں دہشت زدہ کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں)، وہ خدائی حکم کے عین مطابق بندروں میں تبدیل ہو جائیں گے۔

Scanned with CamScanner

یہی وجہ ہے کہ جب میں لوگوں کو "نئے سربیا" کی باتیں کرتے سنتا ہوں تو مجھے یہی فکر ہوتی ہے کہ شہری تہذیب کا جتنا کچھ حصہ ہمارے پاس باقی رہ گیا ہے اُسے کس طرح محفوظ رکھا جائے اور خود کو بندر میں منقلب ہونے سے کس طرح بچایا جائے۔

***

راہ گم کردہ یادیں

اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی کچھ عرصہ پہلے لکھی ہوئی ایک بات کو، جو مجھے اب بھی عزیز ہے، نوسٹلجیائی انداز میں دوہرانا چاہتا ہوں:

"ایک دن، ایک نیا (اور حقیقی) یوگوسلاو آئین ان لفظوں سے شروع ہو گا: ہمارے ملک میں تمام یادوں کو مساوی پیدا کیا گیا ہے۔"

اگر کچھ اَور نہ بھی ہو تو ان لفظوں سے اس اصول کو ایک دھچکا ضرور پہنچتا جس کی رو سے قومی یادوں کو اچھی، ترقی پسندانہ یادوں اور کم اچھی، بمشکل قابلِ قبول یادوں کے خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اب تو ہمارا کوئی مشترک ملک ہی نہیں رہا؛ اب تو ہم یادوں کی برتری قائم کرنے کی غرض سے ایک خونیں اور غلیظ جنگ میں مبتلا ہیں۔

یہ حقیقت ایک سنگین ستم ظریفی کی حامل ہے کہ آج کی تمام راہ گم کردہ یادیں یا تو مسخ کردہ حقائق پر مبنی ہیں یا مکمل طور پر فرضی ہیں۔ تاریخی حقائق کے درمیانی خلا کو ہر رنگ کے تعصبات سے پُر کر لیا گیا ہے۔ نیم خواندہ سرب آبادی کا ایک بڑا حصہ، جو میلوشےوِچ کے "وقار کی بحالی" کے عزم کے نشے میں دھت ہے، یہ پختہ عقیدہ رکھتا ہے کہ دورِ وسطیٰ میں سرب لوگ سونے کے چمچوں سے کھانا کھایا کرتے تھے۔ اس فینٹسی کو ایک معصومانہ تصور قرار دے کر دوسری، نئی اختراع کردہ یادوں کے خانے میں پھینکا جا سکتا تھا، اگر اس میں بدمزگی کے مضمرات پوشیدہ نہ ہوتے۔ یعنی یہ کہ جب ہم سرب سونے کے چمچوں سے کھانا کھانے میں مشغول تھے (اور سربوں کی زبان میں چمچ کے لیے kasika کا جو لفظ مستعمل ہے وہ ترکی زبان سے ماخوذ ہے!)، اُس وقت باقی تمام لوگوں نے غالباً اپنی انگلیاں شوربے میں ڈبو رکھی ہوں گی، اور یہ بات آج کل کے حفظِ مراتب میں ان سب لوگوں کو ایک درجہ کمتر ٹھہرانے کے لیے کافی ہے۔

ایک مقبول دعویٰ یہ ہے: "دنیا کی کم ہی قوموں کے پاس استودینیکا (Studenica) جیسی عمارت ہو گی۔" اشارہ بارھویں صدی کے اواخر کی سرب موناسٹری کی جانب ہوتا ہے۔ اس

دعوے کا مقصد دنیا کی قوموں کی صف میں نمایاں مقام حاصل کرنا ہے۔ استودینیکا بلاشبہ ایک قابلِ قدر یادگار ہے (خصوصاً اپنی تین چوتھائی بلندی تک)، اور میں نے ہمیشہ اسے تعمیر کرنے والے ہنرمندوں کے لیے تحسین کا جذبہ محسوس کیا ہے، اور اُن فرماں رواؤں کے لیے بھی جنھوں نے ان معماروں کو دوردراز کے علاقوں سے بُلوایا اور انھیں اپنی بہترین صلاحیتیں بروے کار لانے کی اجازت دی۔

اس کے باوجود "کم ہی قوموں" والی اس پروپیگنڈائی مناظرہ بازی کے مقابلے میں حقیقت کا راست گویانہ بیان آخرکار زیادہ تحسین آمیز ٹھہرتا ہے۔ اس لیے کہ جب استودینیکا کی عمارت بن رہی تھی، اُس وقت یوروپ میں، بلکہ پورے کاکیشیا میں، کسی بھی قوم کے پاس ایک یا ایک سے زیادہ استودینیکا موجود نہیں تھے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ دوسری قومیں آرکیٹیکچر کے ایسے ایسے عجائب اور تعمیر اور ڈزائن کے ایسے ایسے جمالیاتی اور روحانی رازوں کی ملکیت کا دعویٰ کر سکتی تھیں جو ہمارے اچھے بھلے استودینیکا کے جوشیلے پرستاروں کے خواب میں بھی کبھی نہ آئے ہوں گے۔

غیر فطری یادوں کی یہ بداعتدالیاں بےحد قابلِ افسوس ہونے کے باوجود المناک صورت اختیار نہ کرتیں اگر ان سے ایک طرح کی منفی ڈیٹا پروسیسنگ کی حوصلہ افزائی نہ ہوتی، یعنی ایک ایسے عمل کی جس کے ذریعے حقیقت پر مبنی یادوں کو -- خواہ وہ دوسروں کی ہوں یا خود اپنی -- باقاعدہ ختم کیا جاتا ہے اور اس کام میں اُنھیں مادّی طور پر مسمار کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ شہروں کو تباہ کرڈالنے والی آگ، جس کا ہم آج اپنی دہشت زدہ آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں، دراصل یادوں کے ان ذخیروں پر بےپناہ طیش ہی سے بھڑکتی ہے جو شہر کی ملکیت ہوتے ہیں۔ یہ حیوان صفت لوگ اس ذخیرے کو اپنی تیار کردہ تاریخ سے بدل ڈالنا چاہتے ہیں۔ میری مراد صرف عجائب گھروں، کتب خانوں اور دستاویزخانوں (archives) کی تباہی سے نہیں ہے؛ میں اُن تعمیراتی ہیئتوں اور ان میں مخفی پیغامات کے پاکیزہ ذخیروں کی تباہی کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو ان عمارتوں کی صورت میں زندہ تھے۔ یہ پیغامات (ان کی مثال کے لیے استودینیکا ہی کی عمارت کا تصور کرلینا کافی ہے) اجتماعی قومی یادداشت سے بھی بالاتر حیثیت رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں، کسی گروہی نمائندگی کو روا نہ رکھتے ہوئے یہ پیغامات بتدریج "صحت مند" یادداشت کے منطقے سے باہر رہتے ہیں اور یوں شہردشمنوں کو مشتعل کرتے ہیں جنھیں ہر اُس شے کا سامنا کرنے سے اپنی کمتری کا احساس ہوتا ہے جو ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ عمارتی نقاشی کی متنوع شکلیں، سجاوٹ کے مختلف طریقوں کے قاعدے، ہیئتوں کے متعدد اسلوب -- ان سب کے گرد ایک پُراسرار، بلکہ جادوئی، ہالہ ہوتا ہے۔

Scanned with CamScanner

جدید دور کے وحشی جس منظم جوش کے ساتھ شہروں کو تباہ کرتے ہیں وہی منظم جوش قبرستانوں کو مٹانے میں دکھاتے ہیں۔ اور چوں کہ قبرستان بھی دراصل ایک طرح کا شہر ہی ہوتا ہے، وہی اضطراب --- دوسرے لوگوں کی یادوں کا، اور ان یادوں کے بدشگون، پُراسرار اور ناقابلِ فہم مشمولات کا وہی خوف --- یہاں بھی کارفرما ہوتا ہے۔ وہ یہ بات کبھی نہیں سوچتے --- وہ اسے جان بھی کیسے سکتے ہیں؟ --- کہ اپنے آس پاس رہنے والوں کی یادوں کو برباد کرکے وہ درحقیقت اپنی ہی بشریاتی یادداشت کی زنجیر کی کڑیاں توڑ رہے ہیں۔

نسلی طور پر خالص کلچر کا کہیں وجود نہیں۔ یہ سوچنا کہ ایسا کوئی کلچر موجود ہے، بلقان کے خطّے کے لیے خاص طور پر مہلک ہے جہاں ایک دوسرے میں پیوست کلچر کے ہزاروں نمونے انتخاب کے لیے دستیاب ہیں۔ میں اپنی بات کو ایک مثال کے ذریعے واضح کروں گا۔ ہم سرب سڑکوں کے کنارے بنائی ہوئی اُن سنگی یادگاروں پر بجا طور پر نازاں ہیں جنھیں ہماری زبان میں "کرائیپوتاش" (krajputas) کہا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ یادگاریں عموماً اُن سورماؤں کی ہیں جنھوں نے تُرکوں سے جنگ کرتے ہوئے جان دی تھی، لیکن ان یادگاروں کی شکل بہت واضح طور پر ترکوں کے سنگِ مزار کی تکرار محسوس ہوتی ہے، جو خود قبلِ اسلام کے عرب، فونیشی اور عبرانی "بیتل" (betel) سے ماخوذ ہے۔ لیکن ہمارا کرائیپوتاش شاید ہمیں اس بات پر قائل کرنے کے لیے کوشاں ہے کہ وہ دراصل ایک مقامی سرب علامتی ہیئت ہے۔

جس شے کو کمیونزم کہا جاتا ہے اسے یادوں کو خاموش کرنے، کچلنے اور مسل ڈالنے میں خاص مزہ ملتا تھا۔ لیکن اگر ایک بار وہ کسی یاد کو اپنا لیتا تو پھر اس پر اپنے مخصوص عمل سے پوری اسطوری عمارت بنا لیا کرتا تھا۔ قدیم باشندوں کی ذہنی پیچیدگیوں کا ہمیشہ لحاظ رکھتے ہوئے، وہ ان اساطیر کو حددرجہ سادہ اور عمومی توضیحات کی مدد سے خوف سے عاری کر دیا کرتا تھا؛ اس نے بہت سی علامتوں کو، ان کے قدیم مفہوم کو تبدیل کر کے، اسطوری رُتبے سے محروم کر دیا۔ اب، جب کہ ہم قوم پرستی کا نیا مذہب اختیار کر چکے ہیں، ہم ان یادوں کو مذہبی احتیاط کے ساتھ الٹتے پلٹتے ہیں اور انھیں "اُن کی" اور "ہماری" کے خانوں میں تقسیم کرتے جاتے ہیں۔ جو یادیں "اُن کی" ہیں انھیں قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں اور جو "ہماری" ہیں انھیں سجاتے سنوارتے ہیں۔ یہ ایک نہایت خارج کن، جارحانہ اور جنونی عمل ہے اور کسی قسم کے حِلم یا ضبط کو روا نہیں رکھتا۔ یہ تو بورژوا قوم پرستی کی، مثلاً وکٹورین الحاد پرستی کی، جانب سے اپنے انتہائی شاوِنیت زدہ حامی تک کو بخشی ہوئی اس اجازت سے بھی عاری ہے کہ جہاں کہیں حُسن یا فنی قدر دکھائی دے وہ اُسے سراہ سکتا ہے۔

اس نئی قوم پرستی کے فروغ میں دانش وروں نے جو کردار ادا کیا ہے وہ نہایت واضح اور بجا

Scanned with CamScanner

طور پر بدنام ہے۔ سابقہ دور میں حکمرانوں سے اختلاف رکھنے والے قوم پرستوں کی تنقید بہت سخت لیکن بے اثر ہوتی تھی کیوں کہ تجزیاتی تنقید ممنوع تھی۔ باقی اگر حکمرانوں کے گرد تھوڑا بہت شوروغوغا ہوتا رہے تو اس سے ان کی حیثیت اور ساکھ کو سہارا ہی ملتا تھا۔ مزید برآں، یہ راز بھی سب جانتے ہیں کہ قوم کے ان چیمپینّوں نے، جو اقتدار کے پہلے یا دوسرے حلقے میں شریک تھے، مرکزیت زدہ قومی کمیٹیوں سے خفیہ روابط استوار رکھے تھے اور یہ کمیٹیاں ضرورت پڑنے پر انھیں قبولیت عطا کرنے میں بالواسطہ کردار ادا کرتی تھیں۔ اس بات کا احساس رکھتے ہوئے کہ وہ ایک پیچیدہ، بلکہ خطرناک، کھیل کھیل رہے ہیں، انھوں نے ان کمیٹیوں کے قواعد و ضوابط کو خاموشی سے قبول کرلیا۔ اس طرح انسانی روحوں کے ان انجینیروں نے رفتہ رفتہ نئی قائم کردہ قومی یادداشت کے اماموں اور ترجمانوں کی حیثیت اختیار کرلی۔

اس دوران قومی فینٹسیوں کے بینار تیزی سے بلند ہورہے تھے اور ان کے سائے ہر چیز پر پڑنے لگے تھے۔ بیکن (Bacon) کے "نیو اٹلانٹس" کی تجربہ گاہوں کی طرح علوم اور فنون کی فرسودہ (anachronistic) اکیڈمیاں (یوگوسلاویا میں اس طرح کے آٹھ ادارے تھے!) لیبارٹری کے ماحول میں نت نئی بیماریوں کے جراثیم تیار کرنے میں مشغول ہوگئیں۔ لیکن پھر، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، شیشیاں اور بوتلیں پھٹنے لگیں، عفریت بے قابو ہوکر آزاد ہونے لگے اور وبا پھیل گئی۔

بدقسمتی یہ تھی کہ ان جراثیم کو سازگار حالات دستیاب ہوئے۔ بلقان کے خطّے میں قومی تلخی اور انتقام کے آمیزے میں رزمیے کے ہارمون کا عنصر ہمیشہ شامل ہوجاتا ہے۔ ہم سرب اپنے برادرانہ، قبائلی اور قومی ڈراموں کا تصوّر ہمیشہ اپنی رزمیہ شاعری کے خلاصوں کی مدد سے کرتے ہیں، اور یہ خلاصے عام ادب سے، مگر بیشتر صورتوں میں لوک ورثے کے معروف ماہروں کے مطالعوں سے، ماخوذ ہوتے ہیں۔ اس خلاصے کے بنیادی اجزا یہ ہوتے ہیں: قوم کا شاندار ماضی، اُس زرّیں (یا چوں کہ رزمیے دراصل "سورماؤں کے رجز" ہوتے ہیں، اس لیے سیمیں) دور کا زوال، اور اُن تمام پوشیدہ قوتوں پر لعنت کا ایک نعرہ جو اس زوال کا سبب بنیں۔ توقع یہ کی جاتی ہے کہ ہمارے سورما پالاس کے روایتی مجسمے (palladium) کو پھر سے اپنے قبضے میں کرلیں گے جو درحقیقت اُن کی شناخت کا ایک طلسمی متبادل، قومی یادوں کا مجموعہ اور ان کی قدیم طاقت کا ذخیرہ ہے، اور اس کی مدد سے وہ اُن تمام چیزوں کو پھر سے پالیں گے جنھیں ایک بار کھو چکے ہیں۔

یہ میرا منصب نہیں -- یا مکمل طور پر میرا منصب نہیں -- کہ میں ادب کے اس کردار کا محاسبہ کروں جو اس نے ایک فرضی قومی یادداشت کی تشکیل میں ادا کیا ہے۔ حقیقت بہرحال یہ ہے

Scanned with CamScanner

کہ ہمارا ادب (یہاں "ہمارا" سے مراد علاقائی، قوم پرستانہ، محبِ وطن اور قومی آزادی کا نقیب ادب ہے) شہری افق سے دُور ہی دُور رہنے کا عادی رہا ہے۔ اس دوری کی وجہ میری سمجھ میں آج تک نہیں آئی۔

اگر ناول کو باقی تمام اصناف کے مقابلے میں بنیادی طور پر شہری صنف کہا جائے، تو رزمیہ ترانوں اور ساگاؤں کو، اپنے ماخذ اور سماجی کردار دونوں کے اعتبار سے، ماقبلِ شہری اصناف قرار دیا جائے گا۔ کوئی عظیم دور ایسا نہیں رہا جس میں ایک عظیم شہر موجود نہ ہو، اور کوئی عظیم شہر ایسا نہیں رہا جس میں کم از کم ایک آن لکھا ناول موجود نہ ہو۔ شہری منصوبہ ساز جب اپنے کام کے دوران سیمولیشن (simulation) کی تکنیکیں استعمال کرتے ہیں (یعنی کمپیوٹر کی مدد سے کسی ممکنہ صورتِ حال کے تمام عناصر کو فرض کر کے اس کے نتائج کا اندازہ لگاتے ہیں) تو اکثر وہ ان تکنیکوں، اور ان کے ریاضیاتی ماڈلوں کو، ایک طرح کے مثالی ناول کے بیانیے ہی کی طرز پر تعمیر کرتے ہیں۔ آئیے، ہم اپنے بنائے ہوئے کلیے کو لغویت تک لے جا کر تولستوئے کے "جنگ و امن" کے ساتھ ایک تجربہ کریں۔ اگر اس ناول میں سے ایسے تمام پاروں کو خارج کر دیا جائے جو ماسکو یا پیٹرزبرگ سے متعلق ہیں، یعنی شہری سماج کو بیان کرتے ہیں، تو باقی کیا بچتا ہے؟ جو کچھ باقی بچتا ہے وہ روایتی روسی رزمیہ شاعری کے مخصوص موضوعات، جنگ میں مشغول ایک قوم کی بےحد وسیع اور تفصیلی تصویر، اور فلسفیانہ تکرار کی خاصی بھاری خوراک پر مشتمل ہے۔

اب یہ بات تھوڑی بہت ضرور واضح ہو گئی ہو گی کہ معاصر سرب ناول بنیادی طور پر ماضی کے زمانوں ہی کو (مثلاً پہلی جنگِ عظیم کے زمانے کو) اپنا موضوع کیوں بناتا ہے۔ ایسے ناول میں ایک یا ایک سے زیادہ شہر وجود نہیں رکھتے، یہاں تک کہ حقیقی شہری بھی موجود نہیں ہوتے۔ یہ ایسا ناول ہے جو اپنی عملی -- یعنی غیر شاعرانہ -- افادیت میں سورماؤں کے رجز کا قائم مقام ثابت ہوتا ہے۔ اس بات کا پس منظر بھی کچھ واضح ہو گیا ہو گا کہ معاصر سرب ناول میں بِپناٹک (hypnotic) عمل پیش آتا ہے، یعنی "گزرے دنوں" کی تصویریں آج کل کی حقیقی صورتِ حال کے پہلو بہ پہلو موجود ہوتی ہیں، لیکن یہ دونوں عناصر آسانی سے الگ الگ اکائیوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اور حقیقت سے جدا ہو جانے والا استعارہ دراصل استعارہ نہیں بلکہ کوئی نعرہ یا چلتا ہوا فقرہ ہوتا ہے۔ اس طرح یہ ناول اپنے لکھے جانے کا مقصد حاصل کر لیتا ہے، یعنی غیر محسوس طور پر طرزِ عمل کا ایک نمونہ پیش کرتا ہے جو کسی فرد کے فیصلے یا عمل کے لیے مثال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

عظیم ناولوں کے عظیم مصنفوں کے ہاں بھی جبر کی صورتِ حال پیش آ سکتی ہے، لیکن ذرا

Scanned with CamScanner

سوچیے کہ --قومی سورما شاعروں کی بات تو جانے دیجیے-- ہمارے چھوٹے شاعروں اور میدان میں مشغول شاعروں کے ذہن میں کیا ہو رہا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری روایتی صنفِ سخن، جو لوک موسیقی کے اکتارے (gusle) سے مشابہت رکھتی ہے، آج تک ہماری قومی یادداشت بحال کرنے کے موثر ترین ذریعے کا کام دے رہی ہے۔ یہ صنف واضح طور پر ہمارے بالائے تولستوئے (para-Tolstoyan) ناول کے مقابلے میں کہیں زیادہ جارحانہ ہے، اگرچہ ہمارے ادب نے جو کام اپنے ذمے لے لیا ہے اسے انجام دینے میں شاعری اور نثر دونوں شانہ بہ شانہ حصہ لیتی ہیں۔ اس کی مثال کے طور پر ہمارا بوسنیا کی المناک صورتِ حال کی طرف دیکھ لینا کافی ہے۔

***

انسانی تناسب کا ایک شہر

۱۹۷۴:

پچھلی صدی کے آخر تک یوروپی سیاح متعدد مشرقی شہروں کے خارجی رخ کو تقریباً لغوی معنوں میں عجائب کے طور پر دیکھا کرتے تھے۔ مزید برآں، کئی شہر تو ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے اُنھیں باقاعدہ سوچ سمجھ کر یہی تاثر پیدا کرنے کی غرض سے بنایا گیا ہو، جیسے وہ پکار پکار کر کہہ رہے ہوں کہ دیکھو، ہم سراب اور فریبِ نظر کے شہر ہیں! یہ بات کہ یہ تاثر محض مغربی سیاحوں کے تخیل کی پیداوار نہیں تھا، بعض شہروں کے ناموں سے واضح ہو جاتی ہے۔ مثلاً "سماریا"، جس کے لغوی معنی کی تعبیر لسانی اشتقاق کی رو سے اس طرح کی جا سکتی ہے: "ہر دیکھنے والے کے لیے مسرت"۔

میں نے سرائیوو شہر کو پہلی بار اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔ میں چھوٹے گیج کی ٹرین میں سفر کر رہا تھا جو پہاڑیوں پر سے نیچے اتر رہی تھی۔ یہ شہر واقعی دیکھنے والے کو مسرت بخشتا تھا۔ اور میرا بچکانہ لسانی اشتقاق کیسا ہی سادہ لوح کیوں نہ ہو، لیکن اس نام کے معنی نے مسرت کے اس تجربے کو اور زیادہ گہرا کر دیا تھا: سرائیوو سچ مچ ایک کارواں سرائے دکھائی دینے لگا۔ میں نے اس شہر کے نام کو اپنے لیے پیغام سمجھا: آؤ، ننھے مسافر، اور اپنے تھکے ہوئے پیروں کو آرام دے لو!

Scanned with CamScanner

۱۹۸۱:

میں نے کتنی بار اپنی اس بات کو دُہرایا ہے کہ کوئی شہر اُس وقت تک حقیقی شہر نہیں ہو سکتا جب تک اُس کے پاس اپنی شخصیت، اپنی نفسیاتی تصویر، اپنا کردار، اپنے ساتھ اور اپنے باہر کی دنیا کے ساتھ، اچانک آ نکلنے والے مسافروں، اپنے گردوپیش، مادرِ فطرت اور دوسرے شہروں کے ساتھ پیش آنے کا اپنا مخصوص انداز نہ ہو۔ میری اس بات کی تکرار کرنے کی بہت سی وجوہ رہی ہیں کہ شہروں کو عمدہ کتابوں کی طرح پڑھے جانے کے قابل اور دانائی سے لبریز ہونا چاہیے۔

شہر اور ناول کے درمیان ایک باہمی رشتہ موجود ہے۔ میں اس بات کی طرف اشارہ کرنے سے کبھی نہیں تھکتا کہ رزمیے کے مقابلے میں ناول بڑی حد تک ایک شہری صنف ہے: ہر ناول کے لیے اس کے شہر کا ہونا لازمی ہے، ہر شہر کے لیے اس کے ناول کا ہونا لازمی ہے۔ میں اپنے دانائی کے لمحوں میں سرائیوو شہر کا ناول پڑھتا ہوں۔ کچھ ایسی خوش کن کتابیں ہوتی ہیں جنھیں ہم صرف اُس وقت کھولتے ہیں جب ہمارا دل خوشی سے لبریز ہو اور ہمارے سب معاملات ٹھیک ٹھیک چل رہے ہوں۔

۱۹۷۶:

اب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں اپنی اس بات میں مبالغے سے کام لے رہا تھا کہ کوئی شہر -- ہر شہر، لیکن بعض شہر دوسرے شہروں سے کچھ زیادہ -- دنیا پر نظر ڈالنے کے ایک بے مثل مقام، سب کچھ جان لینے کے دلچسپ کھیل کے لیے ایک بے حد منفرد کھلونے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اپنی ڈائری میں یہ نوٹ -- مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے -- میں نے سرائیوو سے لوٹ کر لکھا تھا۔ شاید مجھے اس مقام سے دنیا کی ایسی باتیں بھی دیکھنی تھیں جو اُس وقت تک پیش نہیں آئی تھیں۔

۱۹۷۴:

دیکھنے کی سطح اور سمجھنے کی سطح کے درمیان، دنیا کی حقیقی تصویر اور

خیالوں کی دنیا کے درمیان کسی جگہ ہرقلیہ کا شہر واقع تھا، جو شیعوں کے لیے وہی حیثیت رکھتا تھا جو Manichean دور کے تیرا لوسیدا (Terra Lucida) کو حاصل تھی، جہاں فلسفیانہ اور شاعرانہ امیجری کے منطقے میں کہیں انسانی تجربے سے اوپر اُٹھ جانے کی کسی ابتدائی سطح نے اپنے تمام خوابیدہ امکانات کو بروئے کار لانے کے لیے ایک شہر کا لبادہ پہن لیا تھا۔ یہ افلاطونی تصوّر اس سادہ سچ کی یاد دلاتا ہے کہ شہر -- تمام شہر، اور ہر شہر انفرادی طور پر -- ایک جانب ایک مقدس غیر زمینی مظہر اور دوسری جانب علم کا ایک ذریعہ، تدریس میں کام آنے والا ایک نمونہ اور دنیا کو سمجھنے کے لیے خدا کا عطا کیا ہوا ایک آلہ ہوسکتا ہے۔

دنیا پر نظر ڈالنے کا یہ مقام اب مسمار کردیا گیا ہے، دنیا کو سمجھنے کے اس آلے کو، "لفظ" (Logos) کے اس آلے کو، ٹکڑے ٹکڑے کرکے پھینک دیا گیا ہے۔

۱۹۷۵:

ہماری یہ غیر معمولی کہاوت بہت سے لوگوں کو عجیب معلوم ہوتی ہے: "شہر میں آنا اپنی مرضی سے اور جانا شہر والوں کی اجازت سے۔" یہ کہاوت اُس مشرقی مقولے سے مماثل محسوس ہوتی ہے کہ "شیراز میں داخل ہونا آسان ہے، لیکن باہر کیوں کر نکلا جائے؟" مشرقِ قریب، مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید کے بہت سے قدیم شہروں میں آدمی کے لیے "راستا جاننا" لازمی تھا۔ راستا جاننے کو مادّی معنوں میں بھی لیا جا سکتا ہے، کیوں کہ راستے سے بھٹک جانے کے متعدد امکانات موجود ہوتے تھے، لیکن اسے استعاراتی مفہوم میں بھی دیکھنا چاہیے۔ کیوں کہ راستا جاننے کی بات ایک ایسی مابعدالطبیعیاتی صورتِ حال کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے جس سے انسانی ذہن نے -- مشرق میں بھی اور مغرب میں بھی -- بھول بھلیوں پر مشتمل پُراسرار شہر کی بہت سی فینٹسیوں کو پیدا کیا ہے جس کے مرکز میں علم کا ایک خزانہ دفن ہے۔ لیکن صرف وہاں تک پہنچنے کا راستا جاننا کافی نہیں، واپسی کے راستے کا بھی علم ہونا چاہیے۔ یہی نوسٹلجیائی امید ہے یہ!

Scanned with CamScanner

بھول بھلیّوں کا نظریہ ایسے رازوں کے وجود کو تسلیم کرتا ہے جو کسی چیستاں کے بے حد پیچیدہ نظام پر قدرت رکھنے والے شخص کو اندر آنے کی اور پھر باہر نکلنے کی بھی اجازت دیتے ہیں۔ ایسی کسی بھول بھلیاں کا کوئی وجود نہیں جہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستا نہ ہو، سارے راستے بند ہوں اور امید کے لیے کوئی گنجائش نہ ہو۔ بد قسمتی کی بات یہ ہے کہ رات کو ٹی وی پر دکھائی جانے والی سرائیوو کی خبریں اس نظریے کو جھٹلاتی ہیں، ایک ایسے بھول بھلیوں کے شہر کی جھلکیاں دکھاتی ہیں جہاں سے باہر آنے کا کوئی راستا نہیں۔

۱۹۷۴:

ماضی قریب اور بعید کے شہروں کو اپنا تعارف کرانے اور اپنی نمائش کرنے کا ایک خاص سلیقہ حاصل تھا۔ وہ اس کے لیے قابلِ دید مناظر سے لے کر مبالغہ آمیز ناموں تک ہر آزمودہ اور نئی ترکیب سے کام لیا کرتے تھے۔ اگر ہمیں معلوم ہو کہ فارس کے شہر یزدی قرہ کے نام کے معنی "پرندوں کی بستی" کے ہیں تو ہم ارسٹوفینز کے Ornithes کو ذہن میں لائے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ کیا یہ کلاسیکی یوٹوپیا اور ایک دل آویز، بنیادی طور پر لسانی، مگر نامعلوم سمت میں بڑھتی ہوئی، تمثال تخلیق کرنے کی روایت کو زندہ کرنے کا عمل تھا؟ یہ فیصلہ کرنا ہمارا کام ہے۔

مجھے تلازمات کے ایک نئے سلسلے کا اضافہ کرنا ہے: پرندوں کی بستی، تباہ شدہ یوٹوپیا، مُردہ پرندوں کی بستی۔ کل رات ٹی وی پر مجھے ایک پیڑ کے نیچے پڑے ہوئے مُردہ پرندے دکھائی دیے تھے۔

۱۹۷۵:

انیسویں صدی کے سفر نامہ نگاروں کو، جو مشرقِ وسطیٰ کے خطّے میں دن رات بے مقصد یا بامقصد سفر میں رہا کرتے تھے، ایک ایسے مظہر کے مشاہدے کا موقع ملا جس کی توضیح کرنا آج بہت دشوار ہے۔ میری مراد خوابیدہ شہروں میں رات کے وقت ناموجودگی کی ایک ظاہری اور رمزی حالت کے تجربے سے ہے: بے حد دبیز تاریکی، اور اس سے بھی زیادہ دبیز خاموشی۔ کوئی صدا نہیں، کوئی سرسراہٹ نہیں، سانس لینے کی آواز

Scanned with CamScanner

نہیں، کوئی جگنو نہیں، روشنی کی کوئی کرن نہیں، کتوں اور کوّوں کے بولنے کی آواز تک نہیں۔ اور سیاح اس سے کیا نتیجہ اخذ کرتا تھا؟ یہ کہ شہروں کو گہری نیند میں دیکھ کر مرے ہووں کی بستی کا، موت کے نگر (necropolis) کا خیال آتا ہے۔ اُن کا یہ تاثر اس بات سے اور بڑھ جاتا ہو گا کہ مسلمانوں کا ہر شہر بیک وقت زندوں اور مُردوں کا شہر ہوتا تھا، مکان اور قبریں شہر کے رقبے میں مساوی طور پر شریک ہوتی تھیں۔

جب میں لوگوں کو ان کے اپنے باغیچے میں یا پڑوس کے پرانے عوامی باغ میں، جو اب میونسپل قبرستان میں تبدیل ہو گیا ہے، یا Le Corbusier جیسے کھُلے میدانوں میں دفن ہوتے دیکھتا ہوں، تو پیئر لوتی (Pierre Loti) کی اُس تحریر کو یاد کیے بغیر نہیں رہ سکتا جس میں اس نے زندوں اور مردوں کو ساتھ ساتھ بستے دکھایا ہے۔ ایک قدیم رسم کو دوبارہ زندہ کر دیا گیا!

۱۹۷۴:

شہر میں داخلے کے دروازے کے پاس بسا ہوا شہرِ خموشاں ایک ایسا موتیف ہے جس سے آثارِ قدیمہ کے عالم بخوبی مانوس ہیں۔ لیکن اس علامتی شہر کی تراشیدہ پتھروں والی ماتمی تعمیر کو شہر سے کیا گیا ایک عہد بھی سمجھا جا سکتا ہے، ایک ایسا عہد جو قبر تک اور اُس سے بھی آگے تک وفاداری کا عہد ہے۔ جب قبرستان کے ایک جانب کا شہر دوسری جانب کے شہر کی طرح تباہ ہو جاتا ہے تو دونوں مل کر ایک مخفی پیغام کو معنی بخشتے ہیں۔ آدمی کو جاننا چاہیے کہ شہر میں داخل کس طرح ہوا جاتا ہے اور باہر کیوں کر آیا جاتا ہے۔ اور شہر سے رخصت ہوتے وقت اسے شکر گزاری میں، قبر کے تنگ دروازے پر ہی سہی، جھک جانا چاہیے۔

لوگوں نے -- جو در حقیقت بڑی عمر کے بچے ہی تھے -- مُردوں کے شہروں کو حقیقی شہروں کی صورت میں خلق کیا تھا اور ان کی جگہ اپنے شہر کے یادگاری دروازوں کے باہر تجویز کی تھی۔ اب -- اور ہماری آنکھوں کے عین سامنے -- ایک بڑے شہر کو ایک بڑے قبرستان میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ لوگوں کے لیے شہر سے رخصت ہونے کا ایک ہی راستا باقی رہ گیا ہے اور وہ قبر کے تنگ دروازے سے ہو کر غالباً پاتال کی سنگین خاموشی کی جانب نکلتا ہے۔

Scanned with CamScanner

۱۹۸۰:

کوئی شہر اُسی وقت تک شہر -- یا دوسرے لفظوں میں ہمارا شہر یا ہمارا وطن -- رہ سکتا ہے جب تک ہم اُسے اپنے تخیّل کے ساتھ اپنے سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "وطن" اور "شہر" کے تصورات کے معنی اس سے کہیں بڑھ کر ہیں کہ کوئی شخص کس جگہ کا رہنے والا ہے۔ ہر شہر، ہر دانا اور حسین شہر، ہر شہر جس نے اپنے وقار کو قائم رکھا ہے، میرا اپنا وطن ہو سکتا ہے اگر میرا تخیّل مجھے وہاں پہنچانے میں کامیاب ہو جائے۔ اس بات کا اُلٹ بھی پوری طرح درست ہے، یعنی میرا تخیّل ہی میرا وطن ہے۔

بہت پہلے میرے تخیّل نے مجھے سرائیوو، موستار اور دُوکوور کے شہروں میں پہنچا دیا تھا، اور ان شہروں میں خود کو اور اپنے وطن کو پا لیا تھا۔ اب میرے یہ تینوں شہر، میرے تینوں وطن، آگ کی لپیٹ میں آ گئے ہیں اور ان کے ساتھ ہی میرا تخیّل بھی شعلوں میں گھِر گیا ہے۔

۱۹۷۴:

اگر رابرٹ برٹن کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے میں Anatomy of Meloncholy لکھتا تو اس بات کو بیان کرتا کہ کس طرح برسوں، بلکہ کئی دہائیوں سے میں اُن شہروں کے جنھیں میں نے دیکھا ہے، یا جن شہروں سے بغیر دیکھے محبت کی ہے، ان کی تصویروں کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑنے کی پُرمشقت کوشش کرتا رہا ہوں۔ میں ان ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک واحد شہر کی مکمل تصویر بناتا، جو "میرا شہر" ہوتا۔ میرے اس وسیع شہریاتی منصوبے کو شروع کرنے کا سبب یہ تھا کہ جن دنوں میں نے اپنے اس خیال کو مادّی شکل دینے کے لیے خاکے بنانے شروع کیے، وہ ۱۹۵۰ کی دہائی کے آخری اور ۱۹۶۰ کی دہائی کے اوائلی سال تھے، وہ ایسا وقت تھا جب شہر ایک اچانک اور گہری تبدیلی کے عمل سے گزر رہے تھے۔ بےحد قیمتی مرئی نمونے میری آنکھوں کے سامنے سے ایک ایک کر کے غائب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اُن سب کو جمع اور محفوظ کر کے میں اپنے اس خوف سے نجات پانے کی امید کرتا تھا جو شہروں کو، تمام

Scanned with CamScanner

شہروں کو، اپنے تمام محبوب شہروں کو ٹوٹ پھوٹ کر عدم میں غائب
ہوتے دیکھ کر مجھ پر طاری ہو گیا تھا۔

میرا وہ ذاتی، اُداس اور مختلف شہروں کے اجزا سے مل کر بنایا گیا شہر اب کہاں ہے؟ اسے تباہ کر دیا گیا۔ کھیل ختم ہو چکا، اس کی غیر مادّی مسرّت اب موت کے کنارے پر ہے۔

۱۹۸۰:

معاملے کو ہلکے پن کی حد تک سادہ بناتے ہوئے ہم اسے کائنات اور جرثومے یا بڑی دنیا اور چھوٹی دنیا کے تصوّر تک لے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس تصوّر کی گہرائی میں اترنے پر ہمارا سامنا نہایت پیچیدہ، پُراسرار اور ابدی انسانی عقائد سے ہوتا ہے، مثلاً تمام چیزوں کے ایک مجموعی کلُ کے اجزا ہونے کا عقیدہ، یا اسباب اور نتائج کی جادوئی زنجیروں میں بندھے ہوئے فرد کا عقیدہ، جہاں شہر انسان اور کائنات کی ایک درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے شہر کو ایک سکڑی ہوئی کائنات کی شکل میں بھی دیکھا جا سکتا ہے اور ایک پھیلے ہوئے فرد کی صورت میں بھی۔ یہ ایک انوکھا اور دقیانوسی خیال ہے لیکن انجام کار خاصا معقول ٹھہرتا ہے۔ کم از کم مَیں اپنے دل کی گہرائیوں میں اس کی سچائی کی قسم کھا سکتا ہوں: میں اپنی ذات میں ایک چھوٹا سا شہر ہوں، اور شہر میری ہی ذات کی توسیع ہے۔ کیوں کہ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر میں کون ہوں اور یہ شہر کیا ہے؟

شہر اور مَیں، ہم دونوں کیا ہیں اور کہاں ہیں؟ ہمیں ایک جلتے ہوئے تنور میں ڈال دیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں: شہر مر چکا ہے اور راکھ میرے جسم کی ہے۔

۱۹۷۴:

میں اُس تشبیہ کو نہیں بھول سکتا جو ایک ایسے دور میں میرے ذہن پر مسلط رہی ہے جسے میں اپنی تیار کردہ ذاتی تاریخ کہنا پسند کرتا ہوں۔ وہ تشبیہ یہ ہے: ''شہر فرد میں اسی طرح اپنا عکس ڈالتا ہے جیسے پانی میں۔'' اس کا مفہوم میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا، اس کے باوجود جب بھی اس تشبیہ کو یاد کرتا ہوں تو مجھے یہ بھی یاد آ جاتا ہے کہ کس طرح ایک زمانے

Scanned with CamScanner

میں میں نے شہر کی جانب اپنا سفر شروع کیا تھا، ایک ایسا سفر جو اُس لمحے سے لے کر اب تک دن رات جاری رہا ہے۔ اس کے علاوہ یہ استعارہ یاد آتے ہی مجھے یہ خیال بھی آتا ہے کہ اگر شہر فی الواقع فرد میں اسی طرح اپنا عکس ڈالتا ہے جیسے پانی میں، تو ایک فرد، بنی نوع انسان کے ایک رکن کے طور پر، میری ذات کے ہر حصّے میں شہر کی جھلکیاں، یا اس کی تخیلی ابتدائی تصویر کی جھلکیاں، موجود ہوں گی۔ ایک چھوٹا سا، ذرّے جتنا، شہر میرے جسم کے ہر خلیے میں جگمگا رہا ہے، اور کسی ریت کے ذرّے کی طرح لامحدود ہے۔

آج اگر میں اسی بات کو لکھوں تو اس طرح لکھوں گا: "میرے جسم کے ہر خلیے میں ایک تباہ شدہ شہر کے آتش پارے جگمگا رہے ہیں۔" یا یوں: "شہر مر چکا ہے، راکھ میرے جسم کی ہے۔"

۱۹۸۰:

تعمیراتی اسالیب کے نظریے کے مطابق ہر ڈورک (Doric) ستون ایک جوان مردانہ جسم کے مثالی تناسب کا چربہ ہوتا ہے اور ہر آیونک (Ionic) ستون ایک جوان نسوانی بدن کے تناسب کی تصویر کشی کرتا ہے۔ یہ تصور کہ ہر عمارتی ستون میں کوئی مرد یا عورت پوشیدہ ہے، اس کلاسیکی فنِ تعمیر کے اس خیال کی تکرار معلوم ہوتا ہے کہ عمارت لکڑی اور پتھر کو انسانی بدن کی مماثلت میں لانے کا نام ہے۔ علاوہ ازیں، اس سے یہ نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے کہ اگر کہیں کوئی شخص کسی نہ کسی انداز میں ایک مکمل طور پر نیا شہر تعمیر کرنے کا ارادہ کرے، جس کی بنیاد کائنات اور انسان، اور انسان اور خلیے کے تناسب کے نظریے پر استوار ہو، تو اس شہر کی خارجی ہیئت ایک جانب کائنات کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہو گی اور دوسری جانب اس میں انسانی جسم کے خدوخال پوشیدہ ہوں گے۔ ذرا اس زندہ، حسین ترتیب کے حامل ذہن کا تصوّر کیجیے جو شہر کو اس طرح تصوّر میں لا سکے کہ ایک طرف وہ انسانی جسم کے نمونے پر تعمیر کی گئی ہو اور دوسری جانب کائنات کو اپنے ڈھنگ سے بیان کرتی ہو۔

کیا یہ محض اتفاق ہے؟ تباہ شدہ سرائیوو کا نقشہ، جس حد تک اُسے ٹی وی میں دکھائی جانے

Scanned with CamScanner

والی تصویر کی مدد سے جوڑا جا سکتا ہے، کسی اور شے سے اتنی مشابہت نہیں رکھتا جتنی کسی ایسے انسان سے جو کھولتے ہوئے پانی کے حوض میں جا گرا ہو اور بار بار اپنا سر پانی کی سطح کے اوپر اٹھائے رکھنے کی جدوجہد کر رہا ہو۔ ایک انسانی سرائیوو۔

***

شہر کی مدافعت

(اپنے سرائیوی دوستوں کے نام ایک خط)

اپنی عمر کے آٹھویں عشرے میں داخل ہوتے ہوئے، آگ اور خون کے بھیانک خوابوں کی اذیت میں مبتلا، کرب زدہ ضمیر کی بے آواز مگر متواتر ملامتوں سے بدحواس، مَیں خود کو، شاید زندگی میں آخری بار، اپنی جوانی کے محبوب خیالوں کی جانب لوٹتا ہوا پاتا ہوں، اُن خیالوں کی جانب جن کو میں یہاں بھی اُنھیں اصطلاحوں میں بیان کروں گا جن میں بار بار بیان کرتا رہا ہوں، یعنی شہر کے جوہر (essence) اور شہر کی تقدیر (fate) کی باہمی کشمکش کی اصطلاحوں میں۔ لیکن جن خیالوں کو میں نے کبھی ترتیب دیا تھا، جنھیں ایک حتمی شکل دے کر امن کے دنوں کے مطالعۂ شہریات کی آہنی نظری تجوریوں میں بند کر کے رکھ دیا تھا، ان کو دوبارہ ٹٹولتے ہوئے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے نئے معنی اختیار کر لیے ہیں: آج کی غیر متوقع ہولناکیوں سے رشتہ جوڑ کر یہ خیالات اُنھیں مباحث کو، جن سے انھیں شروع سے سروکار رہا ہے، ایک نئے انداز سے روشن کرنے لگے ہیں۔

شہر کے جوہر اور شہر کی تقدیر کے پُراسرار موضوع پر میں نے بہت سوچا ہے، اس موضوع پر بولنے، لکھنے، لیکچر دینے اور پرچار کرنے میں میری بہت عمر گزری ہے، اور میرا یہ یقین ہمیشہ برقرار رہا ہے کہ میں اور میرے طالبِ علم اس موضوع کے مباحث اور درجہ بندیوں کے اس طرف، یعنی زبانی بحث مباحثے کے محفوظ منطقے میں، کھڑے ہیں۔ مجھے کبھی گمان تک نہیں ہوا کہ مجھے وہ دن دیکھنے کے لیے زندہ رہنا پڑے گا جب میرے عزیز ترین شہروں کی تقدیر انھیں ایک ایسی سفاکی کی زد میں لے آئے گی جس کی توضیح تو کجا، جس کی پیش بینی تک سے ہمارے ہنگامہ خیز نظریے عاجز رہے ہیں۔

پوری دیانت داری سے کہوں تو میرے اکثر لیکچروں پر اُس حد درجہ دانستہ جذباتیت کا رنگ غالب رہا ہے جسے پروفیسر حضرات کلاس میں اپنے پسندیدہ موضوع یا نظریے پر بات کرتے

ہوئے اختیار کر لیتے ہیں۔ اور شہر، یا شہروں، کی تقدیر کے معاملے پر غور کرتے ہوئے، خواہ یہ شہر یوروپ کے ہوں یا باقی دنیا کے، میں اور میرے طالب علم بھیانک سے بھیانک مفروضے تک سے ذرا متاثر نہیں ہوتے تھے۔ ہمارے سامنے جدید مہانگروں کی تقدیر کا موضوع ہوتا تھا۔ دنیا اور دنیا کے شہروں کو پیش آنے والی آفتوں کی پیش گوئی فیشن کی چیز تھی، اور اس قسم کے تاریک ترین قیاسات بھی اپنے اندر ایک طرح کی جمالیاتی حظ اندوزی کا پہلو رکھتے تھے۔ شہر -- عالمی شہر -- قیامت پر مذہبی یقین اور "مغرب کے زوال" پر اعتقاد کی زد میں تھا۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے اس مثالی شہر کو Panurbean کا نام دیا جا سکتا ہے۔ "شہر کا انجام" اور "شہر کی تباہی" جیسے جذباتیت سے سرشار فقروں کی مدد سے شہروں کو لاحق مریضانہ داخلی پھیلاؤ، غیر منصفانہ دولت مندی، اور طاقت کے غیر شخصی ارتکاز کے نتائج سے خبردار کیا جاتا تھا۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں بھی اس دل چسپ مشغلے میں شامل تھا، میں نے شہر (urbs) اور لفظ (logos) کے اختلاط سے ایسی تمثیلیں وضع کیں جن میں جدید دور کے شہر کو (جس سے میری مراد درحقیقت پوری انسانی تہذیب تھی) درپیش اندوہ ناک انجام کی مماثلت زوال آمادہ شہرِ روم میں تلاش کی گئی تھی۔ میری تحریریں آنے والی ابتلا کی کائناتی اصطلاح میں تشریح کرتی تھیں، یعنی جب شہر کائنات کی طرح پھٹ پڑے گا۔ کیوں نہ ہو، آخر یہ استعارہ اس قدر ترغیب انگیز جو تھا۔

> "کائنات کا دھندلی، اور انسانی حسیات کے لیے ناقابلِ فہم، شبیہوں کے ایک انبار کی شکل میں تبدیل ہو جانے کا عمل، اور اپنی آنکھوں کے سامنے شہروں کے کائناتی دُھند میں منتشر ہو جانے کا منظر، ہم ان دونوں کے درمیان ایک خاص طرح کی مماثلت محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے---
> ہمارے کلاسیکی اجداد اگر شہر کے تصور اور دنیا کے درمیان نفیس مماثلتیں وضع کرنے پر قادر تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک سالم کُل کو دیکھ سکتے تھے۔ میرے لیے جس واحد ترتیب کو تصور میں لانا ممکن ہے -- یعنی کسی ایسی ترتیب کو جو مکمل طور پر تخیل کی پیداوار نہ ہو -- وہ فقط کائنات اور شہر کے انتشار کی مماثلت کا استعارہ ہے۔"
>
> *The City as a Symbol of Immortality and the Death of the City*، ۱۹۷۲۔

بلاشبہ، مَیں جن اصطلاحوں میں سوچ رہا تھا وہ نہایت خیالی، حددرجہ استعاراتی تھیں۔ دراصل

Scanned with CamScanner

میرے ذہن میں محض شہر کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کا خطرہ اور بڑے شہر کو پیش آنے والی دیگر متوقع مشکلات تھیں۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن میں اس استعاراتی مماثلت کو واقعی اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا؛ میں کبھی گمان تک نہیں کر سکتا تھا کہ مجھے شہر کا یہ کائناتی انتشار اپنے ٹی وی کے اسکرین پر دیکھنا پڑے گا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اپنے محبوب شہروں کو، جو میرے اتنے قریب ہیں کہ مجھے اپنے ہی وجود کا ناگزیر حصہ محسوس ہوتے ہیں، ان پیارے شہروں کو ایک دن سفاک، کم و بیش قدیم مذہبی قربانی کے سے قتل کی دہشت انگیز ٹیکنولوجی کا نشانہ بننا پڑے گا۔

لیکن "کائناتی انتشار" کے موضوع پر خود میرے غور و فکر اور دوسرے لوگوں کے خیالات میں کوئی ایسی چیز موجود ہے جو امن کے زمانے کے مطالعہ شہریات کی اس ہنگامہ خیز نظریہ سازی کی قدر کو مشتبہ بنا دیتی ہے؛ کوئی ایسی چیز ہے جو مجھے بُری طرح بے چین کر دیتی ہے اور میں اپنے لکھے ہوئے تمام مضامین کو نئے سرے سے جانچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ ممکن ہے سطح کے نیچے، روزِ حشر کے عقیدے پر مبنی میری اس تمام قیاس آرائی کی تہہ میں، مجھے ایسے ہولناک امکانات کا احساس رہا ہو جو اپنی نوعیت میں نہ کائناتی ہیں نہ ماحولیاتی، اور نہ عالمی مسیحی اعتقاد سے وابستہ، بلکہ ناقابلِ یقین طور پر میرے آس پاس سے پیدا ہوئے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ مجھے اندر کہیں اس قیامت کا احساس سا رہا ہو جو ہم پر پھٹ پڑنے والی تھی، لیکن میں نے اس احساس کو سمجھنے کی خواہش یا ہمت نہ کی ہو؟

"شہر بنانے والوں" اور "شہر مٹانے والوں" کے درمیان -- ہر زمانے، ہر قوم، ہر نسل، اور ہر فرد میں موجود شہر دوستی اور شہر دشمنی کے رجحانات کے درمیان -- ہونے والی کشمکش کے مفروضے سے اپنی جنونی وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے میں حقیقت سے کتنا قریب تھا! کتنا قریب، اور کتنا دور!

اگر ایسا نہیں تھا تو پھر میں، مثال کے طور پر، ان سخت جان اور انا پرست شہر دشمنوں کے وجود کا احساس کرنے سے کیوں کر قاصر رہا جو خود ہمارے درمیان موجود تھے؟ آخر کار اب، ان کے کیے ہوئے جرائم کے روبرو آ کر، مجھے اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ یہ جُرم پیشہ لوگ -- جنھوں نے اریحا، سدوم، عمورہ اور ٹرائے کو جلایا اور برباد کیا تھا، ان شہروں کو نسلی یا ایسی ہی کسی دوسری خالصیت کے نام پر ویران کیا تھا -- محض شہریات کے مطالعے کے درسی مفروضوں کی مخلوقات نہیں ہیں۔

کلاسیکی تحریروں میں ان سفاک لوگوں کے جرائم کے دہشت ناک بیانات ملتے ہیں، لیکن آج

Scanned with CamScanner

یہ مجرم -- یہ ظالم، حیوان لوگ جن کے اصلی اور معرفی نام جان بوجھ کر فراموش کر دیے جاتے ہیں -- وہی جرائم خود ہماری آنکھوں کے سامنے انجام دے رہے ہیں، اور اپنے پیچھے شہروں -- وُوکوور، موستار اور ابھی بالکل حال میں نصف سرائیوو -- کے جلے ہوئے ڈھانچے چھوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے بعد کن شہروں کی باری ہے؟ پرِشتینا، نووی پزار، اسکوپیے؟ سُوبوتیکا اور نووی ساد؟

آج میرے لیے مطالعۂ شہریات کے موضوع پر اپنی پہلے پہل کی تحریروں کی توضیح کرنا ایسا ہی ہے جیسے اپنے ڈراونے خوابوں کی تعبیر کرنا۔ اگر ان مضامین میں کوئی انتباہ موجود تھا تو میں نے اس پر کبھی توجہ نہیں دی۔ شاید یہ انتباہ میرے تحت الشعور کی پاتال میں کہیں موجود تھا اور حد درجہ خوفناک تھا۔ لیکن یہ وقت اپنی مبہم پیش قیاسیوں کو کھود کھود کر نکالنے کا نہیں ہے۔ اس وقت شہر مٹانے والے سفّاک حیوان اپنے کام میں، شہروں کو جلانے، تاراج کرنے، شہریوں کو قتل کرنے، کتب خانوں اور دستاویز خانوں کو تباہ کرنے، عبادت گاہیں اور عجائب گھر مسمار کرنے میں، بُری طرح مصروف ہیں۔

"کسی شہر کو قتل کرنا"، اس فقرے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب ہے شہر کی قوّت کو نچوڑ لینا، اس کی مابعد الطبیعیاتی ایروس (eros) کا، اس کی زندہ رہنے کی، اپنا آپ رہنے کی خواہش کا گلا گھونٹ دینا؛ شہر کی وہ تمام یادگاریں مٹا ڈالنا جن کی مدد سے وہ اپنی قیمتی یاد کو ہوا کے دوش پر زمان و مکاں میں قائم رکھ سکے، اس کے حال کے ساتھ ساتھ اس کے ماضی کو بھی نیست و نابود کر دینا---

جس شے کو میں "شہر کا پاکیزہ جوہر" کہتا ہوں، وہ انسانی فطرت کے بہترین گوشے سے، اس کے اخلاقی حُسن سے پھُوٹتی ہے۔ کوئی بیس برس ہوئے، میں نے لکھا تھا: "ہم سب آج بھی اپنے لافانی شہروں کو اپنے وجود میں تھامے ہوئے ہیں۔" لیکن اس میں کیا شک ہے کہ کسی شہر کو اپنے وجود میں تھامے رکھنے کے لیے یہ بھی توضروری ہے کہ ہمارا کوئی شہر ہو اور ہمیں اس کی قدر بھی معلوم ہو۔ ایسے شہر واقعی موجود ہیں جنھیں اُس وقت تک مٹایا نہیں جا سکتا جب تک اُن کا ایک بھی شہری زندہ ہے اور اُنھیں اپنے وجود میں تھامے ہوئے ہے۔

یہی وجہ ہے، میرے پیارے، نڈھال، زخمی، بےپناہ تحسین اور بےپناہ ظلم کا سامنا کرنے والے دوستو، میں تمھیں اپنے دل میں جگہ دیتا ہوں اور اُس حد تک تمھارے ساتھ ہوں جتنا اپنی اسی برس کی ضعیفی میں میرے بس میں ہے، میں تمھاری اذیت ناک، بےخواب راتوں میں تمھارے ساتھ ہوں۔ شہر کی مدافعت آنے والے وقت کے لیے واحد اخلاقی قضیہ ہے۔ یہ ایک ایسی روشنی

Scanned with CamScanner

ہے جسے دیکھنے سے، جس کی معنویت سمجھنے سے، انتہائی بشر دوست انسان بھی، فطرت اور انسان کے درمیان کشمکش اور نباتی اور حیوانی حیات کے مسائل کی بابت اپنی گہری فہم کے باوجود، اب تک قاصر ہیں۔

**

Scanned with CamScanner

رباعیاتِ سرمد

نثری ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن

بک مارک، پوسٹ بکس ۵۲۳، لاہور

Scanned with CamScanner

۱۱

جواد قراحسن : سرائیوو : ایک دروں بیں شہر کا مرقع

جواد قراحسن (Dzevad Karahasan) ۱۹۵۳ میں سرائیوو میں پیدا ہوے۔ وہ مصنف، تھیئٹر کے تنقید نگار، سرائیوو یونیورسٹی میں ڈرامے کے استاد اور ادب اور تنقید کے ایک جریدے *Izraz* کے مدیر ہیں۔ ڈرامے کے موضوعات پر مضامین اور کتابوں کے علاوہ ان کی تین نثری کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے ایک کا عنوان *The Eastern Divan* ہے۔

جواد قراحسن

ترجمہ: اجمل کمال

سرائیوو: ایک دروں بیں شہر کا مرقع

سرائیوو بوسنیا ہرزگووینا کا سب سے بڑا شہر اور دارالحکومت ہے، مگر اس کے باوجود وہ ہر لحاظ سے کسی بھی دوسرے چھوٹے بوسنیائی شہر جیسا ہے۔ ۱۴۴۰ میں عیسیٰ بے اسحاقووچ نے سرائیوو کی بنیاد رکھی تھی۔ اسے ایک دریا (دریاے ملیاکا) کی وادی میں بسایا گیا جو چاروں طرف سے اونچی پہاڑیوں سے گھری ہوئی ہے جو شہر اور باقی کی دنیا کے درمیان ایک پردہ کھینچ کر انھیں ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں۔ اس طرح یہ شہر ہر خارجی چیز کو نظروں سے اوجھل کر کے اپنا رخ اپنی ہی طرف موڑے ہوے ہے۔ شہر کا تجارتی مرکز چارشیا کا علاقہ ہے (یہ نام یوروپی زبانوں میں جدید شہر کے قلب کا ہم معنی ہے)۔ چارشیا کو وادی کی ہموار نچلی تہہ میں بسایا گیا تھا، جب کہ سکونتی محلے، جنھیں "محل" کہا جاتا ہے، اس ہموار سطح کے چاروں طرف پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر بسے ہوے ہیں۔ اس طرح شہر کے قلب کے گرد ایک نہیں بلکہ دو حلقے کھنچے ہوے ہیں جو اسے دنیا سے جدا رکھتے ہیں۔ ایک حلقہ پہاڑیوں کا ہے جو پورے شہر کو گھیرے میں لیے ہوے ہیں اور دوسرا، اندرونی، حلقہ ان محلوں کا جو، علاقے کے جغرافیائی خدوخال اور شہری منصوبہ بندی کے باعث اور مرکزِ شہر سے اپنے تعلق کی وجہ سے، ایک حفاظتی حصار کی حیثیت رکھتے ہیں تاکہ قلبِ شہر کو ہر خارجی شے سے محفوظ رکھا جا سکے۔ چارشیا کی مثال بالکل کسی گھونگھے یا شیل فش کی سی ہے جو اپنے بیرونی خول کی حفاظت میں ہو۔

یا تو خارج کی دنیا کی نسبت سے یہ دوہرا حفاظتی حصار شہر کو خود بخود دروں بیں ہونے، اپنی جانب رخ کر لینے پر مائل کرتا ہے، یا کسی اور وجہ سے اپنے قائم ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد سے سرائیوو نے دنیا کے استعارے کی صورت اختیار کر لی تھی، ایک ایسے مقام کی صورت جہاں دنیا کے مختلف چہرے ایک ہی نقطے پر جمع ہو گئے تھے، بالکل اسی طرح جیسے روشنی کی بکھری ہوئی کرنیں منشور (prism) میں یکجا ہو جاتی ہیں۔ بنیاد پڑنے کے کم و بیش سو سال کے اندر اندر یہ شہر توحید

Scanned with CamScanner

پر بھی تمام مذہبوں کے ماننے والوں کو، ان مذہبوں کے زیر اثر پیدا ہونے والی تہذیبوں کو، متعدد زبانوں کو اور ان زبانوں سے تعلق رکھنے والے رہن سہن کے مختلف طریقوں کو اپنے دامن میں آباد کر چکا تھا۔ یہ ایک چھوٹے سے علاقے میں بسی ہوئی پوری دنیا، دنیا کے مرکز کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ جیسے باطنیوں (Esoterics) کی تدریس کا ہر مرکز اپنے اندر پوری دنیا کو سموئے ہوئے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرائیوو ناقابلِ تردید طور پر ایک دروں بیں شہر ہے، ٹھیک انھیں معنوں میں جو علمِ باطنیہ میں اس لفظ سے منسوب کیے جاتے ہیں: ہر چیز جس کا ہونا دنیا میں ممکن ہے، آپ کو سرائیوو میں اپنی پیناگوری، جوہری صورت میں نظر آ سکتی ہے، اس لیے کہ سرائیوو دنیا کا مرکز ہے۔ یہ بالکل جامِ جہاں نما کی مثال ہے جس میں دنیا کے تمام واقعات، تمام ممکنہ انسانی تجربات، دنیا کی ساری اشیا اور سارے مظاہر دیکھے جا سکتے ہیں، عین اسی طرح جیسے بورخیس کا "الالف" (El Aleph) اپنے اندر ان تمام واقعات کو سموئے ہوئے ہے جو کبھی پیش آئے تھے، آئندہ کبھی پیش آئیں گے، یا ممکنہ طور پر پیش آ سکتے ہیں۔ ہندوستان کے مغرب کی طرف کی دنیا میں جو کچھ موجود ہے وہ سرائیوو میں بھی موجود ہے۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ، تمام دوسرے بوسنیائی شہروں کی طرح، سرائیوو خارجی دنیا سے اس قدر الگ تھلگ، اپنے آپ میں اتنا منہمک اور اس درجہ دروں بیں ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دنیا کے لیے ایک ایسے شہر کا وجود ضروری ہے جو، جامِ جہاں نما کی طرح، دنیا کے جوہر کو اپنے اندر تھامے ہوئے ہو۔ یا ممکن ہے اس کا سبب کچھ اور ہی ہو۔ میں نہیں کہہ سکتا، مگر اتنا مجھے ضرور معلوم ہے کہ یہ شہر اسی طرح کا ہے۔

جوں ہی یہ شہر قائم ہوا، تین توحیدی مذہبوں -- اسلام، کیتھولک مسیحیت اور اور تھوڈوکس مسیحیت -- کے نمائندے یہاں چلے آئے۔ یہ لوگ ترکی، عربی اور فارسی، بوسنیائی، کروشیائی اور سربیائی، جرمن اور اطالوی زبانیں بولتے تھے۔ اسے قائم ہوئے پچاس برس گزرے تھے کہ پارسا فرماں رواؤں فرڈیننڈ اور ازابیلا نے اسپین کی سرزمین سے یہودیوں کو نکال بھگایا۔ ان میں سے کچھ یہودیوں نے سرائیوو میں پناہ لی، اور یوں چوتھا توحیدی مذہب ان کے ساتھ چلا آیا اور اس مذہب سے وابستہ تہذیب بھی جو ان کی سو سالہ خانہ بدوشی کا ثمر تھی۔ وہ اپنے ساتھ کئی اور زبانیں بھی لے کر آئے۔ اس طرح سرائیوو ایک نیا بابل اور ایک نیا یروشلم بن گیا، ایک ایسا شہر جہاں زبانیں گڈمڈ ہو گئیں اور جہاں انسان ایک ہی نظر میں تمام اہلِ کتاب کی عبادت گاہوں کو بیک وقت دیکھ سکتا تھا۔

زبانوں، عقیدوں، تہذیبوں اور لوگوں کے گروہوں کے اس آمیزے کے مقدر میں تھا کہ وہ اس چھوٹے سے رقبے میں ساتھ ساتھ بسیں اور مل جل کر کلچر کی ایک انوکھی شکل پروان چڑھائیں جو

Scanned with CamScanner

بوسنیا ہرزگووینا سے، اور اس سے بھی زیادہ سرائیوو شہر سے، مخصوص ہے۔ یہ کلچر مجموعی طور پر اس خطّے کے بہت سے علاقوں اور بہت سے شہروں میں پایا جاتا ہے جو کبھی کثیر قومی اور کثیر مذہبی سلطنت عثمانیہ میں شامل تھے جو خود گروہوں، زبانوں اور مذہبوں کے ایک آمیزے پر مشتمل تھی۔ لیکن اتنا یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس وسیع و عریض سلطنت میں کوئی اَور شہر ایسا نہیں تھا جہاں اتنی زیادہ زبانوں، مذہبوں اور تہذیبوں نے اتنے چھوٹے سے علاقے کو بیک وقت آباد کیا ہو۔ شاید یہی سبب تھا کہ بوسنیا کو سلطنت میں ایک منفرد مقام حاصل تھا۔ اسے ایک خودمختار "پاشالوق" قرار دیا گیا تھا۔ بوسنیا کے تہذیبی نظام کی مخصوص نوعیت (جس سے میری مراد وہی ہے جسے کلود لیوی اسٹروس نے طرزِ زندگی، یا روزمرہ زندگی کے عناصر اور اعمال کا پورا مجموعہ قرار دیا ہے) اس بات کا تقاضا کرتی تھی کہ اسے کسی نہ کسی درجے کا خاص سیاسی مقام حاصل ہو۔

بوسنیا کے تہذیبی نظام کو، جو اپنی خالص ترین شکل میں اور ممکنہ حد تک ہم آہنگی کے ساتھ سرائیوو شہر میں قائم تھا، پوری درستی کے ساتھ "ڈرامائی" کے لفظ سے بیان کیا جا سکتا ہے جو اپنے مفہوم میں "جدلیاتی" کے لفظ کی عین ضد ہے۔ اس تہذیبی نظام کے بنیادی اصول اُن اصولوں کے مماثل ہیں جن پر فنِ ڈراما کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔ ان میں اہم ترین اصول یہ ہے کہ کسی نظام کے مختلف عناصر کے درمیان بنیادی رشتہ تناؤ کا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ یہ عناصر ایک دوسرے کے مخالف رخ پر وجود رکھتے ہیں، جو اُن میں سے ہر ایک کی تعریف متعین کرتا ہے، اور عین اسی تخالف کے باعث ایک دوسرے سے منسلک رہتے ہیں۔ اس طرح منسلک ہو کر یہ عناصر ایک مجموعی نظام (کلُ) کے اعضا بن جاتے ہیں اور اس کے باوجود اپنی اصل نوعیت کو قائم رکھتے ہیں، یعنی اُن خصوصیات کو جو اُن میں اس نظام کا حصہ بننے سے پہلے موجود تھیں۔ ان خصوصیات کو محفوظ رکھتے ہوئے، ہر عنصر مجموعی نظام کا حصہ بننے کے عمل میں کچھ نئی خصوصیات بھی حاصل کر لیتا ہے۔ ہر عنصر خود اپنے اندر ایک پیچیدہ کلُ کی نوعیت اختیار کر لیتا ہے جس میں دو باہم متخالف پہلو موجود ہوتے ہیں۔

اس عمل کے نتیجے میں قائم ہونے والا تہذیبی نظام اپنے اندر جو جوہری خصوصیت رکھتا ہے اُسے کثیر مشربی (pluralism) کہا جا سکتا ہے۔ یہ خصوصیت اس نظام کو اُس وحدانی (monoistic) نظام سے بالکل متضاد بنا دیتی ہے جس کی تعریف "جدلیاتی" کے لفظ سے کی جا سکتی ہے اور جو آج بھی مغرب کے اُن تمام بڑے شہروں پر غالب ہے جہاں سرائیوو ہی کی طرح عقیدوں، مذہبوں اور گروہوں کے آمیزے موجود ہیں۔ اگر ایک ڈرامائی تہذیبی نظام کا بنیادی رشتہ تناؤ کا ہے جو دونوں عناصر کی انفرادیت کی تصدیق کرتا ہے، تو جدلیاتی تہذیبی نظام میں یہ رشتہ

Scanned with CamScanner

عناصر کے ایک دوسرے میں انضمام کے رجحان کا ہے، جس کے نتیجے میں کمتر برتر کا حصہ بن کر اور کمزور طاقتور کا حصہ بن کر غائب ہو جاتا ہے۔ ڈرامائی تہذیبی نظام کے ہر عنصر کے لیے دوسرے عنصر کا وجود لازمی ہے کیوں کہ اس کے بغیر اُسے خود اپنی انفرادیت حاصل نہیں ہو سکتی، کیوں کہ اس کی مخصوص نوعیت دوسرے عنصر کی مخصوص نوعیت سے رشتہ قائم ہونے پر ہی ظہور میں آ سکتی ہے۔ جدلیاتی بنیاد پر قائم کیے گئے نظام میں "دوسرا عنصر" (یا "غیر") محض ظاہری طور پر الگ حیثیت رکھتا ہے، در حقیقت وہ "پہلے عنصر" (یا "انا") ہی کا بدلا ہوا روپ ہوتا ہے۔ یعنی "غیر" خود میری ذات کے اندر موجود ہے، کیوں کہ جدلیاتی تہذیبی نظام (اور جدلیاتی طرزِ فکر) میں متضاد عناصر اپنی اصل میں ایک ہی ہوتے ہیں۔ سرائیوو اور مغربی شہروں میں پائے جانے والے معاصر بابلی آمیزے کے درمیان یہی جوہری فرق ہے، اور اسی فرق کو بیان کرنے کے لیے اس طویل وضاحت اور تہذیبی نظاموں کے اس قدرے تکنیکی بیان کی ضرورت محسوس ہوئی۔

ڈرامائی اصولوں پر قائم ہونے والے تہذیبی نظام کی سب سے زیادہ چونکا دینے والی خصوصیت عیاں اور نہاں کے درمیان، ظاہر اور باطن کے درمیان، باہمی تبصرے اور تخالف کا ایک زندہ دلانہ کھیل ہے، ایک ایسا کھیل جو شہر کی اندرونی تنظیم، شہر کے ہر جزُ کی نقشہ گری، ہر جز کے اندر کی زندگی، اور رہنے سہنے سے لے کر کھانے پینے تک شہر کے مجموعی شب و روز کے ہر عنصر کا تعین کرتا ہے۔ یہ کھیل، جسے زندگی کی ہر سطح پر جاری و ساری دیکھا جا سکتا ہے، ایک اور خصوصیت ہے جس کی بنا پر سرائیوو کو ایک دروں بیں شہر قرار دیا جا سکتا ہے۔

ایک دوسرے کو مکمل، منعکس اور منفرد کرتے ہوئے عیاں اور نہاں، خارجی اور داخلی عناصر کا یہ باہمی تفاعل (interaction) شہر کے نقشے میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ شہر کا قلب، محلّوں اور پہاڑیوں کے دورویہ حصار کے اندر واقع ہونے کے باعث، خارجی دنیا سے بالکل الگ تھلگ اور دروں بینی کی گویا تجسیم ہے۔ سکونتی محلّے شہر کے نقشے پر یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے منوّر قلب سے چاروں سمتوں میں شعاعیں نکل رہی ہوں، اس طرح کہ مرکز کے ایک جانب مسلمانوں کا محلّہ وراتنک واقع ہے، دوسری جانب کیتھولک مسیحیوں کا محلّہ لاتین لوک ہے، تیسری سمت میں آرتھوڈوکس مسیحیوں کا محلّہ تاشلیھان واقع ہے اور چوتھی سمت میں یہودیوں کا محلّہ بیے لاوے ہے۔ ان محلّوں کے درمیان بیسترک، بیَی تاش اور کوواچی جیسی کئی چھوٹی چھوٹی بستیاں ہیں اور ان میں سے ہر ایک، بڑے محلّوں کی طرح، کوئی نہ کوئی واحد عقیدہ، زبان یا رسم و رواج رکھنے والوں سے آباد ہے۔

شہر کا مرکز، جو ان محلّوں کے بیرونی محیط پر کھینچے گئے دائرے کے عین وسط میں پڑتا ہے،

چارشیا کہلاتا ہے۔ وہ ایک ایسا مقام ہے جو لوگوں کے رہنے کے لیے نہیں بلکہ کارگاہوں، دکانوں اور دوسری تجارتی سرگرمیوں کے لیے مخصوص ہے۔ دوہرے حصار کے درمیان واقع چارشیا تکنیکی اعتبار سے دروں بینی کے سوا کچھ نہیں ہے: نہ صرف اپنے گرد کھنچے ہوئے محلوں اور پہاڑیوں کے حلقوں کے باعث بلکہ جیومیٹری کے لحاظ سے بھی یہ دائرے کا مرکز ہے۔ یہ علاقہ معنوی اعتبار سے بھی مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسا کہ باطنیوں کا کہنا ہے، کسی شے کا مرکز ہمیشہ کھُلا ہوا ہوتا ہے تاکہ دنیا کی ہر ممکنہ شے کو اپنے اندر سمو سکے۔ اور چارشیا میں، دنیا سے جدا کرنے اور محفوظ رکھنے والے حصاروں کے اندر، ہر وہ شے موجود ہے جو اس کے گردوپیش کی دنیا میں موجود ہے۔ چارشیا ہی وہ مقام ہے جہاں سکونتی محلوں کے جدا جدا کلچر اپنا آفاقی پہلو ظاہر کرتے ہیں کیوں کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں ہر کلچر میں مضمر آفاقی قدروں کو اپنے اظہار کا موقع ملتا ہے۔ اور یہ اظہار تجارت کے ذریعے سے ہوتا ہے جو اس دنیا میں وجود کو باقی رکھنے کا معاشی وسیلہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ چارشیا ہی وہ مقام بھی ہے جہاں انسانی ہم آہنگی، باہمی ابلاغ کی انسانی ضرورت اور دوسروں کو قبول کرنے پر آمادگی کی قدریں نظر آتی ہیں، کیوں کہ چارشیا لوگوں، چاروں سمتوں میں آباد لوگوں، کے ملنے جلنے، بات چیت کرنے، تعاون کرنے اور شانہ بہ شانہ وقت گزارنے کی جگہ ہے۔ بیے لاوے کے یہودیوں، وراتنک کے مسلمانوں، لاتین لوک کے کروٹوں یا اطالویوں، تاشیلہان کے سربوں یا یونانیوں کی دکانیں پہلو بہ پہلو کھلی ہوئی ہیں۔ وہ سب ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، ساتھ کام کرتے ہیں، کاروبار میں مسابقت کرتے ہیں، کاروبار میں ہاتھ بٹاتے یا دھوکا دیتے ہیں، یا ان میں سے کوئی دو مل کر کاروبار میں تیسرے کا مقابلہ کرتے ہیں، اور تعاون یا تنازعے کے اس باہمی ربط کے ذریعے اپنی بنیادی انسانی خصوصیات اور اپنے اپنے کلچر کی آفاقیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ چارشیا لوگوں کے مابین وہ سارے امتیاز مٹا دیتا ہے جو ان کے مختلف کلچروں سے وابستہ ہونے کے باعث موجود ہیں، کیوں کہ وہ ان سب کو اُس نقطے پر لا کر مساوی حیثیت دے دیتا ہے جو تمام انسانوں میں مشترک ہے: کاروبار، اشیا کی ضرورت، محبت، رشک اور دوستی۔ چارشیا میں پہنچ کر وہ سب لوگ، اپنے مابین قائم تمام امتیازات کے باوجود، محض لوگ، محض سرائیوو کے باشندے، محض دکان دار اور ہنرمند، بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرائیوو شہر کا مرکز چارشیا بیک وقت دروں بینی بھی ہے اور کشادگی بھی۔

سرائیوو شہر کے باشندے چارشیا سے رخصت ہوتے ہی انسانی آفاقیت کے بجاے اپنے اپنے مخصوص کلچر کے نمائندے بن جاتے ہیں۔ یعنی ہر محلہ عددی اکثریت رکھنے والوں کے کلچر تک محدود زندگی بسر کرتا ہے۔ اس طرح، مثال کے طور پر، بیے لاوے بہت واضح طور پر ایک

یہودی محلہ ہے جہاں کے شب و روز یہودی کلچر کے مخصوص زیروبم کو بڑی یکسانی سے دُہراتے رہتے ہیں، بالکل اُسی طرح جیسے لاتین لوک میں روزمرہ زندگی کیتھولک کلچر کی مطابقت میں رواں دواں رہتی ہے، ورانتک میں اسلامی کلچر کی اور تاشلیہان میں اور تھوڈوکس کلچر کی مطابقت میں۔ لاتین لوک کا کوئی کیتھولک اُسی قدر مسیحی ہوسکتا ہے جتنا کوئی روم کا باشندہ، جیسے ورانتک میں رہنے والا کوئی مسلمان اُتنا ہی مسلمان ہوسکتا ہے جتنا مکّے کا رہنے والا۔ شاید اس سے بھی زیادہ، کیوں کہ سرائیوو میں رہنے والے ہر مذہبی گروہ کے پڑوس میں کوئی دوسرا مذہبی گروہ آباد ہے جس کے مقابل وہ اپنے مخصوص کلچر کے خدوخال کو پہچانتے ہیں اور اس کے واضح تر شعور سے آشنا ہو کر اپنی جداگانہ شناخت کو تقویت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ لاتین لوک اور بیسترک ایک دوسرے کے پہلو میں آباد ہیں، جس کا مطلب ہے کہ کیتھولک اور مسلمان علاقے، کیتھولک اور مسلمان کلچر ایک دوسرے کو مَس کرتے ہیں۔ اس قربت اور مسلسل ربط کے باعث دونوں مذہبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک دوسرے کے تعلق سے خود کو پہچانتے اور اپنی اپنی شناخت کا شعور حاصل کرتے ہیں۔ دوسرے کو دریافت کرنا خود کو دریافت کرنے کا سبب بنتا ہے، دوسرے کی شناخت سے اپنی شناخت حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح محلہ، جو خارج ہے، سرحد ہے، محیط ہے، تکنیکی طور پر کشادگی کا حامل ہے، (کیوں کہ اس کا ایک رخ پہاڑیوں کی جانب، فطرت کی جانب، خارجی دنیا کی جانب، کھلا ہوا ہے)، لیکن معنوی اعتبار سے اسے بند بھی قرار دیا جا سکتا ہے کیوں کہ اس کی حدود کے اندر لوگ ایک مخصوص کلچر میں زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنے روزمرہ کے اعمال سے اس کلچر کی محدود خصوصیات کی تسکین اور تشریح کرتے ہیں۔

اس طرح کشادگی اور بستگی، خارج اور داخل کے باہمی تخالف اور باہمی انعکاس کا وہ کھیل شروع ہوتا ہے جو سرائیوو شہر کی سب سے زیادہ چونکانے والی خصوصیت ہے، اور اسی کھیل سے باہر اور اندر کی دنیا کا وہ تناؤ جنم لیتا ہے جو شاید سرائیوو کے وجود کے عین قلب میں واقع ہے۔ چارشیا تکنیکی طور پر بند لیکن معنوی طور پر کھلا ہوا ہے، جب کہ ہر سکونتی محلہ تکنیکی اعتبار سے کھلا ہوا لیکن معنوی اعتبار سے بند ہے۔ چارشیا آفاقیت کا مظہر ہے جب کہ محلہ ٹھوس اور محدود تخصیص کی نمائندگی کرتا ہے۔ چارشیا چاروں طرف سے حصار میں محفوظ ہے اس لیے دنیا کی ہر ممکنہ شے کو اپنے اندر سمو سکتا ہے، محلہ خارجی دنیا کی جانب کھلا ہوا ہے اس لیے معنوی اعتبار سے اس کا اپنی خصوصیات پر زور دینا اس کی بقا کے لیے لازمی ہے، کیوں کہ خارج کی دنیا میں وہی شے باقی رہ سکتی ہے جس کی سرحدیں متعین اور ہیئت مخصوص ہو۔ اس طرح چارشیا اور محلہ، کائنات اور فرد، کشادگی اور بستگی، خارج اور داخل، ظاہر اور باطن، ایک دوسرے میں یوں منعکس ہوتے ہیں جیسے آئینے میں

Scanned with CamScanner

کسی شے کا عکس پڑ رہا ہو۔

خارج اور داخل کے درمیان باہمی تخالف اور باہمی انعکاس کا یہ پیچیدہ کھیل، جس پر ایک طرح سے سرائیوو شہر کی بنیاد قائم ہے، اور جس کو چارشیا اور محلّے کے رشتے میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے، شہر کے کردار کے ہر پہلو میں پہچانا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر شہر کے باشندوں کے مکانات کی ساخت میں۔

سرائیوو کے لوگ پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر بنے ہوئے مکانوں میں رہتے ہیں اور ان ڈھلانوں پر شہر کے محلّے پھیلے ہوئے ہیں۔ ان مکانوں کا ایک رخ -- چہرہ، سامنے کا رخ، پیش رخ -- گلی کی جانب، یعنی شہر کی، چارشیا کی جانب ہوتا ہے، جب کہ دوسرا رخ پہاڑی کی طرف، فطرت کی، بیرونی دنیا کی طرف، ہوتا ہے۔ سامنے کے رخ پر مکان ایک چوبی جنگلے سے گھرا ہوتا ہے، یعنی ایک مادّی دیوار سے جو مکان کے پیش رخ کو اوجھل کر دیتی ہے، جب کہ پیچھے کے رخ پر، پہاڑیوں کی، فطرت کی طرف کھلے ہوئے رخ پر، مکان کے گرد کوئی جنگلا نہیں ہوتا، یا صرف علامتی باڑھ ہوتی ہے۔ مکان کے سامنے اور پیچھے، دونوں جانب، صحن یا باغیچہ ہوتا ہے۔ مکان کے پیش رخ اور لکڑی کے جنگلے کے درمیان سامنے کا صحن ہوتا ہے، چاروں طرف سے بند، اور پچھلے رخ پر، مکان کی پچھلی دیوار اور پہاڑی کے درمیان، پچھلا صحن جو صرف ایک طرف سے (یعنی مکان کی دیوار کی طرف سے) بند اور تین اطراف سے کھلا ہوتا ہے۔ یہ بات کہنا تقریباً ممکن ہے کہ مکان کی حدیں پہاڑی میں فطری طور پر ضم ہو جاتی ہیں۔

مکان کا نقشہ اور باغیچوں کی ساخت اور استعمالی تقسیم واضح طور پر مخالف انعکاس کے اُسی کھیل کی تکرار ہے جس کا مشاہدہ ہم شہر کے نقشے اور چارشیا اور محلّوں کے باہمی رشتے میں کر چکے ہیں۔ جیسا کہ میں نے کہا، مکان کا چہرہ تکنیکی اعتبار سے بند ہے، کیوں کہ سامنے سے (گلی، شہر اور چارشیا کے رخ پر) وہ بلند چوبی دیوار کے اندر محفوظ ہے جس میں انسان کی آنکھ نہیں جھانک سکتی۔ لیکن استعمالی اور معنوی اعتبار سے اس کا چہرہ کھلا ہوا ہے (اس کا رخ شہر کے مرکز کی طرف ہے) کیوں کہ یہی وہ رخ ہے جس پر مکان میں داخل ہونے کا دروازہ واقع ہے، یہیں سے مہمان گھر میں داخل ہوتے ہیں، اسی رخ سے مکان دنیا کے ساتھ رابطہ قائم کرتا ہے۔ پچھلا رخ تکنیکی طور پر کھلا ہوا ہے کیوں کہ اس کے اور بیرونی دنیا کے درمیان کوئی دیوار نہیں، بلکہ مکان کسی رکاوٹ کے بغیر باغیچے سے، پہاڑی سے، کھلے دیہی علاقے سے پیوست ہو جاتا ہے۔ لیکن استعمالی اور معنوی طور پر یہ مکان کا بند رخ ہے، کیوں کہ پچھلے دروازے سے لوگ صرف باہر نکلتے ہیں۔ مہمان اس رخ سے داخل نہیں ہوتے، خوراک اس دروازے سے گھر میں نہیں لائی جاتی، لوگ کام پر جانے کے لیے یہ دروازہ

Scanned with CamScanner

استعمال نہیں کرتے۔ پچھلا دروازہ صرف گھر والے پہاڑی کی طرف کے باغیچے میں جانے کے لیے استعمال کرتے ہیں، اس لیے اُس طرف سے مکان اور مخالف رخ پر آباد شہر کے درمیان کسی قسم کے رابطے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

صحن اور باغیچے کا بھی بالکل یہی معاملہ ہے۔ سامنے والا صحن تکنیکی طور پر بالکل بند ہے، خول کی طرح، کیوں کہ اس کے چاروں طرف چوبی جنگلے کی یا مکان کی دیواریں ہیں۔ گھر والوں کی اجازت کے بغیر اس میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا اور نہ اندر جھانک سکتا ہے۔ لیکن مکان کے جس قدر رقبے کو گھر والے دنیا کی نظروں سے اوجھل رہنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اُس میں یہ صحن، معنوی اور استعمالی طور پر، سب سے زیادہ کھلا ہوا ہے: مہمان، فوجی یا عدالتی سمن، خوراک اور پولیس، سب یہیں سے داخل ہوتے ہیں۔ مکان میں داخلے کی خواہش رکھنے والے ہر شخص کو یہ صحن پار کرنا پڑتا ہے۔ اور جب موسم خوش گوار ہو تو مہمان اسی صحن میں بیٹھتے ہیں۔ مکان کا پچھلا صحن یا باغیچہ، جس کا رخ پہاڑی اور دیہات کی جانب ہے، تکنیکی اعتبار سے مکمل طور پر کھلا ہوا ہے (اس کے صرف ایک پہلو پر مکان کی دیوار ہے)، لیکن استعمالی اور معنوی لحاظ سے بالکل بند ہے کیوں کہ اسے صرف گھر والے استعمال کر سکتے ہیں اور وہاں پہنچنے کا واحد راستا مکان کے اندر سے ہے۔ یہ پچھلا صحن مہمانوں کے لیے، باہر سے آنے والے ہر شخص کے لیے بند اور گھر کے مکینوں کے لیے مخصوص ہے اور وہ جب چاہیں اسے اپنی تفریح یا خوشی کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

مکان کے اندر بھی جگہ کی تقسیم بالکل اسی طرح ہے، کیوں کہ اندرونی دیواریں اسے کھلے اور بند حصوں میں، مردانے اور زنانے میں، بانٹ دیتی ہیں۔ اجنبی صرف مردانے میں آتے ہیں اور مہمانوں کو وہیں بٹھایا جاتا ہے۔ مردانے میں بات چیت پیسے اور سیاست، فوج اور فرصت، کے موضوعات پر مشتمل ہوتی ہے، جب کہ زنانے میں صرف گھر کے مرد داخل ہوتے ہیں اور وہ بھی بلائے جانے پر۔ زنانے میں گفتگو خوراک اور پیار محبت کے بارے میں ہوتی ہے۔ یہ محبت کی اور بچوں کی پیدائش کی جگہ ہے۔

اس طرح دیکھا جائے تو سرائیوو کے باشندوں کی رہنے کی جگہوں کا نقشہ بھی بالکل شہر کے نقشے کی طرح ہے، یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے، موزائیک کے کرسٹل کا چھوٹا سا جُز جس میں پورا موزائیک منعکس ہوتا ہے۔ سرائیوو کے رہنے والوں کی شخصی، انتہائی ذاتی زندگی جس انفرادی رقبے میں بسر ہوتی ہے اس میں ہم اُنھیں رشتوں کو، کشادگی اور بستگی، خارج اور داخل کے باہمی انعکاس کے اُسی کھیل کو، پہچان سکتے ہیں جس کا مشاہدہ ہم نے شہر کے نقشے میں، شہر اور بیرونی دنیا، چارشیا اور محلّے کے رشتے میں کیا تھا۔ لیکن اسی کھیل کو شہر والوں کے غذائی کلچر میں، ان کے کھانے پینے

Scanned with CamScanner

کے معمولات میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

بوسنیا کے دوسرے شہروں کی طرح سرائیوو کا غذائی کلچر بھی مطبخ کے دو مثالی نمونوں سے مل کر بنتا ہے جن میں سے ایک حد درجہ کھلا ہوا ہے جب کہ دوسرا مکمل طور پر بند ہے۔ کھلے مطبخ کا نمونہ مختلف اقسام کے گوشت پر مشتمل ہے جسے کھلی آگ پر پکایا اور باہر (ریستورانوں میں، پک نک پر، مکان کے سامنے والے صحن میں) بیٹھ کر کھایا جاتا ہے۔ اس قسم کا کھانا اکثر اوقات ذرا سے مسالے کے ساتھ آگ پر بھونا گیا گوشت ہوتا ہے جسے کھلی قاب یا کاغذ یا لکڑی کی تختی پر رکھ کر پیش کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ کھانا پکانے کے فن کا قدرے پیچیدہ نمونہ بھی ہو سکتا ہے، مگر اس کے باوجود اس کی کھلے پن کی خصوصیت برقرار رہتی ہے۔ سرائیوو کا شاید سب سے خاص پکوان کباب ہیں جنھیں شہر کے لوگ عموماً کھلے آسمان تلے بیٹھ کر کھاتے ہیں اور جو شاید اس بات کا مثالی نمونہ ہے کہ غذائی کلچر کس حد تک کشادہ اور در و دیواروں سے کس قدر آزاد ہو سکتا ہے۔

سرائیوو کے کباب قیمے اور مسالے کے اجزا سے مل کر بنتے ہیں۔ قیمے کو مسالے کے ساتھ مشین میں پیس کر سیخوں پر چڑھایا اور کھلی آگ پر بھونا جاتا ہے اور کھلی، پھیلی ہوئی قاب میں رکھ کر پیش کیا جاتا ہے۔ ان کبابوں کی شکل مردانہ عضو سے مشابہ ہوتی ہے۔ کیا کشادہ، بیرونِ در اور خالص مردانہ کلچر کی اس سے بڑھ کر بلیغ مثال مل سکتی ہے؟

غذائی کلچر کا بند نمونہ اس کی عین ضد ہے۔ اس قسم کی غذائیں اندر، مکان کے اُس حصے میں تیار کی جاتی ہیں جہاں مہمانوں کا داخلہ ممنوع ہے اور جو گھر والوں کا اندرونی حلقہ ہے۔ یہ غذائیں سبزیوں، گوشت اور مسالوں کے اجزا کو ملا کر بنائی اور بند دیگچیوں میں، بند تنوروں میں رکھ کر پکائی جاتی ہیں۔ اس غذائی کلچر کے شاید سب سے منفرد نمونے وہ کھانے ہیں جنھیں "دولما" کا مشترک نام دیا جاتا ہے۔ دولما کسی سبزی (مثلاً بینگن) کے ایک دانے اور اُس میں بھری گئی چیزوں، عموماً قیمے، چاول، مسالے اور باریک کتری ہوئی سبزیوں، پر مشتمل ہوتا ہے۔ دولما بنانے کے لیے کسی بڑی مرچ کو لمبا چیر کر اس کے اندر کے اجزا نکال دیے جاتے ہیں، آلو کو کھوکھلا کر لیا جاتا ہے، پیاز کی اندرونی پرتیں ہٹا دی جاتی ہیں، گوبھی کو اندر سے خالی کر لیا جاتا ہے یا انگور یا پالک کے پتے کو موڑ کر گول کر لیا جاتا ہے، اور قیمہ اور دوسری چیزیں اندر بھر دی جاتی ہیں۔ اگر دولما کو کسی سخت سبزی کے دانے کو کھوکھلا کر کے بنایا جائے تو اس کی بیرونی شکل اُسی سبزی کی سی ہوتی ہے اور اگر کسی پتے میں لپیٹ کر تیار کیا جائے تو بالکل گیند کی طرح گول۔ یہ دولما کے ایک دانے کی شکل ہے، مگر جب بہت سے دانے تیار کیے جائیں تو انھیں دو دستوں والی دھاتی قاب میں ترتیب سے سجایا جاتا ہے اور یہ قاب یا تو ڈھکنے والی ہوتی ہے یا اس پر موم جامے کا کاغذ سختی سے لپیٹ دیا جاتا

Scanned with CamScanner

ہے۔ پھر اسے کم اونچائی والے بند تنور میں رکھ دھیمی آنچ پر اس طرح پکایا جاتا ہے کہ سبزی کا رس باہر نکل نکل کر دولما کی بیرونی سطح کو بھورا اور خستہ کرتا رہے۔ دولما کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شامل ہر جزو کا الگ الگ مزہ برقرار رہتا ہے اور سب سے مل کر ایک بالکل نیا ذائقہ پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ نیا ذائقہ اس قدر پیچیدہ اور انوکھا ہوتا ہے کہ کسی اور کھانے سے اس کی مثال نہیں دی جا سکتی۔ دولما، جیسا کہ اسے پکانے کے خارجی بیان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، ڈرامائی طریقے سے تیار کی جانے والی غذا ہے اور بوسنیا کے کلچر کی ڈرامائی ترتیب سے خاص مشابہت رکھتی ہے۔ بقائے باہم دولما کی بہت اہم صفت ہے، اس لیے کہ اگر اسے تیار کرتے ہوئے کوئی ایک بھی جز اپنے انفرادی ذائقے سے محروم ہو جائے تو اسے کامیاب قرار نہیں دیا جا سکتا۔

کیا بوسنیا کے غذائی کلچر کے ان دونوں نمونوں پر مزید کسی تبصرے کی ضرورت ہے؟ کیا اس بات کی وضاحت درکار ہے کہ ان دونوں نمونوں کے باہمی رشتے میں اُسی کھیل کی جھلک دکھائی دیتی ہے جسے ہم نے چارشیا اور محلے، مکان کے اگلے اور پچھلے رخ، مکان کے مردانہ اور زنانہ حصّوں کے باہمی رشتے میں کارفرما دیکھا تھا؟ کیا اس بات کی تکرار ضروری ہے کہ یہ غذائی کلچر اپنے تمام عناصر میں پورے شہر کو اسی طرح منعکس کرتا ہے جس طرح موزائیک کے ایک ٹکڑے میں پورے موزائیک کا عکس دکھائی دیتا ہے؟

تو پھر کیا اس بات کو صاف لفظوں میں بیان کرنا ضروری ہے کہ سرائیوو کا یہ بے حد نفیس اور پیچیدہ کل، جو اپنے اندر پورے بوسنیا ہرزگووینا کا عکس رکھتا ہے، ناگزیر طور پر انتہائی نازک ہے؟ کیا اس بات کی صریح نشان دہی لازمی ہے کہ یہ شہر رزمیہ کلچر کے قیدیوں کو ٹھیک اُسی طرح اپنی طرف راغب کرتا ہے جیسے کسی بچے کے کانچ کے گولے میں رکھا ہوا پھول کسی وحشی کو اپنی طرف بلاتا اور کھینچتا ہے؟ لیکن ان دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے جسے واضح کرنا ضروری ہے: وحشی کانچ کے گولے میں رکھے پھول کو مسحور ہو کر تکتا رہ جاتا ہے، کانچ کو توڑ کر پھول کو اکھاڑنا نہیں چاہتا کیوں کہ وحشی فطری طور پر سادہ انسان ہے اور اسے احساس ہے کہ ایسا کرنے سے وہ جادو ختم ہو جائے گا جو اس کھلونے کا حسن ہے۔ دوسری طرف، رزمیہ کلچر کا قیدی (اس کلچر میں موسیقی ایک تار کے ساز سے پیدا کی جاتی ہے اور اسے اپنا اسیر بنا لیتی ہے) سرائیوو اور اس کے مرکز کے گرد کھنچے حلقوں کو سحرزدہ ہو کر تکتا ہے اور اس کی تہ تک پہنچنے سے اُسی وحشی کی طرح قاصر رہ جاتا ہے۔ مگر اُس وحشی کے برعکس رزمیہ انسان سرائیوو کو توڑپھوڑ دیتا ہے، کیوں کہ رزمیہ کلچر پر پروان چڑھنے کی وجہ سے وہ اپنی سادگی اور حسن کے سحر میں آنے کی صلاحیت کھو چکا ہے۔

ان حروف کا راقم ایک ٹھنڈے مزاج کا شخص ہے اور جذباتیت سے کوئی خاص علاقہ نہیں

Scanned with CamScanner

رکھتا۔ اس عبارت میں لفظوں کو لُغوی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، اور اس قسم کی دوسری تحریروں کی طرح اس کے ذریعے بھی دراصل یہی بتانا مقصود ہے کہ ہر لغوی سچائی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ لیکن سب سے بڑی تکلیف "جبری ہجرت" کے الفاظ کی لُغوی سچائی اور اس کی لغویت ہے۔ اس سے مراد صرف، یا سب سے زیادہ، آدمی کی اپنی جبری ہجرت نہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے قلم، غالیچے، میز اور کتابوں سے جدا ہونے پر مجبور ہو جائے۔ اس سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ایک شہر کے جلاوطن ہونے کا منظر ہے۔ اس لمحے سرائیوو کو اسی جلاوطنی کے عمل میں مبتلا کر دیا گیا ہے اور وہ اپنے مادّی وجود سے نکل کر مثالی منطقے میں، پہاڑیوں سے گھری ہوئی اپنی وادی سے رخصت ہو کر یاد، حافظے اور تجرید کے عالم میں، داخل ہو رہا ہے۔ اس طرح سرائیوو جو باطنیوں کی بنائی ہوئی تعریف کے مطابق، یعنی غیر لُغوی معنوں میں، ایک دروں بیں شہر تھا، اب احمقانہ حد تک لُغوی مفہوم میں اپنے اندر سمٹتا جا رہا ہے۔ اور یہ لغوی مفہوم بہت تکلیف دیتا ہے، یقین جانیے۔

**

Scanned with CamScanner

افضال احمد سید

کی نظموں کا مجموعہ

دو زبانوں میں سزائے موت

قیمت: ساٹھ روپے

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

۱۲

گوران استیفانووسکی : سرائیوو : ایک شہر کے قصّے (کھیل)

ڈراما نگار گوران استیفانووسکی (Goran Stefanovski) ۱۹۵۲ میں بِتولا، مقدونیا، میں پیدا ہوئے۔ وہ اِسکوپیے یونیورسٹی میں ڈراما کی تصانیف کے موضوع پر لیکچر دیتے ہیں۔ ان کے کھیلوں میں Proud Flesh، Tattooed Souls اور The Black Hole شامل ہیں۔ Sarajevo: Tales from a City جس کا ترجمہ یہاں "سرائیوو: ایک شہر کے قصے" کے عنوان سے پیش کیا جارہا ہے، استیفانووسکی نے انگریزی میں تحریر کیا اور اسے ۱۹۹۳ میں ریور سائیڈ اسٹوڈیو، لندن، کے بین الاقوامی تھیٹر فیسٹول میں پیش کیا گیا۔ اس کے علاوہ اسے یوروپ کے دوسرے بڑے بڑے شہروں میں اسٹیج کیا جاچکا ہے۔

گوران استیفانووسکی

ترجمہ: افضال احمد سید

سرائیوو: ایک شہر کے قصّے

یہ کھیل سرائیوو شہر کی روح کی سلامتی کے لیے روشن کی گئی ایک شمع کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کا انتساب اپنی ابتلا کا بہادری سے سامنا کرنے والے سرائیوو کے شہریوں اور حارث پاشوویچ نامی ایک شخص کے لیے ہے۔

Scanned with CamScanner

کردار

سارا: محقق اور عمارت ساز۔ نرس۔ حسن آغانیچا۔ لِن۔ پناہ گزیں۔ ربی۔

رُودی: پوسٹ مین۔ افسر ا۔ ڈپلومیٹ۔ اسٹیورڈ۔ سانتا کلاز۔ اِسکن ہیڈ۔ میجر تانکوشک۔

گورچین: فائرمین۔ پرنس کانسٹنٹ۔ حسن آغا۔ راکر۔ گاوریلو پرنسپ۔

حمدیا: مورخ۔ نگراں۔ شاعر۔ بے پِستروِچ۔ آئیوو آندرِچ۔ یوسِپ بروز ٹیٹو۔

فاتہ: گھریلو عورت۔ ڈبراونک اور وُوکوور کا کورس۔ قصّہ گو۔ بادلوں کا کورس۔ پاگل خانے کے نگراں کی بیوی۔ اور تھوڈوکس دینی پیشوا۔

سولیو: غیر ہنر مند مزدور۔ بلو سولجر۔ چھتوں کا کورس۔ باورچی۔ پاگل خانے کا نگراں۔ اسکائی اسکریپر اُزیر۔

عذرا: ڈاکٹر۔ ڈبراونک اور وُوکوور کا کورس۔ ساس۔ چیلو بجانے والی۔ کھڑکی کے پاس والی عورت۔ امام۔

مویو: ٹیکسی ڈرائیور۔ افسر ۲۔ معمولی اسمگلر۔ اسکائی اسکریپر مومو۔ ٹرام۔

مایا: اخبار نویس۔ ڈبراونک اور وُوکوور کا کورس۔ مسافر پرندوں کا کورس۔ پانی کا کورس۔ بیوی۔ کیتھولک دینی پیشوا۔

Scanned with CamScanner

سین ۱
مستقبل

(سارا سرائیوو کا احاطہ کرنے والی پہاڑیوں پر نمودار ہوتی ہے)

سارا: میرا نام سارا ہے۔ میں ایک محقق ہوں۔
عمارت سازی میرا فن اور موسیقی میرا عشق ہے۔
میں شکست خوردہ ہوں اور پناہ گزیں۔ میں یوروپ کی
تاریکی سے آئی ہوں، اُس مقام سے
جس کے پاس کبھی متحد ہونے کا خواب تھا،
مگر اب وہ صرف تنہا، بدامن اور مختصر
ظالمانہ شہری ریاستوں کا ایک مجموعہ ہے۔
ہماری زندگیاں بے سکون ہیں، ہمارا مستقبل متزلزل،
ہمارے شہر اُداس، پُرتشدد اور غلیظ ہیں،
اوزون کا سوراخ بڑھتا جارہا ہے، زہریلے فضلات اور زیادہ،
اور تیزابی بارشیں متواتر ہورہی ہیں۔
میرے پاس، کسی بچے کی طرح، ایک اُلوہی منصوبے کا تصوّر
اور ایک خواب تھا۔ میں ایک غیر مرئی شہر تعمیر کرنا چاہتی تھی۔
ذہن کا شہر، ایک نیا شہر، انسانی تناسب کا شہر۔

***

Scanned with CamScanner

سین ۲
سارا رُودی پوسٹ مین سے ملتی ہے
جو بعد میں کچھ اَور ہی ثابت ہوتا ہے

(رُودی آتا ہے)

رُودی: ہیلو!
سارا: ہیلو!
رُودی: کون ہو تم؟
سارا: کون ہو تم؟
رودی: میرا نام رودی ہے۔ میں پوسٹ مین ہوں۔
سارا: پوسٹ مین؟
رودی: کیا میں پوسٹ مین نظر نہیں آتا؟
سارا: کیا میں پہلے کبھی تم سے مل چکی ہوں؟
رودی: ہر شخص مجھ سے پہلے کبھی مل چکا ہے۔ میں سرائیوو کی
شاہراہوں اور گلیوں کے اتار چڑھاو سے گزرتا ہوں۔ میں شادی اور پیدائش پر
نیک تمناؤں کے ٹیلی گرام، موت کی تعزیتیں، پنشن پانے والوں کی پنشنیں،
اخبار اور رسالے، پارسل اور پلندے، ٹیلی فون کے بِل،
عاشقانہ خطوط اور تحائف بانٹتا ہوں۔
میں لفافوں سے ٹکٹ چُراتا ہوں۔ میرے پاس اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔
تم کہاں جا رہی ہو؟
سارا: میں شہر جا رہی ہوں۔
رودی: شہر؟ اب کوئی شہر نہیں ہے۔ تمام ملبہ ہی ملبہ ہے۔
تم کیا ڈھونڈنے جا رہی ہو؟
سارا: روح۔
رودی: کیا ہم سب روحیں نہیں ہیں؟ کس کی روح؟
سارا: شہر کی۔

رودی: اس سے کچھ کم نہیں؟

سارا: اس سے کچھ کم سے کام نہیں چلے گا۔

رودی: شاید وہ قتل ہو چکی ہے۔

میں درشت نہیں بننا چاہتا۔ کیا تم نے اخباروں میں نہیں پڑھا؟
کیا تم نے ٹی وی پر نہیں دیکھا؟ وہ غائب ہو چکی ہے۔ ختم ہو چکی ہے۔
سرائیوو اب نہیں رہ گیا
یہ کبھی خوب صورت تھا
اب اس کی عصمت لُٹ چکی ہے
پہلے یہاں خیابان تھے
اب صرف بند گلیاں ہیں
پہلے یہاں لوگ تھے
اب صرف پرچھائیاں ہیں
پہلے یہاں گھر تھے
اب صرف کھنڈر ہیں
پہلے یہاں باغ تھے
اب صرف قبرستان
پہلے اس کا ایک چہرہ تھا
اب صرف زخم کے نشان
پہلے اس کا ایک ذہن تھا
اب صرف دیوانگی ہے
پہلے یہاں ستارے تھے
اب صرف سیاہ سوراخ ہیں
پہلے اس کی ذات تھی
اب صرف مَیں ہوں

سارا: (اُسے پہچان جاتی ہے) تو یہ تم ہو پھر۔

مجھے تمھاری سڑاند کو پہچان لینا چاہیے تھا۔

رودی: مجھے کوئی بھی نہیں چاہتا۔ میں اتنا غیر مقبول کیوں ہوں؟

سارا: تم اُس شہر خور وحشی دیوتا کے پیغام بر ہو
جس نے اس خطۂ ارض کے لیے خطرہ بننا شروع کیا ہے،
جس کا قالب شیر کے جسم اور انسان کے سر سے بنا ہے،
جس کی نظریں سورج کی طرح عاری اور بے رحم ہیں،
جو اپنی پیدائش کے لیے یہاں سے بیت اللحم کی طرف
رینگتا ہوا گیا تھا۔
تمہارا آقا شہروں کو نگلنے، بستیوں کو ہڑپ کرنے والا وہ درندہ ہے
جو چرنوبل، اوسیتیا، چیچنیا اور نگورنو کاراباخ، آرمینیا اور آزربائیجان،
شمالی آئرلینڈ، باسک کنٹری، فلانڈرز اور ویلونیا کے تعاقب میں ہے۔

(رودی سارا پر حملہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، مگر سارا اپنی مدافعت کے لیے تیار ہے۔
وہ ارادہ ترک کردیتا ہے۔)

رودی: تم پریشان ہو۔ اسی طرح سرائیوو کی روح بھی
اس خرابے کے اوپر منڈلاتے ہوئے پریشان تھی۔
کہتے ہیں کہ وہ مقدس تھی اور کئی زبانوں میں گویا ہوتی تھی۔
کہتے ہیں وہ بیک وقت مذکر، مونث اور غیر جاندار تھی
اور کئی منگلوں اور بالوں میں روپوش ہونے کی عادی تھی۔
مگر اب وہ سب کہاں ہیں؟
اور وہ خود کہاں ہے؟
سب ختم ہو چکا ہے۔
سارا: میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔
رودی: میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ تم کیوں نہیں چلی جاتیں اور
سماترا میں یا شاید بورنیو کے ساحلوں پر نئی چراگاہ کھوج لیتیں؟
وقت بدل چکا ہے۔ اب نہ شہر ہیں نہ روحیں۔
کیا تم کسی معجزاتی نئی زندگی کی توقع رکھتی ہو؟
کیا تم سمجھتی ہو کہ راکھ سے ایک پرندہ اٹھے گا
اور عنقا کی طرح اڑنے لگے گا؟ ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔

Scanned with CamScanner

اب کسی آسمانی ہستی کی آمد نہیں ہو گی۔

(اچانک آسمان پر قوسِ قزح نکل آتی ہے۔)

اس کا یقین مت کرو۔ یہ فریب ہے، مکمل فریب۔ جھوٹ۔

(وہ قوسِ قزح کو دیکھتے ہیں۔)

***

سین ۳
ایک پناہ گاہ

(دو مکانوں کے درمیان ایک گلی۔ نیم تاریک۔ سڑک سے آٹھ آدمی گلی میں آتے ہیں۔ وہ سارا کی لاش اندر لاتے ہیں۔ باہر گولے گر رہے ہیں اور ہر طرف ہنگامہ ہے۔)

رودی: یہ مر چکی ہے۔
گورچین: یہ خوب صورت ہے۔
عذرا: یہ مری نہیں ہے۔ بے ہوش ہے۔
فاتہ: خدا جانے اس کی ماں کہاں ہے۔
مایا: (اخبار پڑھتے ہوے) یہ دیکھو۔ یہ میں نے لکھا ہے۔
مویو: (سڑک کی طرف دیکھتے ہوے) اس کو چھوڑو۔ مجھے اور بھی کام ہیں۔
سولیو: (گانے لگتا ہے۔)
حمدیا: خاموش رہو۔ جیسا کچھ ہے وہی بہت خراب ہے۔
عذرا: وہ دیکھو، قوسِ قزح۔ کتنی خوب صورت!
رودی: ہمیں بس یہی چاہیے تھا۔
(گورچین سے) تمھیں اس کو سڑک پر ہی چھوڑ آنا تھا۔

Scanned with CamScanner

گورچین: تمھیں کیسا لگتا اگر میں تمھیں سڑک پر پڑا رہنے دیتا؟
مایا: (فوٹو کھینچتے ہوئے) یہ بڑا زبردست ہو گا۔
فاتہ: ضرور کسی قسم کی علامت ہو گا۔
مویو: (باہر دیکھتے ہوئے) اوہ، ہمیں تھوڑا سا دم لینے دو۔
مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔
سولیو: (گاتا ہے۔)
حمدیا: گانا بند کرو، پلیز! دیکھو کیا ہو رہا ہے!

***

سین ۴
عام لوگوں کا گیت

سب لوگ: ہم
سرائیوو کے عام لوگ
تاریکی اور
کم زوری اور
نا امیدی کی اِس گھڑی میں
عہد کرتے ہیں
زخموں پر مرہم رکھنے
اور راہ دکھانے کا،
اور ضمانت دیتے ہیں
رسموں کی ادائیگی کی حُرمت اور
شہر کو بدروحوں سے بچانے کی
ہم
نتیجہ خیز شکار اور ماہی گیری کے لیے مقامات کی
نشان دہی کریں گے

Scanned with CamScanner

جنگلی حیات کی افزائش کریں گے
موسم پر قابو پائیں گے
بچوں کی پیدائش کا عمل آسان بنائیں گے اور
مستقبل کے واقعات کو آشکار کریں گے۔

(وہ چلے جاتے ہیں۔ سارا اکیلی ہے۔)

***

سین ۵
سارا ہوش میں آتی ہے اور اپنے ارادوں کی وضاحت کرتی ہے

سارا: میں ایک شہر بنانا چاہتی ہوں
جو ہمیں راس آئے
جیسے گھونگھے کو اس کا خول راس آتا ہے
اندرونی تضادات سے پاک
ہمیں زیادہ برمایہ انسان، بہتر انسان،
انسان کے شایاں انسان بنانے کے لیے۔
یا تو ایسا ہو ورنہ
ہم اپنی روح،
اپنا دل،
اپنا دماغ ہار جائیں گے
--ہاں سچ ہے، یہ رقت انگیز معلوم ہوتا ہے--
کاش میں زمین کی دیوی ہوتی
تاکہ ایک دائرہ جوت سکتی
ایک ذخیرہ دریافت کرتی

Scanned with CamScanner

اور اُس کے مقام کو نشان زد کرتی
اور بنیادیں رکھتی
اور کہتی
یہ ایک نئی دیومالا ہے
ایک نیا شہر
قوسِ قزح کے میناروں والا
جہاں سورج
میرے لیے اور تمہارے لیے
اور ہمارے بچوں کے لیے
اور نئی دنیا کے لیے
ہمیشہ چمکتا رہتا ہے۔

***

سین ۶
سارا مویو ٹیکسی ڈرائیور سے ملتی ہے
جو اس کے علاوہ کچھ اَور بھی ثابت ہوتا ہے

(رات۔ سارا ایک ٹیکسی کی طرف بڑھتی ہے جو تباہ شدہ عمارتوں والی سڑک کے بیچ میں کھڑی ہے۔ مویو ٹیکسی پر جھکا ہوا ہے۔ اس کی پُشت سارا کی طرف ہے۔)

سارا: ہیلو! تم ٹیکسی ڈرائیور ہو؟

(وقفہ)

ہیلو!

مویو: بالکل، میں ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔
تم دیکھ سکتی ہو میں ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔

Scanned with CamScanner

سارا: کیا یہ کرائے کے لیے خالی ہے؟
مویو: بالکل، یہ کرائے کے لیے خالی ہے۔
تم دیکھ سکتی ہو یہ کرائے کے لیے خالی ہے۔
سارا: میں متاسف ہوں۔
مویو: تم متاسف نہیں، تم احمق ہو۔
سارا: کیا تم مجھے لے چلو گے؟
مویو: تم کہاں جا رہی ہو؟
سارا: میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔
مویو: پھر تم کہیں نہیں جا رہی ہو۔
سارا: کیا تم بغیر پیسوں کے نہیں چلتے؟

(مویو اپنی پُشت اس کی طرف پھیر لیتا ہے۔)

سارا: کیوں نہیں چلتے؟
مویو: کیوں چلوں؟
سارا: یگانگت؟
مویو: کیا؟
سارا: انسانی یگانگت؟
مویو: اچھا؟
سارا: ہاں۔
مویو: ٹھیک ہے، میں تمھیں لے چلتا ہوں۔
سارا: میں روح کو تلاش کرنے کی کوشش میں ہوں۔
مویو: کس کی روح؟
سارا: شہر کی۔
مویو: اچھا؟ خدا کامیاب کرے۔
سارا: چلاتے وقت کھڑکی کھلی رکھنا۔ ہم گانا گائیں گے۔
وہ ہمارا گیت سن لے گی۔
مویو: میری گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بہت سے لوگ سفر کر چکے ہیں

Scanned with CamScanner

عشق بازی کرنے والے، خودکشی کرنے والے،
ریلوے اسٹیشن کی طرف تیزی میں جانے والے،
ریلوے اسٹیشن سے تیزی میں آنے والے،
شراب کے نشے میں میری گردن پر قے کرنے والے،
رُسوا جگہوں پر جانے والے سیاست داں،
دردِزہ کے عذاب میں مبتلا عورتیں،
طلاق کا فیصلہ کر کے نکلنے والے میاں بیوی۔
اور اب تم ہو جو آدھی رات کو
سرائیوو کی روح کے لیے گانا گانا چاہتی ہو۔
سارا: مگر تم میرا انتظار کر رہے تھے۔
مویو: تمہارا انتظار کر رہا تھا؟ واقعی، میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔

(وہ عبا اور صوفیانہ کلاہ پہنتا ہے۔)

سارا: کیا تم ہمیشہ ٹیکسی چلاتے وقت یہی پہنتے ہو؟
مویو: تم نے مجھے پہچانا؟
سارا: خواجہ نصرالدین، صوفی مسخرہ۔
مویو: تم ایک لطیفہ سنو گی؟
اس شخص نے مجھ سے کہا، مجھے کچھ نصیحت فرمائیں۔
میں نے کہا، موت کو یاد رکھو۔
اس نے کہا، میں موت کی بابت علم رکھتا ہوں۔ مجھے کچھ نصیحت فرمائیں۔
میں نے کہا، اگر تم موت کی بابت علم رکھتے ہو تو
تمھیں کسی اور نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔

(وہ ایک سوٹ کیس نکالتا ہے، اسے کھولتا ہے اور عمدہ ترین ریشم کے گز کے گز نکالتا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ لامتناہی معلوم ہوتا ہے۔)

ایک دفعہ کا ذکر ہے، جیسا کہ حکایت میں ہے،

Scanned with CamScanner

میں نے سرائیوو کے تمام لوگوں کو جمع کیا
اور انھیں ایک اہم انکشاف کی نوید دی۔ وہ سننے کے مشتاق تھے۔
میں نے کہا، لوگو! میں ایک اہم بات بتانے جارہا ہوں۔
کیا تم سننے کے لیے تیار ہو؟
ہاں! وہ اپنی آواز کی آخری حد تک چلّائے۔
خوب! میں نے کہا، کیا تم جانتے ہو وہ کون سی بات ہے؟
نہیں! انھوں نے جواب دیا۔ خوب! میں نے کہا،
اگر تم نہیں جانتے کہ وہ کیا ہے تو پھر میں تمھیں نہیں بتا سکتا۔
چند دنوں کے بعد میں نے انھیں پھر اپنے گرد جمع کیا
اور میں نے پھر کہا کہ میں انھیں ایک اہم بات بتانے والا ہوں
کیا تم اسے سننا چاہتے ہو؟ میں نے پوچھا۔
ہاں! انھوں نے پُرزور آواز میں کہا۔
خوب! میں نے کہا، اگر تم جانتے ہو تو پھر تم جانتے ہی ہو،
اور مجھے اُس بات کے بتانے کی کیا ضرورت ہے جو تمھیں معلوم ہی ہے۔
اور میں روانہ ہو گیا۔
اگلی بار میں نے انھیں پھر جمع کیا اور کہا،
کیا تمھیں علم ہے کہ میں تمھیں کیا بتانا چاہتا ہوں؟
اور ان میں سے نصف نے کہا، ہاں! اور نصف نے کہا، نہیں!
خوب! میں نے کہا،
جن کو معلوم ہے وہ اُن لوگوں کو بتا دیں جو نہیں جانتے۔

(وقفہ۔)

تم ہنسیں نہیں؟ ٹھیک ہے، لطیفہ کچھ زیادہ مزیدار نہیں تھا۔

(وہ درویش کا رقص کرتا ہے۔ پھر اپنی عبا اتارتا ہے۔)

سارا: کیا تم پھر ٹیکسی ڈرائیور بن گئے؟

Scanned with CamScanner

مویو: نہیں میں خواجہ نصرالدین ہوں، ٹیکسی ڈرائیور کے بھیس میں۔

(مارلبرو کا ایک پیکٹ نکالتا ہے۔)

پیو۔ امریکا کا بنا ہوا، ڈیوٹی فری۔
اچھے دن میں میں ایک سو پی جاتا ہوں۔
سرائیوو میں خوش آمدید!
تم نے میری اُداسی دور کر دی۔ مجھے نہیں معلوم کیوں۔
سارا: جو تمھیں نہیں معلوم وہ تم نہیں جان سکتے،
جو جانتے ہوئے اُسے جانے بغیر نہیں رہ سکتے۔

***

سین ۷
مویو اور سولیو کا کیبرے

(سولیو ایک گوشے میں پلاسٹک کی بالٹیاں لیے کھڑا ہے۔ وہ گاتا ہے اور ہر تھوڑی دیر بعد پھونک مار کر اپنے ہاتھ گرم کرتا ہے۔ سارا آتی ہے۔)

سارا: تم یہاں کیا کر رہے ہو؟
سولیو: پانی کا انتظار کر رہا ہوں۔
سارا: کیا میں تمھارے ساتھ انتظار کر لوں؟
سولیو: تمھارے پاس سگریٹ ہے؟

(سارا اسے ایک سگریٹ دیتی ہے۔)

میرا نام سولیو ہے۔ میں ایک غیر ہنر مند مزدور ہوں۔
میں نے خاکروب کا، گورکن کا کام کیا ہے۔ چڑیا گھر میں پنجرے صاف کیے ہیں۔

Scanned with CamScanner

تمھارے خیال میں آج کل چڑیا گھر میں جانور کیا کھا رہے ہیں؟
میں نے باغوں کی صفائی کی ہے۔
یہ شہر کبھی صاف ستھرا تھا۔

(گاتا ہے۔)

سارا: تم کوئل کی طرح گاتے ہو۔
سولیو: شکریہ! مجھے تمھاری تعریف پسند آئی۔
میرے لیے اس کی بہت اہمیت ہے۔
سارا: تھوڑی دیر پہلے میں ایک مسخرے سے ملی تھی۔
سولیو: مویو؟
سارا: تم اُسے جانتے ہو؟
سولیو: کسے؟ مویو کو؟

(مویو داخل ہوتا ہے۔ وہ پانی کی دو بالٹیاں اٹھائے ہوئے ہے۔ وہ قطار میں لگ جاتا ہے۔)

مویو: ہیلو! ہم مویو اور سولیو ہیں۔
سولیو: ہم مشہور بوسنیائی مسخرے ہیں۔
مویو: ہمیں نہایت احمق سمجھا جاتا ہے۔
اور یہ رہا ایک لطیفہ اس بات کے ثبوت میں۔

(سولیو کی طرف مڑتا ہے۔)

تمھیں ایک کار خرید لینی چاہیے۔
سولیو: کیوں؟
مویو: تاکہ تم سیر کر سکو۔
سولیو: مثلاً کہاں کی؟

Scanned with CamScanner

موبو: مثلاً اگر تم یہاں سے الاوزا جانا چاہو
تو آدھے گھنٹے میں پہنچ سکتے ہو۔
اس وقت ساڑھے گیارہ بجے ہیں،
تم آدھی رات کو وہاں ہو گے۔

(وقفہ۔)

سولیو: میں آدھی رات کو الاوزا میں کیا کروں گا؟

(دونوں سارا کی طرف داد کے لیے دیکھتے ہیں۔)

موبو: اور اب بنفشہ کے پھول بیچنے والے کا لطیفہ جو۔۔۔
سولیو: نہیں نہیں نہیں۔ وہ نہیں۔
سرب، کروٹ اور مسلمان کا لطیفہ کیسا رہے گا؟
موبو: تمہارا مطلب ہے مسلمان، کروٹ اور سرب؟
سولیو: اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟
موبو: مسلمان پہلے مقام پر؟
سولیو: اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟
موبو: جنگ کا فرق پڑتا ہے۔

(وہ سارا کی طرف داد کے لیے دیکھتے ہیں۔)

سولیو: ٹھیک ہے، پھر کروٹ، سرب اور مسلمان کا لطیفہ
موبو: مسلمان تیسرے مقام پر، سرب کے بعد کیوں؟
سولیو: ٹھیک ہے، پھر صرف سرب اور کروٹ کا لطیفہ۔
موبو: صرف سرب اور سرب اور سرب کا لطیفہ کیوں نہیں؟
سولیو: تم صرف سرب کیوں نہیں کہتے ہو؟
موبو: کیوں نہیں؟

(وہ سارا کی طرف داد کے لیے دیکھتے ہیں۔)

سولیو: اس ملک پر لعنت ہو جس میں بوسنیا نہیں ہے۔
مویو: بوسنیا پر لعنت ہو جس کا کوئی ملک نہیں ہے۔
سولیو: میں مسلمان ہوں، مگر میری بیوی کروشیائی۔
یہ ٹھیک ہے کہ صرف آدھی کروشیائی،
کیوں کہ اُس کا باپ سرب تھا، اور اس کی ماں رومانیا کی۔
چلیے خانہ بدوش سہی۔ میں اصل میں یہی سمجھتا ہوں
مگر میں نے کسی سے اس کا اعتراف نہیں کیا۔
مگر میں ایک سیدھا سادہ مسلمان ہوں۔
میں ایک یہودی کے فلیٹ میں کرایہ دار ہوں۔
میں اُنھیں نہیں پسند کرتا، تم جانتے ہو۔ وہ بھی مجھے پسند نہیں کرتے۔
میرا باپ سرب تھا، مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے۔
اُس کی ماں اسکوپیے کی تھی، جو اَب مقدونیا ہے۔
مگر، تمھیں معلوم ہی ہے، اپنی اصل میں سب سرب ہیں،
جب وہ بلغاروی ہونے میں مصروف نہیں ہوتے۔
مویو: میں نے تمھیں ذبح کیا ہے
مگر صرف ہلکا سا،
بس اک ذرا سا، پورے طور پر نہیں،
گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔
مسٹر گاندھی، آپ مغربی تہذیب کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟
سولیو: میں سوچتا ہوں کہ یہ ایک بہت عمدہ خیال ہے۔

(وہ سارا کی طرف داد کے لیے دیکھتے ہیں۔)

یہ سرائیوو کی تلاش میں آئی ہے۔
مویو: مجھے معلوم ہے۔
سولیو: کیا ہم اسے سرائیوو دے دیں؟

Scanned with CamScanner

موبو: کیوں نہیں؟

(وہ جادوگروں کی ٹوپی نکالتے ہیں۔)

موبو اور سولیو:

یہ رہے
ایک ٹوپی سے نکلنے والے
دو سرائیوو
اور تین، اور چار
اور بڑھتے بڑھتے
ایک سو
دو ایک کم یا دو ایک زیادہ
مگر ہم پر اعتبار مت کرو
اصل میں یہ سچ نہیں ہے
دوسرا کوئی سرائیوو نہیں ہے
سرائیوو صرف ایک ہے
اور وہ ہم تمھیں نہیں دے سکتے!

***

سین ۸
سلامتی کے لیے ایک سرود،
اور بعد میں پہلی نظر کی محبت

(فاتہ گھر کے سامنے بیٹھی بچے کو اپنا دودھ پلا رہی ہے۔ سارا اندر آتی ہے۔)

سارا: مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میں سارا ہوں۔

Scanned with CamScanner

فاتہ: میں فاتہ ہوں۔ تم سڑکوں پر کیا کر رہی تھیں؟
باہر تو دیوانگی طاری ہے۔
سارا: مجھے پناہ چاہیے۔
فاتہ: تم میرے پاس رک سکتی ہو۔ میں ایک گھریلو عورت ہوں۔
میں اپنے بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔
سارا: میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں۔
فاتہ: آگ مدد کر سکتی ہے--- آگ---
تغیر کا عظیم وسیلہ، آلائشوں سے پاک کرنے والی،
قے کراتی ہوئی--- رال--- پسینے میں نہلاتی
بھاپ میں نہلاتی--- فصد کھولتی ہوئی---
گندی چیزوں کو جلا دو--- گندی چیزوں کو بھسم کر دو---
خوشبودار دھونی دو--- راکھ اور کالک ملو--- دھوپ میں رکھو
دھوؤ--- چشمے کا پانی--- پھولوں کی میٹھی خوشبو---
نایاب جڑی بوٹیاں--- چائے--- لوبان--- عطر--- خوشبودار تیل---
اگر بتی--- دودھ--- گھی--- سفید چیزیں---
زمین اپنی اصل صورت میں--- تبرکات--- کاہن--- جادو---
جادو منتر--- دیوتاؤں کے نام--- جادوئی تعویذ اور نگینے---
سونا--- چاندی--- کانسی--- زمرّد---
دھول اور سوکھی ریت--- حنا--- بلسان--- بلور---
کنواریاں--- بائیں نہیں دائیں سمت--- صبح--- دھوپ---
دن کی روشنی--- مکمل چیزیں، جیسے دائرے اور پہیے---
مکمل اعداد، جیسے نو اور چار--- چھاتی سے ماں کا دودھ---
آلائشوں سے پاک کرنے والی--- تغیر کا عظیم وسیلہ--- آگ۔

(سارا بیٹھ جاتی ہے اور اپنا سر فاتہ کی گود میں رکھتی ہے۔)

سارا: آپ مویو اور سولیو کو جانتی ہیں؟
فاتہ: کسے؟ مویو اور سولیو کو؟

Scanned with CamScanner

تمہاری جان کی قسم، میں مویو اور سولیو کو جانتی ہوں۔

(گورچین داخل ہوتا ہے۔ پہلی نظر میں محبت۔ فاتہ بھانپ جاتی ہے۔)

اب مجھے چلنا چاہیے۔ اتنا سارا کام پڑا ہے۔

(وہ باہر چلی جاتی ہے۔)

گورچین: شہر پر روزانہ ہزاروں گرینیڈ برس رہے ہیں۔
ہر طرف شعلے برس رہے ہیں۔ مشکل ہے کوئی اپنا کام ڈھنگ سے کر سکے۔

(وہ سارا کو ایک سیب دیتا ہے۔)

یہاں تھوڑی سی خوشی بھی اپنی روح کے ایک حصے کی قیمت پر ملتی ہے۔
یہ بوسنیا ہے، زہر آلود سیب۔
ہم عدم تسلسل کی مخلوق ہیں۔ ایسے افراد جو ایک حیرت انگیز
سمجھ میں نہ آنے والے ایڈونچر کے اختتام پر مر جاتے ہیں۔
ہم سے اپنی ناپائیدار فردیت برداشت نہیں ہوتی۔
اسی لیے ہم عشق کرتے ہیں۔
مگر ایک ہر جا موجود، مطلق العنان موت کا احساس،
جو ازمنۂ وسطیٰ کے طاعون کی طرح، نیک و بد سب پر
بغیر اطلاع یا جواز کے نازل ہو رہی ہے،
بیسویں صدی کے ہمارے خاص تجربے کا خاص مرکز ہے۔

(وہ سارا کو چومتا ہے۔)

میرے پاس ایفل ٹاور کا ایک ماڈل ہے
جو میں نے ماچس کی تیلیوں سے بنایا ہے۔

Scanned with CamScanner

تم کسی وقت آؤ اور اسے دیکھو۔
سارا: کیا یہ تم ہو؟
گورچین: کون؟
سارا: جسے میں تلاش کر رہی ہوں۔

(گورچین باہر چلا جاتا ہے۔)

***

سین ۹
سارا عجیب واقعات سے دل شکستہ نہیں ہے
وہ اپنا خواب بیان کیے جاتی ہے

سارا: میں یہاں آئی ہوں، سرائیوو شہر کے گرد پہاڑیوں پر،
وہی پہاڑیاں جہاں سے ایک بار یہ تاراج ہوا تھا۔
یہاں پر نئے درخت ہیں،
اور درختوں میں نئے پرندے، اور نیا سکوت،
مگر یہ شہر اس کے بعد سے
نقشے پر اور زمین پر مختلف حصوں میں بٹ گیا ہے
اور دیواروں سے تقسیم کر دیا گیا ہے۔
یہی وہ جگہ ہے جہاں سے یہ سب کچھ شروع ہوا۔
یہیں سے،
دوسرے مقامات کو یکے بعد دیگرے ہڑپ کرنے سے پہلے،
پچھلی صدی، سن ایک ہزار نو سو بانوے میں،
شہر خور وحشی دیوتا داخل ہوا تھا۔
اور یہاں میں آئی ہوں، اُس مقام کو دیکھنے
جو کبھی یوروپ کا فخر و انبساط تھا۔

Scanned with CamScanner

میں اس کی روح اور چہرے کو پانے کی جستجو میں ہوں،
اور یہ دیکھنے کی کہ آیا وہ روح اور وہ چہرہ
میرے خوابوں کے، نظر نہ آنے والے، شہر پر سج سکتا ہے۔

***

سین ۱۰
سارا اخبار نویس مایا سے ملتی ہے
جو خوبصورتی سے بحث رکھتی ہے

(کٹے ہوئے درختوں والا پارک۔ مایا سارا کی طرف آتی ہے۔)

مایا: میں موبو، فاتہ اور گورچین کو جانتی ہوں۔
میں مایا ہوں۔ تم کون ہو؟
سارا: سارا۔
مایا: میں اخبار نویس ہوں۔ میں
بازار میں سبزیوں کے کیا نرخ ہیں،
سنیماؤں میں کیا چل رہا ہے،
جھوٹے اشتہارات، کون کیا بیچ رہا ہے اور
کون کیا خرید رہا ہے،
اس طرح کی باتیں لکھا کرتی تھی۔
اب میں زندگی اور موت کے بارے میں لکھتی ہوں۔
میرا اخبار ابھی تک ہر روز نکلتا ہے،
اور میں فوٹوگراف لیتی ہوں، مگر صرف خوبصورتی کی تصویریں
میں اتنی بڑی دنیا میں اپنے ہم پیشہ لوگوں کو زیادہ تر
خوں ریزی کے واقعات میں دلچسپی لیتے دیکھتی ہوں۔
مگر مَیں نہیں!

میں خوبصورتی تلاش کرتی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں
تمہیں اس شہر میں خوبصورتی کہاں ملے گی؟
ٹھیک ہے، درختوں کے ٹھنٹھ دیکھو۔
یہ درخت سردیوں میں کاٹ ڈالے گئے ہیں،
مگر ان کے ٹھنٹھ دیکھو۔ یہ پرانی کہانیوں کے بھتنوں،
پریوں، مسخروں، بالوں والی جادوگرنیوں
میں تبدیل ہو گئے ہیں۔
اور یہ رہے وہ فوٹو گراف جو میں نے کھینچے ہیں۔
سارا: مجھے تم سے مل کر خوشی ہوئی۔

(مایا اپنا کیمرا ایک دیوار پر رکھ دیتی ہے۔ وہ سارا کے برابر آکھڑی ہوتی ہے اور کیمرے کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہے۔ کیمرا کلک کرتا ہے۔ ایک آٹومیٹک تصویر کھنچ جاتی ہے۔)

مایا: مجھے بھی!

***

سین ۱۱
اسٹراٹیجک اسٹڈیز سنٹر میں حیرت انگیز واقعات پیش آتے ہیں

(رودی: افسر ۱۔ مویو: افسر ۲)

رودی (افسر ۱): شاباش افسر ۲۔ اب ہمیں علم ہے
کہ کیا ہو رہا ہے، اور ہم اَور زیادہ موثر ثابت ہو سکیں گے۔
مویو (افسر ۲): یا کم۔
رودی (افسر ۱): بالکل ٹھیک، یا کم موثر۔ یہ نقطۂ نظر کی بات ہے۔

Scanned with CamScanner

موبو (افسر ۲): یا دونوں، میرا خیال ہے۔
رودی (افسر ۱): یا دونوں، اس کا خیال ہے!
مجھے تمھاری حسِ مزاح پسند آئی۔
موبو (افسر ۲): اگر موسم معمول کے مطابق رہا تو اس سردی میں
صرف ۰۰۰،۱۳،۷ افراد مریں گے۔
رودی (افسر ۱): یہ سرکاری اندازہ ہے؟
موبو (افسر ۲): یہ سرکاری اندازہ ہے۔
رودی (افسر ۱): (کسی کو ٹیلی فون کرتے ہوئے) یہ سرکاری اندازہ ہے۔
سولیو (بلو سولجر): (اپنے رے بانز پہنے داخل ہوتا ہے۔)
بلو سولجر، جناب!
افسر ۱ اور افسر ۲: بولو۔
سولیو (بلو سولجر): وہ ہمارے سخت چاکلیٹ اور
بغیر چکنائی کے کریکرز نہیں کھانا چاہتے۔
انھوں نے ڈبوں کا گوشت بلیوں کو پھینک دیا۔
افسر ۱ اور افسر ۲: اُن کو جہنم میں ڈالو!
سولیو (بلو سولجر): بہتر جناب! اور جونز بھی جناب۔
رودی (افسر ۱): اُسے کیا ہوا؟
سولیو (بلو سولجر): وہ اپنی امی کے پاس گھر جانا چاہتا ہے۔
وہ کہتا ہے وہ خوف زدہ ہے۔ بالوں میں کریم
اور آنکھوں پر رے بانز اس کے خوف کا علاج نہیں۔
رودی (افسر ۱): اُس کو جہنم میں ڈالو۔
سولیو (بلو سولجر): بہتر جناب! اور جسموں کو کیا کیا جائے جناب؟
موبو (افسر ۲): کون سے جسم؟
سولیو (بلو سولجر): مُردہ، جناب!
رودی (افسر ۱): ٹھیک ہے، ان کی شایانِ شان تدفین کی جائے۔
سولیو (بلو سولجر): بہتر جناب!
افسر ۱ اور افسر ۲: اچھا سولجر!

Scanned with CamScanner

(بلو سولجر باہر چلا جاتا ہے۔ سارا داخل ہوتی ہے۔ رودی UN افسر/سفارت کار میں تبدیل ہو جاتا ہے۔)

سارا: تم مویو، سولیو، فاتمہ، مایا اور گورچین کو جانتے ہو؟
تمھیں معلوم ہے کہ ان کے ساتھ کیا ہوا؟
رودی (سفارت کار): میں کسی کو نہیں جانتا۔
میں کچھ نہیں جانتا۔
سارا: کچھ کرنا بہت ضروری ہے۔
رودی (سفارت کار): بے شک، کچھ کرنا بہت ضروری ہے۔
یہ انتہائی اہم ہے۔ ہم کر رہے ہیں۔ ایک میٹنگ جاری ہے۔
کل، اگلے ہفتے۔ یہ ایجنڈے پر ہے۔
اسے انتہائی اولیت دی جا رہی ہے۔
ایک فیکس دو۔ سرخ ٹیلی فون پر ہم سے رابطہ کرو۔
تم ٹیلی فون مت کرنا۔ ہم تمھیں ٹیلی فون کریں گے۔
نیویارک، جنیوا، لندن اور بون۔ یو این چینل اور اخبارات۔
عالمی برادری کیا کہے گی۔ اور انتخابات کے دنوں میں ووٹر۔
ہم اس پر بات کریں گے۔ آمنے سامنے، استقبالیہ کے دوران،
چائے کے وقفے میں، لنچ پر۔ ہم جانتے ہیں
لوگ مر رہے ہیں۔ ہم یہاں اسی لیے موجود ہیں۔
مجھے جہاز پکڑنا ہے۔

(رودی سفارت کار باہر جاتا ہے۔)

***

Scanned with CamScanner

سین ۱۲

پناہ گزینوں سے متعلق اقوامِ متحدہ کے ہائی کمیشن کی نرس پرنس کانسٹنٹ سے ملتی ہے

(گورچین اپنے گھٹنوں کے بل جھکا ہوا ہے۔ سارا اس کے بالمقابل۔)

سارا (نرس): تم کیا سوچ رہے ہو؟
گورچین (پرنس کانسٹنٹ): (خموشی۔)
سارا (نرس): تمھیں تھوڑا سا سُوپ چاہیے؟
گورچین (پرنس کانسٹنٹ): (خموشی۔)
سارا (نرس): کیا یہ سچ ہے کہ اُنھوں نے تمھیں اپنے اعضائے تناسل ایک دوسرے کے منھ میں ڈالنے پر مجبور کیا تھا؟
گورچین (پرنس کانسٹنٹ): (خموشی۔)
سارا (نرس): تم تھوڑا سا سُوپ کیوں نہیں لیتے؟
گورچین (پرنس کانسٹنٹ): (خموشی۔)
سارا (نرس): کیا یہ سچ ہے کہ وہاں تمھارے فضلات کو پھینکنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی؟
گورچین (پرنس کانسٹنٹ): (خموشی۔)
سارا (نرس): میرا مطلب ہے تمھارا پیشاب اور پاخانہ۔
گورچین (پرنس کانسٹنٹ): (خموشی۔)
سارا (نرس): یہ بہت اچھا سوپ ہے۔ گرم ہے۔ تمھیں اس سے آرام پہنچے گا۔

(وہ رونے لگتی ہے۔ اس سے لپٹ جاتی ہے۔)

***

Scanned with CamScanner

سین ۱۳
سارا اور عذرا ایک جادوئی قالین پر سوار ہو کر سرائیوو کے اوپر اڑتی ہیں

(اسپتال کا عقب۔ عذرا سفید سرجری گاؤن، جس پر خون کے چھینٹے ہیں، پہنے ہوئے ہے۔ وہ گھبراہٹ میں سگریٹ پھونک رہی ہے۔ اس کا سرجنوں والا ماسک اس کے منھ سے لٹک رہا ہے۔)

عذرا: ہم چوبیس گھنٹے آپریشن کر رہے ہیں۔ میں
تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد سگریٹ پینے کے لیے نکل آتی ہوں۔
پُرانے وقتوں میں میں نے ایمبولینس سروس کے لیے کام کیا تھا۔
شہر میں ہر طرف لوگوں کے گھروں میں جاتی تھی۔
وہ پانی میں محفوظ کی ہوئی چیریاں پیش کرتے،
جو میں قبول کر لیتی۔ اور برانڈی،
جس سے میں انکار کرتی۔
مجھے اپنے لوگوں کی مہمان نوازی پسند ہے۔ بچے میرے لیے
تصویریں بناتے جو میں گھر کی دیوار پر لٹکاتی۔
اور وہ مجھے ٹیلی فون کر کے بتاتے کہ
انھوں نے کسی کو ستایا نہیں۔ اور یہ کہ انھوں نے
چائے اور کھانسی کا مکسچر باقاعدگی سے پیا۔
مجھے سنبھالنا۔

(وہ سارا سے لپٹ جاتی ہے۔)

آؤ ہاتھ تھام لیں اور ہوا میں چھپ جائیں
ہمیں ہاتھ تھامنا چاہیے اور سسکی بھرنی چاہیے
ہمیں اپنے آنسو خشک کر لینے چاہییں

Scanned with CamScanner

کیوں کہ اب سردی آ گئی ہے
اور ہمیں اندھیرے میں ایک دوسرے سے لپٹ کر رہنا چاہیے
اور جنوب کے سمندروں
اور جھینگوں
اور کوکو کا خواب دیکھنا چاہیے۔

(عذرا سارا کو ہونٹوں پر چومتی ہے۔ وہ اپنا گاؤن اتار دیتی ہے۔ اس کے نیچے وہ کئی رنگوں والے خوب صورت کپڑے پہنے ہے۔)

عذرا: میں زہرا امیدووِچ کی بیٹی ہوں، پہلی مسلمان خاتون کی
جس نے اپنا حجاب ترک کیا۔ جنگ کے بعد۔
کون سی جنگ کے بعد؟ آخری جنگ۔ بڑی جنگ۔
تو پھر یہ چھوٹی جنگ ہے؟
یہ بات اُس کی بدنامی کے لیے کافی تھی۔
مجھے اپنی ماں پر فخر ہے۔ میں سچ مچ ایک جدید عورت ہوں۔
میں شانیل ۵، لارا ایشلے ۱، لولو کا شاریل
اور یوئس ساں لوراں کے درمیان فرق کو جانتی تھی۔
اب بھول چکی ہوں۔ ہم بھول جاتے ہیں۔
فراموشی ہمیں سمندر کی ہوا کی طرح چھوتی ہے۔
خزاں میں پتے بھول جاتے ہیں کہ ان کا تعلق درخت سے تھا
اور سردیوں کا پورا موسم یہ یاد کرنے میں گزار دیتے ہیں
کہ وہ کون ہیں۔
سارا: کیا تم مویو، سولیو، فاتہ، گورچین اور مایا کو جانتی ہو؟
عذرا: ہاں جانتی ہوں، بالکل جانتی ہوں۔

(وہ ایک جادوئی قالین نکالتی ہے۔)

چلو چلیں۔

Scanned with CamScanner

سارا: کہاں؟
عذرا: شہر کے اوپر۔

(وہ دونوں جادوئی قالین پر سوار ہو جاتی ہیں۔ وہ سرائیوو کے اوپر اڑتی ہیں۔)

عذرا: اے دریائے ملیاکا کے اوپر بنے ہوئے پلو!
اے ان پلوں پر سے گزرتے ہوئے ہمارے لوگو!
آؤ تمھیں اس قالین پر بٹھا کر اڑا لے جائیں
دمشق کی طرف
دمشق کی طرف!

(وہ اڑتی ہیں۔ سارا نیچے دیکھتی ہے۔)

سارا: دیکھو! انھوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ وہ ہاتھ لہرا رہے ہیں۔

(سارا اور عذرا جواب میں ہاتھ ہلاتی ہیں۔)

***

سین ۱۴
سودہ کا مینار

(نیون قوسِ قزح والا مینار۔ ایک طویل غلام گردش۔ کئی اشیا نمائش کے لیے رکھی ہیں۔ ایک اصل سے زیادہ بڑی نارنگی، ایک سورگیے ساز، ایک سگریٹ، مدڑ، تمباکو، ایک قہوے کا پیالہ اور قہوہ دان۔ درمیان میں ایک شدروان فوارہ، پانی کی پھوار مارتا ہوا۔ سارا اندر آتی ہے۔ طویل خاموشی۔)

حمدیا (نگراں): خوش آمدید!
سارا: کیا سودہ کا مینار یہی ہے؟

Scanned with CamScanner

حمدیا (نگراں): کیا تم نے دوسرے مینار دیکھے ہیں؟
سارا: کیا اور مینار بھی ہیں؟
حمدیا (نگراں): ضرور ہوں گے۔ کیا تمھیں آواز آ رہی ہے؟
سارا: میں معذرت چاہتی ہوں؟
حمدیا (نگراں): کیا تم اس کی آواز سن سکتی ہو؟
سارا: کس کی؟
حمدیا (نگراں): گھڑی کی۔
سارا: کون سی گھڑی؟
حمدیا (نگراں): سنو!

(وقفہ۔)

سارا: میں کچھ نہیں سن سکتی۔
حمدیا (نگراں): شش!
سارا: اس میں سننے کے لیے کیا ہے؟
حمدیا (نگراں): یہ قدرت ساعت گھڑی ہے۔
اسے سننے میں وقت لگتا ہے۔
اس کی ٹک ٹک سے معنی ختم ہو جاتے ہیں۔
سارا: معنی؟ کس چیز کے؟
حمدیا (نگراں): تم یہاں کیوں آئی ہو؟
تمھارے پاس محبت اور کسک ہے۔ اور ماضی کی یاد۔
اور ملال اور تڑپ۔ اور زندہ رہنے کی اشتہا ہے۔
سارا: آپ نے کیسے جانا؟
حمدیا (نگراں): یہ سودہ ہے۔
سارا: اس کا کیا مطلب ہوا؟
حمدیا (نگراں): یہ سنگین اور ہوادار اور تلخ اور شیریں ہے۔
تم محبت سے محبت کرتی ہو۔ محبت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے
اپنے آپ سے محبت کرتی ہو۔ اِس دنیا سے محبت کرتی ہو

Scanned with CamScanner

جس میں محبت کا وجود ہے۔ خوش اور ناخوش باتیں
جیسی ہیں ویسی ہی ہیں۔ شراب میں ڈوبی
اور یادوں اور خواہشوں میں دبی۔
تم ان سے نجات نہیں پا سکتیں۔
ایک بار جب یہ حاصل ہو جائیں، پھر تمھارے ساتھ ہی رہتی ہیں۔

سارا: یہ عجب جگہ ہے۔

حمدیا (نگراں): آج میں نانی کی حیثیت سے تمھاری زندگی کے
ایک بہت عام سے دن کی بات کروں گا۔ تم سننا چاہو گی؟

سارا: میں، نانی کی حیثیت سے؟

حمدیا (نگراں): بس، یہ اسی طرح ہے۔ تم ایک نانی ہو۔ یہ دیکھو،
تم اپنے گھر کے اولیہ یا سنگ فرش صحن میں بیٹھی ہو
جسے ایک اونچی دیوار سڑک کی طرف سے احاطہ کیے ہوئے ہے
صحن کے وسط میں شدروان فوارہ۔
اوپر سڑک کی کھلنے والی ایک مشبک، چوبی کھڑکی
تاکہ نوجوان لڑکیاں باہر کی دنیا پر محبت بھری نگاہیں ڈال سکیں
باغوں میں گلاب ہیں۔ سیب کا بڑا درخت، اس طرح بار آور کیا ہوا
کہ اس میں پندرہ مختلف طرح کے سیب آتے ہیں۔
کسی گھر کی چھت ساتھ والے گھر کی کھڑکی سے اونچی نہیں ہے
تاکہ ہر شخص کو شہر کا نظارہ میسّر رہے۔
گھر کے پیچھے باغ ہے۔ اخروٹ کے بلند درخت، اخروٹ
جو انگلیوں کو روغن آلود اور سیاہ کر دیتے ہیں۔
کارنس پر نارنگیاں رکھی ہیں۔ کھا کر دیکھو۔

(سارا کھانے کی کوشش کرتی ہے۔)

کیسا مزہ ہے؟

سارا: کڑوا۔

حمدیا (نگراں): تمھارا جواب اتنا صحیح نہیں ہے۔

Scanned with CamScanner

سارا: ایک طرح کا کھٹا میٹھا۔ منہ کو سکیڑ دیتا ہے۔
حمدیا (نگراں): یہ گلاب کی پتیوں سے بنایا ہوا گلقند ہے۔
تھوڑا سا چکھو۔ سالیپ یا یولیپ کا شربت پیو۔
بوزا۔ راحت لاخوم۔ ترکی مٹھائیوں سے شوق کرو۔ تم نانی بن کر
دن بھر میں چار پیکٹ سگریٹ پی جاتی ہو۔

(نگراں ایک سگریٹ بناتا ہے۔)

سارا: میرے گرد یہ کیا ہے؟
حمدیا (نگراں): بنفشہ کے پھول، تازہ رنگی ہوئی دیواریں،
لوگ اپنے قہوے کے پیالے اور قہوہ دان
اپنے گھروں سے لے آئے ہیں، اور درختوں کے نیچے
پڑوسیوں کو بلا رہے ہیں۔ ٹرانزسٹر میزوں پر رکھے ہیں۔
لوگ کھیلوں کے مقابلوں کی خبریں سن رہے ہیں اور
نفیس میز اور ہلکی راکیے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

(اسے ایک سگریٹ پیش کرتا ہے۔)

سارا: شکریہ۔

(وہ سگریٹ اپنے ہونٹوں سے لگاتی ہے۔ کش لیتی ہے۔)

حمدیا (نگراں): سکون سے!

(سارا اور آہستگی سے سگریٹ کا کش لیتی ہے۔)

سکون سے!

(سارا اور زیادہ آہستگی سے کش لیتی ہے۔)

Scanned with CamScanner

ہاں، اب ٹھیک ہے۔

(اس کو قہوہ دیتا ہے۔ دونوں لمبے گھونٹ لیتے ہیں۔)

اور اب ایک منظر جس میں کچھ زیادہ پیش نہیں آتا۔
اپنے عام ہم آہنگ انداز میں ایک خاندان ہے۔ تم ایک بچی ہو۔
تمھارے والد اخلاقیات کے پروفیسر ہیں اور وہ
اپنا اگلے دن کا لیکچر تیار کر رہے ہیں۔
وہ ہماری لوک موسیقی میں پائی جانے والی
سفاکیوں کی فہرست کے متعلق لیکچر دینے والے ہیں، اور
یہ کہ کس طرح ان کا اثر ہم میں سے ہر ایک پر پڑتا ہے۔
تمھارا چھوٹا بھائی، اسکندر، فرش پر لیٹے ڈو کھیل رہا ہے۔
اور تم، اس کی بڑی بہن، میرا، اپنا کیمسٹری کا ہوم ورک،
"عناصر کا نظام از مینڈ ٹیلے" لکھ رہی ہو۔
سارا: میرا نام میرا نہیں ہے۔
حمدیا (نگراں): تمھاری امی نے ابھی ابھی بلوط کے بیج بھونے ہیں
اور وہ انھیں پیش کر رہی ہیں۔ وہ تمھیں اور نانی جان کو
بیج کھانے کے لیے بلا رہی ہیں۔ باہر بارش ہو رہی ہے
اور کھڑکیوں پر بوچھار پڑ رہی ہے۔
زمین پر گرے ہوئے پتے پھسلن پیدا کر رہے ہیں۔
یہ خزاں کا موسم ہے۔
سارا: میں آپ کی بات پوری طرح سمجھ نہیں سکی۔
حمدیا (نگراں): اگر یہ ایک تاریخ داں کی خشک بصیرت ہے
تو میں معذرت چاہتا ہوں۔ کبھی میں تاریخ داں تھا۔
حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے۔
وہ اور ہی کچھ ہے۔
سارا: مگر حقیقت کیا ہے؟ کیا ہمیں اُس کو سہنا پڑے گا؟
حمدیا (نگراں): تم بہت دیر سے گھوڑے پر سوار

Scanned with CamScanner

ایک بیاباں میں سفر کر رہی ہو۔ شہر پہنچنے کے جنون میں۔
اور تم یہاں، اس مقام پر پہنچ گئی ہو جسے بیان کرنا دشوار ہے۔
اس شہر کے متعلق باتیں کرنا ایسا ہے
جیسا کہ عمارت سازی کے بارے میں رقص کرنا۔
اور یہاں مینار ہیں۔ اور رنگیں شیشوں والی
گھومتی ہوئی سیڑھیاں جن پر سیپیاں منقش ہیں۔
انھیں کثیر الصوت موسیقی کے اصول پر تعمیر کیا گیا ہے۔
یہ تمام مینار مل کر ایک مینار ہو جاتے ہیں۔
وہ مینار کہیں نہیں ہے۔ وہ نہ آسمان پر ہے اور نہ حقیقت میں
زمین پر ہے۔ ہوا میں معلق ایک شہر۔
ساکت اڑان میں لہراتے ہوئے پَر۔
اس شہر میں کوئی چار مَردوں میں فرق نہیں بتا سکتا۔
مگر تمھارا سفر بہت طویل ہو چکا ہے۔
تم ایک بوڑھی عورت ہو چکی ہو،
اور بازار میں دوسری بوڑھی عورتوں میں شامل ہو جاتی ہو۔
اور تمھاری خواہشیں حسرتوں میں بدل چکی ہیں۔
زندگی یہاں بہت سُست رو ہے، مگر موت ناگہاں۔
باہر جاتے وقت احتیاط رکھنا۔
چیزیں ہولناک طریقے سے تبدیل ہو سکتی ہیں۔

سارا: براہِ مہربانی کچھ اور بتائیے۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟
میں نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی اتنے اخبار نہیں پڑھے،
نہ اتنا ٹیلی وژن دیکھا، نہ اتنی خبریں سنیں۔
مگر میں پہلے کبھی سمجھنے سے اتنی قاصر نہیں رہی۔
اتنی نفرت کیوں؟ شر کہاں سے آتا ہے؟
اس کا کیا مطلب ہے؟ اس سے کیا مقصد حاصل ہوتا ہے۔

(وقفہ۔)

Scanned with CamScanner

کیا آپ اس کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتے؟

(وقفہ۔)

ٹھیک ہے۔

(وقفہ۔)

میرا خیال ہے میرے گھر جانے کا وقت ہو رہا ہے۔

(وقفہ۔)

ہیلو!

(وقفہ۔)

میں چلی جانا چاہتی ہوں، پلیز!

(وقفہ۔)

میں یہاں سے کیسے باہر نکلوں؟ ہیلو!

(نگراں اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے۔ سارا اس کے قریب جاتی ہے اور اسے چھوتی ہے۔ نگراں ایک طرف بے جان مجسمے کی طرح ڈھے جاتا ہے۔ سارا گھبراہٹ میں باہر نکلنے کا راستا تلاش کر رہی ہے۔)

***

Scanned with CamScanner

سین ۱۵
سارا سرائیوو کی ریڑھ کی ہڈی کے بارے میں کلام کرتی ہے

سارا: یہاں چند چیزیں ہیں
وہاں کی
جو کبھی سرائیوو تھا
ایک انسانی کھوپڑی، ایک خاندانی البم، ایک قالین،
مارٹر کے دو ٹکڑے،
قہوے کا ایک پیالہ۔
یہ ایک دوسرے سے کیسے وابستہ تھے؟
یہ ایک دوسرے سے کیسے وابستہ ہیں؟
جب یہ نہیں تھا تو کیسا لگتا تھا؟
کیسا لگتا تھا یہ
جب یہ نہیں تھا؟
مگر میرے پاس اَور بھی کچھ ہے، ایک خاص چیز
ایک ہڈی، اٹھارویں مُہرے کے بالکل نیچے کی
جو کبھی فنا نہیں ہوتی
جو آگ سے
یا کسی اَور عنصر سے تباہ نہیں ہوتی
جو کسی اَور طاقت سے
نہ ٹوٹ سکتی ہے
نہ زخمی ہو سکتی ہے
خدا اس ہڈی کو
مُردوں کو جلانے کے فن میں استعمال کرے گا
ہتھوڑے کی چوٹ سے
یہ ہڈی نہیں ٹوٹے گی

Scanned with CamScanner

مگر وہ اہرن، جس پر یہ رکھی ہوئی ہو گی،
ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا

***

سین ۱۶
ایک معمولی اسمگلر کا قصہ

موبو (معمولی اسمگلر): میں چاہتا ہوں پھر سے امن ہو جائے
تاکہ میں اپنی ہوشیاری کا فن دکھا سکوں۔
میں ایک معمولی اسمگلر ہوں۔
معمولی مالیت کی غیر ملکی کرنسی،
ترکی کی چمڑے کی مصنوعات اور اٹلی کی جینز۔
میں کوئی جنگی منفع خور نہیں ہوں، اور نہ کبھی بنوں گا۔
میں صرف اور صرف ایک معمولی اسمگلر ہوں۔
کیا ہم معمولی اسمگلنگ پر واپس جا سکتے ہیں؟
اور اتوار کو عام لوگوں کی طرح میچ دیکھنے پر؟

***

سین ۱۷
دُبراونک اور وُوکوور کا گیت

فاتہ، عذرا اور مایا: ہم دُبراونک اور وُوکوور ہیں
سرائیوو کو تہنیت پیش کرتے ہوئے
ہماری جڑواں بہن!

ہمارے جڑواں شہر!
ہم کہانی کو جانتے ہیں
ہم اسے پہلے دیکھ چکے ہیں
بھاگو اور چھپو نہیں
برداشت کرو، پیاری بہن
ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

***

سین ۱۸
ایک شاعر کا قصہ

حمدیا (شاعر): گولی چلاؤ، بد بخت اسنائپر!
جو ہونا ہے ہو ہی جائے!
میں ایک شاعر ہوں۔ میری قبر کے کتبے پر لکھا ہو گا،
یہاں وہ شخص سو رہا ہے
جو سرائیوو کی سیمیں روح سے آشنا تھا۔
سرائیوو کے بعد شعر کہنا بربریت ہے۔
اس کے بعد صرف سکوت ہے۔
اب میں صرف وہ نظمیں پڑھتا ہوں جو خلا بازوں نے
زمین پر لوٹنے کے بعد کہیں۔
آسمان کی طرف کثرت سے دیکھو! وہ التجا کرتے ہیں۔
چوزے سوال کریں گے: کیوں؟
صرف عقابوں کو آسمان کی ضرورت ہے۔
چوزے کبھی اوپر نہیں دیکھتے۔
وہ روٹی کے ٹکڑے چننے میں مصروف ہیں۔
چوزوں کے دڑبوں میں آسمان کا کوئی تصور نہیں ہے۔

Scanned with CamScanner

یہ وہ جگہ ہے جہاں میں نے پہلا بوسہ لیا تھا۔
اب وہ جا چکی ہے۔
تم پر تُف ہو!
تم پر تُف ہو!

***

سین ۱۹
حسن آغا نیچا کا قصہ

قصہ گو: حسن آغا ایک جنگ میں بُری طرح زخمی ہو گیا تھا
اور سپاہیوں کے خیمے میں پڑا
اپنے زخموں کے بھرنے کا انتظار کر رہا تھا۔
خیمہ پہاڑیوں میں ایک اونچی جگہ پر تھا۔
اُس کی ماں اور اُس کی بہن اُسے دیکھنے آئیں۔
نہیں آئی تو اُس کی بیوی اور محبوبہ، حسن آغا نیچا۔
حسن آغا نیچا: میں نے جانا بہت چاہا مگر جا نہ سکی۔
رواج کے مطابق بیوی کو سپاہیوں کے خیمے میں جا کر
اپنے شوہر سے، چاہے وہ سپہ سالار ہی کیوں نہ ہو،
ملنے کی اجازت نہیں ہے
اس لیے میں نے ایسا کرنے کی جرأت نہیں کی
مگر خدا جانتا ہے کہ میں پریشان تھی
اور اُس کے لیے تڑپ رہی تھی، اس لیے کہ اس وقت تک،
کئی برسوں کی رفاقت کے بعد بھی،
ہمارے درمیان گہری محبت تھی۔ ہمارے چار بچے تھے
اور سب سے چھوٹا تو ابھی پالنے ہی میں تھا۔
قصہ گو: جب حسن آغا کچھ صحت مند ہوا،

اس نے اپنی بیوی کو پیغام روانہ کیا:
حسن آغا: میرے گھر پر یا رشتے داروں کے ہاں میرا انتظار مت کرنا۔
قصہ گو: جب حسن آغا نیچا کو اپنے محبوب کا پیغام ملا
وہ خود کو ختم کرنے کے ارادے سے قلعے کے مینار پر گئی
مگر اُس کی ساس نے اُسے روک دیا:
ساس: یہاں سے چلی جاؤ
اور کچھ دن میرے خاندان میں چھپ کر رہو۔
میں اپنے بیٹے کے غصے کو، جب وہ لوٹ کر آئے گا،
ٹھنڈا کر لوں گی۔
پھر تم اپنے شوہر اور اپنے بچوں کے پاس آجانا۔
قصہ گو: حسن آغا نیچا ایسا کرنے پر رضامند ہو گئی۔
مگر جب حسن آغا گھر لوٹا:
حسن آغا: میں حسن آغا نیچا کے ساتھ رہنے کا
ذکر سننا بھی گوارا نہیں کروں گا۔ اس کی بے پروائی سے،
جب میں زخمی ہوا پڑا تھا،
میرے دل کو ٹھیس لگی ہے۔
اس نے ہماری محبت سے دغا کی ہے۔
قصہ گو: حسن آغا نیچا کا بھائی بے پنترووِچ بھی
اپنی بہن کے ساتھ حسن آغا کے سلوک پر ناراض تھا۔
وہ دولت مند اور با اثر امرا کے طبقے سے تھا اور اس کا مرتبہ
حسن آغا کے مقابلے میں بہت بلند تھا۔
بے پنترووِچ: تم میری بہن کو ایک فرمان دو گے
جس کے تحت وہ دوبارہ شادی کر سکے۔
حسن آغا: ضرور، اس شرط پر کہ وہ بچوں کو ساتھ نہ لے جائے۔
قصہ گو: اُن دنوں طلاق یافتہ عورتوں کو
ہمیشہ قصوروار سمجھا جاتا تھا، اور اگر شادی ناکام ہوتی
تو اُنھیں کی غلطی سمجھی جاتی تھی۔

Scanned with CamScanner

بے پنتروِوچ اپنی بہن کے لیے یہ ذلت نہیں چاہتا تھا۔
بے پنتروِوچ: پیاری بہن، میں نے تمھاری شادی
قاضیِ امو تسکی سے طے کر دی ہے۔ وہ ایک قاضی اور
باعزت شخص ہے۔ اس کے ساتھ شادی
تمھیں اس سارے معاملے میں بے قصور ثابت کر دے گی۔
حسن آغا نیچا: اور میں؟
کیا میں اس معاملے میں کچھ اختیار رکھتی ہوں؟
کیا میرے پاس انتخاب کرنے کے لیے کچھ ہے؟
قصہ گو: جب شادی کا دن آیا، مہمان بے پنتروِوچ کے محل میں
دلھن کو سسرال کے جانے کے لیے پہنچے۔ بہت سے مہمان
گھوڑوں پر سوار تھے، اور بہت سے گھوڑے دلھن کا جہیز اٹھائے
اس کے نئے گھر کی طرف جا رہے تھے۔
یہ بہار کے آخری دنوں کی دھوپ سے روشن ایک صبح تھی۔
حسن آغا نیچا درمیان میں سب سے زیادہ سیاہ گھوڑے پر سوار تھی
وہ ایک سونے چاندی کے کام والی سفید چادر میں لپٹی ہوئی تھی
جب وہ حسن آغا کے گھر کے پاس سے گزرے،
وہ ٹھہر گئی۔
حسن آغا نیچا: میں اپنے بچوں کو الوداع کہنا چاہتی ہوں۔
قصہ گو: براتی اس کی اس غیر متوقع درخواست پر حیران رہ گئے۔
مگر وہ ٹھہر گئے اور خاموشی سے انتظار کرتے رہے۔
وہ زقند لگا کر گھوڑے سے اتری اور اپنی سابقہ گھر میں داخل ہوئی۔
اس کی سونا جڑی چوبی سینڈلوں کی چاپ پتھر کے صحن پر گونجی۔
اس کی بچیاں دوڑ کر اس سے ملنے کو آئیں۔
حسن آغا ایک بوڑھے بلوط کی چھاؤں میں بیٹھا تھا۔
حسن آغا نیچا نے اپنی بچیوں کو،
جو خوشی سے اچھل رہی تھیں، سینے سے لگایا۔
جب اس کی نظریں حسن آغا پر پڑیں، وہ اٹھا

Scanned with CamScanner

اور اس نے اپنی پشت اس کی طرف موڑ لی۔
وہ آہستگی سے پالنے کی طرف بڑھی۔ بچیاں خاموش تھیں۔
اس نے بچے کو، جو سکون سے سو رہا تھا، اٹھایا۔
اس کے آنسو بچے کی ننھی ہتھیلی پر ٹپکے۔
حسن آغا نیچا: اے میرے غریب بچو، یہ دلہن کبھی تمہاری ماں تھی۔
قصہ گو: باہر برات کا گھوڑا اذیت ناک طرح سے ہنہنایا۔
حسن آغا نیچا نے بچے کو دوبارہ پالنے میں سلادیا۔
اس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔
وہ گر پڑی اور مر گئی۔

***

سین ۲۰
ہوا کا گیت

فاتہ (بادلوں کا کورس): ہم سرائیوو کے بادل ہیں
گھنے، دبیز اور کالے
اور سبک، خوش ہوا اور مدھم
ہم کھہر ہیں
اور جما ہوا دھواں
اور ہوا
اور ہوا میں کچھ ہے
یہ مئی کے چہار شنبے کی لطیف ہوا کا
خوش گوار نیل
اور نیلی سردی کی گذشتہ رات کی
نفرت انگیز چپچپاہٹ ہے۔

Scanned with CamScanner

***

سین ۲۱
ہالیڈے ان، سرمائی اولمپکس ۱۹۸۴
ایک محبّت کی کہانی

گورچین (راکر): سرمائی اولمپکس ۱۹۸۴ کی عالمی اسکیٹنگ چیمپیئن!
سارا (لن): تم میرا سب سے بڑا اعزاز ہو۔
گورچین (راکر): آخری رقص میرے لیے محفوظ رکھنا، لن!
میری نارویجیئن دوشیزہ، اسکیٹس کی اولمپیئن ساحرہ!
تم مستقبل کے راک اینڈرول اسٹار سے مخاطب ہو۔
سارا (لن): میں سرائیوو میں ہالیڈے ان کے موجود ہونے کی توقع نہیں کررہی تھی۔
گورچین (راکر): یہ خاص طور پر ہمارے لیے بنایا گیا ہے
جہاں ہم چھپ سکیں اور خوب پیار کرسکیں۔
سارا (لن): تمھارے شہر میں کبھی اتنی دنیا امڈ کر نہیں آئی ہوگی،
اے بی سی اور این بی سی اور بی بی سی اور آئی ٹی وی۔
گورچین (راکر): سگریٹ پیوگی؟
سارا (لن): میں پہلے ہی سرُور میں ہوں۔
گورچین (راکر): کل، جب جنگ چھڑ چکی ہوگی،
تم اپنی سسپنڈر اور سیاہ اسٹاکنگز میں
ایک نرس بن کر یہاں آؤگی اور سپاہیوں کے لیے
ایک اسکیٹنگ شو پیش کروگی
مگر میں مرچکا ہوں گا
اور یہ شو ضائع جائے گا۔
سارا (لن): میں تمھارا بوسہ لے کر تمھیں زندگی لوٹا دوں گی۔

Scanned with CamScanner

(گورچین اس کے سینے کو چھوتا ہے۔)

گورچین (راکر): تم ایک فرشتہ ہو۔
سارا (لن): وہ تو میں ہوں، ایک زمستاں خواب فرشتہ۔ یہ

(اپنی چھاتیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)

میرے پروں کی نشانیاں ہیں۔

(گورچین گانے لگتا ہے۔
گولیوں کی آوازیں اور شعلے۔)

سارا (لن): یہ کیا ہے؟
گورچین (راکر): آتش بازی! ڈرو مت۔
ہر چیز قابو میں ہے۔ ہر چیز قابو میں ہے۔

(اچانک ایرپورٹ پر لگی ہوئی ایک ڈیسک۔ رُودی ایک اسٹیورڈ ہے۔)

رودی (اسٹیورڈ): فرمایئے!
سارا (لن): بینگ کاک کے لیے دو ٹکٹ پلیز!
رودی (اسٹیورڈ): دور دراز چھٹیاں منانے کے لیے؟
چوبیس گھنٹے کی پرواز؟
سارا (لن): یہی سمجھ لیں۔
رودی (اسٹیورڈ): مگر ایرپورٹ بند ہے۔
سارا (لن): اوہ!

(وقفہ۔)

کب کھلے گا؟

Scanned with CamScanner

(رودی اپنے کندھے اچکاتا ہے۔ وقفہ۔)

سارا (لن): اب کھل چکا ہے؟

(رودی اثبات میں سر ہلاتا ہے۔)

گورچین (راکر): اوسلو کے لیے دو ٹکٹ پلیز!
رودی (اسٹیورڈ): ویک اینڈ منانے کے لیے؟
دو گھنٹوں کی پرواز؟
گورچین (راکر): یہی سمجھ لیں۔
رودی (اسٹیورڈ): مگر ایر پورٹ بند ہے۔
گورچین (راکر): اوہ!

(وقفہ۔)

کب کھلے گا؟

(رودی اپنے کندھے اچکاتا ہے۔ وقفہ۔)

سارا (لن): اب کھل گیا؟

(رودی اثبات میں سر ہلاتا ہے۔)

ڈُبراونک کے لیے دو ٹکٹ پلیز!
رودی (اسٹیورڈ): مختصر چھٹی کے لیے؟
آدھے گھنٹے کی پرواز؟
سارا (لن): یہی سمجھ لیں۔
رودی (اسٹیورڈ): مگر ایر پورٹ بند ہے۔
سارا (لن): مگر آپ نے کہا تھا کھلا ہے۔

روڈی (اسٹیورڈ): کھلا تھا۔
سارا (لن): اوہ!

(وقفہ۔)

گورچین (راکر): کیا اب کھل گیا؟

(روڈی اثبات میں سر ہلاتا ہے۔)

سرائیوو کے لیے دو ٹکٹ پلیز!
روڈی (اسٹیورڈ): سرائیوو کے لیے ٹکٹ کی ضرورت نہیں۔
آپ سرائیوو میں ہیں۔
گورچین (راکر): اوہ! کیا واقعی؟
روڈی (اسٹیورڈ): ہاں۔
گورچین (راکر): اب میں مطمئن ہوں۔
روڈی (اسٹیورڈ): صرف آپ وہاں پہنچ نہیں سکتے۔
گورچین (راکر): کیا مطلب؟
روڈی (اسٹیورڈ): آپ سرائیوو میں ہیں، مگر سرائیوو یہاں نہیں ہے۔
سرائیوو جا چکا ہے۔
گورچین (راکر): اوہ!
سارا (لن): آپ کو پتا ہے وہ کب واپس آئے گا؟

(روڈی نفی میں سر ہلاتا ہے۔)

روڈی (اسٹیورڈ): ایرپورٹ بند ہے۔
آسمان بند ہے۔
ہر چیز بند ہے۔

***

Scanned with CamScanner

سین ۲۲
چیلو بجانے والی کا قصہ

عذرا (چیلو بجانے والی): میں سرائیوو فلہار مونک میں شامل تھی
جب یہ سب کچھ شروع ہوا۔ میں باخ کی سولو پارتیتاس کی
چیلو پر مشق کر رہی تھی۔ تمھیں تو معلوم ہے،
اسے پابلو کسال نے ۱۹۳۸ میں شاندار طریقے سے پیش کیا تھا۔
میں حاملہ ہوں۔ میں بچے کی خواہش مند نہیں تھی،
مگر اسے جنم دینے کا فیصلہ کیا ہے۔
مجھے اس کے باپ کا نام نہیں معلوم۔ وہ کئی تھے۔
ان میں سے کچھ میرے ہم سائے تھے۔
یہ ناقابلِ یقین بات معلوم ہوتی ہے
مگر اب یقین کرنے کو کیا رہا ہے؟
تم مجھے کوئی قابلِ یقین چیز دو،
میں اسے ایک گنگ مچھلی میں تبدیل کر کے
اُودے سمندروں میں پھینک دوں گی
کبھی لوٹ کر نہ آنے کے لیے
کبھی بھی نہیں
یہاں نہیں۔

***

Scanned with CamScanner

سین ۲۳
آئیوو آندرِچ کا قصہ

(حمدیا کے سر پر ہیٹ ہے۔ لمبا کوٹ۔ ہاتھ جیبوں میں۔)

حمدیا (آئیوو آندرچ): تم عام دشمن کو فاصلے سے مار سکتے ہو
بے رحمی کے ساتھ،
مگر اپنے بھائی کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مارتے ہو
دل لگا کر۔
تم دونوں ایک ہو۔ صرف ایک طریقے سے
تم اپنے آپ کو اس سے آزاد کرا سکتے ہو
اپنے آپ کو اس سے خنجر کے ذریعے کاٹ کر
الگ کرنے کے بعد۔

(وقفہ۔)

میرا نام آندرِچ ہے۔
میں نے ادب کا نوبیل انعام پایا ہے۔
مجھے دانائی کا سرچشمہ کہا جاتا تھا۔
میں ان خطابوں سے بلند تھا۔
اب میں ان سے بہت نیچے ہوں۔
یہ سب مادر چود ہیں۔
اور میں کیا کہہ سکتا ہوں؟

***

Scanned with CamScanner

سین ۲۴
مسافر پرندوں کا گیت

مایا (مسافر پرندوں کا کورس):
میں ایک بگلا،
جنوب کی طرف پرواز کرنے والا
ایک مسافر پرندہ ہوں
اب سردی ہے
اور ہم سچ مچ چلے جائیں گے
مگر ہم دوسرے تمام پرندوں،
پروں سے بنی تمام مخلوق کے ساتھ،
چڑیوں اور کبوتروں،
چتکلے کووں اور بطخوں کے ساتھ،
سرائیوو میں ٹھہرے ہوئے ہیں
ان کے پاس جانے کے لیے کوئی اور جگہ نہیں ہے
اور ہمیں اچھا نہیں لگتا کہ
کہیں اور جا کر اپنی دگنی طاقت سے گیت گائیں،
اس لیے ہم یہاں ہیں
بھائی کی مدد بھائی کرتا ہے
میرا خیال ہے یہ کسی نہ کسی طرح کا مشن ہے۔
ہم، سرائیوو کے پرندے، دعا کرتے ہیں
امن کی فراوانی
اور رحم دلی کے لبریز خزانوں کی،
اور دعا کرتے ہیں
حقیقت خود کو آشکار کرے
تاکہ دنیا پھر سے شروع ہو۔

***

Scanned with CamScanner

سین ۲۵

سانتا کلاز پریس ریلیز

رُودی (سانتا کلاز): میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہوں گا۔
کیا آپ مجھے کسی بات کا الزام دے رہے ہیں؟
نہیں؟ پھر سب ٹھیک ہے۔ کیوں کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ
میں اپنے آپ کو مجرم محسوس نہیں کر رہا ہوں۔
میں نے اپنی بہترین کوشش کی۔ کوئی شے ناممکن نہیں ہے،
مگر یہ نہایت، نہایت دشوار تھا۔
میں اپنے دوسرے تمام فرائض کو داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔
دنیا میں صرف وہی تو بچے نہیں ہیں، آپ کو علم ہے۔
یہ بات نہیں کہ میں نے کوشش نہیں کی۔
ان بچوں کے لیے مجھے بھی اتنا ہی دکھ محسوس ہوتا ہے
جتنا آپ کو۔ جی ہاں، اگر اس سے زیادہ نہیں تو!
میں نے کوشش کی، مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اب آپ سمجھے؟
مجھے افسوس ہے۔ اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں۔
انھیں ایک کرسمس بغیر کھلونوں کے منانے دیں۔
اگلے سال مَیں ان کے لیے دگنے کھلونے لاؤں گا۔
اب ٹھیک ہے؟
میری طرف سے انھیں ہیلو کہیے گا۔ اور میری کرسمس!
کچھ اَور کہنے کو نہیں ہے۔
میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہوں گا۔

***

Scanned with CamScanner

سین ۲۶
چھتوں کا گیت

سولیو (چھتوں کا کورس):
ہم، سرائیوو کی چھتیں،
گاتی ہیں
ہم مسجدیں، منارے اور گنبد
ہم سرخ کھپریلیں
ہم اپارٹمنٹ بلڈنگوں کے سپاٹ ٹارمک
ہم غریب لوگوں اور امیروں کے گھروں کی چمنیاں
ہم کلیساؤں کی صلیبیں
گاتی ہیں
ہم
سرائیوو کی چھتیں
گاتی ہیں،
اور مہربان بارشوں،
نئی اُونی برف،
کبوتروں اور گورتوں،
بلیوں اور چاند
اور چاندنی میں
نیند میں چلنے والوں کے لیے
دعا کرتی ہیں
ہم گاتی ہیں اور دعائیں مانگتی ہیں
کہ وہ لوٹ آئیں
ہمارے پاس
دوبارہ لوٹ آئیں

Scanned with CamScanner

سین ۲۷
متحدہ یوروپ میں ایک سڑک پر ہونے والا واقعہ
جس کے باطنی نتائج بر آمد ہوتے ہیں

(یوروپ میں ایک سڑک- شاید روستوک میں- رودی سارا سے ملتا ہے-)

رُودی (اسکِن ہیڈ): کون ہو تم؟ فک! کیا میں اپنی سڑکوں پر
کسی پناہ گیر کے گندے خون کی بُو محسوس کر رہا ہوں؟ فک!
تمہاری بُو تو میں میل بھر سے پہچان لیتا ہوں- فک!
معلوم ہے میرا سب سے محبوب شخص کون ہے؟
سویڈن کا لیزر مین! وہ سب کچھ کرنے کی جرأت رکھتا ہے-
تم نے اس کا نام سنا ہے؟ ضرور سنا ہو گا-
وہ تم جیسوں کی خبر لینے کے لیے مشہور ہے- فک!
رنگ وِیگن کے گرد اُس نے خوف اور دہشت پھیلا رکھی ہے-
فَک! تم ہر جگہ اپنی زہریلی غلاظت اور بیماری پہنچا دیتی ہو،
مگر میں انھیں قبول نہیں کروں گا- فک! یہ دیکھو
یہ چرچ ہے جس میں پناہ گیر چھپے بیٹھے ہیں- ٹھیک ہے؟
ٹھیک ہے! بہت جلد یہ جل کر خاک ہونے والا ہے- کیوں؟
پوچھو مجھ سے- تمھیں خود پتا ہے- فک!
ہاہاہا! بچو مجھ سے! بھاگ سکتی ہو؟
بتاؤ اب کس طریقے سے تمھیں زخمی کروں؟
میں تمھیں چیخنے کا موقع دوں گا-
تم مجھے پسند آئی ہو! فک!

(سارا اس کی طرف دیکھتی ہے-)

کیا ہے؟

Scanned with CamScanner

(سارا اس کی طرف دیکھتی ہے۔)

تم کیا کر رہی ہو؟

(سارا اس کی طرف دیکھتی ہے۔)

تم مجھے اس طرح کیوں گھور رہی ہو؟ فک!
سارا (پناہ گزیں): تمھارے سارے بال سفید ہو چکے ہیں۔

(ایک حیرت انگیز تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ اسکن ہیڈ پناہ گزیں کے سامنے گھٹنوں کے بل گر پڑتا ہے۔ وہ اپنی ہتھیلی اس کے سر پر رکھتی ہے۔ وہ گھٹنوں کے بل چلا جاتا ہے۔)

***

سین ۲۸
ٹرام کا گیت

مویو (ٹرام):

میں ایک ٹرام ہوں
انگلینڈ میں بنی اور پیدا ہوئی
مگر اب سرائیوو کی شہریت اختیار کر چکی ہوں
اور یہ چند معقول وجوہ ہیں کہ
میں کیوں اپنی آزادی واپس چاہتی ہوں:
سب سے پہلے میں بچوں کو
کنڈر گارٹن اور اسکول لے جانا چاہتی ہوں
پھر طالب علموں کو
یونیورسٹی اور تفریح گاہ

Scanned with CamScanner

پھر والدین کو
کام پر اور بازاروں میں
پنشن یافتہ لوگوں کو
پارکوں میں
کھلاڑیوں کو
ان کے میچوں میں
اور آخر میں
(مگر کسی طرح بھی سب سے کم اہم نہیں)
اس لیے کہ میں شاید کچھ مغرور ہوں۔
میں صرف آزاد ہونا
اور دوبارہ حرکت میں آنا
چاہتی ہوں

***

سین ۲۹
۱۹۱۴ میں قتل

(۱۹۱۴ کی گرمیاں۔ خواتین و حضرات وسطی یوروپی لباس میں قہوہ خانے میں بیٹھے برانڈی اور قہوے کے گھونٹ لے رہے ہیں۔ گاوریلو پرنپ اور میجر تانکوشک ایک دوسرے سے متصل دو قہوہ خانوں میں بیٹھے ہیں۔)

ہین (گاوریلو پرنپ): میرا دوست میجر تانکوشک،
اس کا تعلق بلیک ہینڈ انارکسٹ تنظیم سے ہے۔
وہ نشانہ بازی کی مشق میں میری مدد کر رہا ہے۔
ں (میجر تانکوشک): میرا دوست گاوریلو پرنپ،
آسٹرو ہنگیرین شہنشاہ کا ہونے والا قاتل۔

گور چینن (گاوریلو پرنسپ): وہ "ویانا" کافی ہاؤس میں بیٹھا ہے۔
رودی (میجر تانکوشک): وہ "استنبول" کافی ہاؤس میں بیٹھا ہے۔
گور چینن (گاوریلو پرنسپ): وہ ساکر تورت اور موتسارت کولین
اور کاپوچینو سے شوق کر رہا ہے۔
رودی (میجر تانکوشک): اور وہ تفاحیے اور شربت
اور سخت تمباکو اور ترکی قہوے سے۔
گور چینن (گاوریلو پرنسپ): یہ عمارت ویانائی بیروک کی نقل ہے۔
رودی (میجر تانکوشک): وہ مشرقی کرپیش
یعنی اینٹ اور گارے کا مثالی نمونہ ہے۔
یہ یوروپ کی ناف ہے۔
گور چینن (گاوریلو پرنسپ): اور سیون۔
رودی (میجر تانکوشک): اور ناف جسم کا سب سے نازک حصہ ہے۔
گور چینن (گاوریلو پرنسپ): اور سیون جہاں سے چیزیں
اُدھڑتی اور جدا ہوتی ہیں۔
رودی (میجر تانکوشک): اتنا واضح مقام!
گور چینن (گاوریلو پرنسپ): اتنا واضح ہدف!

(دونوں پستول نکالتے ہیں اور بچوں کا ایک کھیل کھیلتے ہیں۔)

دونوں:

اینی مینی سینی
سینی کو کولادا
بر بر لیمونادا

(وہ گاتے ہیں۔)

یوروپ ایک رنڈی ہے
یوروپ ایک کتیا ہے
ہمیں ٹریگر کھینچنا چاہیے
ہمیں سوئچ دبانا چاہیے

وہ ایک ہاتھ سے دیتی ہے
اور دو ہاتھوں سے لیتی ہے
خوب! اگر ایسا ہی ہے
دیکھیں ہم کیا کر سکتے ہیں
ہمیں کچھ ضرر پہنچانا چاہیے
اور تاج کو بھک سے اُڑا دینا چاہیے
اور شہزادہ فرڈیننڈ کو
زمین پر گرا دینا چاہیے

(وہ گولی چلا دیتے ہیں۔)

***

سین ۳۰
پانی کا گیت

مایا (پانی کا کورس):
میں شدرووان کا پانی ہوں
قلقل کرتا اور آپ سے مخاطب
میں فوّاروں کی پھوار ہوں
میں چشمہ
سوتا
دہانہ
روتی ہوئی آنکھ
کٹی ہوئی رگ ہوں
یہ نہ کہیے
یہاں ایسا ہونا ممکن نہیں

Scanned with CamScanner

یہاں ممکن نہیں
ممکن نہیں
ممکن نہیں
آپ کھتے رہیں گے
اور یہ ممکن ہو گا
اور ہو بھی رہے گا

***

سین ۳۱
کھڑکی کے پاس والی عورت کا قصہ

(کھڑکی کے پاس والی عورت نفاست سے ملبوس اور بجی ہوئی، بال اچھی طرح بنے ہوئے۔ پھولوں کو پانی دے رہی ہے۔)

عذرا (کھڑکی کے پاس والی عورت):
میں ہر روز پھولوں کو پانی دیتی ہوں
اور ان سے باتیں کرتی ہوں۔
انھیں اچھا لگتا ہے جب ان سے باتیں کی جائیں۔
اور میں ایسا ظاہر کرتی ہوں کہ کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے۔
اور میں کوڑا کرکٹ اور نارنگی کی پتّیاں صاف کرتی ہوں۔
اور میں اپنی زندگی گزار رہی ہوں۔
ہر بات معمول کے مطابق ہوتی
اگر میری کھڑکیوں میں شیشے موجود ہوتے
اور آدھی دیوار غائب نہ ہو گئی ہوتی۔
کسی اپارٹمنٹ بلڈنگ کی ساتویں منزل کے لیے
یہ کوئی خوب صورت منظر نہیں ہے۔

Scanned with CamScanner

(وہ کسی کو دیکھ کر ہاتھ ہلاتی ہے۔)

میرے پڑوسی ایک بارودی سرنگ پار کر رہے ہیں۔
وہ رقص کے انداز میں حرکت کرتے ہیں۔ ایک بوڑھا آدمی
ایک ہاتھ میں پانی کی بالٹی اور دوسرے میں چھتری لیے جا رہا ہے۔

(وہ اسے ہاتھ ہلا کر اشارہ کرتی ہے۔)

وہ فاصلے میں گم ہو گیا ہے۔
مگر ہم انھیں زیر کر لیں گے۔ محبت جیت جائے گی۔
محبت ہمیشہ جیتی ہے۔
ہمیشہ جیتے گی۔

***

سین ۳۲
باورچی کا گیت

سولیو (باورچی): ایک صحیح بوسنیائی دیوانی ہنڈیا بنانے کے لیے
آپ کو ایک کلو گائے کا گوشت، چوتھائی کلو سوّر کا گوشت،
لہسن، پیاز، کلہ، آلو، سیم، ٹماٹر، ہری مرچیں،
گاجر، جافری، نمک، مرچ، سفید شراب اور پانی درکار ہے۔
گوشت کو ہانڈی میں ڈال کر اس کے اوپر سبزیاں ڈالیے۔
لہسن اور پیاز ملائیے، پانی ڈالیے اور شراب اور نمک اور مرچ۔
ان سب کو مٹی کی ہانڈی میں پکائیے۔ ہانڈی کو
جھلی دار کاغذ سے ڈھانپ دیجیے جس میں آپ نے
سوئیوں سے چھوٹے چھوٹے سوراخ بنا رکھے ہیں۔

Scanned with CamScanner

دو سے تین گھنٹوں میں یہ ہنڈیا تیار ہو جاتی ہے۔

(رونے لگتا ہے۔)

مجھے افسوس ہے، میں آگے کچھ نہیں بول سکتا۔

***

سین ۳۳
یوسپ بروز ٹیٹو کا قصہ

(یوسپ بروز ٹیٹو جنرل کی یونیفارم پہنے داخل ہوتا ہے۔)

حمدیا (ٹیٹو): اس میں میں صرف دو باتوں کا اضافہ کرنا چاہوں گا:
عوام کو جن میں یوگوسلاویا کی طرح ایک نوجوان نسل موجود ہے،
اپنے مستقبل سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ اور یاد رکھیے،
اخوت اور اتحاد کی حفاظت اس طرح کرنی ہوگی
جیسے آنکھوں کی حفاظت کی جاتی ہے۔

***

سین ۳۴
پاگل خانے کے نگراں کی بیوی کا قصہ

(امدادی مہم کے بعد کپڑوں کا ایک ڈھیر۔ بیوی کپڑوں کو اٹھا کر اپنے شوہر کے جسم سے ناپتی ہے۔ وہ اخبار پڑھ رہا ہے۔)

بیوی: ان کے واپس آنے کے تین دن بعد تک سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔

Scanned with CamScanner

اب یہ عجیب عجیب قصّے بیان کرتے ہیں
اور پُرانے اخبار پڑھتے رہتے ہیں۔ تمام ڈاکٹر
انھیں مریضوں کے درمیان چھوڑ کر بھاگ گئے۔
چالیس پاگل عورتیں، اور کوئی دوا موجود نہیں۔
یہ کیا کرسکتے تھے؟ یہ صرف ایک نگراں ہیں۔
اُنھوں نے اِن کو تقریباً پیار سکھایا تھا۔
خیر، میں شکایت نہیں کر رہی ہوں۔ یہاں لوگ بہت مہربان ہیں۔
پہلے ہم ایک ہوٹل میں تھے: خوبصورت کمرہ، ٹائلوں والا باتھ روم،
کیسا شاندار باتھ روم تھا!
میں کبھی ایسے ہوٹل میں نہیں رہی۔ میری استطاعت سے باہر!
اب ہم ایک خیمے میں ہیں۔ مگر یہ اچھا خاصا ہے۔
ہمیں سمندر کا نظارہ میسّر ہے۔ اور اوہ!
سورج ڈوبنے کا منظر کیسا حسین ہوتا ہے!
اور فر کے درختوں کی خوشبو!
بالکل چھٹیوں کی طرح ہے۔ یا ہو سکتا تھا
اگر وہ ہمارے ساتھ ہوتے، ہمارے بچے،
اور اگر ان کی طبیعت اچھی ہوتی۔
کبھی کبھی میں اتنا ڈر جاتی ہوں۔ اگرچہ مجھے ڈرنا نہیں چاہیے۔
ہم پچھلے اچھے وقتوں میں ڈر جایا کرتے تھے۔
اب بالکل نہیں۔ اب ہم بے حس ہیں۔
دور کوئی چیز جھلملا رہی ہے۔ کیا یہ کوئی آنے والی ٹرین ہے؟
یا جانے والی؟
یا دونوں؟

(پاگل خانے کا نگراں گانے لگتا ہے۔)

***

Scanned with CamScanner

سین ۳۵

روزنامہ Oslobodjenje کا ایک مضمون

مایا: "اگر ہم دل سے چاہتے تو کچھ کر سکتے تھے۔"
"اگر ہمیں اُس وقت وہ معلوم ہوتا جو ہم اَب جانتے ہیں،
تو ہم ضرور کچھ کر سکتے تھے۔"
بیسویں صدی کے عظیم بہانے، یا شاید
پوری انسانی تاریخ کا عظیم ترین بہانہ۔ مگر ہم جانتے تھے
اور ہم نے پھر بھی کچھ نہیں کیا۔
اگر ہمارے متعلق کبھی کوئی کتاب لکھی جائے
تو اس کا عنوان "قوت ارادی کے فقدان کی فتح" ہونا چاہیے۔

(وہ پڑھ رہی ہے۔)

اس مضمون میں اب تک بات نہیں بنی۔
میں اسے مہینوں سے لکھ رہی ہوں۔
اس میں کبھی بات نہیں بنے گی۔
اور بن بھی کیسے سکتی ہے؟
میں ایک متحرک ہدف کا نشانہ لے رہی ہوں۔
ایک کھلے ہوئے زخم کا۔ شاید مجھے عام انسانی شائستگی کا
مظاہرہ کرنا چاہیے
اور خاموش رہنا چاہیے۔

***

Scanned with CamScanner

سین ۳۶
دو اسکائی اسکریپروں کا گیت

مویو اور سولیو (دو اسکائی اسکریپر):
ہم دو اسکائی اسکریپر ہیں،
شہر کا افتخار۔
مومو اور اُزر،
ہمارے پیار کے نام ہیں۔
اتنی بڑی دنیا کے
دوسرے اسکائی اسکریپروں کی طرح
ہمارے اندر لفٹیں
اور دوسرے پیچیدہ آلات ہیں۔
ہم ایک شہر سے تعلق رکھتے تھے
جو اَب شہر نہیں رہ گیا ہے۔
شہر کیا ہوتا ہے؟
شہر وہ جگہ ہے
جہاں کسی کو صبح چائے اور ٹوسٹ ملتا ہے
اس کے بارے میں سوچیے
شہر وہ جگہ ہے
جہاں دکانیں ہوتی ہیں
جہاں کوئی چائے خرید سکتا ہے۔ چائے خرید کر
لے جانے کے لیے اُس کا ایک گھر ہوتا ہے
اور گھر تک پہنچنے کے لیے
بس، ٹیکسی یا زیرِ زمین ٹرین
اور گھر میں
بجلی اور گیس ہوتی ہے جس سے

Scanned with CamScanner

تھوڑا سا پانی اُبالا جا سکے،
جہاں سب سے پہلی بات
پائپوں کے میل ہا میل سے گزر کر
نل میں آتا ہوا
پانی ہوتا ہے،
اور اگر کوئی ایک گرم کمرے میں بیٹھ کر
چائے پینا چاہے
تو گیس آتی رہنی چاہیے
اور کام کرنے والے ہونے چاہییں
اسے جاری رکھنے کے لیے
اور میل ہا میل پائپوں کے ذریعے
گھروں تک پہنچانے کے لیے۔
اور ٹوسٹ حاصل کرنا
بیکریوں پر
اور ان میں کارکنوں پر منحصر ہے
جو بغیر آستین کی قمیصوں میں ساری رات
وہاں کام کرتے ہیں۔
کسی شہر میں ان سب کی ضرورت ہوتی ہے
اگر کسی کو صبح صبح
چائے اور ٹوسٹ چاہیے۔
کوئی ذرا سی چیز بھی رہ جائے تو
چائے نہیں ہوتی
ٹوسٹ نہیں ہوتا
شہر نہیں ہوتا۔

***

سین ۳۷

ایک ناراض بیوی کا قصہ

مایا (ناراض بیوی): نکل جاؤ یہاں سے!
میں تمھاری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔ برسوں سے
اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا کہ
میں کون ہوں یا کیا ہوں یا میرے والدین کون تھے،
اور اب یہی سب سے اہم بات ہے۔
جب تک یہ سب شروع نہیں ہوا تھا،
مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ میری کوئی قوم ہے۔
اور اب تمھاری قوم میری قوم کے خلاف ہے۔
میں نے تم سے شادی کی تھی، تمھارے ماضی سے نہیں،
تمھارے عظیم اجداد سے نہیں، مُردوں سے نہیں۔
مجھ سے یہ مزید برداشت نہیں ہو سکتا۔
میں اسے بے ہودگی اور جارحیت کہتی ہوں
اور تم مجھے جتانا چاہتے ہو کہ یہ
نئی معقولیت اور نئی معنویت ہے۔
تمھارا بہت بہت شکریہ! تم جاؤ،
لڑکوں میں شامل ہو جاؤ اور جنگ کرو،
اپنے قبیلے کے لیے، اپنے وطن کے لیے،
افق پر اپنے گلابی مستقبل کے لیے۔
تاریخ آواز دے رہی ہے۔
خاک اور خون!
تمھاری مادرِ وطن کو ایک سپوت ملے گا
اور تمھارے بچے ایک باپ سے محروم ہو جائیں گے۔
ٹھیک ہے، یہ معمولی قیمت ہے!

Scanned with CamScanner

میں اپنے، بچوں کو، ہمارے، بچوں کو،
یہاں سے لے جارہی ہوں۔ خدا حافظ!
خوب جنگ کرو!

(وقفہ۔)

یہ آخری الفاظ تھے جو میں نے اُس سے کہے۔
میں نے اُسے پھر نہیں دیکھا،
اور اَب بہت دیر ہو چکی ہے۔
اور اَب مجھے افسوس ہو رہا ہے۔

***

سین ۳۸
شہر کے مرکز کی تلاش میں چار دینی پیشوا

عذرا (امام): یہ ضرور شہر کا مُردہ مرکز ہے۔
مایا (کیتھولک): شاید تھوڑا سا اَور دائیں طرف؟
فاتہ (اور تھوڈوکس): یا شاید بائیں طرف؟
سارا (ربی): یا شاید بالکل نہیں۔
عذرا (امام): ہم اَور قریب پہنچ گئے ہیں۔
مایا (کیتھولک): ہم نے پیمائش کی ہے۔
فاتہ (اور تھوڈوکس): ہم نے پیمائش پر پیمائش کی ہے۔
سارا (ربی): بار بار۔
عذرا (امام): ہمیں پورا یقین کر لینا چاہیے۔
مایا (کیتھولک): ورنہ دعائیں اثر نہیں کریں گی۔
فاتہ (اور تھوڈوکس): اثر کر ہی نہیں سکتیں۔

سارا (ربی): وقت کم ہے اور ہم جلدی میں ہیں۔
عذرا (امام): یہی ہے۔ یہی جگہ ہے۔
مایا (کیتھولک): شہر کا ستون۔
فاتہ (اورتھوڈوکس): وہ مقام جہاں سے ہر چیز شروع ہوتی ہے
اور جہاں لوٹ کر آتی ہے۔
سارا (ربی): ہمیں یہیں اپنا پُشت پناہ رکھنا چاہیے۔
عذرا (امام): قرآن اور تصوف۔
مایا (کیتھولک): بائبل۔
فاتہ (اورتھوڈوکس): اور ایپوکریفا۔
سارا (ربی): اور توریت اور تالمود۔
عذرا (امام): یہ چہار باد کا گلاب ہے۔
مایا (کیتھولک): اور چہار در کا دروازہ۔
فاتہ (اورتھوڈوکس): اور چہار کلس کی محراب۔
سارا (ربی): ساکن اور متحرک مقام۔
عذرا (امام): اگر یہ گر پڑے
مایا (کیتھولک): ہر چیز گر پڑتی ہے۔
فاتہ (اورتھوڈوکس): اگر یہ ناکام ہوجائے
سارا (ربی): ہر چیز ناکام ہوجاتی ہے۔
سب (ایک ساتھ):
آئیں وہ لوگ
جو آنا چاہتے ہیں
اور وہ چلے جائیں
جو جانا چاہتے ہیں
مجھے
اور میرے پیاروں کو
گزند پہنچائے بغیر

Scanned with CamScanner

(دینی پیشوائیں مختلف زبانوں میں دعا مانگتی ہیں۔)

اِس گھر
اور اس کے سب مکینوں پر
رحمت ہو!

***

سین ۳۹
ناموں کا مینار

سارا: پروفیسر حمدیا؟

(حمدیا اثبات میں سر ہلاتا ہے۔)

میں نے شہر کی تاریخ پر آپ کی کتابیں پڑھی ہیں۔
حمدیا: کیا تم ناموں کو سننا چاہو گی؟
سارا: کون سے نام؟
حمدیا: یہ نام:
دونیا،
مدحت، دامیر،
عصمت، بویان،
باحرہ، دُوشکا، میترہ، سلوبودان،
ایدن، عبداللہ، فواد، اینہ، گوران،
میروسلاو، آئیوو، ہرووبے، یاسنا،
واسویا، سینا، نِہاد،
ولادیمیر، سرجان،

عامرہ،
الما، جنانہ،
میریلا، نذیرہ، فاضلہ،
نیناد، میر سعد، میرزا،
امیر، یلینا، آرس، جنیتا، مارینا،
ویسنا، سانیا، انکیچا، محمد،
ابرو، زلاتکو، ایوان،
طارق، دراوکو،
سلاوکو۔
اور خاندانی نام:
حاجی بیگچ، موزینووچ، دیکلیچ،
حاجی یوسف بیگچ، فیانیچ، سیکی،
پاشچ، مارکووچ، لوورینووچ،
ماریانووچ، اوستی، سلیمانووچ،
میریچ، ماندچ، آغووچ،
آسیاس، پوپووسکی، پروان،
پیتروویچ، ویبر، لیویچ،
فرحتووچ، اولیاچا، پاردو،
بوموستار، سارالیچ، لائیٹنر،
واگنر، فشر، بلوم،
شلوسبرگ، والدیگ، کوبی،
آندرلون، آگوشتون، اجانیلا،
اولنبوک۔۔۔
اور پیار کے نام:
بوچکو، بیگا، زلایا، فاچو، کاکو،
کامپو، گلاوا، بارے، دینو،
زینی، یاکا، بمبو، آودو،

دُوچا، داچا، یاچا، میچا،
چیچا، دیکی، زوکی، کیکی،
میکی، پاشا، ساشا، فوکو،
زوکو، میرو، چیرو، زنکا،
منکا، پیکے، بیبا، بیبا، بیبا،
بیرا، کیرا، فوتا، گوتا،
چیگو، شوابو، اوگی، کوکی،
زدینا، گیگی، بوکی، سینا،
زینا، کینا، دیجا، فسکو،
گوگی، پاپے، چکو، تویگی،
زرکا، بلیا، بچوکا، باسے،
کیمو، کوکو، ایزو، بامے،
کانا، بیبی، نیکا، فاضلہ،
جیجی---

سارا: یہ زندہ لوگوں کے نام ہیں یا مُردوں کے؟
حمدیا: یا اُن کے جو ابھی پیدا نہیں ہوئے؟
سارا: کیا آپ کی فہرست میں مویو، سولیو، فاتہ، مایا، عذرا اور گورچین بھی ہیں؟
حمدیا: مویو، سولیو، فاتہ، مایا، عذرا اور گورچین۔
اب یہ بھی ہیں۔ اور تمھارا کیا نام ہے؟
سارا: سارا۔
حمدیا: اور سارا۔
اب تم بھی فہرست میں ہو۔

***

سین ۴۰
عام لوگوں کا گیت

سب لوگ: ہم
سرائیوو کے عام لوگ
تاریکی اور
کم زوری اور
ناامیدی کی اس گھڑی میں
عہد کرتے ہیں
زخموں پر مرہم رکھنے
اور راہ دکھانے کا،
اور ضمانت دیتے ہیں
رسموں کی ادائیگی کی حُرمت اور
شہر کو بدروحوں سے بچانے کی
ہم
نتیجہ خیز شکار اور ماہی گیری کے لیے مقامات کی
نشان دہی کریں گے
جنگلی حیات کی افزائش کریں گے
موسم پر قابو پائیں گے
بچوں کی پیدائش کا عمل آسان بنائیں گے اور
مستقبل کے واقعات کو آشکار کریں گے۔

***

Scanned with CamScanner

سین ۴۱

دوبارہ پناہ گاہ میں

قوسِ قزح والا آخری سین

(سین ۳ کی طرح۔ گولا باری جاری ہے۔)

رُودی: یہ مرچکی ہے۔
گورچین: یہ خوب صورت ہے۔
عذرا: یہ مری نہیں ہے۔ یہ بے ہوش ہے۔
فاتہ: خدا جانے اس کی ماں کہاں ہے۔
مایا: (اخبار پڑھتے ہوئے) یہ دیکھو۔ یہ میں نے لکھا ہے۔
مویو: (سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے) چھوڑو، اسے چھوڑو۔
مجھے اور بھی کام ہیں۔
سولیو: (گانے لگتا ہے۔)
حمدیا: خاموش رہو۔ جیسا کچھ ہے وہی بہت خراب ہے۔

(وقفہ۔ گورچین سارا کا سر تھامتا ہے۔ وہ اپنی آنکھیں کھولتی ہے اور ہوش میں آجاتی ہے۔ گورچین اسے حیرت سے دیکھتا ہے۔)

گورچین: ہم نے تمھیں مُردہ سمجھ لیا تھا۔
سارا: کیا میں مُردہ تھی؟
گورچین: میرا مطلب ہے ہم سمجھے تھے کہ تم مرچکی ہو۔
سارا: کیا میں مرچکی ہوں؟
گورچین: نہیں تم مری نہیں ہو۔ تم ابھی تک یہاں ہو۔
سارا: کیا میں یہاں ہوں؟
گورچین: تم عجیب ہو! تم ہو کون؟
سارا: سارا۔

گورچین: سارا کون؟

سارا: صرف سارا۔

گورچین: تم کیا کرتی ہو؟

سارا: پرواز کرتی ہوں۔

گورچین: پرواز؟ تم کیسے پرواز کرتی ہو؟

سارا: (خموشی۔)

گورچین: تمھارے پاس پر کہاں سے آ گئے؟
کہاں ہیں وہ؟ کیا وہ نظر نہیں آتے؟

سارا: (خموشی۔)

گورچین: تمھارا مطلب ہے تمھارے پاس فرشتوں جیسے پر ہیں؟

سارا: (اثبات میں سر ہلاتی ہے۔)

گورچین: روح کی طرح؟

سارا: (اثبات میں سر ہلاتی ہے۔)

گورچین: اب تم یہ نہ کہنا کہ تم کوئی دیوی وغیرہ ہو۔

سارا: (خموشی سے اس کی طرف دیکھتی ہے۔)

گورچین: اگر تم دیوی ہو تو پھر تمھاری طبیعت کیوں ٹھیک نہیں ہے؟

سارا: (اس کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔)

گورچین: تم نے یہ سب کیوں ہونے دیا؟

سارا: (اس کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔)

گورچین: تم یقیناً اس پناہ گاہ میں ہمارے ساتھ نہیں چھپو گی۔

(سارا اس کی طرف دیکھتی ہے۔ اچانک سارا سے ایک بہت بڑی قوسِ قزح اُبھرتی ہے۔ سرائیوو کے تاریک حیرت کدے میں ایک چھوٹا سا معجزہ ہوتا ہے۔ ہر شخص اسے دیکھتا ہے۔ وہ سب سارا کو حیرت سے دیکھتے ہیں۔ کیا وہ مر چکی ہے یا عنقا کی طرح اپنی راکھ سے دوبارہ جی اُٹھی ہے؟)

***

اضافی سین الف
کاراجوز تھیٹر

(یہ سین اٹھارویں صدی میں ملا مصطفیٰ باشیشکیا سکی کے لکھے ہوئے سرائیوو کے تذکرے پر مبنی ہے۔)

حمدیا: اور اب عربی تقویم کے مطابق بارھویں صدی
یا عیسوی تقویم کے مطابق اٹھارویں صدی کے سرائیوو میں
زندگی کا ایک منظر، جیسا کہ ۱۷۷۲ عیسوی میں میری،
یعنی ملا مصطفیٰ باشیشکیا سکی کی، زیرِہدایت
سرائیوو کے کاراجوز یعنی پرچھائیوں کے کٹھ پتلی تھیٹر نے
سوچا اور پیش کیا۔ پیش کش کے دوران
"دو مرتبہ ایک شہابِ ثاقب کو اُڑتے ہوئے دیکھا گیا
جو بہت روشن تھا۔"
بغیر ہاتھوں والی عورت: گاؤں سے ایک عورت سرائیوو لائی گئی
جو پیدائشی طور پر ہاتھوں سے محروم تھی مگر
اپنے پیروں سے کپڑے بُننے کا اور دوسرے کام کر سکتی تھی۔
وہ نمائش کے لیے استنبول لے جائی گئی۔
زلزلے: تین راتوں تک اکشام، یعنی شام، سے
یاچیا، یعنی رات، غروبِ آفتاب کے دو گھنٹے بعد، تک
ایک ہی وقت یکے بعد دیگرے زلزلے آتے رہے۔ اس کے بعد
سارا سال، شبانہ روز، زمین کے اندر سے
دھک دھک کرنے کی آوازیں سنی جا سکتی تھیں
جیسی کسی پیپے یا ڈھول پر دھمک ہو رہی ہو۔
اسلحے سے لدے اونٹ: ایک ہزار اونٹ اسلحہ لے کر سرائیوو آئے۔
پھر سات سو اونٹ بارود اور کارتوس لے کر بوسنیا پہنچے۔
سلطان کی جانب سے فرمان آیا کہ لوگوں سے اسلحہ لے لیا جائے

Scanned with CamScanner

اور قاضی کو اس بات پر مامور کیا گیا کہ یہ سب فروخت کر کے
اس کی قیمت اسلحے کے مالکوں کو دے دی جائے۔
طاعون: سرائیوو میں طاعون سب سے پہلے ورانتک محلّے میں پھیلا،
پھر ہرید، چیکالوشا اور بانیشکی بریگ تک بڑھا،
پھر سنبل محلہ اور پاشا محلہ زد میں آئے،
اور اس کے بعد کوسیوو، برکوشا اور سوق بونار۔
اس طرح طاعون اول اول شہر کے نواح اور غریبوں تک محدود رہا۔
سو متموّل شہریوں نے سوچا کہ یہ ان پر حملہ نہیں کرے گا۔
طاعون نے تین سال تک علاقے کو تاراج کیا اور
صرف سرائیوو کے شہر میں پندرہ ہزار آدمی مرے۔
طاعون کے پھیلاو کو روکنے کی دعا:
اے خدا، جو تمام نیکیوں کا خزانہ ہے، ہمیں اُن تمام چیزوں سے
محفوظ رکھ جن سے ہم خوف زدہ ہیں
سب سے پہلا مرنے والا چا بریک پا کا بریک اوغلی تھا،
بیس دن بعد اس کا بھائی سلیمان، کیتلی بنانے والا، بھی
طاعون سے چل بسا۔ یہ معلوم ہو!
پھر بوڑھا زین ساز، علی باشا کا باپ،
نان بائی کا لڑکا سکندر،
ملا عثمان، مفتیہ کا بھائی،
ملا عودیہ درویش بلغراد میں طاعون سے مرا۔
رحین کا بھائی اسکوپیے میں طاعون سے مرا۔
مشہور فربہ اندام، سردار احمد، ادرنہ میں مرا۔
سیہ ابجیم گوالا،
یشو محافظ،
گراہو لوہار،
دیوے تابان حمّال،
بوڑھا دوراک،

Scanned with CamScanner

ابراہیم مالی، یشار کا بھائی
صالح بڑھئی،
بلبل حجام،
شہر میں منادی کرنے والا،
لالٹینیں بنانے والا،
تمباکو فروش،
تورلو کام سیکھنے والا لڑکا،
مدرسے کا طالب علم،
وہ غریب شخص جو ہمیشہ اُدھار لیا کرتا تھا،
آر نواینٹیں چننے والا،
دوغو یا دوغی، موذن،
صالح پتھر پھینکنے والا،
فوچو نابینا،
پاگل علیا، ہمارا پڑوسی،
احمد آفندی اوبرالیہ، کتب خانے کا نگراں،
ماشو، بڑی سرائے کا معمار،
دوسری وجہوں سے مرنے والے:
چوکیدار حالاچ قتل ہوا،
مونچھوں والا علی پاشا جو محصول جمع کرتا تھا، وہ بھی قتل ہوا،
کالے عمر کا لڑکا بند باشا میں ڈوب گیا،
پاشا محلّے کا دکان دار افیون نوشی سے مرا،
حاجی ماکو مکّے کے راستے میں مرا،
ایک آدمی کا گلا گھونٹ دیا گیا، خدا جانے کیوں۔
بچے: سرائیوو کے تمام بچے سردی لگنے سے بیمار ہوے۔
لاشیں: سرائیوو کے درختوں پر کوئی پھل نہیں آیا۔
درختوں پر پتیاں سوکھ گئیں۔
کیڑے مکوڑوں کی بڑی تعداد نمودار ہوئی

Scanned with CamScanner

جنہیں خدا نے چڑیوں کا رزق بنایا۔
کتوں کے کانوں پر زخم پڑ گئے جن پر پسوؤں نے خون چوسنے کے لیے حملہ کیا۔
شتر مرغ اور بینڈھے: خطاط اور مصری سوداگر حسن آفندی
سرائیوو میں ایک شتر مرغ اور دو عجیب بینڈھے لایا۔
اس نے ان لوگوں سے کافی رقم کمائی جو انھیں دیکھنے آئے۔
سیلاب: ایک بہت بڑا سیلاب آیا اور کساپ چارشیا میں ایک چکی
اور کازان دالگک میں کئی دکانوں کو تباہ کر گیا۔
سارا بازار پانی میں ڈوب گیا۔
پانی بستروں کی آدھی اونچائی تک پہنچ گیا۔
اس کی وجہ سے بہت زیادہ ضرر اور نقصان ہوا۔
بہت سے کتے ڈوب گئے اور دو آدمی بھی
جن میں سے ایک فوراً اور دوسرا بعد کے مرحلے میں مر گیا۔
سردی: سردی اتنی سخت تھی کہ کسی کو یاد نہیں کہ
اس سے پہلے ایسی سردی پڑی ہو۔
پانی جم گیا اور اس پر برف کی کئی تہیں پڑ گئیں۔
الفاظ میں ان کا بیان نہیں ہو سکتا۔
بچے سردی کے سارے موسم میں برف پر پھسلتے رہے۔
کم از کم وہ خوش تھے۔
اچار اور گوبھیاں تہہ خانوں میں جم گئیں۔
سردی کی وجہ سے بہت سے پرندے بھی مر گئے۔
خواب: دشمن ربی کے پیچھے چلتے ہیں اور ایک یہودی کی لاش لیے ہیں۔
ایک نائی کلہاڑی سے قاضی کی داڑھی مونڈتا ہے۔
ایک محصول جمع کرنے والا لوگوں کو اپنے گھر دعوت پر بلاتا ہے۔
وہ آتے ہیں مگر وہاں کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے،
صرف روٹی کے چند ٹکڑے پڑے ہیں۔
کھال کھنچے ہوئے کئی گھوڑے سرپٹ دوڑتے ہیں
اور زمین پر گر پڑتے ہیں۔

ایک خیال : بحیرہ عمان میں ایک ٹیڑھا جزیرہ ہے جو دور سے نظر آتا ہے،
گر کوئی کبھی اس پر پہنچ نہیں پایا۔ جزیرے میں ایک درخت
ایک لاکھ آدمیوں کو ٹھنڈی چھاؤں پہنچا سکتا ہے،
اور اس کا پھل انسان کو نوجوان بنا دیتا ہے،
اس کے چہرے سے جھریاں مٹا دیتا ہے اور
اس کی داڑھی کو دوبارہ سیاہ کر دیتا ہے۔
دعا : خدا کرے سردیاں سردیاں رہیں اور گرمیاں گرمیاں،
خدا کرے دوست بہت ہوں اور دشمن کم۔
نقاب پوش لڑکی : ایک گز والی لڑکی نمودار ہوئی۔
وہ وحشی تھی اور کوئی اس سے کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا،
کیوں کہ وہ پیچھے لگ جاتی تھی۔
وہ ایک نقاب پہنتی تھی اور کوئی نہیں جانتا وہ کون تھی۔
شہر میں منادی کرنے والا : میں اعلان کرتا ہوں کہ یہودی اور عیسائی
اب زرد سلیپر ہرگز نہ پہنیں۔ وہ صرف سرخ سلیپر پہنا کریں۔
میں اعلان کرتا ہوں کہ اس سال کے شروع میں
زرد سلیپر پہننے کے حکم کا اطلاق اب نہیں ہوگا۔
بارود ساز : جفت سازوں کے تفریح پر بہت زیادہ لوگ جمع ہوے
اور ہزاروں لوگ یہ دیکھنے آگئے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔
ایک آدمی نے آتش بازی پیش کی۔ وہ بارود اور آگ سے
ہر طرح کی چیزیں پیش کرنا جانتا تھا
اور اس نے بہت پیسے کمائے۔

***

Scanned with CamScanner

اضافی سین ب
گیت کا سیمنار

(سنے آن سنے، اصلی اور تصوراتی، ایک اور بہت سے ذریعوں سے پہنچنے والے، ایک اور بہت سی آوازوں میں، زیادہ سے زیادہ ہوتے ہوئے، پیچ کھاتے، باز گشت کرتے اور مدھم ہوتے ہوئے گیت۔)

جب میں بمباسا گیا
بمباسا گیا تھوڑا سا پانی لانے
میں سفید بھیڑ لے گیا
اپنے ساتھ سفید بھیڑ لے گیا

شام شروع ہوتے ہی کتنی خوشی ہوتی ہے
خوشی کے بغیر زندگی نہیں
فاصلہ کے بغیر محبت نہیں

یا بوریتا پہاڑ کتنا اونچا ہے
خاکستری عقاب اس کے اوپر نہیں اُڑ سکتا
نوجوان لڑکی اسے پار کر گئی
بغیر کسی گھوڑے کے پار کر گئی

پلیوا کی دوسری طرف گھاس اگتی ہے
گھنی گھاس اگتی ہے
اور بھیڑیں چرتی ہیں
ایک لڑکا ان کا چرواہا ہے
لڑکا غم سے روتا ہے

Scanned with CamScanner

وہ غم سے پھٹتا ہے
یہ کون سا گہرا غم ہے؟
اپنے وطن سے دوری کا غم ہے

اے ہوا، چل
تھوڑی دیر کے لیے
زرتوا کی طرف
زرتوا کی طرف
اور موستار کی دھُند کو اُڑا لے جا
موستار کی دھُند، موستار کی دھُند

پھر میں اپنی محبوب دارا کو دیکھوں گا
میری محبوب دارا
اور پوچھوں گا کیا وہ لڑکوں کو
اپنا بوسہ لینے دیتی ہے
اپنا بوسہ لینے دیتی ہے

میں لڑکی کا ہے کو ہوں گی
اگر میں
لڑکوں کو اپنا بوسہ نہ لینے دوں
لڑکوں کو اپنا بوسہ نہ لینے دوں

لطیف آغا ایک سفر میں
اپنے دوست سلیمان کے ساتھ ہے
کیا تمھیں بنالوقا کی یاد نہیں آتی؟
اور بنالوقا کے جشنوں کی؟
اور ورباس کے کنارے نیم مست جمگھٹوں کی؟

Scanned with CamScanner

ہاں، مجھے بنالوقا کی
اور بنالوقا کے جشنوں کی
اور وربا س کے کنارے نیم مست جمگھٹوں کی
یاد آتی ہے

مویو چاندنی میں اپنے گھوڑے کی نعل جڑ رہا ہے
مویو نعل جڑ رہا ہے اور اس کی ماں اسے بُرا بھلا کہہ رہی ہے
گھوڑوں کی نعلیں چاندنی میں نہیں
دن کی روشنی میں، تپتی ہوئی دھوپ میں جڑتے ہیں

علیا، اب تم ہمارے درمیان نہیں ہو
اے سودہ کی روح، اب تم ہمارے درمیان
شراب پینے اور گانا گانے
اور پُرانی ٹولی کو نیم مست بنانے کے لیے نہیں ہو

Scanned with CamScanner

۱۳

ڈبراوکا اُگریشک : جھوٹ کا کلچر

ڈبراوکا اُگریشک : زگرب، خزاں ۱۹۹۲

ڈبراوکا اُگریشک : کروشیائی ادیبو، شب بخیر!

ڈبراوکا اُگریشک : بلقان کے اُداس گیت

ڈبراوکا اُگریشک (Dubravka Ugresic) ۱۹۴۹ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے اور بچوں کے لیے تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ روسی ادب سے متعدد ترجمے اور روسی ادب کے بارے میں بہت سے مضامین بھی چھپ چکے ہیں۔ انگریزی میں اُگریشک کی تین کتابیں *Fording the Stream of Consciousness* (وراگو، ۱۹۹۱)، *In the Jaws of Life* (وراگو، ۱۹۹۲) اور *My American Fictionary* (کیپ، ۱۹۹۴) شائع ہوئی ہیں۔ کروشیا سے ترکِ وطن کرنے سے پہلے وہ ان پانچ ممتاز کروشیائی ادیبوں میں شامل تھیں جنھوں نے فکر کی آزادی کو نئے "قومی ریاستی کلچر" پر ترجیح دی اور جنھیں پریس نے غدار ٹھہرایا اور (چوں کہ اتفاق سے پانچوں عورتیں تھیں) "چڑیلوں" کا لقب دیا۔ ان ادیبوں میں ایک نام سلاوینکا دراکولیچ (Slavenka Drakulic) کا بھی تھا۔

Scanned with CamScanner

دُبراوکا اُگریشِک

ترجمہ: فہمیدہ ریاض

جھوٹ کا کلچر

لوگ ہمیشہ نعرہ تو یہی لگاتے ہیں کہ وہ ایک بہتر مستقبل کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ دراصل یہ درست نہیں۔ مستقبل تو ہم سے بے نیاز ایک خلا ہے جس سے کسی کو دل چسپی نہیں ہو سکتی۔ زندہ تو ماضی ہے، جان جان کر ہمیں غصہ دلاتا ہوا، چٹکیاں لیتا، ہمیں اُکساتا ہوا کہ ہم اسے نیست و نابود کر ڈالیں یا ازسرِ نو مرتب کریں۔ لوگ مستقبل کے مالک بننا ہی اس لیے چاہتے ہیں تاکہ ماضی کو بدل سکیں۔ لوگ اُن تجربہ گاہوں میں داخلہ حاصل کرنے کے لیے برسرِ پیکار ہیں جہاں تصویروں کے خدوخال تبدیل کیے جاتے ہیں اور سوانح عمریوں کو اور تاریخ کو پھر سے لکھا جاتا ہے۔

(میلان کنڈیرا: "خندہ اور فراموشی کی کتاب")

زگرب کے ایک اسپتال میں، حال ہی میں، سرائیوو کے ایک شناسا سے میری ملاقات ہوئی۔ اس کی حالت کافی خراب تھی۔ دائیں ٹانگ پر پلاسٹر، بایاں بازو پٹیوں میں، سارے بدن پر نیل---

"اُف خدا!" میں چلائی، کیوں کہ اور میں کیا کہتی۔

اس نے کہا: "ابھی ابھی سرائیوو سے آیا ہوں۔"

"اُف خدا!" میں نے سر ہلایا۔ "یہ سب--- کیسے ہو گیا؟" میں نے پوچھا۔ (اس سے بڑھ کر احمقانہ سوال اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔)

"میں بتاتا ہوں۔ مگر وعدہ کرو تم کسی سے کہو گی نہیں۔" میں نے سر کے اشارے سے وعدہ کیا۔ مجھے شدید احساسِ جرم ہو رہا تھا اور اس سرائیوو کے شناسا کے لیے بے حد دردمندی بھی محسوس ہو رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

"میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ اچانک --- دھم! ایک گرینیڈ کھلی کھڑکی سے اندر آن گرا۔"

"پھر؟" میں نے اُلٹی سانس بھر کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ وہ پھٹا نہیں --- میں نے اسے اٹھایا --- اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ اور کیا کرتا؟"

"پھر؟"

"پھر کچھ نہیں۔ گرینیڈ پھٹ گیا اور باہر والی دیوار گر پڑی۔"

"پھر؟"

"کچھ نہیں۔ میں نے ٹوٹی دیوار سے باہر جھانکا اور دوسری منزل سے گر پڑا --- سڑک پر۔"

"پھر؟"

"کچھ نہیں۔ بے حد چوٹیں آئیں۔"

سرائیوو کے اس میرے شناسا نے مجھے سچ بتایا تھا۔ لیکن اُس کا سچ کچھ ایسا تھا جو گویا اصلیت کو کم کر کے ظاہر کرتا ہو۔ پل بھر کو اس کی بات نے سرائیوو کے شہریوں کے ہولناک اجتماعی مصائب کو اوجھل کر دیا، بلکہ ان کا مذاق سا بنا دیا۔ نتیجتاً مجھے اس لمحے یوں لگا جیسے وہ مجھے دھوکا دے رہا ہے، کوئی مذموم لطیفہ سنا رہا ہے (اور اس پر ہم دردی کا بھی طالب ہے!)۔ میری موہوم سی مایوسی کو یہ حقیقت بھی کم نہیں کر سکتی تھی کہ وہ بدنصیب شخص بمشکل زندہ بچ پایا ہے اور اس نے اس المناک حشر سے دوچار ہونے والے شہر میں پورا ایک سال گزارا ہے، یا یہ کہ بچ نکلنے پر اس نے مجھے بس آخری واقعہ سنایا جو خود اُس کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اس کے بدن پر اتنی پٹیاں بندھی تھیں کہ وہ مجھے شجاعت کی کوئی من گھڑت، ولولہ انگیز داستان سنا سکتا تھا۔ اور درحقیقت وہی "سچ" ہوتا۔

وہ شخص بھی اُن سب کی طرح تھا جو زمانۂ جنگ کی ہولناکی میں صرف اپنا ذاتی "سچ" بتاتے ہیں۔ ہولناک زمانے عموماً "اجتماع" کے زمانے ہوتے ہیں۔ "سچ" وہی ہوتا ہے جو اس نقشے میں آسانی سے بیٹھ سکے جسے اجتماع سچ تسلیم کرتا ہے۔ اس میں اگر ہم دورِ جدید کے بعد والا الجھاو شامل کر لیں --- تو سچ جھوٹ معلوم ہونے لگے گا اور جھوٹ سچ۔

Scanned with CamScanner

جنگ کے ہولناک زمانے میں، موت کے کلچر کے علاوہ جو چیز آتش زدہ چہروں کی تصویروں کے مسخ نقوش کی طرح اُبھر کر آتی ہے وہ لوگوں کی دوہری زندگیوں کی شکلیں ہیں۔ اس گڈمڈ میں ایک بھیانک توازنِ اضداد قائم ہو جاتا ہے۔ مصائب کے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں مصائب کے طنز کرتے ناٹک، جو ماتم کے سیاہ لباس میں روپوش ہوتے ہیں۔ المیے کے ساتھ المیے کی مزاحیہ نقل گھسٹتی چلتی ہے، اور ناخوشی کے ساتھ کلبیت بندھی چلی آتی ہے۔ وحشی پن اور دردمندی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ عظیم سچائیوں کے زمانے عموماً ہمہ گیر جھوٹ کے کلچر سے معمور ہوتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے جیسے بلقان کی چھوٹی چھوٹی قوموں نے جھوٹ کا یہ کلچر برسوں پہلے ایجاد کر لیا تھا اور اس کے ساتھ رہتے بستے، اسے قائم رکھتے اور مضبوط کرتے چلے آ رہے ہیں۔ جھوٹ بولنا، موت کی طرح، ایک عام سی بات، روزمرہ کا طرزِ عمل بن گیا ہے، عادی جھوٹے بالکل عام شہری ہیں۔ اور اگر سربیائی ادیب اور "جعلی یوگوسلاویا" کے ناکام صدر دوبریکا کوشیک (Dobrica Cosic) کو کسی بات پر خراجِ تحسین پیش کرنا ہی ہو تو ان کا یہ قول اس کا مستحق ہے: "جھوٹ بولنا ہماری حبِ وطن کا ایک پہلو ہے اور ہماری خداداد ذہانت کا ثبوت۔"

سب سے زیادہ تعجب خیز بات لوگوں کی جھوٹ بولنے کی صلاحیت ہے جو ہر سطح پر موجود ہے؛ اور جن لوگوں نے آج کے یوگوسلاویا میں ہوتے رہنے والے مذاکرات میں شرکت کی ہے وہ یقیناً اس سے بخوبی واقف ہیں۔ سچ پوچھیے تو یقین نہیں آتا۔ آپ دیکھیے کہ کتنی جنگ بندیاں توڑی گئی ہیں۔ لوگ کاغذات پر اس ارادے کے ساتھ دستخط کرتے ہیں کہ انہیں فوراً نظرانداز کر دیں گے۔ سابق یوگوسلاویا میں عزت داری کے طرزِ عمل کا تصور غائب ہو چکا ہے، اور یہ بات کلچر کا حصہ بن گئی ہے۔ جھوٹ اتنا عام ہو گیا ہے کہ اگر آپ کو احساس ہو کہ فلاں یا فلاں شخص جھوٹ بول رہا ہے تو آپ کو حیرت تک نہیں ہوتی۔ لارڈ اوون نے کہا تھا کہ یہاں سب جھوٹ کے کلچر پر پل رہے ہیں۔ خود اوون نے جھوٹوں کے ساتھ معاہدہ کرتے وقت یہ نہ سوچا کہ اس طرح یوروپ کے "عزت دارانہ طرزِ عمل" کی خلاف ورزی ہو گی (اگر ایسی کوئی چیز ہوتی ہے اور اگر واقعی وہ داؤ پر لگی ہوئی تھی تو۔)

کیا جھوٹ کے کلچر کا مسئلہ اتنا ہی سہل ہے؟

لوگ یوگوسلاویا میں (جو اب نہیں ہے)، اپنے ملک میں، برسوں سے رہ رہے تھے۔ وہ صرف

Scanned with CamScanner

سڑکیں اور پُل اور ریلوے لائنیں اور شہر ہی نہیں بلکہ اقدار کا ایک نظام بھی تعمیر کر رہے تھے۔ اس نظامِ اقدار کا بنیادی پتھر "سوشلزم کا نظریہ اور عمل" تھا۔ (آج وہی لوگ اسے "کمیونزم"، "ٹیٹو کی حکمرانی" اور "کمیونسٹ آمریت" کا نام دیتے ہیں۔) اس رویّے کی ابتدا بہت حد تک اسٹالن کے دور سے یوگوسلاویا کی علیحدگی سے ہوتی ہے (خواہ یہ علیحدگی بھی "اسی آزمودہ علاج" کے اصول پر مبنی رہی ہو: یعنی بہت سے لوگوں نے نظریاتی راہ بدلنے کے پُرسرعت عمل کا ساتھ نہ دے پاکر یوگوسلاویا کے گلاگ، گولی او توک، میں سزائیں بھگتیں۔) پھر وہ معروف "یوگوسلاوِزم" تھی۔ اس کا مطلب کثیر القومی، متنوع تہذیبیں رکھنے والی قومیت تھا، جس کے قائم ہونے اور برقرار رہنے میں فقط ٹیٹو کے اخوت اور بھائی چارے کے نعروں کا ہاتھ نہ تھا، بلکہ یہ روزمرہ کے عمل میں آنے والی حقیقت بھی تھی۔ (اب وہی تمام لوگ دعویٰ کر رہے ہیں کہ وہ تو قومیتوں کے قید خانے میں رہ رہے تھے، اور یہ کہ موجودہ وحشیانہ جنگ کا ذمے دار تو یوگوسلاوزم کا تصور ہے نہ کہ وہ خود۔)

صرف دس برس پہلے کی بات ہے کہ سابق یوگوسلاویا کے عوام نے ٹیٹو کی موت پر خلوص کے ساتھ آنسو بہائے تھے جو ان کی طویل العمر اماں کی طرح تھا۔ آج وہی لوگ یک زبان ہو کر کہہ رہے ہیں کہ وہ "ایک ظالم و جابر کمیونسٹ آمر" کی حکمرانی میں رہتے تھے۔ کچھ لوگ تو ٹیٹو کے پلاسٹر کے بنائے چہروں پر غصہ اتار رہے ہیں گویا مٹی کے بنے کبوتروں پر نشانہ بازی کی مشق کرتے ہوں۔ اب (دس برس بعد!) اس عمل کے ذریعے وہ خود پر سے کمیونزم کا جِن اتار رہے ہیں۔ گڑے مُردے اکھاڑنے (اور نئے مُردے گاڑنے) کا بلقانی شغف کسی کو نہیں بخشتا: سرب کروٹوں کو دھمکیاں دے رہے ہیں کہ ٹیٹو کی میّت بلغراد سے اکھاڑ کر انھیں ارسال کر دی جائے گی۔

آج وہ لوگ اجتماع کی اسی زبان میں اپنا اپنا "سچ" بیان کر رہے ہیں جو پچاس برس تک خاموش رہے، یعنی وہ لوگ جو اسی اجتماعی زبان میں کثیر القومی ہم وطنی کے بیج کو پورے پچاس برس تک جیتے رہے۔

آمرانہ نظامِ حکومت رکھنے والی دوسری ریاستوں میں زیرِزمین دانش ورانہ سرگرمیوں کی ایک پوری دنیا آباد ہوتی ہے، اندرونِ ملک بھی اور باہر بھی۔ یوگوسلاویا میں (ابتدائی کمیونسٹ برسوں میں اختلاف رکھنے والوں کی معمولی سی تعداد کے سوا) ایسی سرگرمیاں چنداں نہ تھیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد "اُستاشوں"، "چیتنکوں"، "فاشزم کا ساتھ دینے والوں" اور "کمیونزم مخالف لوگوں کو (زندہ یا مُردہ) ملک سے نکالا جا چکا تھا۔ کوئی بیس برس بعد بہت سے لوگ اقتصادی وجوہ سے ملک

چھوڑ گئے۔ ترکِ وطن کرنے والوں میں دانش وروں کی تعداد نہایت معمولی تھی۔ اگر یوگوسلاویا میں بڑی مضبوط زیرِزمین دانش ورانہ مزاحمت موجود تھی --- جیسا کہ آج سب قسمیں کھا رہے ہیں کہ موجود تھی --- تو یہ کیوں کر ممکن ہوا کہ اس کے بارے میں کسی کو ذرّہ برابر علم نہ تھا؟ اور اگر ایسی کسی مزاحمت کا وجود نہ تھا تو ہم اس بات پر کیوں کر یقین کر لیں کہ جس سچ کو لوگوں نے نام نہاد "قومیتوں کے قید خانے" کی دیواروں کے پیچھے تراشا تھا وہ وہی ہے جو اب منظرِعام پر آیا ہے؟ شاید یوگوسلاویا کی نرم خُو آمریت ایسی بھی نرم نہیں تھی، شاید اس میں البانیا یا رومانیا کی آمریت سے زیادہ سختی تھی؟ اگر یہ بات ہے تو کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ اس پر اتنا کم احتجاج ہوا۔

آج کی ایک سچائی جو ثابت کی جا سکتی ہے اور ٹھوس حقیقت ہے وہ تو یہ ہے کہ سابق یوگوسلاویا کے متعدد دانش ور (ادیب، ہدایت کار، فلسفی، اداکار، صحافی) اپنی مرضی سے مجبور پناہ گزینوں کے سمندر میں شامل ہو کر دوسرے ممالک کے در پر دستک دے رہے ہیں۔ تو پھر سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ پرانے سچ کی جگہ اب ایک نیا جھوٹ لے رہا ہے؟ یا پھر معاملہ اس کے اُلٹ ہے؟

ہولناک زمانے اپنی ایک مخصوص تال سے پہچانے جاتے ہیں، جو تباہی اور آبادکاری، بدنظمی اور نظام بندی، آناًفاناً تخریب اور ساتھ ساتھ چلنے والی تعمیر کی تال ہے۔ جو تھا وہ تباہ ہو جاتا ہے (شہر، نظریات، پُل، معیار، کتب خانے، رواج، گرجاگھر، شادیاں، یادگاریں، زندگیاں، قبریں، دوستیاں، گھربار، اساطیر)؛ پہلے والا سچ توڑپھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کی جگہ سرعت سے وہ چیز تعمیر کی جاتی ہے جسے نئے سچ کا درجہ حاصل ہو گا۔

کروشیا کے ایک چھوٹے سے شہر دوگاریس (Duga Res) میں ٹیٹو کی سالگرہ پر اٹھاسی درخت لگائے گئے تھے۔ شہر کے رہنے والوں نے یہ درخت اب کاٹ ڈالے ہیں: ان کا کہنا ہے کہ وہ "کمیونسٹ حکومت کی آخری نشانیاں" مٹا ڈالنا چاہتے ہیں۔ درخت کاٹنے والے لوگ وہی ہیں جنھوں نے درخت لگائے تھے۔

سربیائی قاتل جنرل ملادِک، جو سال بھر سے زیادہ عرصے سے سرائیوو کے بے گناہ شہر کو قبرستان میں تبدیل کرنے میں مشغول ہے، اس کے بارے میں ایک کہانی آج کل اکثر بیان کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے سرائیوو کے اردگرد کی پہاڑیوں پر سے اپنے کسی دوست کے مکان کو توپوں کے نشانے پر لے لیا۔ کہانی کا اگلا حصہ یہ ہے کہ اس کے بعد اس قاتل نے اپنے دوست کو فون پر اطلاع دی کہ اس کا گھر تباہ کیا جانے والا ہے۔

Scanned with CamScanner

"تمھارے پاس صرف پانچ منٹ ہیں۔ اپنی البمیں لے کر باہر نکل جاؤ!"

قاتل جنرل کی مراد خاندانی تصویروں کی البموں سے تھی۔ اپنے منتخب کردہ شکار کی تمام متاع کو تباہ کرنے سے پہلے، جنرل نے کمال فیاضی سے کام لیتے ہوئے اُسے یادداشت کے حق کے ساتھ، خاندان کی چند تصویروں کے ساتھ، بچ نکلنے کا موقع دے دیا۔

جس چیز کو اس وقت بندوق سے، جبری زنا سے، قتل و غارت کے ذریعے، لوگوں کو بے گھر بے در کرکے، نسلی خالصیت کے اقدامات کے ذریعے (اس نئے نظریے کی مدد سے جسے ذرائع ابلاغ کی حمایت حاصل ہے) نیست و نابود کیا جارہا ہے، وہ ہے یادداشت۔ اس کے کھنڈروں پر آج کا سچ کھڑا کیا جارہا ہے جسے کل واحد یاد کی حیثیت حاصل ہوجائے گی۔ اس طرح اگر دیکھیں تو سابق یوگوسلاویا کی دھرتی پر ہونے والی جنگ معدوم ہونے اور وجود میں آنے کی وہی پُرانی کہانی دُہرا رہی ہے جو پوری انسانی تہذیب کی کہانی ہے۔

یوگوسلاو عوام، جو ہنوز تشکیک سے نابلد ہیں، پختہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ سچ کی خاطر نبرد آزما ہیں۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہو تب بھی انھیں معلوم ہے کہ ہر جھوٹ جسے تازہ تازہ سچ تسلیم کیا جائے، آخرکار سچ ہی بن جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب یہ ہولناک زمانہ آخرکار گزر جائے گا تو بچ نکلنے والے ہرگز شرمندہ نہیں ہوں گے۔ جو نئے ملک وجود میں آئیں گے ان کے شہریوں کو ہزاروں لوگوں کی ہلاکت پر، دربدری پر، دردناک مصائب پر، لاکھوں زندگیوں کی بربادی پر، اس ملک کی تباہی پر جسے انھوں نے کبھی اکھٹے تعمیر کیا تھا، کسی قسم کی شرمندگی محسوس نہیں ہوگی۔ کوئی شرمسار نہ ہوگا، نہ طاقت ور جنھوں نے حملہ کیا، اور نہ کم زور جنھوں نے مدافعت کی۔

کیا ذرائع ابلاغ کے لیے جنگ شروع کرانا ممکن ہے؟ میں تو یہ کہنے کی جرأت کروں گی کہ یوگوسلاویا کی سرزمین پر جنگ برسوں پہلے ایک قطعی بے قصور سرب کسان کی مقعد سے شروع ہوئی تھی۔ مجھے آج بھی اُس کا نام یاد ہے: مارتینوویکا۔ مہینوں یہ بےچارہ، جو کسی کھیت میں اس حالت میں پایا گیا تھا کہ ایک بوتل اس کی مقعد میں نصب تھی، اخباروں اور ٹی وی اسٹیشنوں میں (خصوصاً سربیا کے اخباروں اور ٹی وی اسٹیشنوں میں) موضوعِ بحث بنا رہا۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ مارتینوویکا کے ساتھ البانیوں نے بیئر کی بوتل سے زبردستی کی، دوسروں کا خیال تھا کہ وہ خود کج رو تھا اور بوتل سے خودلذتی کر رہا تھا۔ کچھ اَور لوگوں کے خیال میں یہ کام خود سربیوں نے کیا تھا تاکہ اس کی ذمےداری البانیوں پر ڈالی جاسکے۔ بعض حلقے جوزخم کی نوعیت کے ذریعے واقعے کی تہ تک

پہنچنا چاہتے تھے، اس خیال کے تحت کہ اس نے خود ہی قریب کے درخت سے بوتل پر چھلانگ ماری تھی۔ اس کی غم زدہ اور متعدد اولادوں نے باپ کے حق میں بیانات دیے اور کئی ڈاکٹروں نے زخم کھانے یا ازخود لگانے کے امکانات پر بحث و تمحیص کی۔ بےچارے کسان نے یہ تمام وقت اسپتال کے بستر پر ٹی وی کیمروں کے سامنے نقاہت سے مسکراتے ہوئے گزارا۔ ذرائع ابلاغ نے اس کی مقعد کا تماشا بنادیا تھا جو کہ بلقان کی روح کے عین مطابق ہے۔

اس واقعے نے سربیا کے رہنے والوں کے اس اعتقاد کو صحیح ثابت کردیا کہ سربیا کے قائد میلوشیوچ کا یہ فیصلہ قطعی درست تھا کہ کوسووو (Kosovo) اور وویوودینا (Vojvodina) کی علاقائی خودمختاری کو قلم زد کردیا جائے اور آئین کو پُرتشدد طور پر بدل دیا جائے! اس طرح عوام کو ذرائع ابلاغ کی اس بےہودہ اور بھونڈی کہانی میں جذباتی ہو ہو کر حصہ لینے کی عادت پڑ گئی۔ انھوں نے ایک بار پھر ثابت کردیا کہ وہ ذرائع ابلاغ کے ہاتھوں میں نہایت آسانی سے کھیل سکتے ہیں۔

اس کے بعد تو "شہادت" پیش کرنے والے واقعات کا، مثلاً البانیوں کے ہاتھوں سرب اقلیت کے قتلِ عام (!) کی کہانیوں کا، تانتا بندھ گیا جن میں سے ہر کہانی کا سربیا کے ذرائع ابلاغ نے پوری طرح حق ادا کیا۔ لاتعداد سربیائی عورتیں اچانک کہیں سے نکل آئیں جن کے ساتھ جبری زنا کیا گیا تھا اور اس کا ذمےدار البانیوں کے سوا کون ہو سکتا تھا! خود کو اپنے مجروح قومی وقار کا جواز دے کر، اور ذرائع ابلاغ کے مہیا کیے ہوئے قومی اساطیر سے غذا پا کر، سربیائی قوم پرستوں نے کوسووو میں البانیوں پر ظلم و تعدی میں اجتماعی طور پر خود عملی حصہ لیا یا اس کی حمایت کی۔

اور چوں کہ بلقان کے اس بدبخت خطے میں ہر جھوٹ سچ بن جاتا ہے، منھ سے نکلی ہر بات حقیقت ہو جاتی ہے، اس لیے چند برس بعد اس جنگ کا آغاز ہو گیا جو اپنی اصل میں "مردانہ"، اور نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو ہم جنسی کی نوعیت کی جنگ ہے، اور جس میں جبری زنا بطور جنگی حکمتِ عملی روزمرہ کی بےرحم حقیقت بن گیا۔ جبری زنا کا شکار ہونے والی عورتیں بلاشبہ بالکل معصوم تھیں۔ اُن کے بدن تو صرف متحارب گروہوں کے مردانہ پیغامات ایک دوسرے تک پہنچانے کے لیے استعمال ہو رہے تھے۔

ذرائع ابلاغ نے ایک جانی مانی حقیقت کو ازسرِنو دریافت کیا: کہ اپنے قائدین اور ان کی طاقت، ان کے سیاسی ڈھونگ اور اصل عزائم کو خلط ملط کردیا جائے تو نسخہ کارگر رہتا ہے۔ انھیں ایک اور حقیقت کا بھی علم ہوا جس سے شاید وہ پہلے واقف نہ رہے ہوں گے، اور وہ یہ کہ ان کی

قوت کتنی زیادہ ہے! اتنی کہ کسی کے سان گمان میں بھی نہ آئے! کیسا نہ وہ اطمینان کے لطف سے تھر تھرائے ہوں گے جب ان پر انکشاف ہوا ہو گا کہ جھوٹ کتنی آسانی سے جائز سچ بن جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ حیرت میں رہ گئے ہوں گے کہ جب دوسری اطلاعات مہیا نہ ہوں تو لوگ ہر اس بات پر یقین کر لیتے ہیں جو اُن تک پہنچائی جائے، کہ اگر دوسری اطلاعات مہیا بھی ہوں تو لوگ اُسی بات پر یقین کرتے ہیں جس پر وہ یقین کرنا چاہتے ہیں، یعنی اپنے ذرائع ابلاغ پر جو خاص الخاص اُن کے لیے ایک نئی دیومالا تراش رہا ہے۔

اور یوں ذرائع ابلاغ اپنی جنسی مہم چلاتے رہے۔ سربیا کے اخباروں میں ایسے مضامین کی تعداد دن دُونی ہوتی گئی جن میں اُن غدار کروٹوں کا ذکر تھا جنھوں نے دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں ہلاکت کے اُستاشا کیمپ قائم کیے تھے (اور اس بات کی سچائی کو کون جھٹلا سکتا ہے، کیوں کہ ایسے کیمپ واقعی قائم کیے گئے تھے، مگر ان کیمپوں میں ہلاک ہونے والوں میں سرب، خانہ بدوش، یہودی اور خود کروٹ بھی شامل تھے!)۔ سربیا کے ٹی وی پر ان کیمپوں کی تصاویر کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔ کروٹوں کو بار بار مجرموں، اُستاشوں کے القاب سے یاد کیا جانے لگا۔ سربیائی اخباروں میں چھپیں ظلم کی داستانیں، یہ کہ کس طرح کروٹ "اُستاشے" سرب بچوں کی ننھی منی کٹی ہوئی انگلیوں کے ہار پہنتے تھے اور کیسے اب وہ دوبارہ سربوں کے قتلِ عام کی تیاری کر رہے ہیں۔

آخر کار سربیائی ذرائع ابلاغ کا پروپیگنڈا (جسے سربیا کے حکام اور قائدین کی پشت پناہی حاصل تھی) اپنے مطلوبہ نتائج، یعنی کروشیا کے اخباروں میں حسبِ دل خواہ ردِ عمل، پیدا کرنے میں کامیاب ہوا۔ ان اخباروں نے کروٹ بچوں کی ننھی منی کٹی ہوئی انگلیوں کی داستانیں لکھنی شروع کر دیں جو کہ سرب درندے پہنتے تھے۔ اور یوں جنگ کی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔

آج، جب یہ جنگ ہنوز جاری ہے، کروشیا میں سربیائی اخبار مفقود ہیں (اگر وہ ملتے بھی تو انھیں کوئی نہ خریدتا)، اور سربیا میں کروشیائی اخبار نہیں پہنچتے (اگر پہنچتے بھی تو کوئی اُن پر یقین نہ کرتا)، اور ہلاکت خیز جنگ میں مصروف دوسری طرف کے ٹی وی کے پروگرام صرف سٹیلائٹ ایریلوں کی مدد سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ انھیں دیکھنا قطعی غیر ضروری ہے، کیوں کہ دونوں طرف کے پروگرام بالکل ایک جیسے ہیں۔ سرب صرف ان اطلاعات کو جمع کرتے ہیں جو ان کے مفاد میں ہوں، کروٹ ان اطلاعات کو جو ان کے مفاد میں ہوں۔ کروشیا اور سربیا کے درمیان ٹیلی فون کی لائنیں کب کی منقطع ہو چکی ہیں۔

یوگوسلاویا کے گھسے پٹے نظام سے اُگے ذرائع ابلاغ نے، پرانی عادتوں کی پیروی کرتے

ہوئے، جھوٹ کو جائز بنانے میں کامیابی حاصل کرلی ہے۔ جھوٹ سیاسی رویے اور صحافتی طرزِ عمل سے بڑھتے بڑھتے جنگی حکمتِ عملی بن گیا ہے، اور اس لحاظ سے اسے تیزی سے اخلاقی قبولیت حاصل ہو گئی ہے۔

"جب مادرِوطن کی حُرمت کا سوال ہو تو میں بہ خوشی جھوٹ بولنے کے لیے تیار ہوں،" ایک کروشیائی صحافی نے جب یہ بیان دیا تو ان کی بہت تعریف و توصیف ہوئی۔ اب جب کہ اقدار سر کے بل الٹی کھڑی ہو گئی ہیں تو جھوٹ بولنا صرف قابلِ قبول ہی نہیں بلکہ قابلِ تعریف عمل بن گیا ہے۔ (ہم تو مادرِوطن کو بچانے کے لیے جھوٹ بولتے ہیں، ہم وطن کے نام پر جھوٹ بولتے ہیں، اور ظاہر ہے وقتی طور پر جھوٹ بول رہے ہیں، کوئی ہمیشہ جھوٹ تھوڑا ہی بولیں گے، اِس وقت تو صرف اس لیے کہ مادرِوطن خطرے میں ہے!)

جھوٹ کا کلچر اُس وقت اَور بھی پھلتا پھولتا ہے اگر ہمارا حریف ہم سے بھی زیادہ جھوٹ بولے، یا قدیم شیطانی زبان استعمال کرتا ہو جو آگے سے پیچھے، دائیں سے بائیں پڑھنے پر بھی وہی ایک مفہوم ادا کرتی ہے۔ دونوں متحارب قومیں اپنے اپنے سچ کا رخ بیرونی دنیا کی جانب کر دیتی ہیں، اور دورِجدید کے بعد کی تھکی ہاری دنیا بددلی اور دشواری سے ان سچائیوں کو قبول کرنے کے تناسب متعین کرتی ہے: دونوں فریق برابر کے جھوٹ بولتے ہیں، یا ایک فریق زیادہ جھوٹ بولتا ہے اور دوسرا اس سے کم، یا ایک فریق جھوٹ بولتا ہے جبکہ دوسرا سچ بولتا ہے۔۔۔ صرف لاشیں جھوٹ نہیں بولتیں، مگر لاشوں کا اعتبار کون کرتا ہے!

کروشیا (جس کی مثال میں صرف اس لیے دے رہی ہوں کہ یہ مجھ سے قریب واقع ہے) اپنے عوامی، سیاسی اور اخلاقی تعیّنات "قاتل اور مقتول" کے فارمولے کی بنیاد پر وضع کرتا ہے۔ اس (کروشیائی) نقطۂ نظر کی رو سے کروشیا جارحیت کا شکار ہے، اور یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے: اس کی زمین کا ایک حصہ سربوں کے قبضے میں ہے۔ جنھوں نے کئی کروشیائی گاؤوں اور شہروں کو جزوی (یا مکمل) طور پر تباہ کر دیا ہے (مثلاً وُوکووَر یا دُبراونک، جو، بعد از مرگ، قوم کی اجتماعی یادداشت کی علامت بن گئے ہیں!)، ریلوے لائنیں اور پُل اکھاڑ دیے ہیں (جنھوں نے بعد از آں ماضی کے اور ممکنہ طور پر مستقبل کے باہمی رابطے کی علامات کی حیثیت حاصل کرلی ہے!) لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ کروٹوں نے بھی تباہی اور بربادی کے عمل میں حصہ لیا ہے، خصوصاً بوسنیا میں۔ لیکن اس حقیقت نے کروشیائی عوام، حکومت اور ذرائع ابلاغ کے پروان

Scanned with CamScanner

چڑھائے ہوئے اس اجتماعی احساس کی شدت کو ذرا بھی کم نہیں کیا کہ کروشیا جارحیت کا شکار ہے۔

اس اجتماعی تجربے کا اُس لفظ سے تضاد خاصی ستم ظریفی کا حامل ہے (اگرچہ اس ستم ظریفی کا کسی کو احساس نہیں ہوتا) جس نے آج کے کروشیا کی عوامی، تہذیبی اور سیاسی زندگی میں یکایک بڑی مقبولیت حاصل کرلی ہے: یہ لفظ ہے "امیج"۔ اس لفظ کے عام معنی (تاثر یا شہرت) پر زور دینا غیر ضروری ہے۔ مقامی طور پر اس لفظ سے جو چیز مراد لی جاتی ہے وہ ہے "کروشیا کے بارے میں سچ"۔ کروشیائی ذرائع ابلاغ اس قسم کے جملوں سے بھرے ہوتے ہیں کہ "ہمیں دنیا کے سامنے کروشیا کا مثبت امیج اُبھارنے کی کوشش کرنی چاہیے"۔ (یہاں دنیا سے مراد یوروپ اور پھر امریکا کے ذرائع ابلاغ، سیاست داں اور رائے عامّہ ہے۔)

حال ہی میں کروشیا کی حکومت کے نائب صدر نے ٹی وی پر کروشیائی عوام کو دعوت دی کہ وہ دنیا کے سامنے کروشیا کا مثبت امیج تخلیق کریں، جس کا مطلب ہے ایک ایسے مظلوم فریق کا امیج جو راستی پر ہے۔ نائب صدر نے کہا کہ عام شہری بھی بیرونِ ملک دوستوں اور شناساؤں کو خط لکھ کر (آخر بیرونِ ملک ہر شخص کا ایک آدھ دوست تو ہوگا ہی!) اس جہاد میں حصّہ لے سکتے ہیں۔ اس طرح اب ہر محبِ وطن کروشیائی کا فرض ہے کہ وہ "کروشیا کے بارے میں سچ" کو دنیا بھر میں پھیلائے۔ اس مہم نے ایک بار پھر اُس طریقے کو جائز بنا دیا ہے جسے لوگ بہرحال یوں بھی روا رکھتے ہیں، یعنی جو لوگ آپ سے اختلاف رکھتے ہوں انھیں فی الفور تشکیک پسند یا "یوگو نوسٹالجک" کا لقب دے دیا جائے۔ اس طرح ان دانش وروں کی مذمت بھی جائز ہو جاتی ہے جنھوں نے کبھی موجودہ حکومت کے خلاف کبھی ایک لفظ بھی منھ سے نکالا ہو، اور اُن لوگوں کی بھی جو بار بار بیرونِ ملک کا سفر کرتے ہوں ("اِدھر ہم ہیں جنھوں نے یہیں رہ کر سب کچھ سہا، کیوں کہ مادرِ وطن کو خطرہ لاحق تھا!")۔ پاس پڑوس میں رہنے والوں کی نشان دہی بھی ہو سکتی ہے جنھوں نے کبھی غصے میں کہا ہو کہ "بھاڑ میں جائے ایسی آزادی جس میں کچھ کھانے پینے کو نہیں ملتا"۔ کسی یار دوست کے بارے میں بتایا جا سکتا ہے جس کے منھ سے نکل گیا ہو کہ "جہنم میں جائے ایسا ملک جس نے میرے دو جوان بیٹے مجھ سے چھین لیے"۔ ساتھ کام کرنے والوں کی بات ہو سکتی ہے جنھوں نے کبھی حیرت کا اظہار کیا ہو کہ "ہم کیوں لڑ رہے ہیں جب دونوں طرف ابھی تک اُنھیں کمیونسٹوں کا راج قائم ہے؟" اور محبِ وطن شہری یہ تمام کام کرتے ہوئے خلوص سے یقین رکھتے ہیں کہ وہ حبِ وطن کے تقاضے پورے کر رہے ہیں۔

قدم بہ قدم، کروشیا کے بارے میں "سچ" پھیلانے کی اس مہم کے بھیانک نتائج برآمد ہوئے ہیں: ذرائع ابلاغ پر حکمراں پارٹی، یعنی حکومت، کا تقریباً مکمل کنٹرول۔ جمہوری انتخابات کے

Scanned with CamScanner

باوجود کروشیا میں اقتدار مکمل طور پر حکمراں پارٹی اور ریاست کے صدر کے ہاتھ میں ہے، جو حکمراں پارٹی کے سربراہ بھی ہیں اور نہایت وسیع صدارتی اختیارات رکھتے ہیں۔ ان اختیارات کی منظوری پارلیمنٹ نے نئے آئین پر رائے شماری کے ساتھ دی تھی۔ یہ منظوری حاصل کر لینا کچھ زیادہ دشوار نہ تھا کیوں کہ ایوان میں اسی پارٹی کو اکثریت حاصل ہے۔ سب سے طاقتور ذریعہ ابلاغ ٹیلی وژن، اور دوسرے نمبر پر ریڈیو، دونوں ہی ریاست کے ترجمان ہیں۔ رہا ملک کا واحد بڑا اخبار سو وہ (کہا جاتا ہے کہ معاشی نظام میں آنے والی تبدیلیوں کے باعث) ایسے ادارتی بورڈ کے تحت چلایا جا رہا ہے جس میں اکثریت اُن لوگوں کی ہے جو برسرِ اقتدار جماعت سے تعلق رکھتے ہیں!

اب تک ان اداروں سے درجنوں صحافی برطرف کیے جا چکے ہیں، اور ان کی جگہ ایسے لوگوں کو ملازمت دی گئی ہے جو "کروشیا کے بارے میں سچ" پھیلائیں۔ ایک ایسی ہی اخبار نویس نے کہا، "کچھ لوگ کروشیا کے بارے میں سوچتے ہیں جب کہ کچھ کروشیا کو محسوس کرتے ہیں۔ کروشیا کو سوچنا نہیں چاہیے۔ اسے تو صرف محسوس کرنا چاہیے۔" ان کے یہ الفاظ اب ایک معتبر مقولے کا درجہ حاصل کر چکے ہیں جو جا بجا دُہرایا جا رہا ہے۔ یہ نعرہ آج کی کروشیائی صحافت کی اچھی طرح عکاسی کر سکتا ہے۔ چند صحافی چھوٹے موٹے مقامی اخباروں میں تھوڑی بہت تنقید کی کوشش کرتے ہیں لیکن ایسے معدودے چند مضامین کی اشاعت بھی اُسی وقت ممکن ہے جب ان اخباروں کے مدیران وقتی طور پر کروشیا کا بہتر "امیج" پیش کرنے کے خواہاں ہوں تاکہ ایسی "مغربی افواہوں" کا سدِباب کیا جا سکے جن کے مطابق کروشیائی صحافت میں "سب خیر" نہیں ہے۔

"امیج" جو کہا جاتا ہے کہ آج کل کے سیاسی حالات میں سچ سے زیادہ اہم ہے، اسے فروغ دینے میں صرف سرکاری ادارے ہی نہیں بلکہ تازہ تازہ تشکیل شدہ غیرسرکاری تنظیمیں (NGOs)، مثلاً کروشین ڈیفیمیشن لیگ، بھی شامل ہیں۔ اس بات کی نشان دہی کرتے ہوئے کہ "کروشیا کے بارے میں جھوٹ برسوں سے پھیلائے جا رہے ہیں"، مذکورہ لیگ کے صدر نے پچھلے دنوں اعلان کیا: "ہم عالمی رائے عامہ کا رخ کروشیا کے حق میں موڑنے کے لیے جدوجہد کریں گے، اور سچ کو اپنے طاقتور ترین اور واحد ہتھیار کے طور پر استعمال کریں گے۔ اپنے ملک کا دفاع کرنا ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے اور یہی ہمارا سب سے بڑا مقصد ہے۔ کردار کُشی بندوق، ٹینک اور لڑاکا جہاز سے زیادہ طاقتور ہتھیار ہے۔"

اگر کوئی حالات سے ناواقف شخص مقامی اخبار پڑھے تو اسے گمان ہو گا کہ ہم کوئی سچ مچ کی جنگ نہیں لڑ رہے ہیں بلکہ تمام تر کشمکش بہتر "امیج" کے لیے ہے۔ اخباروں میں کثرت سے

Scanned with CamScanner

اس قسم کے موضوعات نظر آتے ہیں کہ: "دنیا میں مسلمانوں کا امیج کروٹوں سے بہتر کیوں ہے؟"، "سرب عالمی رائے عامہ اُچک لینے اور بہتر امیج قائم کرنے میں کیوں کر کامیاب ہو گئے؟"، "کروٹوں کو دنیا میں بہتر امیج حاصل کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟" وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال، (یک جماعتی) طاقت، ذرائع ابلاغ پر تسلط، سنسر شپ (جواز: یہ زمانۂ جنگ ہے)، نظریاتی پروپیگنڈا (جواز: غیر معمولی نوعیت کے حالات ہیں)، ذرائع ابلاغ کی لگاتار "محبِ وطن" مہم (ظاہر ہے کہ فطری!)، یہ سب مل کر بھی کسی نظام کو چلانے کے لیے کافی نہیں۔ دوسرے الفاظ میں پیغامات بھیجنے کے لیے ضروری ہے کہ کوئی پیغامات وصول کرنے والا بھی ہو۔

1991 کے موسمِ خزاں میں تقریباً ہر روز زگرب کے تمام باشندے (جن میں راقم الحروف بھی شامل تھی) ہوائی حملے کا سائرن بجنے پر زیرِ زمین حفاظت گاہوں میں چلے جاتے تھے۔ خوش قسمتی سے زگرب شہر میں یہ مشق غیر ضروری تھی، گو کہ بعض دوسرے شہروں (زادار، وُوکوور، ڈبراونک، کارلوواچ، سیبےنک وغیرہ) کے لیے نہایت ضروری ثابت ہوئی۔ 1991 کے موسمِ خزاں میں زگرب کے لوگ سڑکوں پر نکلنے سے ڈرنے لگے کیوں کہ سڑکوں پر سرب اسنائپروں کی فائرنگ کے واقعات ہو رہے تھے۔ (بظاہر یہ چمنی صاف کرنے والوں یا ڈاکیوں کا بھیس بدل کر آتے تھے!) قاتل اور ان کا شکار ہونے والے دونوں پُراسرار طور پر گمنام رہتے تھے، حالاں کہ وہ "کروشیا کے بارے میں سچ" پھیلانے کی مہم کے لیے خاصے کار آمد ہو سکتے تھے۔ مگر تازہ ڈرامائی واقعات کے ہجوم میں انھیں جلد ہی بھلا دیا گیا۔ اس طرح رفتہ رفتہ ہم سب شہری ایک اجتماع کے جثے میں منقلب ہو گئے جس پر حملہ کیا جا رہا تھا، اور دشمن ایک اجتماع کا وہ جثہ بن گیا جو کہ حملہ آور تھا۔ یہ رفتہ رفتہ بڑھنے والا اجتماعی آسیب خوف (paranoia)، جو کہ حقیقی مفروضوں پر بنیاد رکھتا تھا، قومی نفسیات میں اس طرح جڑ پکڑ چکا ہے کہ پوری قوم افواہوں کی حقیقت کے طور پر تعبیر کرنے پر تُلی رہتی ہے (آخر بہت سے لوگ حقیقت کو بھی تو افواہ بنا دیتے ہیں!) خوف، دوستوں اور عزیزوں کی جدائی، غربت، بے یقینی، اطلاعات پر پابندی، جنگ کی دہشت اور پھیلتے ہوئے انتشار کے ستائے ہوئے کروشیائی شہری اس واحد سچ کو قبول کرنے پر پوری طرح آمادہ ہیں جو انھیں پیش کیا جا رہا ہے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ آمرانہ ذہنیت، اجتماع پسندی اور حالات سے مطابقت کا میلان -- جو حملے کی شکار قوم کے تصور سے پیدا ہوئے ہیں -- اب انتہائی مضبوط ہو چکے ہیں۔ سیاسی خام کاری، بدعنوانی، حقوقِ انسانی کی پامالی، غرض کسی بھی عمل پر اعتراض کا یہی مطلب سمجھا جاتا ہے کہ یہ "نوخیز کروشیائی ریاست پر حملہ" ہے، "کروشیا دشمنی" ہے، "سرب نوازی" ہے، "غداری" ہے

Scanned with CamScanner

--- لہذا "جھوٹ" ہے۔

مریضانہ اجتماع پسندی پر مبنی نظام قائم کرنے کے لیے ضرورت اسی بات کی تھی کہ حکام، ریاستی نظریے اور اس کے علم بردار شہریوں کے درمیان مکمل تعاون وجود میں آئے۔ اس طرح لوگ ریاست پر تھوپی گئی آمریت، انسانی حقوق کی خلاف ورزی اور بنیادی جمہوری اصولوں سے سراسر روگردانی، ہر چیز سے اپنی مطابقت کو اس بنیاد پر جائز باور کرتے چلے جاتے ہیں کہ: ہماری بقا داو پر لگی ہے، یہ تو حالت جنگ ہے، ان حالات میں ہم آزادیِ اظہار و صحافت جیسی غیر اہم چیزوں پر کیوں کر توجہ دے سکتے ہیں، وغیرہ۔ اور اسی طرح کے دلائل خود حکام کی جانب سے بھی دیے جاتے ہیں۔

ان حالات میں ہر وہ فرد جو بھیڑ کی زبان میں اور اجتماع کی اصطلاحات میں گفتگو نہیں کرتا، غدار اور عوام دشمن قرار دے دیا جاتا ہے۔ اب چوں کہ یہ حقیقت ہے کہ اس طرح کے "عوام دشمنوں" کی تعداد "عوام دوستوں" یعنی اُن لوگوں سے بہت کم ہوتی ہے جو اجتماع کی زبان میں بولتے ہیں، یا بولتے ہی نہیں، لہذا کروشیائی اخباروں میں پھر پھر کر وہی نام بار بار شائع ہوتے رہتے ہیں جو پہلے سے شائع ہو رہے ہیں اور جن پر غداری کا ٹھپا لگایا جا چکا ہے۔

عورتیں (صحافی، ادیب، آرٹسٹ) اس نوعیت کی کیچڑ اُچھال مہموں کا اکثر نشانہ بنتی ہیں۔ ایسے ماحول کو جو عرصۂ دراز سے اپنی گھری پدر پرست (patriarchal) خُوبُو کو سوشلزم کے خول میں دبکائے پڑا تھا اور عورت مرد کی برابری کا داعی تھا، موجودہ "جمہوریت" کے عمل میں پدر پرستی کے احیا کا بھی نادر موقع میسّر آ گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ بالکل فطری بات ہے کہ ذرائع ابلاغ نے کردار کشی کے لیے سب سے پہلے عورتوں ہی کا انتخاب کیا۔ اُن میں سے چند تو کھلی "عوام دشمن" ہیں کیوں کہ انھوں نے علانیہ اپنے جنگ مخالف (لہذا قوم مخالف) انفرادی نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے، ان کے ساتھ ساتھ بعض مرد دانش ور بھی اس مہم کی لپیٹ میں آ گئے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے دفاع میں کوئی آواز نہیں اُٹھاتا؛ اکادکا صحافی، کوئی دوست یا کوئی جنگ مخالف عورتوں کی انجمن کبھی کبھار کچھ کہہ دے تو دوسری بات ہے۔ دوسری طرف ان پر حملہ کرنے والوں میں ان کے ہم عصر بھی شامل ہوتے ہیں: صحافی، دوسرے ادیب، کروشیا کے آزادیِ تحریر PEN گروپ کے ارکان۔ سیاست دانوں کے علاوہ عام شہری بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ موخرالذکر کو اس کا موقع اخباروں میں "قارئین کے خطوط" کے کالموں میں، اور اگر "ملزم" بات کرنے پر آمادہ ہو تو ٹی وی پر باقاعدہ انٹرویو کے پروگراموں میں ملتا ہے۔ یہ انٹرویو ایک طرح

Scanned with CamScanner

سے ٹی وی پر چلائے جانے والے مقدمے ہوتے ہیں جن میں گمنام شہری "ملزم" سے سوالات کرتے ہیں اور پھر اس کے جوابات پر تبصرہ کرتے ہیں۔

یہ اجتماعی آسیبِ خوف افراد ہی کی کردار کُشی پر بس نہیں کرتا۔ عدم تحفظ اور خوف کے خاصے حقیقی ماحول میں، جہاں زندگی ہمیشہ خطرے کی زد میں محسوس ہوتی ہے، غیر یقینی حالات اور انتہائی بے بسی کی کیفیت میں، کبھی کبھی کروشیا کے شہری اپنی تمام دشمنی کا رخ اُس پورے اجتماعی ہیولے کی طرف بھی موڑ دیتے ہیں جو "ان کو نہیں سمجھتا"، اور ایسے تمام لوگوں کے ایک مبہم اجتماع کو دوست ٹھہراتے ہیں جو "ان کو سمجھتا ہے۔" مثلاً کروشیائی اخباروں میں گاہے گاہے ایسی سرخیاں نظر آجاتی ہیں کہ "فرانسیسی اور انگریز ہمیں ناپسند کرتے ہیں"، اور چوں کہ افواہ نے اطلاع کی جگہ لے لی ہے لہٰذا چند ایک اس قسم کی تھیوریاں بھی گشت کر رہی ہیں کہ دراصل کروشیا کے خلاف ایک بین الاقوامی سازش کی جارہی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جھوٹ کے کلچر کا استحکام صرف خوف، اُبھرے ہوئے قومی (یا قوم پرستانہ) جذبات، دشمن کے لیے بھرپور نفرت، خطرے کے احساس، آمرانہ نظام کے قیام، ذرائع ابلاغ کے پروپیگنڈے اور جنگی صورت حال کا مرہونِ منت نہیں۔ جھوٹ کا کلچر اپنی حکمت عملی خود پیدا کرتا ہے۔ اس کا ایک اہم حصہ لوگوں کی یادداشت کو ہراساں کرنا ہے: لوگوں کو زبردستی مجبور کرنا کہ جو انھیں یاد ہے وہ فی الفور بھول جائیں اور جو بھول چکے ہیں اسے فوراً یاد کریں۔ یوگوسلاویا کی شکستگی کے بعد، نئی کروشیائی حکومت کے انتخاب اور آزادی کے اعلان کے بعد، ہراساں کر کے بُھلانے کا یہ عمل انتظامی احکامات، ذرائع ابلاغ اور ان کے علاوہ اجتماعی جذبات کے ہاتھوں انجام پارہا ہے۔ لفظ "یوگوسلاویا" (ایک ملک جہاں کروٹ پچاس برس تک رہے) ممنوعہ بن چکا ہے، اور "یوگوسلاو"، "یوگونوسٹالجک"، اور "یوگوزومبی" کے الفاظ قومی غدّار کے معنوں میں مستعمل ہیں۔ عوامی یادداشت پر اثرانداز ہونے کے لیے نئی حکومت نے انتظامی اقدامات کیے: پرانی یادگاریں ہٹادی گئیں؛ شاہراہوں، باغوں، اسکولوں کے نام، حتّیٰ کہ زبان تک کا نام تبدیل کردیا گیا ہے۔ سَریلی (Cyrillic) اور سربینَن کے نام ناپسندیدہ قرار پائے ہیں۔ اقدار کا ایک پورا نظام راتوں رات تبدیل کردیا گیا ہے۔ تاریخی اصطلاحات کو ازسرِ نو معنی پہنائے جارہے ہیں۔ "فاشزم مخالف"، سابق "پارٹیزن"، "کمیونسٹ"، "بایاں بازو"، جو پہلے مثبت معنی رکھنے والے الفاظ تھے، اب یکایک منفی مفہوم اختیار کر چکے ہیں (حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ پوری کروشیائی حکومت، بشمول صدر، ان لوگوں پر مشتمل ہے جنھوں نے اپنا سیاسی مذہب ابھی پچھلے ہی دنوں

Scanned with CamScanner

تبدیل کیا ہے: یہ تمام حضرات سابق کمیونسٹ ہیں)۔ قوم پرست، دہشت گرد جلاوطن، "اُستاشا"، اور حتیٰ کہ خود "آزاد ریاست کروشیا" کی اصطلاحیں جو کل تک منفی معنی رکھتی تھیں، اب مثبت و منفی کی قید سے آزاد، بلکہ مثبت معنی میں استعمال کی جانے لگی ہیں۔ اس طرح بہت سے تاریخی تصوّرات اور "تاریخی حقائق" کو یکایک نئے انداز سے پرکھا جانے لگا ہے (مثلاً نازیوں کا ساتھ دینے والوں، یعنی اُستاشوں، کے بارے میں اس نئی جانچ پرکھ کا فیصلہ یہ ہے کہ جرائم تو خیر اُنھوں نے کیے مگر "یوگو کمیونسٹ گریٹر سرب پروپیگنڈا" نے ان جرائم کو بہت بڑھا چڑھا کر ظاہر کیا۔) لہذا دوسری چیزوں کی طرح آزاد ریاست کروشیا کو بھی نئے سرے سے جانچا تولا جانے لگا ہے۔ ماضی کی اس حکومت نے بے شک نازیوں کا ساتھ دیا تھا، لیکن کم از کم وہ کروشیائی ریاست بنانے کی امنگوں کی تو عکاسی کرتی تھی!

یوں اقدار اچانک بدل کر رہ گئی ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں تہذیبی، سیاسی اور نظریاتی قدریں سرعت سے اس طرح اُلٹ پلٹ ہوئی ہیں کہ لوگ بوکھلا کر رہ گئے ہیں: کل تک جو ناخوب تھا اب اچانک خوب ہو گیا ہے، جسے اچھا کہا جاتا تھا وہ اب بُرا کہلایا جانے لگا ہے۔ اس بوکھلاہٹ میں لوگ اپنی ذاتی زندگی، اپنی شناخت کو بھلا دینا چاہتے ہیں۔ ایک اجتماعی نسیاں، غیر شعوری یا دانستہ جھوٹ، اس نئی شناخت سے مطابقت پیدا کرنے کے عمل میں ہمیں احساسِ تحفظ بخش سکتا ہے: ہم وہ نہیں جو اب تک تھے، بلکہ ہم تو کوئی اور ہیں!

میرے ایک ہم عصر ادیب نے کسی غیر ملکی صحافی کو یہ بیان دیا ہے کہ یوگو کمیونزم کے دور میں وہ ریاستی جبر کا شکار رہے: ان کی کتابوں پر پابندی عائد کر دی گئی تھی اور انھیں جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ میرے یہ ہم عصر ادیب کبھی جیل نہیں گئے اور نہ کبھی "ریاستی جبر" کا نشانہ بنے: ان کی تمام کتابیں باقاعدگی سے شائع ہوتی رہیں۔ پھر بھی میرے خیال میں وہ جھوٹ نہیں بول رہے۔ ذرائع ابلاغ کے چوطرفہ حملے اور اجتماعی جبر اس میں وہ اپنے ذاتی کوائف بھول بیٹھے ہیں۔ انھوں نے غیر شعوری طور پر اپنے کوائف میں کچھ ردّوبدل کر لیا ہے۔ عام تناظر میں بولا ہوا جھوٹ ہی قابلِ قبول سچ بن چکا ہے۔ اور پھر وہ غیر ملکی اخبار نویس ایسی ہی کوئی کہانی سننے آیا تھا: اس کے "مغرب زدہ" سر میں اس کا مثالی نمونہ پہلے ہی سے موجود تھا: یعنی ایک سابق کمیونسٹ آمریت میں ریاستی جبر کا نشانہ بننے والے ادیب کی کہانی اور نئی جمہوری حکومت قائم ہونے کے بعد اس کا پُرمسرّت انجام!

زگرب کے ایک شاعر ہیں جو برسوں سے جاپانی ہائیکو لکھ لکھ کر پوری قوم کا ناک میں دم کیے

ہوئے تھے۔ انھیں جاپان سے خاص شغف تھا۔ پورے سابق یوگوسلاویا میں ان گنت ہائیکو شاعروں کے حلقے نمودار ہو گئے تھے، اِکے بانا آرائشِ گل کے کورسوں کا بھی اہتمام ہو رہا تھا، جاپانی شاعری کے انتخاب چھپ رہے تھے، جاپانی شہر اوساکا اور یوگوسلاو شہر وارازدِن کو جڑواں شہر قرار دیا جا رہا تھا اور ہائیکو مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ اور یہ سب سرگرمیاں جو "آمریت" کے دنوں میں پوری قوم کے لیے دردِ سر بنی ہوئی تھیں، انھیں موصوف کے زیرِ اثر ہو رہی تھیں۔ مگر اب انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ "ٹیٹو حکومت" نے ان پر خوب جبر کیا۔ بھلا کیوں؟ ان کا کہنا ہے کہ ہائیکو شاعری کی وجہ سے!

آج کروشیا کے بے شمار شہریوں کو، جن میں البانوی، کروٹ، سرب اور مسلمان سب شامل ہیں، سکونتی پرمٹ، شناختی کارڈ اور پاسپورٹ حاصل کرنے میں شدید دشواریاں پیش آرہی ہیں۔ اگر کسی کا باپ کروشیا سے باہر پیدا ہوا ہو، اگر وہ خود مثلاً اسکوپیے یا سرائیوو میں پیدا ہوا ہو، اگر وہ زگرب منتقل ہونے سے پہلے بلغراد میں رہا ہو، اگر وہ پناہ گزیں ہو، تو اسے نوکرشاہی کے ایک ناخوشگوار طریقِ کار کا سامنا کرنا پڑے گا، اور زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ اسے اس ملک کی شہریت نہیں مل پائے گی جہاں اس نے اپنی پوری یا زیادہ تر عمر گزاری ہے۔ ان کا وطن جہاں وہ برسوں سے رہتے چلے آئے ہیں، اچانک ان کا نہیں رہا۔ اپنی آئندہ زندگی کے لیے ایک گوشہ حاصل کرنے کی خاطر انھیں اپنی گزشتہ زندگی کو بھلا دینا ہوگا۔ یہاں رہ سکنے کے لیے، اپنی اور اپنے بال بچوں کی بقا کے لیے، انھیں اپنی شخصیت کے ایک پہلو کو مٹا ڈالنا اور کسی نئے پہلو کو شامل کرنا پڑے گا، صرف اسی صورت میں کسی اعلیٰ تر نوکرشاہی سطح پر وہ جگہ پیدا کی جا سکے گی جہاں قوم کے لیے نیا (اِس بار سچ مچ نیا!)، روشن (اِس بار سچ مچ روشن!) مستقبل (اس بار سچ مچ مستقبل!) تعمیر کیا جائے گا۔

اجتماعی یادداشت کو بذریعۂ جبر اس بدلنے کے عمل میں جبراً بھلانے اور جبراً یاد رکھنے کی جدوجہد ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ ان دونوں کا مقصد ایک نئی ریاست، ایک نئے سچ کی تخلیق ہے۔ جبراً یاد کرانے کی حکمتِ عملی کے ذریعے ایک قومی تشخص کا تسلسل قائم کیا جاتا ہے (جس میں بظاہر کئی خلا ہیں)، اور جبراً بھلانے کے ذریعے "یوگوسلاو" تشخص اور اس کے دوبارہ جنم لینے کے دوردراز امکانات کا قلع قمع کیا جاتا ہے۔ جبراً یاد کرانے کے عمل کی انتظامی، علامتی، ثقافتی شکلیں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ سڑکوں، چوراہوں، اداروں کے پُرانے نام بدل کر انھیں (مشہور و معروف!) کروٹوں

سے منسوب کیا جارہا ہے۔ کروشیا کی تاریخی ہستیوں، ادیبوں، سیاست دانوں کی یادگاریں قائم کی جا رہی ہیں۔ اسکولوں اور ذرائع ابلاغ کی زبان اور درسی کتابیں تبدیل کی جارہی ہیں۔ کروشیا کی ثقافتی تاریخ سے شخصیات کو برآمد کر کے انھیں معزز مقام پر فائز کیا جارہا ہے، وغیرہ۔ جبراً یاد کرانے کا عمل قومی "بڑھخولیا" (megalomania)، ہیروؤں کی تشکیل، دیومالا کی تیاری اور دوسری لغویتیوں ---المختصر جھوٹ--- سے قطعی دریغ نہیں کرتا۔ اس قومی "بڑھخولیا" کی علامات جابجا دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً اعلان ہو گیا ہے کہ زگرب "عروس البلاد" ہے، کروشیا کا وجود میں آنا دراصل ایک "معجزہ" ہے، اور یہ بھی کہ کروشیا "دنیا کا سب سے زیادہ جمہوری ملک" ہے۔ قومی دیومالا گھڑنے کے خبط میں یہ "سنجیدہ" نظریہ پیش کر دیا گیا ہے کہ کروٹ درحقیقت ایرانی نژاد ہیں، اور اس قسم کے جملے تو خوب مقبولِ عام ہیں کہ "کروشیا کروٹوں کے ہزار سالہ خواب کی تعبیر ہے!" قومی دیومالا تیار کرنے کا یہ ذوق و شوق تاریخی طور پر مستند حقائق کو مسخ کرنے، ان کی شکل "بہتر بنانے" اور سرے سے انھیں فرض کر لینے سے بھی نہیں چوکتا۔ لہذا جو حمد و ثنا پہلے ٹیٹو کے لیے وقف تھی، پرائمری اسکولوں میں تاریخ کے مضمون کی تازہ نصابی کتابوں میں اسی کو تیزی سے کروشیا کے موجودہ صدر سے منسوب کیا جارہا ہے۔

موثر محاذ آرائی کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کو جبراً، ڈنڈے مار مار کر، کچھ یاد کرایا جائے، مثلاً یہ کہ "ہم" "اُن" سے (یعنی سربوں سے) مختلف ہیں، یاد کرو (اور یاد رکھو) کہ "ہماری تہذیب، مذہب، زبان، رسم و رواج، سب کچھ "اُن" سے مختلف ہے۔ جنگی حکمتِ عملی میں یہ خبط (جو کروشیا کے اجتماعی شعور میں گہرائی تک اُتر چکا ہے) اس طرح استعمال ہوتا ہے: ہم اُن سے (یعنی سربوں سے) مختلف ہیں، کیوں کہ--- کیوں کہ ہم تو بہتر ہیں! یہ بات ہماری تاریخ سے ثابت ہے، ہم ہمیشہ تعمیر کرتے ہیں اور وہ (سرب) ہمیشہ تخریب کرتے ہیں۔ ہم یوروپی، کیتھولک، تہذیب یافتہ لوگ ہیں جب کہ وہ (سرب) اور تھوڈوکس، جاہل، وحشی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

عام کروشیائی شہری، جو نہایت محب وطن ہیں، اس امر پر نہایت اطمینان کا اظہار کرتے ہیں کہ آخرکار اُس "خواب" کی تکمیل ہوئی جو کہ وہ ایک ہزار سال سے دیکھ رہے تھے۔ جو ذرا کم محبِ وطن ہیں وہ سوچتے ہیں کہ چاہیں یا نہ چاہیں، یہ ہزار سالہ خواب بہرحال آج کی حقیقت بن چکا ہے۔ کرائینا (Crajina) کے علاقے میں رہنے والے کروشیائی سرب کوئی اپنا "ہزار سالہ خواب" دیکھ رہے ہیں۔ جب سچائیوں کا ایک مجموعہ جھوٹ بن چکا ہو اور جھوٹ سچ بن چکا ہو، اُس وقت عوام کی اکثریت کس کے سامنے جھکتی ہے؟ ظاہر ہے عوام کی اکثریت کے سامنے!

Scanned with CamScanner

میں نے ایک غیر ملکی ٹی وی رپورٹر کا قصہ سنا۔ بے چارہ بوسنیا کے کسی گاؤں میں جا نکلا جہاں ایک قتلِ عام ہوا تھا۔ اس نے مقامی لوگوں کو پیسے دے دلا کر لاشوں کو ایک دیدہ زیب ڈھیر کی شکل میں اکٹھا کیا اور ان کی تصویر بنائی۔ مگر اُسے کچھ ٹھیک سے پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کون کیا ہے۔ لہٰذا اس نے نہایت متاثر کن کمنٹری ریکارڈ کرائی کہ مسلمانوں نے سربوں کا قتلِ عام کیا۔ یہ لاشیں دراصل مسلمانوں کی تھیں۔

میں نے کئی غیر ملکی صحافیوں کے بارے میں سنا کہ انھوں نے مقامی لوگوں کو پیسے دے کر خطرناک تصویریں کھنچوائیں، (کہ انھیں کچھ پیسے ہی مل جائیں، مکھیوں کی طرح تو ویسے ہی مر رہے ہیں!)۔ کتنوں ہی نے یہ یقین کر کے کہ وہ سچ لکھ رہے ہیں، دوسروں کی ہلاکت سے اپنی جیبیں بھریں۔

ہاں، کچھ ایسے بھی لوگوں کو مَیں جانتی ہوں جنھوں نے بےلوث طریقے سے دنیا کے سرد مہر دل پر اثر ڈالنے اور متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ سوزن سونٹاگ انھیں میں سے ایک ہیں۔

میں بعض ایسے مہربان غیر ملکیوں کے بارے میں بھی جانتی ہوں جن کا دل اس حالتِ زار پر پسیجا اور انھوں نے امداد کے طور پر پناہ گزینوں کے کیمپوں میں بھاری تعداد میں کوئلے سے گرم ہونے والی استریاں بھیجیں۔ اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ دور دراز بسنے والے یہ قبائلی مدتِ مدید سے بجلی استعمال کر رہے ہیں۔ یا ہو سکتا ہے یہ استریاں سرائیوو کے باسیوں کو بھیجی گئی ہوں (جہاں بجلی کی رسائی ختم ہو چکی ہے)، تاکہ کم از کم استری کیے ہوئے کپڑوں میں تو ہلاک ہوں۔

جنگ بھی ایک کیک ہے۔ سب کو اپنا اپنا ٹکڑا چاہیے: سیاست دان (مقامی اور غیر ملکی)، جرائم پیشہ اور سٹے باز (مقامی اور غیر ملکی)، جنگ سے دولت کمانے والے (مقامی اور غیر ملکی)، اذیت پسند، خود اذیتی کے دلدادہ، باضمیر اور مہربان (مقامی اور غیر ملکی)، تاریخ داں اور فلسفی (مقامی اور غیر ملکی)، اخبار نویس (مقامی اور غیر ملکی)۔ جنگ ایک پہلے سے موجود شناخت کو تباہ کرتی ہے لیکن ایک عجلت میں تیار کی گئی ارزاں شناخت پیدا کرنے کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ غیر ملکی فلسفیوں کے لیے یہ ایک نیا کھلونا ہے، ایک کسوٹی جس پر پرانے اور نئے نظریات پرکھے جائیں: چھوٹی یوروپی قومی ریاستوں کا نظریہ، یوروپ کی سرحدیں یا بلا سرحد یوروپ؟ قوم پرستی کے مثبت اور منفی پہلو، بعد از آمریت نظریات اور نیو ورلڈ آرڈر۔ غیر ملکی سیاست دانوں اور حکمتِ عملی کے ماہرین کے لیے جنگ ایک امکانی مستقبل کا اندازہ کرنے کے لیے ایک زندہ نمونہ ہے۔ بیرونی ذرائع ابلاغ کے لیے یہ ایک گرما دینے والا تجربہ ہے۔ غیر ملکی قارئین و ناظرین کے لیے اپنے سرد

پڑتے ہوئے اخلاقی اور جذباتی نظامِ ہضم میں تحرک پیدا کرنے کا ایک نادر موقع ہے۔ جنگ جرائم پیشہ افراد کو قومی ہیرو بننے کا موقع فراہم کرتی ہے اور دانشوروں کو جرائم پیشہ بننے کی اجازت دیتی ہے۔

بوسنیائی سربوں کا قائد رادووان کراجک جس کے جنگی مجرم ہونے کے ناقابلِ تردید ثبوت موجود ہیں، مغربی ذرائع ابلاغ کا پسندیدہ موضوع ہے۔ جب اسے ٹی وی کے اسکرین پر دکھایا جا رہا ہو تو کسی نامعلوم وجہ سے عموماً پیش منظر میں رکھا جاتا ہے۔ اس طرح کراجک (جو پیشے کے اعتبار سے سائیکیٹرِسٹ ہے) اپنے مغربی حاضرین سے زیادہ اچھی طرح مکالمہ کر سکتا ہے۔ میں ٹی وی دیکھنے والے (یا اخبار پڑھنے والے) ایک عام مغربی شخص کا اس طرح تصوّر کرتی ہوں کہ وہ سکون سے اپنی آرام کرسی پر نیم دراز ہے۔ میرا تصوّراتی ناظر (یا قاری) پہلے تو ایک مخفی اطمینان محسوس کرتا ہے کہ خدا کا شکر ہے، میں ایسے دہشت ناک ملک میں نہیں رہتا (یہ آخر ہے تو بلقان، یوروپ تو ہے نہیں!)۔ پھر وہ بوسنیا کے تاریک جنگلوں سے نکل کر آئے ہوئے بھیانک خونی کے بڑے سے، پسینے میں نہائے ہوئے سر پر نظر ڈالتا ہے اور ایک لمحے کے لیے خود کو ایک رومانی تصوّر کی لہروں پر چھوڑ دیتا ہے جہاں ایک مجرم نے پوری دنیا کی ناک میں نکیل ڈال رکھی ہے۔ پھر وہ ہڑبڑا کر ایسے نامناسب خیالات کو اپنے سر سے دور کر دیتا ہے اور اس "راہزن" کی بربریت پر سچ مچ دہشت زدہ ہو جاتا ہے۔ پھر وہ ٹی وی (یا اخبار) بند کر دیتا ہے۔ تب میرا تصوّر کردہ یہ مغربی ناظر (یا قاری) ایک نامعلوم سا سکون محسوس کرتا ہے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا کہ عین اس لمحے کراجک کا تاریک ہیولا اس کی آرام کرسی میں بیٹھا ہوا ہے اور اسے -- اس آرام کرسی، اس ٹی وی اور اس اخبار کے مالک کو -- پوری طرح اپنے قبضے میں لے چکا ہے۔

میں، ایک ادیب کی حیثیت سے، خود کو ایسا تصوّر کرنے کی اجازت دے سکتی ہوں۔ بلکہ مجھے پورا یقین ہے کہ بیرونی دنیا، تہذیب کی معزز ٹھیکے دار، براعظم یوروپ -- جس پر کروٹ اور بوسنیا کے لوگ، اور خود سرائیوو کے باسی (جو مہینوں سے چھٹے بحری بیڑے کے سرائیوو پہنچنے کے منتظر ہیں) -- اُس یوروپ نے بھی اس صورتِ حال میں کچھ نہ کچھ کردار ادا کیا ہے، الزام کا خاصا بھاری بوجھ اس کے کاندھوں پر بھی ہے، وہ بھی سچ اور جھوٹ کے "مغربی" کلچر کے مسئلے کا شکار ہے۔ اور مسئلے کی جڑ، خواہ یوروپ چاہے یا نہ چاہے، بوسنیا میں واقع ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ کراجک کا تاریک، ہولناک ہیولا اس وقت یوروپی گھروں کی آرام کرسیوں میں سکون سے بیٹھا ہوا

Scanned with CamScanner

ہے۔

آج سابق یوگوسلاویا کے تمام علاقوں میں لوگ ایک مابعدِ جدید (postmodern) ترتیب یا انتشار میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل کے زمانے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ اس چکراتے ہوئے زمانی انتشار میں ہر وہ چیز جو کبھی ہمارے شعور میں تھی اور ہر وہ چیز جسے ہم آئندہ چل کر جانیں گے، جی اٹھی ہے اور وجود رکھنے کا حق حاصل کر چکی ہے۔

ٹھیک پچاس برس کے عرصے (۱۹۹۱-۱۹۴۱) کے بعد، کسی جنمی موزونیت کے ساتھ، دوسری جنگِ عظیم دوبارہ شروع ہو گئی ہے۔ کتنے ہی گاؤں جو پچاس سال پہلے جلائے گئے تھے، ایک بار پھر جلا دیے گئے ہیں، کتنے ہی خاندان اُسی مماثل تقدیر کا سامنا کر رہے ہیں، کتنے ہی بچے اپنے باپ دادا کی زندگی دوبارہ بسر کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض صورتوں میں ہتھیار تک بالکل وہی ہیں: یعنی مقامی "عجائب خانۂ انقلاب" سے ضرورت کے تحت چرائے گئے ہتھیار، دوسرے لفظوں میں ٹیٹو کے پارٹیزن سپاہیوں کے استعمال کیے ہوئے ہتھیار، یا دوچھتیوں سے اتارے ہوئے، بکسوں سے نکالے ہوئے ہتھیار جنھیں پچاس سال پہلے "چیتنکوں" اور "اُستاشوں" نے وہاں رکھ چھوڑا تھا۔

نئی قائم ہونے والی ریاستیں بھی دراصل "عجائب خانوں کے نوادر" ہیں: نئے منتخب شدہ لیڈروں کے کلمات اور اقوال اُنھیں الفاظ کی جانب اشارہ کرتے ہیں جو ماضی میں کبھی بولے گئے تھے۔ گھومتے اور چکراتے ہوئے آئینوں میں اچانک گزرے زمانے کی جھلکیاں، تاریخ کے ٹکڑے چمک اٹھتے ہیں۔ آج کے لیڈروں کے چہروں میں کسی اَور زمانے کے قائدوں کی ہیبت ناک جھلک دکھائی دے جاتی ہے۔ اس چکاچوند میں سواستیکا اور ریڈ اسٹار ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ بلقانی لوگوں کے چکراتے سروں میں "ہزارسالہ خواب" ہیں جس کا کوئی ٹکڑا لمحہ بھر کو حقیقت کی طرح چمک کر غائب ہو جاتا ہے اور کوئی اَور ٹکڑا اگلے لمحے تک کے لیے اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ اس شکستہ ملک کے علاقوں میں، جہاں کچھ دنوں پہلے تک سب لوگ ساتھ رہتے تھے — شکار ہونے والے اور شکار کرنے والے، حملہ آور اور حملے کا نشانہ بننے والے، فاتح اور مفتوح — اب ان لوگوں نے اپنے خواب ایک دوسرے سے بدل لیے ہیں۔ کبھی کبھی وہ ایک ہی خواب دیکھتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ان کا خواب دوسروں کے خوابوں سے مختلف ہے۔

ہم شکستہ یوگوسلاویا کے رہنے والے ماضی اور حال کے ساتھ ساتھ مستقبل کو بھی بسر کر رہے ہیں: قیامت کے بعد آنے والا مستقبل، وہ مستقبل جو دوسروں کے لیے ابھی تک مستقبل ہی

Scanned with CamScanner

ہے۔ سرائیوو مستقبل سے نکلا ہوا، اور مستقبل کا شہر ہے، بیک وقت موجود اور غیر موجود، سائنس فکشن فلموں اور کارٹونوں سے نکلا ہوا شہر، Blade Runner اور Mad Max جیسی فلموں کے لیے ایک نیا اسکرین پلے۔ "میں ٹرمینیٹر ہوں!" میری ایک دوست نے سرائیوو سے نکل آنے پر کہا، "میں نے ایسی بے تحاشا موت دیکھی ہے کہ میں ٹرمینیٹر کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی۔" میری دوست دنیا میں نکل گئی۔ "مجھے دنیا کو بتانا ہے کہ میں سرائیوو سے، مستقبل سے نکل کر آرہی ہوں!"

ہمارا آج کا وجود، جس کے چاروں طرف لوگ مر رہے ہیں، ایسا ہے جیسے اسکرین پر ماضی اور مستقبل کی فلمیں ساتھ ساتھ دکھائی جا رہی ہوں۔ "میں زندگی کو یوں دیکھتا ہوں جیسے سنیما کے اسکرین کو دیکھ رہا ہوں،" بہت پہلے میرے ایک دوست نے بلغراد سے لکھا تھا۔ کسی ڈوبتے ہوئے جہاز کی طرح، سابق یوگوسلاویا کے علاقوں میں حقیقت کا وجود ختم ہو چکا ہے۔ ذرائع ابلاغ پر الزام اور جھوٹ کی مسلسل تکرار نے اس کی حقیقت کو کند کر دیا ہے۔ لوگ ٹی وی اسکرین پر اپنی موت کا منظر دیکھ رہے ہیں۔ نہ معلوم یہ گولی جو مجھے ہلاک کرے گی ٹی وی اسکرین سے آرہی ہے یا کمرے کی کھڑکی سے۔ اس سے کوئی خاص فرق بھی نہیں پڑتا کیوں کہ ہم سب مدّت ہوئی مر چکے ہیں۔ سرائیوو سے میرے دوست اور ادیب عبداللہ سدران نے لکھا ہے: "یا پھر ہم پہلے ہی مر چکے ہیں، صرف ہمارے ناخون بڑھ رہے ہیں جیسا کہ لاشوں کے ساتھ ہوتا ہے، اور اب یہ پنجوں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔" دہشت کی تکرار دہشت کو ختم کر دیتی ہے، شر کی تکرار اسے ہلکا بنا دیتی ہے۔ جو کچھ اب ہو رہا ہے اگر وہ ماضی کی تکرار ہے، یا مستقبل کا اشارہ ہے، تو گویا کچھ بھی نہیں ہوا!

اس لحاظ سے جھوٹ کے کلچر کی میری کہانی ریت کے گھروندے کی طرح ڈھے جاتی ہے۔ اس مضمون کی ابتدا میں سرائیوو کے ایک شخص کا ذکر تھا جس کا جسم نظر آنے والے زخموں اور نیلوں سے بھرا ہوا تھا۔ میرا جسم بھی زخموں اور نیلوں سے بھرا پڑا ہے مگر وہ نظر نہیں آسکتے۔ جلد ہی میں بھی اس سمندر میں شامل ہو جاؤں گی جو پناہ کے لیے بیرونِ ملک رواں ہے۔ میں کسی خود فریبی میں مبتلا نہیں ہوں۔ اُن بیرونی ملکوں میں کم سے کم ایک چیز یقیناً میرا انتظار کر رہی ہے: ٹی وی اسکرین اور اخبار۔ اور وہاں، شاید ایک دن میں اخبار کھولوں اور مجھے اپنے کسی سربیائی ہمعصر کا لکھا ہوا کوئی مضمون دکھائی دے جائے جس کا موضوع ہو: سربیا میں جھوٹ کا کلچر۔ کیوں کہ میرے مضمون کا متن تو صرف آدھی کہانی ہے، سچ کا نصف حصّہ۔ یا جھوٹ کا نصف حصّہ، جیسا کہ میرے خیال میں میرے ہم وطن کہیں گے۔

**

Scanned with CamScanner

دُبراوکا اُگریشِک

ترجمہ: فہمیدہ ریاض

زگرب، خزاں ۱۹۹۲

کیا موت سے قبل زندگی کا وجود ہے؟ یہ رومانیائی پہیلی کچھ عرصہ پہلے کمیونسٹوں کے مزاجِ سیاہ کے عجائب گھر سے نکل کر میری یاد میں در آئی۔

''نہیں!'' میری ماں نے فیصلہ کن طور پر کہا۔ ''صرف جان بچانا ہے۔''

کروشیا میں ''زندگی'' کی جگہ آج کل ''جان بچانا'' یا ''بچ نکلنا'' جیسی اصطلاحیں استعمال ہو رہی ہیں۔ میری پڑوسن آہ بھر کر یہی کہتی ہے: ''کاش کسی طرح جان بچا لے جائیں۔'' ایک دوست کہتا ہے: ''ہم زندہ بچے ہوئے ہیں، یہی بڑی بات ہے۔ چلو، کسی نہ کسی طرح جان بچ ہی جائے گی۔'' یہی بات مادام مِشلین کہتی ہیں: ''ایسے وقت میں اہم بات یہ ہے کہ آدمی کسی طرح بچ نکلے۔'' مادام مِشلین دوسری جنگِ عظیم، پہلی آزاد ریاست کروشیا، کمیونسٹ یوگوسلاویا، دوسری آزاد ریاست کروشیا، ایک اور جنگ، ان سب سے اپنی جان بچا لائیں۔ انھیں خوب معلوم ہے کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔

چند ماہ زگرب سے باہر گزار آنے کے بعد اب میں زندہ بچ نکلنے کا کاروبار سنبھالنے کے لیے تیار ہوں۔

''سب سے اہم بات یہ ہے کہ آدمی پریشان نہ ہو اور سوَر کا گوشت نہ کھائے،'' میری ماں کا کہنا ہے۔

''کیوں؟'' میں پوچھتی ہوں۔

''سنا ہے قسائیوں کو ذبح کیے ہوئے سوَروں کے پیٹ میں سے سونے کی زنجیریں، انگوٹھیاں، اور دانتوں پر چڑھانے والے خول مل رہے ہیں۔۔۔'' میری ماں سازباز کے انداز میں سرگوشی کرتی ہے۔ ''میں تو یوں بھی گوشت نہیں کھاتی۔''

''کیوں؟

Scanned with CamScanner

"ارے اتنا مہنگا ہے!"

جان بچانے کا تہیہ کرنے والوں کو شناختی کاغذات کی ضرورت ہوتی ہے۔ کئی گھنٹے قطار میں کھڑے رہنے کے بعد میں شناختی کارڈ کے کاؤنٹر تک پہنچی۔

"قومیت؟" کلرک نے چلّا کر پوچھا۔

"بے قومیت،" میں نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" وہ چنگھاڑی۔

"آپ کے پاس دیگر کا بھی تو کوئی خانہ ہوگا۔"

"نہیں! فضول باتیں بند کرو اور بتاؤ تم کون ہو،" کلرک نے اس بار قطار کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے ڈانٹ کر کہا۔ (بالکل جیسے سوویت آمرانہ نظام کی کتابِ آداب میں ہدایت کی گئی تھی۔)

"سرب ہو گی، بتاتے ہوئے ڈر رہی ہے،" میرے پیچھے کھڑے ہوئے کسی شخص نے تبصرہ کیا۔

"کیا تم سرب ہو؟"

"میں لاقوم ہوں،" میں نے وضاحت کی۔ "غیر اعلان کردہ قومیت!"

"اس جنگ میں کوئی غیر اعلان کردہ کیسے ہو سکتا ہے؟" کلرک نے چیخ کر کہا۔

"میں جنگ میں غیر اعلان کردہ نہیں ہوں،" میں نے کہا۔ "میں تو صرف قومیت کے خانے کی بات کر رہی ہوں۔"

میرے پیچھے کھڑا ہوا شخص نرمی سے بولا: "کہہ دو کہ کروشیائی ہو، اور معاملہ ختم کرو۔"

"میں ایسا نہیں کر سکتی،" میں نے کہا۔ "جس وقت تک کسی مخصوص گروہ کا ہونے سے کوئی شہری سماجی، سیاسی اور انسانی طور پر قابلِ قبول ہے اور دوسرے گروہ کا ہونے سے ناقابلِ قبول، اُس وقت تک نہیں۔" میں نے اس مہربان شخص کو سمجھایا، اور دل ہی دل میں بڑی خوش ہوئی کہ اپنا موقف اطمینان بخش طریقے سے بیان کرنے میں کتنی کامیاب رہی۔

"سنو! میرا ایک دوست سرب تھا۔ اس نے لکھوا دیا کہ وہ بنجارا ہے۔ تم بھی کہہ دو کہ بنجارن ہو۔ یہ چلتا ہے۔" وہ میری مدد کرنے پر مصر تھا۔

"میں --- دیگر ہوں!" اس بار میں نے بھی چیخ کر کہا۔ اور نہ جانے کیوں اپنے موقف کو بیان کرنے کے لیے انگریزی میں بلند آواز سے پورے لفظ کے ہجے کیے:

Scanned with CamScanner

"O-T-H-E-R-S!"

"دوسرے لوگ انتظار میں کھڑے ہیں۔ ٹھیک ہے میں دیگر لکھے دیتی ہوں۔ جہنّم میں جاؤ!" کلرک نے دوبارہ گویا پوری قطار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اس طرح مجھے وہ ضروری کاغذات حاصل ہو گئے جو تصدیق کرتے ہیں کہ میں کروشیا کی شہری ہوں۔

اس بات کے پیشِ نظر کہ میں پناہ گزیں نہیں ہوں اور میرے پاس ابھی تک ملازمت بھی ہے، میرے زندہ رہ جانے کے مواقع نہایت بہتر ہو گئے ہیں۔ ڈبل روٹی اور دودھ کے لیے میں بہت احتیاط سے بجٹ بناتی ہوں۔ میں کرایہ اور بجلی، پانی اور ٹیلیفون کے بِل نہیں دیتی، میں اخبار نہیں خریدتی، اور یہ کفایت کی وجہ سے نہیں ہے۔ میں گوشت نہیں کھاتی۔ پھلوں اور سبزیوں کی جگہ مَیں امریکی وٹامن گولیاں چُوس لیتی ہوں (ان کی سال بھر کی رسد میرے پاس ہے۔) میں نے اپنے کپڑے پناہ گزینوں کو دے دیے ہیں۔ جوتوں کی مجھے کوئی خاص ضرورت نہیں کیوں کہ میں باہر جاتی ہی نہیں۔ سنگھار کی اشیا کی جگہ میں والماشیا کا خالص زیتون کا بچاکھچا تیل استعمال کرتی ہوں جو میں نے پچھلے سال براک کے جزیرے پر خریدا تھا۔ میں نے شکایت نہ کرنا سیکھ لیا ہے۔ کچھ دن پہلے میں نے اپنی پڑوسن سے کہا تھا کہ میں چہرے پر لگانے والی کریم نہیں خرید سکتی۔ میں نے کہا تھا: "دیکھو تو کیا نوبت آ گئی ہے۔ کریم کی جگہ زیتون کا تیل۔۔۔"

"شکر کرو کہ تم ابھی تک زندہ ہو اور تمہارے سر پر چھت ہے اور تم اپاہج نہیں ہوئیں۔ فرض کرو تم محاذ پر ہوتیں اور اس وقت وِیل چیئر پر پھر رہی ہوتیں، تب؟" میری پڑوسن نے نہایت سختی کے ساتھ مجھ سے کہا۔

"واقعی!" میں بولی۔

"یا تم چاہتی ہو کہ میلوشےوچ آ جائے؟" پڑوسن نے اپنا چہرہ بالکل میرے چہرے میں گھسیڑتے ہوئے خوفناک آواز میں کہا۔

"نہیں نہیں، ہر گز نہیں! خدانخواستہ!" میں نے کہا۔

"عین ممکن تھا کہ عینِ اس وقت وہ ہولناک سرب کسی کیمپ میں تم سے زنا بالجبر کر رہے ہوتے، تمھیں اذیتیں دے رہے ہوتے؟" اس نے اور بھی جوش میں آ کر کہا۔ "کیا تم یہی چاہتی ہو؟ بولو، بتاؤ!"

"نہیں نہیں!" میں نے کانپ کر کہا۔ "اُف! اس قدر خوفناک نقشہ!"

Scanned with CamScanner

"یا شاید تمھاری خواہش ہے کہ ہم اب تک قومیتوں کے قید خانے میں رہ رہے ہوتے؟"

"کیسا قومیتوں کا قید خانہ؟"

"ارے بھئی وہی سابق یوگوسلاویا۔"

"اوہ! نہیں، قید خانے میں تو ہرگز نہیں!"

"تو پھر! اگر دیکھا جائے تو ہمارے حالات اچھے ہی ہیں،" میری پڑوسن نے کہا۔

"بالکل بالکل!" میں نے کہا، اور نہ جانے کیوں زیتون کے تیل کی بوتل اُس کے ہاتھ میں تھما دی۔

"یہ تم لے لو،" میں نے متاثر ہو کر کہا۔

"شکریہ،" وہ بولی۔ "آلو کا سلاد بنانے میں بہت کام آئے گی۔"

اب میں روزمرہ کی زندگی کے بارے میں بالکل شکایت نہیں کرتی۔ میں روسی ادب کی ماہر ہوں: میں نے زوشینکو، اِلف (Ilf) اور پیتروف کو پڑھ رکھا ہے۔ میں نے بلگاکوف پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا تھا۔ میں آمریت (کم از کم ادبی آمریت) کی ترکیب کار سے بخوبی واقف ہوں۔ مگر میں نہیں جانتی تھی کہ کبھی میں خود اس میں زندگی گزار رہی ہوں گی۔ خصوصاً اب تو ہرگز نہیں جب جمہوریت آ گئی ہے۔ سابقہ یوگو کمیونسٹ دور میں (میں نے یہ اصطلاحیں سیکھ لی ہیں) قطاریں یقیناً چھوٹی اور تنخواہیں زیادہ تھیں، اور "روسی مناظر" کم تر دکھائی دیتے تھے۔ لیکن اس بارے میں میں اپنی زبان بند رکھتی ہوں۔ مجھ پر بالشوزم کا الزام لگایا جا سکتا ہے۔ اور بالشویک کون ہیں، یہ تو سب جانتے ہیں: سرب، چیتنک، یوگو حملہ آور، ہمارے جانی دشمن جنھوں نے ہمیں اس عذاب میں مبتلا کیا۔

میں جانتی اور تسلیم کرتی ہوں کہ زمانۂ جنگ میں تہذیب و ثقافت کو اولیت حاصل نہیں ہوتی۔ میں سنیما دیکھنے نہیں جاتی (وہاں بم پھٹ سکتا ہے)، کتابیں نہیں پڑھتی (وہ ہیں ہی نہیں) -- حالاں کہ جنگ کے زمانے میں سب لوگ ادیبوں کے بارے میں باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ نہ جانے کیوں تمام بعد از کمیونزم ریاستیں اس بات کی خواہاں ہیں کہ ادیب اُن کی رہنمائی کریں۔ سربیا کی پارلیمنٹ میں نصف ارکان ادیب ہیں۔ خود ہمارے صدر ادب سے اپنی اُلفت پوشیدہ نہیں رکھتے۔ جوں ہی کوئی حکومت کا پسندیدہ ادیب مرتا ہے، صدر بہ نفسِ نفیس تعزیت کے لیے ٹی وی پر نمودار ہو جاتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

"اگر تم ہمیں ایک سو چالیس کلو گرام کاغذ لادو تو ہم تمھاری کتاب چھاپ دیں گے،" میرے ایک ناشر دوست نے مجھ سے کہا۔

"میں ایک سو چالیس کلو کاغذ کہاں سے لاؤں؟"

"یہ میں کیا جانوں،" میرا دوست بولا۔ "یہ تمھارا دردِ سر ہے۔ ادیب تم ہو!"

کبھی کبھی میں حسرت سے ماضی کے ایک بھولے بسرے آمرانہ برس کو یاد کرتی ہوں جو میں نے ماسکو میں گزارا تھا۔ میرے تمام احباب۔۔ادیب، دانشور، مصوّر۔۔ہنسی خوشی حکومت کی مخالفت کرتے تھے اور خفیہ سرگرمیوں میں سر سے پیر تک غرق تھے۔ کیا تخلیقی اور جان دار دور تھا! اور اب دیکھیے، کہ جمہوریت ہے، ہم نے خود ووٹ دے کر حکومت کو منتخب کیا ہے اور۔۔۔ ہائیں! یہ میں کیا بک رہی ہوں؟ کہیں پاگل تو نہیں ہو گئی؟ کیا میں کیک پر آئسنگ کی خواہاں ہوں؟ کیا میں اب جمہوریت اور آمریت میں تمیز تک نہیں کر سکتی؟

میں جاں بر رہوں گی، میں اپنے آپ سے کہتی ہوں۔ میں باہر نہیں جاؤں گی۔ میں کسی سے نہیں ملوں گی۔ یہ محسوس کر کے مجھے اطمینان ہوتا ہے کہ میرے دل کے اطراف لاتعلقی کی تہہ جمنے لگی ہے۔ اگر کسی سرب کا گھر دھماکے سے اُڑتا ہے تو میں سُنی ہوئی باتیں دُہراتی ہوں: "تو انھوں نے ہماری زمین پر گھر بنایا ہی کیوں تھا!" اور میں دیکھتی ہوں کہ میرے اس ردِعمل کو سب لوگ سراہتے ہیں۔ اگر کسی معصوم سرب پر حملہ ہوتا ہے تو میں احتجاج نہیں کرتی۔ میں کہتی ہوں: "اب پتا چلا کہ بلاقصور مار کھانا کیسا ہوتا ہے!" اور اس بات پر کوئی ناراض نہیں ہوتا، کوئی تبصرہ نہیں کرتا۔ لوگ مل کر اثبات میں سر ہلاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ پورا ملک، میرا پیارا ننھا سا کروشیا ایک مدرسہ بن گیا جہاں طلبا ہم آواز ہو کر کورس گا رہے ہوں۔

اب میں بالکل فکر نہیں کرتی۔ میں نے اپنی بقا کے حق میں فیصلہ کر لیا ہے۔ اب میں اُن سرپھروں کی سرِعام کردار کشی خاموشی سے دیکھتی ہوں جنھیں اختلافِ رائے کی مجال ہوئی، اور وہ بھی دنیا کے اس سب سے زیادہ جمہوری ملک میں! (جیسا کہ ہمارے صدر بار بار کہتے ہیں)۔ میں دیکھتی ہوں کہ ٹی وی کس طرح کردار کشی کا اکھاڑا بن چکا ہے۔ (ٹیلی وژن کے ڈائرکٹر صدر کے گہرے دوست ہیں۔) میں دیکھتی ہوں کہ ہر طرف یادگاریں مسمار کی جا رہی ہیں۔ میں بالکل فکر نہیں کرتی۔ فکر کیوں کروں؟ ارے بھئی ہمارے شہروں کو بمباری نے خاک میں ملا دیا ہے اور میں چند یادگاروں کا رونا لیے بیٹھی رہوں۔ یوں بھی جمہوریت میں یہ عام بات ہے کہ لوگ جن یادگاروں

کو پسند نہیں کرتے اُنھیں گرا دیتے ہیں اور جو یادگاریں چاہتے ہیں وہ بنا لیتے ہیں۔

"ہم نے ہمیشہ تعمیر کی ہے۔۔۔ یہ تو ہمارے خون میں ہے۔ اس دوران اگر کچھ ٹوٹ پھوٹ ہو جائے تو یہ بُری عادت ہمیں وحشی سربوں کی صحبت میں پڑ گئی ہے،" میرے پڑوسی کا کہنا ہے۔

"بالکل ٹھیک،" میں کہتی ہوں اور یاد کرتی ہوں کہ میں نے اپنی بقا کے حق میں فیصلہ کیا ہے۔

کبھی کبھی لوگوں کے چہروں پر خوف اور عقیدت کے ملے جلے تاثرات دیکھ کر، اور کسی مطلق العنان حکمراں کے لیے ان کی سرحام، بے شرمانہ آرزو پر میرا جی متلاتا ہے۔ یا اُس وقت جب میرے ہم وطن موجودہ جمہوری منتخب صدر کو ابا، باوا اور بابائے وطن کہتے ہیں، اس بات کو سراسر بھول کر کہ بعینہٖ یہی الفاظ وہ ٹیٹو کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس بات کو ابھی دس ہی برس تو ہوئے ہیں!

اُس وقت میرے لیے کاروبارِ بقا ذرا زیادہ مشکل ہو جاتا ہے جب ٹی وی شو میں شامل تمام افراد اپنے گلوں میں پڑی صلیبوں کا رخ کیمرے کی طرف کر کر کے دکھاتے ہیں جیسے یہ کوئی ڈراونی فلم ہو۔ مردوں کے گریبان نیچے تک کھلے ہوئے، تاکہ صلیب دور سے نظر آسکے، اور برہنہ گردنوں والی عورتیں۔ صلیبیں ناظرین کو بے تابی سے اشارے کرتی ہیں کہ ان کے پہننے والے مذہب پر پختہ عقیدہ رکھتے ہیں، مغربی ہیں اور مہذب ہیں۔ جنگلی جانوروں کی طرح خون کے پیاسے نہیں، جیسا کہ ہمارے دشمن ہیں۔ میں نئی ترجیحات کو سمجھتی ہوں۔ ایک آدھ صلیب کی نمائش کی کیا اہمیت، جب کہ اصل جانیں ضائع ہو رہی ہیں (حالاں کہ گلے کی چین میں پڑی یہ صلیبیں مجھے کبھی کبھی دھات کے بنے اُس نشان کی یاد دلاتی ہیں جو فوجیوں کے گلے میں پڑا ہوتا ہے اور مارے جانے پر جسے اُن کے منھ میں ڈال دیا جاتا ہے۔)

میرا ایک ملاقاتی شدید بیمار ہو گیا۔ اس نے کہا: "میں اپنی بقا چاہتا ہوں۔ مرض پر فتح پانے کے لیے مجھے اس کے ساتھ زندہ رہنا سیکھنا ہو گا۔" میرے ملاقاتی کی جان بچ گئی مگر وہ بدل بہت گیا۔ وہ کھویا کھویا لگتا ہے۔ بیرونی دنیا کی کوئی شے اس میں تحرک پیدا نہیں کرتی۔ وہ ہمیشہ اپنی نبض ٹٹولتا رہتا ہے اور اپنی حرکتِ قلب سننے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی اُس کے زرد، سُتے ہوئے چہرے پر نفرت کی پرچھائیں نظر آتی ہے۔ "مجھے صحت مندوں سے نفرت ہے،" وہ صاف کہتا ہے۔

جان بچانے کی حالت جذباتی، سماجی اور اخلاقی طور پر مریضانہ خودپرستی کی کیفیت کا نام ہے۔ بقا کا تہیہ کیے ہوئے لوگ عجیب و غریب قسم کے ہوتے ہیں۔ شاید اگلے ہفتے مَیں دودھ اور ڈبل روٹی خریدنے کے بدلے مٹی کا تیل خرید لوں اور جان پالاچ (Jan Palach) کی طرح بیچ چوراہے پر اپنے بدن پر چھڑک کر آگ لگا لوں۔

"یہ سرقہ ہے!" کوئی باخبر راہ گیر کہے گا۔ "جان پالاچ نے بھی خود کو نذرِ آتش کیا تھا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے،" کوئی دوسرا کہے گا۔ "مگر کیوں کیا تھا؟"

**

Scanned with CamScanner

دُبراوکا اُگریشِک

ترجمہ: اجمل کمال

کروشیائی ادیبو، شب بخیر!

"کروشیائی مجاہدو، تم جہاں کہیں بھی ہو، شب بخیر!" کروشیائی ٹیلی وژن کی شام کی نشریات کا اختتام اِسی پیغام پر ہوتا ہے۔ مادرِ وطن کا دفاع کرنے والوں کے لیے یہ پیغام، پرائم ٹائم میں، نشر کیا جانا سال بھر پہلے شروع ہوا تھا، اور آج بھی جاری ہے۔

اِس دشوار زمانے میں کروشیائی ادیب کی زندگی آسان نہیں ہے۔ اب کہ روزمرہ حقیقت کی بنیادی سرحدیں صرف زندہ رہنے اور جان بچا لے جانے تک محدود ہو گئی ہیں، کروشیائی ادیب کی صورتِ حال مزید پیچیدہ ہو گئی ہے۔ وہ لکھنا بھی چاہتا ہے، اور سادہ ترین لفظوں میں بیان کیا جائے تو لکھنے کا مطلب ہے سوچنا۔ یہ عمل کچھ کروشیائی ادیبوں کے لیے، خصوصاً اس ادیب کے لیے جس کا ہم یہاں ذکر کر رہے ہیں، اس قدر محال کیوں ہو گیا ہے؟

ہمارا یہ کروشیائی ادیب آج ایک سادہ سفید کاغذ کے سامنے اس طرح بیٹھا ہے جیسے یہ کاغذ نہیں بلکہ بارودی سرنگوں سے بھرا میدان ہو۔ اس کے بہت سے ساتھی ادیب میدان پار کر کے دوسری طرف پہنچ چکے ہیں، اور ہاتھ ہلا ہلا کر اُسے بلا رہے ہیں۔ وہ مہربان آواز میں اسے پکارتے ہیں۔ "چلے آؤ!" وہ کہتے ہیں، "اتنا مشکل نہیں ہے۔" ہمارا ادیب شک میں اپنی گردن ہلاتا ہے۔ اس کے کچھ ساتھی ایسے بھی تھے جو اُس پار نہ پہنچ سکے، اور کچھ ایسے جو بمشکل میدان پار کرنے میں کامیاب ہوے۔ بعضے بالکل کنارے کے پاس کھڑے ہیں اور میدان پار کر جانے کا حوصلہ نہیں کر پاتے۔ لیکن بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے نہ صرف میدان عبور کیا بلکہ گزرتے ہوے انتباہ کی تختیاں بھی لگاتے گئے: "بارودی سرنگوں سے ہوشیار!" سفید کاغذ کے سادہ صفحے ہمارے ادیب کے سامنے پڑے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز تنبیہوں سے بھری ہوئی ہے: ہر طرف "ٹھہرو!" کے سرخ نشان ہیں، حفاظت سے گزرنے کے تنگ راستوں پر سبز بتیاں لگی ہیں، خبردار رہنے کی

Scanned with CamScanner

زرد علامتیں ہیں، کھوپڑی والے خطرے کے نشان بنے ہوئے ہیں---

ہمارا کروشیائی ادیب خود کو ابلاغ کی ایک بالکل نئی دنیا میں پاتا ہے جو جنگ کی تازہ اور ہولناک حقیقت کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے۔ کبھی کبھی اُسے یوں لگتا ہے کہ فنکارانہ پیغامات بھیجنے کا کام اب آوازوں میں تمیز کرنے، رکاوٹیں ہٹانے اور اپنی سابقہ تحریروں کی (جو بہرحال لکھی جا چکی ہیں) وضاحتیں کرنے کی دردناک مشقت بن کر رہ گیا ہے۔ اُسے لگتا ہے کہ ماضی کے کسی چند صفحوں کے متن کو اس سے دگنے طویل فٹ نوٹس درکار ہیں۔ اس کے متن کو اب اُس طرح نہیں سمجھا جاتا جیسے پہلے سمجھا جاتا تھا: کوئی چیز بیچ میں حائل ہو جاتی ہے، لفظوں کے معنی وہ نہیں رہے جو پہلے تھے، اس کا لکھا ہوا ہر لفظ پلٹ کر اس کے منہ پر آ پڑتا ہے۔

ہمارے ادیب کو اس کا سبب یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب اشاروں میں باتیں کرنا ممکن نہیں رہا، کیوں کہ ایک مشترک کوڈ جو پہلے تھا اب موجود نہیں رہا۔ یا اس کی جگہ کوئی نیا مشترک کوڈ قائم ہو گیا ہے جو باقی سب کو معلوم ہے مگر اُسے نہیں معلوم۔

اس کے علاوہ اُسے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ جس دنیا سے وہ خود واقف تھا وہ (چاہے یہ اچھی بات ہو یا بُری) ریزہ ریزہ ہو کر بکھر چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کا، ہمارے ادیب کا، تناظر اب مشکوک قرار پایا ہے، زمانۂ جنگ کے انتشار کا نشانہ بن گیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے ادیب کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ جن لوگوں سے خطاب کر رہا ہے اب ان کے ذہنی رخ کو نہیں پہچان پاتا۔ یہ لوگ بدل گئے ہیں اور وہ خود نہیں بدلا۔ یا شاید معاملہ اس کے برعکس ہو، وہ خود بدل گیا ہو اور یہ لوگ پہلے جیسے ہوں۔ کچھ بھی ہو، یقینی بات یہ ہے کہ اس کے پیغام کو مختلف لوگ مختلف طرح پڑھنے لگے ہیں: وہ جو خندقوں میں بیٹھے ہیں اور وہ جو خندق کے اِس طرف یا اُس طرف ہیں؛ وہ جن کے سروں پر چھت ہے اور وہ جو چھت سے محروم ہو چکے ہیں؛ وہ جو خوراک سے محروم ہیں اور وہ جن کے پاس کھانے کو کافی کچھ ہے؛ وہ جنھیں نئی وضع کے کنسنٹریشن کیمپوں میں رہنے کا تجربہ ہو چکا ہے اور وہ جنھوں نے صرف ٹیلی وژن پر جنگ کی تصویریں دیکھی ہیں۔

ابلاغ کی اس نئی ترتیب میں ہمارے ادیب کو اس مطالبے کا سامنا ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں ایسے واضح اشارے شامل کرے جن کی اس کے پڑھنے والے توقع رکھتے ہیں: پڑھنے والے بھی آخر اس متن میں سے گزرنا، اسے "درست" رُخ سے پڑھنا چاہتے ہیں۔

پہلا اشارہ -- جو موجودہ حالات میں پورے متن کا تعین کر دیتا ہے -- لکھنے والے کی نسلی وابستگی ہے۔ اگر وہ اتفاق سے کروٹ ہے، تو نئی وضع کی حقیقت پر اس کی تنقید کی مذمت تو ضرور ہو گی لیکن اُسے معاف کر دیا جائے گا۔ آخر ہے تو وہ ہمیں میں سے، پڑھنے والے عوام اطمینان

Scanned with CamScanner

محسوس کرتے ہوئے سوچیں گے۔ اگر وہ سرب ہے، یعنی کروشیائی سرب، تب اُسے ہرگز معاف نہیں کیا جائے گا۔۔ بہت طویل عرصے تک تو اُس کے سرب ہونے ہی کو معاف نہیں کیا جائے گا۔۔ لیکن بہر حال اس اشارے سے کم از کم یہ بات صاف ہو جائے گی کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے۔ اگر اس کی نسلی وابستگی نامعلوم ہے تو اس پر کسی نہ کسی نسل کا لیبل عوام خود لگا دیں گے: کوئی نہ کوئی اُس کی اصل جان جائے گا، یا گمان کرلے گا کہ جانتا ہے۔ (جاننے اور جاننے کا گمان کرنے میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔)

لوگوں کے بلڈ گروپوں کے حساب سے بنائے گئے اس نقشے میں کسی بھی سماجی عمل کا فیصلہ ۔۔ خواہ یہ پڑوسی کو "صبح بخیر" کہنے کا معمولی عمل ہی کیوں نہ ہو۔۔ مقدس بلڈ گروپ کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ عام پھیلے ہوئے آسیبِ خوف کے اس نظام میں، کسی فرد کی قومیت ہی بنیادی حقیقت کا درجہ رکھتی ہے اور باقی تمام چیزوں کو پرکھنے کی کسوٹی کا کام دیتی ہے۔ اسی سے کسی پیغام کے تناظر یا سیاق و سباق کا تعین ہوتا ہے اور یہی پیغام بھیجنے والے اور وصول کرنے والے کے باہمی رشتے میں بنیادی مفروضے کا کردار ادا کرتی ہے۔ ادیب اور اس کے متن سے پہلا مطالبہ یہی ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اس مفروضے کا صاف لفظوں میں اور برسرِ عام تصفیہ کرے۔ اس خوف سے کہ اس کا پیغام سمجھا نہیں جائے گا، یا کچھ اور سمجھ لیا جائے گا، ادیب یہ پہلا اشارہ دے دیتا ہے۔ ایسا کرتے ہی اُس کا پیغام ابلاغ کے مختلف راستوں سے مختلف ردِ عمل پیدا کرتا آگے بڑھنے لگتا ہے: ہم ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں، ہم ایک دوسرے سے متفق ہیں، ہم ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں لیکن متفق نہیں، ہم متفق ہیں خواہ ایک دوسرے کو سمجھتے نہ ہوں۔

ایک اَور نمایاں طور پر اہم اشارہ جو کسی متن کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے ۔۔ خواہ یہ متن پڑوسی سے کہے گئے "صبح بخیر" ہی پر کیوں نہ مشتمل ہو۔۔ ادیب کا سماجی پس منظر ہے، یا کم سے کم یہ کہ وہ کئی سیاسی متبادلوں میں سے کس سے واضح طور پر یا ڈھکے چھپے انداز میں وابستہ ہے۔

آسیبِ خوف میں مبتلا ابلاغی نظام کی اس سیاسی خانہ بندی میں "یوگو نوسٹلجیا" کا شمار انتہائی معنی آفریں (loaded) اشاروں میں ہوتا ہے۔ یہ بہت سے دوسرے لیبلوں سے، جو آج کل مروج ہیں ۔۔ مثلاً "چیتنک"، "قومیت کے لحاظ سے کلر بلائنڈ"، "کمیونسٹ"، "گریٹ سرب" وغیرہ۔۔ کہیں زیادہ معنی آفریں ہے۔ اس چھوٹی سی اصطلاح میں بہت سی خطرناک چیزیں پوشیدہ ہیں، مثلاً نئے نظام کی بابت پُرفریب تشکیک، یہ خیال کہ شاید پرانا نظام، کمیونسٹ نظام، اِس سے بہتر تھا۔ نئے نظام کی بابت شک رکھنا نوزائیدہ ریاست کے خلاف ایک مخاصمانہ عمل ہے۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ یہ شخص جنگ کی مذمت کرتا ہے اور ممکن ہے یہ تک مانتا ہو کہ ہمارے دشمن

Scanned with CamScanner

بھی انسان ہیں۔ اس سے اس شخص کی کمیونزم سے، اور کمیونزم کے ساتھ آنے والی ہر چیز سے، وابستگی کا بھی اشارہ ملتا ہے۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ نوسٹلجیا خطرناک ہے کیوں کہ یہ یاد رکھنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ نئی قائم شدہ حقیقت میں ہر چیز نئے سرے سے شروع کی گئی ہے۔ اور نئے سرے سے شروع کرنے کے لیے اس سے پہلے کی ہر چیز کا بھلایا جانا لازمی ہے۔

یہی سبب ہے کہ ادیب، کم و بیش خوشی خوشی، اپنے متن میں کچھ اضافی اشارے بھی شامل کر لیتا ہے۔ یہ اشارے اس کے پس منظر اور اسلوبِ تحریر کے لحاظ سے واضح یا قدرے مبہم ہو سکتے ہیں، لیکن ان کا ہونا اس امر کے لیے ضروری ہے کہ متن اپنے پڑھنے والوں تک صاف صاف پہنچ سکے۔ یہ اشارے اس قسم کے ہوتے ہیں: "میں یوگو نوسٹلجیا میں مبتلا نہیں ہوں"؛ "میں قومیتوں کے قیدخانے کا حامی نہیں ہوں"؛ "میں کمیونسٹ نہیں تھا"، یا "تھا تو سہی مگر بہت کم عرصے کے لیے"، یا "تھا تو سہی مگر ان کے بارے میں میری رائے ہمیشہ پست رہی"، وغیرہ وغیرہ۔

بعینہٖ جس طرح عام لوگ ایک دوسرے سے اپنے ابلاغ کو سہل بنانے اور چیزوں کو ان کے درست مقام پر رکھنے کی غرض سے مختلف قسم کے بِلّے لگا لیتے ہیں -- گردن میں پہنی ہوئی ننھی صلیبیں، کاروں اور فلیٹ کی کھڑکیوں پر کروشیا کے قومی نشان کے اسٹکر -- اسی قسم کے اشاروں کے سادہ اور عام فہم نظام کی توقع ادیب سے بھی کی جاتی ہے۔ اس کا کام پیغام بھیجنا ہے اور اس پیغام کا وصول کرنے والے تک بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچنا ضروری ہے۔

لیکن لگتا ہے کہ پیغام وصول کرنے والے اب "قارئین" نہیں رہے بلکہ "عوام" بن گئے ہیں۔ اور ہمارا ادیب، چاہے یا نہ چاہے، ایک بالکل نئی صورتِ حال میں ہے: اسے عوام کے نام پیغام بھیجنے ہیں! وہ، ارادہ کر کے یا اتفاق سے، عوام کا ادیب بن گیا ہے۔ اور عوام کا ادیب بننے سے کیا مراد ہے، یہی ہمارے ادیب کو معلوم نہیں۔ جیسے یہ معلوم نہیں کہ "عوام" سے کیا مراد ہے۔ اُس کا ادبی حافظہ اُدھیڑبن اور تلاش کے عالم میں اس جسیم اور مبہم ملغوبے کو "پاپولر" ناولوں سے، انیسویں صدی سے، "سمجھ کر لکھوانے" کے نظریے سے، حبِ وطن سے، دشوار حالات میں "دانش ور کے کردار" سے، جوڑنے کی تگ و دو کرتا ہے۔ آخر ان "عوام" نے ایسے حالات میں "سمجھ کر لکھوانے" کا کام کیوں شروع کر دیا، ہمارا ادیب جھلّاتا ہے، جب کہ کتابیں یوں ہی نایاب ہیں، اور جب کہ "عوام" کو کتابوں کی نایابی پر کوئی خاص تشویش بھی نہیں ہے، اور جب کہ ایسے ناخوشگوار حالات میں آرٹ یوں بھی سنی سنائی باتوں کی ترسیل تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے!

ہمارا ادیب جانتا ہے کہ جنگ نے ہر چیز کو بدل ڈالا ہے: کوئی بھی شخص اب وہ نہیں رہا جو پہلے تھا: خود اُس کی اپنی حقیقت، اُس کا اپنا معمول درہم برہم ہو چکا ہے۔ اس کی جگہ، اس کی

Scanned with CamScanner

آنکھوں کے سامنے، ایک نئی حقیقت وجود میں آ رہی ہے: نئی اقدار قائم کی جا رہی ہیں، ایک نئی دنیا تعمیر ہو رہی ہے اور جوں ہی اس کا نام رکھ دیا جائے گا، یہ ایک زندہ وجود بن جائے گی۔

تعمیر کا عمل نام رکھنے ہی سے شروع ہوتا ہے: یہ مکان ہے، یہ وطن ہے، یہ سیاہ ہے، یہ سفید ہے۔ ہمارا ادیب شدید اُلجھن میں مبتلا ہے۔ اسے انکسارانہ خیال آتا ہے کہ نام رکھنا تو خدا کا کام ہے۔ اسے نام رکھنے کے اس جوش و خروش پر تعجب ہوتا ہے، بظاہر اس کا مقصد اپنے آپ کو اور دوسروں کو یقین دلانا ہے کہ نئی حقیقت واقعی وجود رکھتی ہے۔ راستا کھو بیٹھنے سے محفوظ رہنا صرف واضح، ٹھوس حدوں والی دنیا میں ممکن ہے جس کا مخصوص نام بھی ہو۔ صرف اسی طرح ہم پاگل پن، ابہام اور متبادل سچائیوں کے انتشار کے خطرات سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

اور تب ہمارے ادیب کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجتی ہے: اس کا، کسی ادیب کا، کام تو کسی واحد سچائی سے وابستہ ہو جانا نہیں ہے، ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن اس کے اور اس کے مخاطبوں کے درمیان جو نیا رشتہ قائم ہوا ہے اس میں صرف ایک ہی سچائی کی گنجائش ہے، یا اُس شے کی جس کا نام سچ رکھا گیا ہے۔ باقی سب کچھ جھوٹ ہے۔

ہمارا ادیب خود کو ابلاغ کی ایک نئی صورتِ حال میں پاتا ہے جو فوٹوگرافی سے ملتی جلتی ہے جہاں اس کے اندر، بالکل ڈبل ایکسپوژر کی طرح، چیزیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہی ہیں: اس نئی صورتِ حال میں وہ نہیں جانتا کہ کس نقطے پر ذات کی حد ختم اور ادیب کی حد شروع ہوتی ہے، یا اس کے دل اور دماغ کی درمیانی سرحد کس جگہ واقع ہے۔ خلجان کی اس حالت میں اُس سے ایک ایسی چیز کی فراہمی کا مطالبہ کیا جاتا ہے جو اس کی سمجھ میں نہیں آتی، جو اس کے بس سے باہر ہے: اس سے اپنے عوام کی ترجمانی کرنے کو کہا جاتا ہے، "درست" سیاسی سچائیوں کا پیغام رساں یا لاؤڈ سپیکر بننے کا، تسلی دینے اور رہنمائی کرنے کا، مقبولِ عام مغنّی اور زخموں پر مرہم رکھنے والے کا کردار ادا کرنے کا، "قومی وجود" کو پرکھنے اور اسے روحانی طور پر زندہ کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

ہمارا ادیب سخت بے چینی کا شکار ہے، اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں مسلسل بج رہی ہیں، اس کی "قومیت" کا اسمِ اعظم، "اپنے عوام" -- "ادیب کے عوام" -- کا اسمِ اعظم، بار بار نمودار ہوتا ہے۔ اسے قومی برادری کی جانب سے دلکش مقبولیت اور تکلیف دہ استرداد کے عشرے، صدیاں اور زمانے یاد آتے ہیں۔ اسے "کردار" سے مطابقت پر رضامند ہونے کے نتائج یاد آتے ہیں، اسے اپنے ہم عصروں کے ادبی کیریر، ان کے لکھے ہوئے سابقہ اور حالیہ لفظ یاد آتے ہیں جو اِنھیں ہونٹوں سے، اِنھیں قلموں سے نکلے تھے۔ اسے ادیب کے ہنر کی عمومی تاریخ اور اس

Scanned with CamScanner

کے خاص خاص شرمناک اور باوقار لمحے یاد آتے ہیں۔

ہمارا ادیب کروشیا کا شہری ہے: وہ گویا ایک دل ہے جو عام مصائب کی وریدوں سے جُڑا ہوا ہے۔ اس کی دنیا دو ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے، حقیقت اس کے سامنے کسی بھیانک بدخواب کی طرح ظاہر ہو رہی ہے۔ اس کا نصف حصہ، ادبی نصف، تجویز کردہ حکمت عملی کی مزاحمت کرتا ہے: دہشت گردی کو نام دینے کے لیے اُسے فراموش کر دیا جائے، پرانے یوٹوپیا کے ملبے پر نیا یوٹوپیا تعمیر کیا جائے، غیر مبہم زبان استعمال کی جائے، ننھے تصوراتی پھول تخلیق کیے جائیں جو شعور میں سبزے کی نئی پتیاں بن کر جی اُٹھیں۔ یہ سب کچھ تو ایک بار پہلے بھی ہو چکا ہے، اور اس کو کچھ بہت عرصہ بھی نہیں گزرا، اسے یہ بات کلچر اور سیاست کے رشتے کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوئی ہے۔ اس کا دوسرا نصف حصہ، شہری نصف، اپنے ہم وطنوں کو، اپنے موجودہ اور سابقہ ملک کو، پیش آنے والے مصائب پر غم سے پارہ پارہ ہو رہا ہے۔ وہ ان دونوں نصف حصّوں کو ایک دوسرے سے کیوں کر الگ کرے، کس طرح ایک دوسرے سے پیوست کرے؟ کیسے آگے بڑھے؟

جواب کی جستجو میں ہمارا ادیب اپنے ہم عصر ادیبوں، صحافیوں، دانشوروں سے رجوع کرتا ہے۔ ان میں سے وہ لوگ جو خاموش نہیں ہیں، اکثر مطابقت پیدا کر چکے ہیں۔ انھوں نے ابلاغ کے بدلے ہوئے نظام اور نئی قائم کردہ حقیقت میں طرزِ عمل کے مخصوص ضابطوں کو تسلیم کر لیا ہے۔ یعنی اُنھوں نے اپنی اجتماعی ادبی زندگی کی پرانی ترکیبوں کو برقرار رکھا ہے۔ کسی خاص فنّی یا اخلاقی دشواری کے بغیر وہ اُسی زبان، اُنھیں ذہنی اور لسانی فارمولوں سے کام لے کر بتاتے ہیں کہ کس طرح ناخوش گوار صورت حال سے ہر شخص یکساں طور پر متاثر ہوا ہے۔ باہر سے دیکھنے پر یہ لوگ ایک گرم، دھواں بھری، شیریں اجتماعیت میں معصومیت اور اطمینان کے ساتھ تیرتے معلوم ہوتے ہیں۔ لگتا ہے ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہے کہ وہ ایک ایسے انجام سے دوچار ہونے والے ہیں جس سے ان کا پہلے بھی سابقہ پڑ چکا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک شفقت بھری فراموشی نے ان کی یادداشت کو موکر دیا ہے۔

ہمارا ادیب اپنے ہم عصروں کو بحث میں مصروف دیکھتا ہے، ایسے جوش و خروش کے ساتھ جس پر وہ خود بھی حیران ہیں، اس موضوع پر کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ کروشیا کے عظیم ترین کلاسیکی ادیب کی تحریریں مکمل صورت میں شائع کی جائیں، یا ان میں سے سیاسی مضامین حذف کر دیے جائیں، خاص طور پر وہ مضامین جو یوگوسلاویا سے متعلق ہیں (کیا ان کو شائع کرنا کا یہ مناسب وقت ہے؟)، ایسے ادیب کی تحریریں شائع ہونی بھی چاہییں یا نہیں؟ ہمارا ادیب اپنے ہم عصر

Scanned with CamScanner

ادیبوں کو زور شور سے بحث کرتے ہوئے دیکھتا ہے کہ ایک اور ہم عصر ادیب کو (جس پر اُن کا اجتماعی ماتھا کافی دنوں سے ٹھنک رہا تھا) تلف کیوں نہ کر دیا جائے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے ہم عصر ادیبوں کے ذہن سے یہ بات نکل گئی ہے کہ ماضی میں چند اصول ان کی رہنمائی کرتے تھے اور اب اُن کی جگہ نئے اصولوں نے لے لی ہے۔ وہ یہ بھول گئے ہیں کہ اُن کے ساتھ بھی ماضی میں یہ سلوک کیا گیا تھا۔ اس کے ہم عصر راہداریوں میں کھڑے ہو کر گفتگو کر رہے ہیں، تقریباً سنسان اداراتی بورڈوں میں ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں، ایک دوسرے پر الزامات عائد کر رہے ہیں جیسے کوئی سچا مومن کسی ملحد کو ملزم ٹھہرا رہا ہو۔

نئے قائم شدہ اور آسیب خوف میں مبتلا ابلاغی نظام میں، اپنی اپنی روزمرّہ زندگی میں، اس کے ہم عصر اچانک صحیح راستے، صحیح خیال کی غیر مرئی جنگیں لڑنے لگے ہیں۔ وہ ناگاہ چھوٹے چھوٹے محبِ وطن مخبروں کی ایک بے قاعدہ فوج میں گھِر گئے ہیں جو اُنھیں اِس شخص یا اُس شخص کے وطن دشمن رویے کی بابت اطلاعیں فراہم کرتی ہے۔ حق خطرے میں ہے، پُرخلوص محبِ وطن احساسات داؤ پر لگے ہوئے ہیں، اور اس وقت تمام طریقے روا ہیں۔ طریقوں کی پروا مت کرو، یہ سب کچھ وطن کے نام پر کیا جا رہا ہے جو خطرے میں ہے۔ اس کے ہم عصر ادیب، محسوس کیے بغیر، پولیس والوں اور درباریوں میں تبدیل ہو رہے ہیں جن کی انگلیاں اجتماعی حبِ وطن کی نبض پر ہیں۔ اپنے چہرے پر سچے مومنوں کا سا سنجیدہ، گدلا بھُورا نقاب چڑھائے (جسے غیر شعوری طور پر پیش رووں سے اخذ کر لیا گیا ہے) اس کے ہم عصر ادیب خود کو انتظامی اہلکاروں میں بدل رہے ہیں۔ اجتماعی نظاموں میں، جن کی مردانگی کا اظہار محض افراد کا شکار کرنے، ان کو اجتماع کے زور پر کچلنے کی شکل میں ہوتا ہے، یہ ایک منطقی مفروضہ ہے کہ شکار کرنے والے بھی ایک دن شکار ہو جائیں گے۔ اور یہ بھی کہ کچلے جانے والے ایک دن شکار کرنے لگیں گے۔ اور یہ عمل اسی سرعت سے ہوتا ہے جیسے پوپ کورن بنانے والی مشین میں مکئی کے دانے اُچھل رہے ہوں۔ اور جس وقت ہمارے ادیب کے ہم عصر ایک مقدس، وابستہ موعویت کے ساتھ اپنے قلم تلوار کی طرح اٹھا رہے ہوتے ہیں اور ان کا رخ اپنے دشمنوں کی طرف کر رہے ہوتے ہیں، جس وقت وہ اپنی اچھی طرح تیز کی ہوئی سنسر کی قینچیوں کو حرکت دے رہے ہوتے ہیں (ظاہر ہے کہ صرف عارضی طور پر: ابھی موزوں وقت نہیں آیا!)، انھیں پورا یقین ہوتا ہے کہ وہ یہ کام پہلی بار کر رہے ہیں (ہماری زندگی، ہماری آزادی، ہمارا مستقبل داؤ پر لگا ہوا ہے!) اور اُن کی پُشت پر ایک تازہ کار اور ان سے زیادہ ہُنرمند شکاری کا ہیولا اُبھر رہا ہوتا ہے۔

Scanned with CamScanner

میں خود، راقم السطور، ایک کروشیائی ادیب ہوں- اس میں میرا کچھ دخل نہیں، میں نے اس ملک میں پیدا ہونے کا فیصلہ خود نہیں کیا تھا- لیکن اِن سفید کاغذوں پر لکھتے ہوئے، میں فیصلہ کرتی ہوں کہ لوبلوں سے کوئی سروکار نہیں رکھوں گی- میں اس فیصلے کے دھماکاخیز نتائج سے آگاہ ہوں، اور مجھے کوئی شکایت بھی نہیں ہے- ہر شخص کو اپنا راستا چُننا ہوتا ہے- بے شک، میں اس بات کو بھی تسلیم کرتی ہوں کہ ایسے ناخوشگوار حالات میں ہر شخص، عام شہری سے لے کر صدرِ ریاست تک، اسلحے کے اسمگلر سے لے کر مجاہد تک، ہر شخص ادیب سے یہ توقع رکھنا اپنا حق سمجھتا ہے کہ وہ وطن کی بابت اپنی ذمے داری پوری کرے، عوام کی ترجمانی کرے، اپنے کروشیائی وطن کا جاں نثار بیٹا بن کر دکھائے (اور بیٹیاں؟)، وطن کی محبت کا بلند آواز میں، صاف لفظوں میں اور برسرِعام اعلان کرے- لیکن میں اپنے آپ کو حق دیتی ہوں کہ ان مطالبات کو پورا کرنے سے انکار کردوں-

اپنے "عوام" -- راقم السطور کے "عوام" -- کی تاریخ سے میں نے جانا ہے کہ ادیب اور شہری کے کرداروں کو خلط ملط کرنے سے کیسی بدقسمتیاں جنم لیتی ہیں: ادیبوں کے لیے، ان کے عوام کے لیے، آزادیِ اظہار کے لیے، اور خود ادب کے لیے- لہذا، ایک ادیب کے طور پر میں اپنے ملک کی سرحدوں کی ہرگز حفاظت نہیں کروں گی- میں ادب کی سرحدوں کے آس پاس چہل قدمی کرنے یا ذرا دیر کو آزادیِ اظہار کی منڈیر پر بیٹھ کر ستانے کو ترجیح دیتی ہوں-

مجھے اب تک نہیں معلوم کہ مجھے اوسِپ ماندلستام کی بات پر یقین کرنا چاہیے یا نہیں، جس کے خیال میں "ادیب دراصل ایک توتا ہے، اس لفظ کے عمیق ترین معنوں میں"- اس نے کہا تھا: "توتے کا کسی زمانے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا- یہ دن اور رات میں تمیز نہیں کرتا- اگر اس کی ٹیں ٹیں سے مالک کو بیزاری ہونے لگے تو وہ اسے ایک سیاہ کپڑے سے ڈھانپ دیتا ہے، اور یہ ادب کے لیے رات کی علامت ہے-" مجھے ٹھیک سے یہ بھی نہیں معلوم کہ کروشیا میں رات پوری طرح آگئی ہے یا نہیں- لیکن کون کہہ سکتا ہے؟ اس لیے، کروشیائی ادیبو، تم جہاں کہیں بھی ہو، شب بخیر!

**

Scanned with CamScanner

دُبراو کا اُگریشک

ترجمہ: فہمیدہ ریاض۔ اجمل کمال

بلقان کے اُداس گیت

موسیقی سے بڑھ کر ہمیں کون قریب تر کرسکتا ہے؟
(بورس پاسترناک)

بورس "ح" بلغاریا کے شاعر اور ہر اعتبار سے ایک سنجیدہ شخص ہیں۔ چند برس ہوئے، مشرقی یوروپ کے بارے میں ہونے والی ایک کانفرنس میں میری اُن سے وطن سے باہر ملاقات ہوئی تھی۔ بورس نے اپنا معمولی سرمایہ غیر ملکی ناظرین (اور اپنی ادیب برادری) کے سامنے پھیلا دیا: بانسریاں، پائپ، سیٹیاں --- بورس پہلے اپنے کچھ اشعار سناتے اور پھر، جیسے کسی مصیبت سے چھٹکارا پا کر، اپنے گنوارُو آلاتِ موسیقی کے بارے میں بتانے لگتے: اس بانسری سے یہ آواز نکلتی ہے، اس پائپ کو یوں بجایا جاتا ہے۔ اور وہ ایک ایک چیز بجا کر دکھاتے۔

میں حیران تھی کہ آخر بورس اپنی یہ معمولی چیزیں دنیا بھر میں کیوں اٹھائے پھر رہے ہیں، اس قدیمی آکرینا (ocarina) کی آواز انہیں اپنے اشعار سے بڑھ کر پیاری کیوں ہے۔ آخر یہ قلم کار دوسرے ادیبوں کی طرح اہم موضوعات پر بات چیت کیوں نہیں کرتے، مثلاً اُن کے ملک میں جمہوریت، ذرائع ابلاغ کی آزادی، اور بعد از آمریت زمانے کے ایسے ہی دوسرے دلچسپ موضوعات پر اظہار خیال؟

ایک شام کانفرنس کے بعد بورس "ح" نے مجھے ایک قدیم بلغاروی لوک گیت سکھانے کی کوشش کی۔ گیت ایک ایسی عورت کے بارے میں تھا جو اپنے شوہر کی سرائے سے واپسی کا انتظار کر رہی ہے۔ ہر دو سطروں کے بیچ میں چھوٹی چھوٹی تانیں تھیں (اُواُواُو اِی اِی اِی)، "ہائے رے ہائے" جیسے ٹکڑے تھے، "دیارے دیا" جیسی خرافات تھیں۔ گیت کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ سب کے شوہر ہائے رے ہائے گھر آگئے ہُواُواُواُو، اور میرا بانورا نہیں آیا، ہائے ہائے میں کیا کروں، ہائے میں کیا کروں، اُوہُوہو آہ آہ---

Scanned with CamScanner

میں نے احتجاج کیا: "یہ سب مجھے آپ کیوں سکھا رہے ہیں؟ خدا کے لیے، مجھے لوک گیتوں سے شدید چڑ ہے۔۔۔"

"یاد کرلو،" بورس نے سادگی سے کہا، "کون جانے۔۔۔"

ایسی ہی ایک اَور کانفرنس میں ہم دوبارہ ملے۔ بورس "ح" پہلے کی طرح اپنے دیہاتی، قدیم ساز سب کو دکھانے کے لیے سجا رہے تھے۔ اُنھیں دیکھ کر مجھے پرانے زمانے کی وہ بڑی بوڑھیاں یاد آئیں جو مشرقی یوروپ کے بازاروں میں اب بھی نظر آجاتی ہیں۔ اسی طرح وہ بھی جو کچھ اُن کی گرہ میں ہوتا ہے کسی گاہک کی امید میں پیش کر دیتی ہیں، جیسے چند سوکھے مارے سیب، ہرے دھنیے کے چار پتّے، لہسن کی واحد گانٹھ۔۔۔

مجھے لوک تماشے سے نفرت ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ وہ گیت میں بھُولی نہیں۔ کبھی کبھی میں لحاف سے منھ ڈھک کر تاریکی میں وہی چھوٹی چھوٹی تانیں لگاتی ہوں (ہُواُواُو، اِی اِی اِی)، میں اپنی بے نام پریشانی کو سُلانے کی کوشش کرتی ہوں اور وہی ٹکڑے گاتی ہوں (ہائے رے رے رے! ہائے رے رے رے!)، اسے ایک بے کیف سی تال میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہوں، اُس شوہر کا انتظار کرتی ہوں جو نہیں ہے، اور اسی طرح اُوہُوہُو، آہ آہ کی آوازیں نکالتی ہوں۔ سوچتی ہوں اس سے تو اچھا تھا کہ کوئی چھوٹا سا انڈین گیت سیکھ لیتی۔ لیکن کیا کِیا جائے، میں نے تو یہی بلغاروی گیت سیکھا۔

کبھی کبھی میں لحاف میں منھ ڈھانکے، اندھیرے میں کپکپاتے ہوے، اپنے بلقان کے اُداس گیتوں کی سسکیاں بھرتی ہوں، اپنا بلقان کا بخار، بلقانیوں کا بخار، بھگانے کے لیے، موسیقی کے سُروں سے اپنا اضطراب دور کرنے کے لیے، میرا اضطراب جو موسیقی کی دھُنوں سے پیدا ہوتا ہے، میں اپنے خوف کا علاج تال سے کرنے کی کوشش کرتی ہوں، میرا خوف جو تال سے جنم لیتا ہے۔۔۔

***

ٹینگو

ایک گرم دن کی بات ہے، میں نیویارک کے زیرِزمین ریلوے کے اسٹیشن میں کچھ دیکھ کر ٹھٹھک گئی، جیسے مجھ پر کسی نے جادو کر دیا ہو۔ ایک اَدھیڑعمر جوڑا ارجنٹینا کا ٹینگو رقص کر رہا تھا، اپنے اطراف ایک ایسا اَن دیکھا دائرہ کھینچتا ہوا جس میں بس اِن دونوں کا وجود باقی تھا: ایک مرد اور

ایک عورت۔ پاس ہی ایک گرد آلود کیسٹ پلیئر زمین پر دھرا تھا۔ مرد اور عورت نہ خوب صورت تھے نہ بد صورت، نہ جوان تھے نہ بوڑھے، وہ سیاہ کپڑوں میں ملبوس تھے جو پرانے، گھسے گھسائے مگر صاف تھے۔ مرد کا سیاہ جامہ روشنی میں چمکتا ہوا چکنا لگ رہا تھا۔ وہ پورے انہماک سے ناچ رہے تھے، کوئی نمائشی حرکت کیے بغیر، سنجیدگی اور متانت کے ساتھ، جیسے اُنھیں کسی کو خوش کرنے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ ان کے اطراف بِھیڑ آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ میں تعجب میں تھی کہ یہ نیویارک کے رہنے والے، جہاں قدم قدم پر ہر طرح کے موسیقار اور نٹ اور تماشا گر اور فقیر پڑے لڑھکتے ہیں، آخر انھیں اس جوڑے میں کیا نظر آرہا ہے۔ اس شہر میں جو ایک سیکنڈ کے لیے بھی کبھی نہیں رکتا، آخر لوگ کیوں اپنی ریل گاڑیوں کے گزرتے ہوئے وقت بھلائے، اِس معمولی سے ارجنٹینی جوڑے کا رقص دیکھنے میں محو ہیں؟

شاید اس رقص نے ہم سب کو اس طرح مسحور اس لیے کر دیا کہ ہمیں اس میں "سچ" دکھائی دیا تھا۔ وہ رقص مبالغے سے پاک تھا۔ وہ دونوں اپنے رقص کو، جیسا کہ وہ حقیقت میں تھا، جوں کا توں سچائی سے پیش کر رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنی گرہ کا کل مال دیکھنے والوں کے سامنے زمین پر پھیلائے بیٹھے ہیں، اس کے سوا اُنھیں اَور کچھ بھی نہیں آتا، یہ رقص اور اس کی تال ہی اُن کی سب سے گھری، محرمانہ سچائی ہے۔ ارجنٹینا کا یہ رقص ہی اُن کا شناختی کارڈ تھا، ان کا نام تھا، ان کی ذات تھا، ان کا وجود تھا۔

زیرِ زمین ریلوے اسٹیشن میں بلا کی گرمی تھی۔ ناچنے والے جوڑے کے زیتونی چہرے بالکل خشک تھے، ان پر پسینے کا ایک قطرہ تک نہ تھا۔ پل بھر کو مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی پر پسینا بہتا محسوس ہوا۔ اُن دونوں کا پسینا، مجھے خیال ہوا۔

***

ری رے

ساحل سے زگرب لوٹتے ہوئے میں نے اور میرے دوست نے نسبتاً لمبا راستا اختیار کیا۔ یہ ۱۹۹۰ کے موسمِ گرما کی بات ہے جب لوگ اُس مختصر راستے پر گاڑی نہیں چلانا چاہتے تھے جو کنین (Knin) سے ہو کر گزرتا تھا۔ ہم ساحلی شہر اسپلٹ سے دیر گئے نکلے تھے، مگر ہمیں امید تھی کہ راستے میں کوئی ریستوراں مل جائے گا جہاں ہم رات کا کھانا کھا سکیں گے۔ سینیہ (Sinj) کے قصبے کے بعد راستے میں، جو نہ جانے کیوں خالی تھا، ہمیں ایک دیہاتی سرائے نظر آئی جس میں روشنی

Scanned with CamScanner

تھی، اور ہم وہاں رک گئے۔ ہوا اس وقت تیکھی تھی، ہمارے اطراف ننگے کھیت پھیلے تھے، سامنے ویران راستا تھا، اور آسمان پر ایک روشن چاند تھا۔

سرائے میں پہلے مَیں نے قدم رکھا، اور دہلیز پر ہی ٹھٹھک کر رہ گئی، جیسے کسی نے مجھے زمین میں گاڑ دیا ہو۔ کمرے کے گاڑھے دھویں میں تقریباً بیس لوگ بیٹھے تھے۔ وہ سب بالکل خاموش تھے۔ آنکھوں کی بیس جوڑیاں میری آنکھوں میں گڑ گئیں۔ پھر دروازے سے قریب ترین بیٹھے ہوئے شخص نے، شاید یہ سوچ کر کہ منطقی طور پر پہل اُسی کو کرنی چاہیے، اپنی بیئر کی بوتل بہت سست رفتاری سے اٹھائی اور ایک طویل گھونٹ بھرنے لگا۔ دیر تک بیئر کے گھونٹ کے حلق سے اُترنے کی غٹ غٹ آواز آتی رہی۔ پھر نظریں جھکائے بغیر اس نے اسی طرح سست رفتاری سے بوتل واپس میز پر رکھی۔ پھر اس طرح جیسے بوتل کے میز سے مَس ہونے پر کوئی گھنٹا بج گیا ہو، اس نے اپنی گردن کی رگیں پھُلائیں اور ـــ گانا شروع کر دیا۔ اس نے اپنی نگاہیں میری آنکھوں میں اور بھی گہری گاڑ دی تھیں۔ وہ طاقت ور، شہوانی آواز جو نہ جانے کہاں سے نکل رہی تھی، کسی بھیڑیے کی غراہٹ کی طرح تھی۔ پھر دوسرے لوگ بھی، میری آنکھوں میں گھورتے ہوئے، اس غراہٹ میں شامل ہو گئے۔ ان نگاہوں سے کسی بھی جذبے کا اظہار نہیں ہو رہا تھا، وہ سب ایک تاریک، مسلسل انداز سے مجھے بس گھورے جا رہے تھے۔

میں اور میرا دوست آگے چل پڑے۔ کچھ راستا طے کرنے کے بعد، اندھیرے میں سے اچانک ایک بڑی سی روشن کشتی نکل آئی جو سڑک کے کنارے لنگرانداز تھی۔ اس کا نام "مرکو" تھا۔ اس اُجاڑ، غیرارضی ویرانے میں، سنسان راستے پر، آسمان پر چمکتے تیکھے چاند میں، سرائے میں بیئر پیتے مَردوں کی بھیڑیے جیسی غراہٹ میں، سڑک کے کنارے کھڑی ناو میں، اپنے وطن کی اس شب سفری میں، مَیں نے اپنی پوری حسیات کے ساتھ دیوانگی کو پہچانا (اصل دیوانگی بعد میں شروع ہونے والی تھی)، اُس سناٹے کو جس میں ہر شے ساکت ہو کر پہلی گولی کے دھماکے کی منتظر ہوتی ہے۔

زگرب پہنچنے سے پہلے مجھے اس بات کا ادراک نہیں ہوا کہ سینیہ کے قریب سرائے میں مَیں نے جو کچھ سنا تھا وہ ان علاقوں کا مشہور قدیم لوک گیت "ری رے" تھا: قدیم زمانوں کی یادگار، بےالفاظ، شہوت بھری مردانہ چنگھاڑ، جو دالماشیا کے عقب میں واقع اس علاقے کے دور دراز حصّوں میں، لیکا اور کرائینا میں، اب بھی رائج ہے۔ کبھی کبھی "ری رے" لفظوں کے ساتھ بھی گایا جاتا ہے، اسے "گانگا" کہا جاتا ہے۔ اسے ہرزگووینا کے علاقے میں، کروٹ اور سرب، عموماً مرد، اب بھی گاتے ہیں۔ اسے کئی مرد ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر گاتے ہیں: اُن کے گلے کی

رگیں پھولی ہوئی ہیں، چہرے سُرخ پڑے ہوئے؛ وہ ٹانگیں چِیر کے کھڑے ہوئے دو یا تین سُروں کی موٹی آوازیں نکالتے ہوئے گاتے ہیں۔ اس قسم کا ایک "گانگا" اس طرح ہے:

میرے گان گا
میں تجھ کو نہ لیتا میرے گان گا
اگر میں تجھ میں
جسمانہ ہوتا

اور وہ کشتی! مجھے یہ جان کر سکون نہیں ہوا کہ وہ بڑا سا روشن ہیولا میرے آسیبی تخیل کی پیداوار نہیں تھا۔ کوئی مقامی شخص واقعی کسی ناو کو سڑک کے کنارے کھینچ لایا تھا اور اس میں گھر بنا کر رہنے لگا تھا۔ اس کا نام "مرکو" تھا۔

خالص ذاتی سطح پر میں نے جس طرح واقعات کو محسوس کیا ہے، اُس کے مطابق جنگ کا آغاز اُسی رات سے ہوا۔ اُس رات میری حسیات نے انمل بے جوڑ تصویروں کا جو مونتاژ جذب کیا ---قدیم ترین تصویر (مردوں کی بھیڑیے جیسی غراہٹ) سے جدید ترین تصویر (سڑک کے کنارے رکھی کشتی) تک--- وہ اپنے متفرق اجزا کو یک جا رکھنے میں ناکام رہا۔ اس میں جلد ہی دراڑیں پڑ گئیں، اس کے اندر سے دیوانگی باہر اُبل پڑی اور ایک چھناکے کے ساتھ صداؤں اور تال میں تبدیل ہو گئی۔

***

تال

زگرب کے ایک شام کے اخبار میں ۲۱ دسمبر ۱۹۹۳ کو مَیں نے ایک چھوٹی سی خبر پڑھی۔ خبر یہ تھی کہ میونخ، جرمنی، کے ایک مے خانے میں کروشیائی لوک لباسوں کی نمائش ہو رہی ہے۔ متن میں یہ بھی تھا کہ نمائش اُن چیزوں کو برسرِعام لانے کے لیے کی جا رہی ہے جو سابق یوگوسلاویا میں دبا دی گئی تھیں، اور یہ کہ یہ ملبوسات کروشیا کا اپنا، خاص الخاص کلچر پیش کریں گے۔ میری توجہ نہ اس خبر میں پوشیدہ جھوٹ نے کھینچی نہ حکومتی پالیسی کے رٹائے ہوئے سبق کی نئے انداز میں کی گئی تکرار نے، نہ اس بات نے کہ یہ لوک ملبوسات اُسی انجمن نے عاریتاً فراہم کیے ہیں جو پہلے

یوگوسلاوی لوک ثقافتی انجمن تھی اور اب جس کا صرف نام بدل کر کروشیائی لوک ثقافتی انجمن کر دیا گیا ہے۔ اس خبر نے تو میری یادداشت میں کوئی ایسا بٹن دبا دیا کہ پوری پچاس سالہ تاریخ میرے سامنے کتاب کی طرح کھُل گئی۔ ایک ایسی کتاب جس میں موسیقی درج تھی!

سابق یوگوسلاویا میں اگر کسی ایسی چیز کا نام لیا جا سکتا ہے جو کہ حد سے زیادہ اُبھاری ہوئی تھی (نہ کہ "دبائی" ہوئی)، تو وہ لوک ثقافت تھی۔ پچاس سال سے یوگوسلاویا کی ریاستوں کے عوام اپنے شوخ رنگ کے نت نئے لوک لباسوں میں ناچ گا اور اُچھل کود رہے تھے۔ (یوگوسلاویا میں رہنے والی متعدد قوموں اور قومیتوں کے ناچ اور گیت، کثیرالقومی ناچ اور گیت، کثیرالصوبہ جاتی اور بین الصوبہ جاتی اور اندرون صوبہ جاتی نسلی، لسانی لباس اور لباس اور ناچ گانے اور ناچ گانے!) بلکہ اس کے علاوہ انھوں نے اَور تو کچھ بھی کام نہیں کیا تھا۔ اگر تب میں اور اَب میں کوئی فرق تھا تو اتنا کہ پہلے وہ سب مل جل کر ناچتے گاتے تھے اور اَب وہ سب علیحدہ علیحدہ ناچ گا رہے ہیں۔ نئی نویلی جمہوری حکومتوں نے اپنے اپنے علاقوں کے گرد سرحدیں سختی سے کھینچ لی ہیں اور اپنا اپنا ناچ گانا دوسروں کے ناچ گانے سے علیحدہ کر کے ناچ گا رہے ہیں۔ لیکن عین سابق یوگوسلاویا کی طرح، جس نے سب سے زیادہ زور لوک تماشے پر دیا تھا، نئی ریاستیں بھی ناچ گانے ہی کو اوّلیت دے رہی ہیں۔

مجھے اب تک یاد ہے، اسکول میں ہماری استانیاں یوگوسلاویا بھر کی مقبول لوک دھُنوں سے ہمیں کس طرح بور کیا کرتی تھیں۔ ہمیں جنوب سے شمال تک کے گیت سننا اور ناچ دیکھنا پڑتے تھے۔ سلووینیا کے لوک گیت (پتھریلے راستے پر اے میری گھوڑی!)، مقدونیا کے گیت (بلجانا سفید کپڑا بن ن ن ن رہی ہے!)، قوموں کے ناچ، قومیتوں کے ناچ، یہ سب ہماری جسمانی تربیت کا جزولاینفک تھے۔ سنگ دل استانیاں ہمیں لوک گیتوں کے قومی شاگرد طائفے میں ہانک ہانک کر دھکیل دیتی تھیں جہاں ہر قسم کے قومیتی، لسانی، صوبائی تشخص پر، ناچ کے گھماو اور پیر مارنے کے سُبھاو کے ذریعے، خوب زور دیا جاتا تھا۔ اس طرح سب کو دور دراز علاقوں کے سارے باجوں اور سارے سازوں اور رقص کے بہتر ہزار صوبہ جاتی تشخصاتی طریقوں سے ایڑی سے چوٹی تک واقفیت ہو جاتی تھی۔

لگتا ہے یوگوسلاویا کی پچاس سالہ روزمرّہ زندگی کی تاریخ بنی ہی اس لوک رقص و موسیقی سے تھی۔ اخباروں میں روز یہی خبریں چھپتی تھیں کہ اس صوبے کے طائفے نے اُس صوبے میں رقص پیش کیا، اُس صوبے کے طائفے نے اس صوبے میں رقص پیش کیا، انھوں نے دنیا بھر کے سامنے تمام لوک رقص ایک ایک کر کے اور اکٹھا پیش کیے۔ تمام سوشلسٹ ملک لوک گیتوں اور ناچوں کو

Scanned with CamScanner

ایک معصوم، متوازی نظریاتی حکمتِ عملی کے طور پر استعمال کرتے تھے جس کی مزاحمت مشکل تھی۔ یہ تو سبھی کو بھاتے تھے، تعلیم یافتہ اور ان پڑھ عوام بلا تخصیص اس کے سحر کے اسیر ہو سکتے تھے۔۔ بہرے لوگ تو خاصی معمولی تعداد میں ہوتے ہیں! (۱)۔ لہذا ہوا یہ تھا کہ سابق یوگوسلاویا کے وفاقی گنبد تلے، تنوّع کو، دبانا تو کجا، حتی الامکان اُبھارا گیا تھا اور ایک ایک لسانی، قومی اور نسلی اکائی کو ڈھول بجا بجا کر کانوں سے ذہنوں میں اتارا گیا تھا۔ کمیونسٹ ملک شاید یہ چاہتے ہوں گے کہ ان میں بسنے والی قومیں اور قومیتیں صرف لوک تماشے پر قانع رہیں اور کسی اور چیز (مثلاً اپنے لیے علیحدہ زمین وغیرہ) کا مطالبہ نہ کر بیٹھیں! ان کمیونسٹ ریاستوں کے کھنڈر پر سابق ریاستوں میں بسنے والی قومیں نئی جمہوریائیں تعمیر کر رہی ہیں۔ سب سے پہلے تو انھوں نے لوگوں کو اُن کے اپنے ثقافتی تشخص کی "آزادی" دی (اُف! ایک بار پھر اُسی چیز کی آزادی!) اور بالکل پہلے کی طرح لوک ورثے کے میلے لگوانے میں جُٹ گئیں، کیوں کہ وہ جانتی ہیں کہ یہ تو سب سے زیادہ کارگر افیم ہے۔ دوسری صورت میں کہیں عوام کو یاد نہ آجائے کہ وہ ڈھول ڈھمکّے پر ناچنے گانے والے نیم عاقل، سدا مسکراتے ہوئے ٹولوں کے علاوہ کچھ اَور بھی ہیں، کہ وہ ایک ریاست کے سیاسی شعور رکھنے والے باشندے ہیں۔ کہیں اُنھیں یہ یاد نہ آجائے کہ "اپنی زمین" پر آزادی سے ناچنے گانے کی قیمت انھوں نے آگ اور خون اور لاشوں سے چکائی ہے، اور جہاں افسوس کہ وہ فی الحال صرف ناچ گا ہی سکتے ہیں، اَور کچھ نہیں کر سکتے۔

جہاں لوک رقص اور گیتوں نے ہمارے تنوّع کو اجاگر کیا تھا، وہاں سابق یوگوسلاویا میں اتحاد اور یک جہتی (ماضی کے دو لفظ!) پورے ملک میں یکساں مقبول پاپ میوزک نے پیدا کی تھی۔ اس طرح ہمارا سابق وطن ایک چھوٹے سے صندوقچے کی طرح تھا جسے کھولنے پر موسیقی بجنے لگتی ہے!

سابق یوگوسلاویا کے باسی آج جب اکٹھے ہوتے ہیں جب کہ جنگ کے نسیان کا بھاری پہیا انھیں کچل چکا ہے، اپنی اپنی ریاستوں کے پروپیگنڈے سے ان کے ذہن سُن ہو چکے ہیں اور ان کی حالت ان معمولوں کی سی ہو گئی ہے جو اپنے عامل کے اشارے پر سوچتے ہیں، اس حالت میں وہ واحد مشترک حوالہ جواب تک باقی ہے، پاپ موسیقی کی تاریخ ہی ہے۔ اب نہ انھیں پارٹی کانفرنسیں یاد ہیں نہ پارٹی لیڈر نہ ہر دس سال بعد بدلنے والی نظریاتی اصطلاحات: وہ اپنا مشترک جغرافیا اور تاریخ فراموش کر چکے ہیں، وہ "یوگوزومبی" بن کر رہ گئے ہیں۔ لیکن جو کچھ انھیں یاد رہ گیا ہے، اور جس کے بارے میں وہ آج بھی خوشی سے باتیں کرتے ہیں، وہ پاپ میوزک کے میلے ہیں اور گلوکاروں کے نام ہیں اور چلتے ہوئے مقبول گیتوں کے ٹکڑے، اور اپنے اپنے "موسیقی کے احمق"۔ دوسرے الفاظ میں لوگوں کو پرانی روزمرّہ زندگی کی فضول باتیں یاد ہیں اور یاد آتی ہیں۔ اور روزمرّہ

Scanned with CamScanner

زندگی کا یہ کلچر ہی، نہ کہ کوئی ریاست یا سیاسی نظام، یوگونوسٹلجیا کا منبع ہے، اگر آج ایسی کوئی چیز موجود ہے تو۔ یاد کا چٹکیاں لے سکنا، پاپ میوزک کی طرح، صرف دل کی اہلیت ہی پر تو مبنی ہے۔

***

موسیقی کا وائرس

ٹیٹو کی موت کے فوراً بعد یوگوسلاویا کی قومی یک جہتی کو نئے انداز کے ایک "شاہکار" لوک گیت کی شکل میں ڈھالا گیا جس کا نام تھا: "یوگوسلاویا"۔ پوری قوم چیخ چیخ کر اس گیت کو دُہرانے میں جُٹ گئی، لگتا تھا جیسے ہر شخص نے آنے والے انتشار کو منڈلاتا دیکھ لیا ہو۔ یہ جدید لوک گیت ہر ریڈیو اسٹیشن سے، ٹی وی کی ہر اسکرین سے، سڑکوں پر بنی سرایوں سے باہر اُبلا کرتا، لوگ گلیوں میں چلتے ہوئے اسے گنگنایا کرتے، فٹ بال کے میچوں میں اسی کی گونج سنائی دیا کرتی۔ یوگوسلاو عوام کی سُست نبض اس سوقیانہ، لوک تال پر تیز ہو جایا کرتی۔

میری ایک شناسا انگریز عورت نے، جو ایک ٹورسٹ ایجنسی میں کام کرتی ہے، مجھے اپنا دیکھا ہوا ایک منظر تفصیل سے بتایا۔ وہ انگریز سیاحوں کے ایک گروپ سے ملنے گئی جو یوگوسلاویا کی سیاحت سے تازہ تازہ لوٹے تھے۔ اسے ایک غیر معمولی منظر دکھائی دیا۔ دھوپ میں سنولائے ہوئے چہروں، جلتی آنکھوں اور گردن کی پھولی ہوئی رگوں کے ساتھ گلا پھاڑ پھاڑ کر "یوگوسلاویا" گا رہے تھے۔ اجنبی زبان کے اس گیت کے نامانوس قافیوں پر (جن میں بلاشبہ یوگوسلاویا کے حُسن اور اس کی جغرافیائی یک جہتی کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا تھا) ان کی زبان لڑکھڑا جاتی اور وہ مارے خوشی کے قہقہے لگانے لگتے۔ یہ انگریز سیاح یوگوسلاویا سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ انھوں نے اگلے سال دوبارہ وہاں جانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ انھوں نے میری شناسا عورت سے، جو ان کے دورے کی منتظم تھی، یوگوسلاو موسیقی کے کیسٹ فراہم کرنے کا مطالبہ کیا اور رخصت ہوتے ہوئے دائرے کا روایتی رقص کرنے لگے!

***

رولیکس گھڑی کی تال

نئے انداز کے لوک گیت گانے والے مقبول بوسنیائی گلوکار زنیف گلائیوا نے بوسنیا کے

Scanned with CamScanner

پہلے جمہوری انتخابات میں آزاد امیدوار کے طور پر حصّہ لیا اور اچھے خاصے ووٹ حاصل کیے۔ "اگر مجھے اقتدار حاصل ہو گیا تو ہر شخص لامے کے سوٹ اور رولیکس گھڑیاں پہنا کرے گا،" اس نے اپنی انتخابی مہم کے دوران اعلان کیا۔ ززیف منتخب نہ ہو سکا۔ فتح ان کے حصّے میں آئی جنھوں نے اس سے زیادہ بلند و بالا دعوے کیے تھے۔ اب لامے سوٹ اور رولیکس گھڑیاں پہننے والے نئی منتخب حکومت کے ایوانوں میں بیٹھے ہیں، جب کہ ان نعمتوں سے محروم عوام کے پاس موسیقی کی دولت ہے!

***

"فوکسی"

فوکسی کیا ہے؟ فوکسی جدید انداز کے، "نئے ترتیب دیے ہوے" لوک گیت کو کہتے ہیں جو دراصل ایک متعدی وائرس ہے۔ فوکسی گیت سابق یوگوسلاویا کے جغرافیے پر آباد قوموں کو باہم جوڑنے والا گوند، ان کی مشترک بیماری ہے، ایک علامت ہے جس سے وہ ایک دوسرے کو فوراً پہچان لیتے ہیں اور ایک دوسرے سے فوراً بیک وقت ہمدردی اور نفرت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ فوکسی گیت "قومی روح" کی بربنگی ہے، قوم کا دل ہے، ایک نازک مقام ہے، جینیاتی کوڈ ہے، آواز کی شکل میں ڈھلی ہوئی اجتماعی یادداشت ہے۔

آج، جب سابق یوگوسلاویا کی قومیں اپنے اپنے خطۂ زمین کو ہر اُس چیز سے پاک کرنے میں مصروف ہیں جسے غیر سمجھا جاتا ہے اور اپنے چھوٹے چھوٹے کلچری مکانوں کی جھاڑپونچھ میں لگی ہوئی ہیں، جب اپنے حاصل کردہ ورثے کے چھن جانے کے خوف سے وہ "قومی جوہر" اور "قومی روح" کے تحفظ کے لیے نت نئے کمیشن قائم کر رہی ہیں، جب وہ اس قومی جوہر کو عجلت میں گھڑ رہی ہیں کیوں کہ انھیں بالکل اندازہ نہیں ہے کہ اسے کیسا ہونا چاہیے -- اس وقت فوکسی گیت ہی ہمیں ہمارے اپنے معلوم ہوتے ہیں، یہی ہمارا اپنا عوامی ابتذال ہے جسے ہم سے جدا نہیں کیا جا سکتا، جیسے ریگستان سے ریت کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ فوکسی گیت ہماری مشترکہ موروثی ثقافتی بیماری ہے، ایک طنزیہ تہذیبی مسکراہٹ ہے، اور کیا پتا یہی ہمارا "قومی جوہر" بھی ہو۔

آج کل "فوکسی" کی جگہ نسبتاً زیادہ معزز اصطلاح یعنی "جدید لوک موسیقی" استعمال کی جاتی ہے۔ یہ مونث اصطلاح ہے (سلووینی، کروٹ، سربیائی، مقدونیائی اور بوسنیائی زبانوں میں موسیقی کا لفظ مونث ہی ہوتا ہے۔)

Scanned with CamScanner

فوکسی یوگوسلاویا میں پیدا ہوئی اور یوگوسلاویا کے ساتھ ساتھ بڑی ہوئی۔ شروع شروع میں اسے عُسرت اور تنگ دستی کے دن دیکھنے پڑے، مگر وہ پہلے ریڈیو، پہلے فرج، پہلے ٹی وی کے ساتھ گھروں میں داخل ہو گئی۔ فوکسی اور "عام آدمی" ("عوام" کا ایک لسانی متبادل!) اپنی محبت کی تال پر ناچنے کی مشق کرنے لگے۔ فوکسی اُسی عام آدمی کی زبان بولتی تھی، اُسی کی روزمرّہ کی حقیقت کے گیت گاتی تھی، وہ دونوں مل کر اپنی قدریں قائم کرتے تھے۔ فوکسی اور عام آدمی دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بجتے تھے۔ فوکسی کے گیتوں کے عام آدمی کی اُمنگیں جھلکتی تھیں: جنسی اُمنگیں اور معدے کی اُمنگیں ("تم نے مجھے رونے کے لیے تنہا چھوڑ دیا، تم نے میری بنائی ہوئی ایپل پائی کو چھُوا تک نہیں---" ایک فوکسی گیت کا ٹکڑا)؛ جنسی تسکین کی اُمنگیں ("میری ماں گھر سے باہر ہے، میں اپنے گلاب کے ساتھ ہوں---")؛ جنسی تہذیب کی اُمنگیں ("چادر پر دو سرخ بوندیں ہیں، تم مجھ سے پہلے پہنچ گئیں میری پیاری---") فوکسی بہت اونچی اونچی باتیں نہیں کرتی تھی، عالمانہ زبان نہیں بولتی تھی، عام آدمی کی، اپنے عام آدمی کی، توہین نہیں کرتی تھی، اُس کا منھ نہیں چڑاتی تھی۔ وہ اپنا مہربان ہاتھ سدا اُس کی نبض پر رکھتی اور اپنی تال کو اُس کی دھڑکن پر ڈھالتی تھی۔ فوکسی عام آدمی کی موت اور تدفین تک اُس کا ساتھ دیتی تھی۔ جب وہ فوج میں بھرتی ہو کر جاتا، جب اپنی محبوبہ کے ساتھ ہوتا، جب اپنی محبوبہ سے الگ ہوتا، جب شادی کرتا، جب اس کے بچے پیدا ہوتے، جب اس کے ماں باپ رخصت ہوتے، فوکسی ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی۔ فوکسی کبھی سیاست میں دخل نہیں دیتی تھی (جس شاخ پر بیٹھے ہوں اسے کاٹنے سے فائدہ؟) اپنے مخصوص انداز سے وہ اسی نظام کی اقدار کو تقویت دیتی تھی جس میں پھلتی پھولتی تھی۔ اور بے شک، فوکسی جس حب الوطنی کے گیت گاتی تھی وہ عام آدمی ہی کی تو مستقل دھُن تھی۔ وہ اُس کے خطّے کے نغمے سناتی، اُس کے دیہات اور کوہساروں کے انفرادی اور مقامی گیت گاتی، عام آدمی کے اپنے یوگوسلاویا کے عالمی ترانے چھیڑتی۔ فوکسی کے گیتوں کے موضوعات وسیع تھے، لیکن وہ کوشش کرتی کہ اس کے بنیادی لفظ وہی رہیں، وہی چند لفظ جو عام آدمی کی سمجھ میں آتے اور اُسے بھاتے ہیں: دل، ماں، میری پیاری، گھر، محبت، تقدیر، زندگی، دوست۔ فوکسی "اپنا دل کھول کر رکھ دیتی" تھی۔ فوکسی عام آدمی کی آزادی تھی۔ وہ اس کی صحبت میں خود کو آرام سے محسوس کرتا تھا۔

نئے انداز کی لوک موسیقی کے گلوکار اور گلوکارائیں، عام آدمی کے دیوی دیوتا تھے: یہ یوگوسلاویا کا خواب تھا، عظمت اور خوشحالی کی پری کہانی تھی جس نے سچ کا روپ لے لیا تھا۔ گراموفون ریکارڈوں اور کیسٹوں کے کاغذی غلافوں سے، ٹی وی کے پروگراموں سے، پوسٹروں سے، اخباروں اور رسالوں کے رنگین صفحوں سے، ہر کونے سے عام آدمی کے دیوی دیوتا اُسے

مسکرا مسکرا کر دیکھتے تھے۔ گلوکارائیں، یوگو باربی ڈولز، اپنے چست اسکرٹوں میں ملبوس، گریبانوں کی گہری وی کے ساتھ، اونچی ایڑی کے جوتوں کے ساتھ، بالکل اُس روپ میں جلوہ گر ہوتی تھیں جو خود اُن مغنّیاؤں کے ذہنوں میں تھا: ایک پُرکشش، ناقابلِ مزاحمت حسین عورت کا روپ، جو عام آدمی کے "اصل عورت" کے تصوّر کی تسکین کرتا تھا۔ مرد گلوکار، کھُلے کالروں، گردن میں پڑی طلائی زنجیروں، انگلیوں کی بھاری سنہری انگشتریوں والے مغنّی—وہ بھی اپنے "عام آدمی" کے ساتھ مکمل، مستند ہم آہنگی سے رہتے تھے۔ وہ (ہر اعتبار سے) کامیاب آدمی کے اُس روپ کی عکاسی کرتے تھے جو اُن کے اپنے ذہنوں میں تھا، اور عام آدمی کے (ہر اعتبار سے) کامیاب آدمی کے تصوّر کی تسکین کرتے تھے۔ یوگوسلاویا کے ماس کلچر کے یہ دیوی دیوتا عام آدمی ہی کی سنہری پرچھائیں تھے۔ دور دراز کی دیہاتی سرایوں سے، مزدوروں کے قصباتی قہوہ خانوں سے، ٹرنک روڈ کے کنارے بنے ڈرائیوروں کے ہوٹلوں سے، یہ پرچھائیاں اچانک اُچھل کر نمودار ہو جاتیں۔ وہ بہت گہرائی میں سے اُچھل کر باہر آتیں اور راتوں رات ستاروں میں تبدیل ہو جاتیں۔ قہوہ خانوں کی سستی "تھکیائیوں" سے—جن کی چولیوں میں نشے میں دھُت مرد اپنی مہینے بھر کی کمائی ٹھونس دیا کرتے تھے—گلوکارائیں یوگوسلاو ماس کلچر کی اُن شہزادیوں میں منقلب ہو جاتیں جو لوگوں کی رسائی سے باہر تھیں۔ یہ فوکسی گلوکار ہی تھے (نہ کہ کمیونسٹ!) جو حکومت کی، ہر حکومت کی (حتیٰ کہ یوگوسلاو حکومت کی بھی) طاقت ور، سنہری انگلیوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اگر وہ اتنے ہی مالدار تھے تو ملک سے باہر کیوں نہیں چلے گئے؟ مارکیٹ کی وجہ سے! صرف اپنے "وطن" میں رہ کر ہی وہ اپنے گیتوں سے عام آدمی کی ضروریات کی تسکین کر سکتے تھے اور عام آدمی، عوام، ان کی ضروریات پوری کر سکتا تھا۔

فوکسی نے، نام نہاد "عام آدمی" کی اس وفادار ساتھی نے، سیاسی تبدیلیوں کو جلد ہی سمو لیا اور سیاسی پروپیگنڈے میں، جنگ کی صنعت گری میں منقلب ہو گئی۔ وہ کسی ٹرانسفارمر کی طرح، قومی رہنماؤں کے سیاسی خیالات کا مرکب "عام آدمی" کے جانے پہچانے گیتوں کے سانچوں میں بھرنے لگی۔ سیاست اور مقبول عام کلچر کا یہ تعاون آج اپنی انتہائی جائز، انتہائی بلند حدوں کو چھو رہا ہے: ماس کلچر کا اسٹیج سیاسی (گویا جنگی) پیغامات کی ترسیل کا پُرشور ترین، لہٰذا پُرزور ترین، ذریعہ بن چکا ہے، اور سیاسی زندگی عین مین کسی اسٹیج کی طرح لگنے لگی ہے۔

سابق یوگوسلاویا میں جنگ کی ذمے داری جن عناصر پر ہے، ان میں ایک اہم ترین عنصر ذرائع ابلاغ ہیں۔ یہ لفظ سننے والے کے ذہن میں اخبارات، ٹیلی وژن اور ریڈیو کا خیال آتا ہے۔ جدید لوک موسیقی کا نام جنگی مجرموں کی فہرست میں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ اس پر یہ الزام بظاہر

کھو کھلا سا معلوم ہوتا ہے۔
آج جب ہر نوع کی چیزیں تباہ ہو چکی ہیں --زندگیاں، کتب خانے، اسکول، بے بہا تہذیبی یادگاریں-- ان کے ملبے میں سے وہی ناقابلِ شکست فوکسی اپنا سر اٹھاتی ہے، جیسے قبرستان میں رکھے پلاسٹک کے پھول۔ وہی جس نے تباہی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا، آج کھنڈروں پر کھڑی آنسو بہا رہی ہے؛ وہی جس نے جنگی رجز پڑھ پڑھ کر بیٹوں کو محاذ پر بھیجا تھا، اب اُن کی قبروں کے سرہانے بیٹھی سسکیاں بھر رہی ہے؛ وطن میں اور وطن سے باہر بنے مہاجر کیمپوں میں وہی، جس نے نفرت کو جنم دیا تھا، اب ہر چیز کے لیے "قسمت" کو قصوروار ٹھہرا رہی ہے۔ ہاں، فوکسی واقعی ناقابلِ شکست ہے!

***

گیت ہماری قسمت ہے

سودہ بچیردوچ، جو عرفِ عام میں "بوسنیا کی سودہ" کہلاتی ہے، جو تقریباً چھ برس سے مغربی یوروپ میں رہ رہی ہے، اپنے گیتوں کے پہلے ہی البم سے بے حد مقبول ہو چکی ہے۔ اس کے گیت "بوسنیا کی ایک لڑکی"، "میں گھر لوٹتی ہوں"، "میری پیاری ماں" اور "تم کو کیا ہو گیا؟" ہٹ نغموں کی ہر فہرست میں موجود ہوتے ہیں۔ یہ اطلاع "بوسنیا پریس" کی ہے۔
اسی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوے سودہ نے کہا: "گیت ہماری قسمت ہے۔"

***

اکتارا نوازوں کے بادشاہ کا خاکہ

پال پالیکووسکی (Paul Pawlikowski) نے بوسنیائی سربوں کے قائد رادووان کراجک کے بارے میں ایک فلم (بی بی سی ۱۹۹۲) بڑی مشّاقانہ تدوین کر کے بنائی ہے جس میں اَنمل بے جوڑ واقعات کو یکے بعد دیگرے جھلکیوں میں دیوانگی کے درجہ بہ درجہ بڑھنے کے اظہار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ فلم میں ہم ایک ایسے شخص کو دیکھتے ہیں جو ماہرِ نفسیات ہے، سائنس کا عالم (ڈاکٹر) ہے، شاعر ہے اور ایک سفّاک قاتل ہے۔ فلم کی تھیم کی موسیقی ایک گیت ہے جو اس لیڈر کے کردار کو پیش کرتی ہے۔ فلم میں ہم اسے اکتارا (gusle) تھامے، ایک گیت بولے

ہولے گنگناتے ہوئے دیکھتے ہیں ("تیرہ کپتان مے خواری کو بیٹھے")، اور پھر اداسی سے تباہ شدہ سرائیوو پر نظر ڈالتے ہوئے وہ خود اپنے اشعار گاتا ہے ("چاروں طرف شفاف سکوت۔۔۔ جیسا کہ موت سے پہلے۔۔۔") پھر ہم ایک اصلی ڈاکوؤں کا اڈا دیکھتے ہیں جس میں چھریوں کے رقص کے بعد (شاید دُنبے ذبح کرنے کے لیے!) نشے میں دھُت قاتل بے تابی سے پیر پٹختے ہوئے سربیائی "دائرہ رقص" کرتے ہیں۔ پھر ایک منظر میں روسی شاعر ایدوارد لیمونوف (Eduard Limonov) سرائیوو پر دو تین فائر کرتا ہے اور روسی اور سرب گرم جوشی سے اکٹھے مے خواری کرتے ہیں۔ لیمونوف اور رادووان ایک دوسرے سے جام ٹکرا کر اپنے اپنے عوام کے نام پر شراب کا گھونٹ بھرتے ہیں۔ ایک منظر میں ہم ایک اور قاتل، جنرل راتکو ملادِک، کی فربہ انگلیاں دیکھتے ہیں جو میز پر طبلہ بجا کر رادووان کی گنگناہٹ پر تال دے رہی ہیں۔ رادووان لوک گیتوں کی خطابت گنگنا رہا ہے (کیمرے کی جانب منہ کر کے شاعرانہ انداز میں: "سربیا کے ایمان کی علامت پوشیدہ غم ہیں")۔ اس "فطری" موسیقی کے امتزاج میں ہمیں گولیوں کے دھماکوں اور سستے قومی نغموں کی ملی جلی آوازیں سنائی دیتی ہیں ("کون جھوٹا کہتا ہے کہ سربیا چھوٹا ہے!") ساؤنڈ ٹریک پر گرجا کی گھنٹیاں اور بارود کے دھماکے ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔

رادووان کراجک اپنے ذاتی پاگل پن کی اس طرح تبلیغ کرتا ہے گویا یہ بیسویں صدی کے اختتام پر ایک مشترکہ آدرش ہے۔ اس قاتل نے ہیلی کاپٹر میں بوسنیا کے کوہساروں پر اڑتے ہوئے (ناک پر مشہورِ زمانہ نام والا قیمتی چشمہ لگا کر) اپنی تصویریں کھنچوائی ہیں۔ وہ فون کرتا دکھائی دیتا ہے ("ہیلو اینگل۔۔۔")۔ وہ بالکل فطری انداز میں اپنے ڈاکوؤں کے اڈے سے نکل کر ایک نہایت مہنگی مردانہ کپڑوں کی دکان میں نظر آتا ہے جو شاید جنیوا میں ہے ("نہیں،" وہ ایک کوٹ پہن کر دیکھتے ہوئے کہتا ہے، "اسے پہن کر تو میں پولیس والا نظر آ رہا ہوں!")۔ یہ قاتل، کمیونسٹ لیڈروں کے گھسے پٹے انداز (ہاتھ میں قلم، سامنے میز) کے بدلے اپنے آپ کو بالکل نئے نویلے انداز میں پیش کرتا ہے جو زیادہ پُرکشش ہے: ایک ایسا شخص جو ماہرِ نفسیات ہے، سائنس کا ڈاکٹر ہے، جو لکھتا پڑھتا نہیں، مگر سربیائی زبان میں ہولے ہولے گنگناتا ہے، انگریزی میں تقریر کرتا ہے، انگلیوں سے طبلہ بجاتا ہے، اپنی انگلیاں چبا چبا کر لہولہان کر لیتا ہے اور سفاکانہ قتل کرتا ہے۔

پالیکووسکی کی فلم میں "دائرہ رقص" سربوں کے سرائیوو شہر کے محاصرے کی علامت ہے۔ کراجک اور دوسرے قاتل ۔۔۔ یہ زوردار تال کا بھائی چارا۔۔ شہر کو ایک تنگ حلقے میں گھیرے ہوئے ہیں ("اے دلکش ترک حسینہ اترا نام راہب رکھیں گے او وادی میں سرائیوو اسربوں کے گھیرے میں") تاکہ ان کے پیر پٹخنے کی تال دوسرے ہر آہنگ (مسلم، یہودی، کروشیائی اور

دوسرے سرب آہنگ) کو مٹا ڈالے۔ آخر کار یہ اپنا دائرہ رقص "جنت کے باسیوں" کی حمدوثنا میں کریں گے۔ لیکن اس سے پہلے کہ مُردے اٹھ سکیں، انھیں اپنے آپ کو دوسروں کی موت کے بھاری بوجھ سے آزاد کرنا ہوگا۔ اور اس لیے دم بخود کر دینے والا اکتارا ہزارویں بار دھواں دیتے کھنڈروں میں سربوں کی شجاعت اور سرب سورماؤں کے مدحیہ گیت گانے کو موجود رہے گا۔ ان اکتارا بجانے والوں میں یقیناً رادووان کراجک بھی ہوگا، تمام اکتارا نوازوں کا بادشاہ!(۳)۔

***

گلوکار اور صدر

میلان کنڈیرا نے اپنے ناول "خندہ اور فراموشی کی کتاب" میں لکھا ہے:

جب ایک مشہور چیک پاپ گلوکار کاریل گوٹ ۱۹۷۲ میں ملک سے باہر گیا تو چیکوسلوواکیا کے صدر ہُوشاک کو خوف نے آلیا۔ اس نے فوراً میز پر بیٹھ کر گلوکار کے نام ایک ذاتی خط لکھا (یہ اگست ۱۹۷۲ کی بات ہے جب گوٹ فرینکفرٹ میں تھا)۔ اس خط کا ایک اقتباس درجِ ذیل ہے، میں نے اپنی طرف سے اس میں کچھ بھی نہیں جوڑا ہے:

"پیارے کاریل، ہم تم سے بالکل خفا نہیں ہیں۔ مہربانی کر کے لوٹ آؤ۔ ہم تمھاری ہر خواہش پوری کریں گے۔ اگر تم ہماری مدد کرو تو ہم تمھاری مدد کریں گے۔۔۔" ذرا اس خط پر غور کیجیے۔ صدر ہُوشاک نے کتنے ہی ڈاکٹروں، اسکالروں، خلابازوں، کھلاڑیوں، فلم ڈائرکٹروں، کیمرامینوں، کارندوں، انجنیئروں، فنِ تعمیر کے ماہروں، تاریخ دانوں، صحافیوں، ادیبوں اور مصوّروں کو پلک جھپکائے بغیر جلاوطن ہو جانے دیا تھا، لیکن اس کے لیے یہ خیال ناقابلِ برداشت تھا کہ کاریل گوٹ ملک چھوڑ کر چلا جائے۔ وجہ یہ ہے کہ کاریل گوٹ یادداشت سے تہی موسیقی کی علامت تھا، اس موسیقی کی جس میں بیتھوون اور ایلنگٹن کی ہڈیاں اور پالسترینا اور شون برگ کی خاک دفن ہے۔

اقلیم فراموشی کا صدر اور موسیقی کی دنیا کا یہ احمق، دونوں ایک دوسرے کے شایانِ شان ہیں۔ دونوں کا مقصد ایک ہے: تم ہماری مدد

کرو، ہم تمہاری مدد کریں گے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

جو بات کنڈیرا نے بیان کی وہ مشرقی یوروپ کے تمام ملکوں کی خصوصیت اور اس خطّے کے باسیوں کی مشترکہ یادداشت کا حصہ ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کے پاس اپنے اپنے موسیقی کے احمق موجود تھے، بلکہ سوشلسٹ پاپ میوزک کے ابتدائی دور میں بعض احمق ہمارے درمیان مشترک بھی تھے، مثلاً یہی کاریل گوٹ۔

کنڈیرا کے بیان کردہ واقعے کے اکیس سال بعد ایسا ہی ایک واقعہ کروشیا کی چھوٹی سی آزاد جمہوری ریاست میں پیش آیا۔ ایک معروف پاپ گلوکارہ جس نے سیاسی تبدیلی اور جنگ کے دنوں میں اپنی جذباتی حب الوطنی کی بنا پر خاصی شہرت حاصل کر لی تھی، اس نے اعلان کیا کہ وہ صدر کے سامنے بر سرِ عام گھٹنوں کے بل جھک کر التجا کرے گی کہ اُس کے آبائی قصبے کوناوالے کو سربوں کے حوالے نہ کیا جائے۔ (سربوں نے واقعی اس قصبے پر حملہ کر کے اسے تباہ و برباد کیا اور دُبراونک کے شہر کو اسی کوناوالے کی پہاڑیوں پر چڑھ کر اپنی بندوقوں کا نشانہ بنایا۔) گلوکارہ کا یہ اعلان عین اُس وقت سامنے آیا جب صدرِ محترم "عوام دشمن" دانشوروں پر اپنے غیظ و غضب کا اظہار کر رہے تھے۔ کروشیائی ذرائع ابلاغ "پانچ چڑیلوں" کو آگ میں جھونکنے میں مصروف تھے (یہ پانچوں عورتیں دراصل ادیب اور اخبار نویس تھیں جو، مقامی ذرائع ابلاغ کے کہنے کے مطابق، اپنی تحریروں کے ذریعے "کروشیا کے خلاف بین الاقوامی سازش" میں، گویا کروشیا کو "ریپ" کرنے کے عمل میں، شریک ہو گئی تھیں!)

جب اس گلوکارہ کا اعلان صدر تک پہنچا تو اس نے گلوکارہ کے نام فوراً ایک نہایت دردمندانہ اور مشفقانہ کھلا خط لکھا۔ تمہیں بالکل فکر نہیں کرنی چاہیے، ایسا ہرگز نہیں ہوگا، ایسا کسی قیمت پر نہیں ہونے دیا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ صدر کا اقدام بالکل درست تھا۔ اس نے ایک ایسی عورت کو جواب دیا جو اس جواب کی مستحق تھی، جو گھٹنوں کے بل جھک کر التجا کرنے پر آمادہ تھی: تم ہماری مدد کرو، ہم تمہاری مدد کریں گے۔۔۔

اس واقعے کی ایک اور تفصیل بھی ہے۔ یہ وہی موقع تھا جب کروشیائی (اور عالمی) ذرائع ابلاغ بوسنیائی اور کروشیائی عورتوں کے ریپ کیے جانے، سربوں کی ہوس کا نشانہ بننے، کی خبروں سے لبریز تھے۔ اور عین اسی موقعے پر کروشیا کے موسیقی کے اسٹالوں پر ایک تازہ فوکسی گیت دھڑا دھڑ بک رہا تھا: Punish me like a Woman (واضح رہے کہ یہ گیت گھٹنوں کے بل جھکنے والی گلوکارہ کا گایا ہوا نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ بات ضرورت سے زیادہ ہی بھونڈی ہو جاتی۔)

Scanned with CamScanner

***

ایک گلوکار کی موت

کروشیا میں ۱۹۹۳ میں ایک گلوکار "تے الف" کار کے حادثے میں مارا گیا۔ بات یہ تھی کہ وہ کار بہت زیادہ تیز چلا رہا تھا۔ اس نے اپنی گاڑی دوسری کار سے ٹکرادی جس کی وجہ سے دوسری کار میں بیٹھے ہوئے دو افراد بھی موقعے پر ہی ہلاک ہو گئے۔ اخباروں میں یہ خبر بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ چھپی۔ اس کے بعد یہ خبر مسلسل روزانہ آتی رہی لیکن دوسری کار میں سوار، حادثے میں مارے جانے والوں کا ذکر کم سے کم تر ہوتے ہوتے بالکل غائب ہو گیا۔ اس گلوکار نے دو ایک قومی نغمے بھی گائے تھے۔ چند ہی دنوں میں ان نغموں کا ذکر خبر کا بنیادی اہمیت رکھنے والا عنصر بن گیا۔ ساتھ ہی متن میں یہ تبدیلی آئی کہ حادثے میں ہلاکت کو شہادت کا درجہ دے دیا گیا۔

اس شہادت کا سوگ بڑے پیمانے پر منایا گیا۔ ننھے منے بچے قومی لباس پہن کر، اس کے گائے ہوئے نغمے گنگناتے ہوئے اور اشک بار، ٹیلی وژن کی قومی نشریات میں دکھائے گئے۔ ملک کے منتخب صدر بھی، افسردہ اور سنجیدہ، تعزیت کرتے نظر آئے۔ اور اب حال ہی میں شہید گلوکار کے شہر کے باسیوں کا یہ خط اخبار میں شائع ہوا ہے:

> وہ اپنے شہر کے نہایت ممتاز علمبردار تھے جس کا انھوں نے اپنے گیتوں میں سدا ذکر کیا۔ ان کے نغموں نے دنیا بھر کے انصاف پسندوں کی توجہ جارحیت پسند سربوں کے حملے کی جانب مبذول کرائی، اور اس طرح دیکھیں تو سچائی کو اجاگر کرنے میں بے حد اہم کردار ادا کیا۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ فلاں سڑک کا نام (جسے حال ہی میں ایک نازی مخالف شخصیت سے بدل کر ہماری اپنی کروشیائی تاریخ کے ایک ہیرو سے منسوب کیا گیا ہے)، دوبارہ بدل کر شہید گلوکار کے نام پر رکھ دیا جائے۔

***

موسیقیانہ طلاق

نیدا "ی" یوگوپاپ موسیقی کی دنیا کی سب سے پہلی اسٹار تھی۔ اس کے سستے جدید لوک نغمے "ہمارے دلکش (آج کل سابقہ) وطن" بھر میں گونجا کرتے تھے۔ نیدا اسرائیوو کی رہنے والی تھی اور

Scanned with CamScanner

اس کا نغمہ نگار "ن" زگرب کا تھا۔ زمانۂ جنگ کے دورانیے میں نیدا سرب ہو گئی۔

حسبِ معمول جنگ کی روداد دکھانے کے بعد کروشیائی ٹیلی وژن نے ایک نوخیز گلوکارہ کا پروگرام پیش کیا جس نے نیدا جیسے کپڑے پہن رکھے تھے اور اس جیسا ہی سنگھار کر رکھا تھا۔

"ہم نے نیدا کے تمام مقبول گانے ریکارڈ کر لیے ہیں تاکہ زگرب کے اس عظیم نغمہ نگار ن کے نغموں کو کروشیائی پاپ موسیقی کا حصّہ بنا سکیں،" نوخیز گلوکارہ نے زور دے کر کہا۔

"مگر آپ تو بالکل نیدا کی طرح گاتی ہیں،" ٹی وی رپورٹر بولا۔

"اسی طرح تو ن کے نغموں کو پھر سے کروشیائی بنایا جا سکتا ہے،" کروشیائی گلوکارہ نے کہا، اور لمحہ بھر کو اس پیچیدہ منطق سے خود بھی بوکھلا کر بولی: "بعد میں مَیں اپنا علیحدہ تشخص پیدا کرنے کی کوشش کروں گی۔"

***

رُوں رُوں

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ کہیں یہ موسیقی تو نہیں جس نے مجھ سے میرا وطن چھڑوا دیا۔ اپنی جلاوطنی کی وجوہات، جو ہم تصور کرتے ہیں بسا اوقات ان سے بہت کم سنجیدہ نوعیت کی ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر آوازوں سے بعض لوگ پاگل ہو سکتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ موسیقی کی حسیت (بدذوقی، مثلاً) کسی کو جلاوطن نہ کرا دے؟ یہ تو خیر جو بھی کچھ ہو، مگر جلاوطن لوگ اکثر محسوس کرتے ہیں کہ جلاوطنی ایک مسلسل صوتی حسیت کا عالم ہوتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ جلاوطنی محض (بُری یا بھلی) موسیقی کی یادوں سے عبارت ہے۔

ایک دن مَیں میونخ کے مرکزی علاقے میں اپنے ایک شناسا ایگور سے ملنے گئی، مگر میرین پلاٹز سے کچھ فاصلے پر موسیقی نے میری توجّہ اپنی طرف کھینچ لی اور میں رک گئی۔ ایک عمر رسیدہ بنجارا وائلن پر ہنگری کے بنجاروں کی کوئی دھُن بجا رہا تھا۔ اس نے میری اُچٹتی ہوئی نظر دیکھ لی اور مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں فاصلہ بھی تھا اور بے باکی بھی۔ اُس نے پہچان لیا تھا کہ میں اُسی جیسی ہوں۔ میرے حلق میں کوئی چیز پھنس گئی اور میری سانس گھٹنے لگی۔ میں نے نظریں جھکا لیں اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ میں غلط سمت میں چلنے لگی ہوں۔ چند قدم بعد میری نظر ایک ٹیلی فون بوتھ پر پڑی اور مجھے یوں لگا جیسے میری جان بچ گئی ہو۔ میں فوراً قطار میں کھڑی ہو گئی اور ایسا ظاہر کرنے لگی گویا اس طرف ٹیلی فون کرنے ہی آئی ہوں۔ میرے

Scanned with CamScanner

آگے ایک نوجوان کھڑا تھا: چُست سیاہ چمڑے کی جیکٹ، چست جینز، اونچی ایڑمی کے بوٹ، چہرے پر مدم تحفظ اور گستاخی کے تاثرات اس طرح ملے جلے جیسے رنگ ایک دوسرے پر چڑھ رہے ہوں۔ مجھے فوراً معلوم ہو گیا کہ وہ "ہم میں سے" ہے، میرا ہم وطن۔ اس نے جس طرح آہستہ آہستہ اور مستقل مزاجی سے نمبر ملائے۔۔ دائیں بائیں دیکھے بغیر، کسی سستے ریستوراں کے ویٹر کی طرح۔۔ اس سے میرا دل غصّے اور رحم سے بھر گیا اور میں قطار میں کھڑے دوسرے لوگوں کی طرف دار ہو گئی۔ آخرکار اسے اس کا مطلوبہ نمبر مل گیا (آخر ہمیں میں سے تھا، اور کون!)۔ میرے ہم وطنوں کی ٹیلی فون پر طویل گفتگو کرنے کی عادت نے، جس کا موضوع کچھ بھی نہ ہو، جیسے دونوں ایک دوسرے کو تھپک رہے ہوں، سہلا رہے ہوں، لاڈ کر رہے ہوں، نخرے سہ رہے ہوں اور کروا رہے ہوں، اس عادت کو دیکھ کر میرا دل ایک بار پھر غصّے اور رحم سے بھر گیا۔ وائلن کی اُداس رُوں رُوں مسلسل جاری تھی۔ نوجوان کسی میلیچا نامی عورت سے بات کر رہا تھا۔ میرے دماغ میں، جیسے کسی فلم کی تدوین کر رہی ہوں، وائلن کی رُوں رُوں اس نوجوان کی باتوں کے ساتھ بار بار جُڑ رہی تھی۔ سیاہ آنکھوں والا بنجارا مستقل میری سمت دیکھے جا رہا تھا۔ پل بھر کو میرے جی میں آئی کہ قطار چھوڑ کر چلی جاؤں، مگر میں نے ایسا نہیں کیا کیوں کہ اس طرح تو میرا بھید کھل جاتا۔ اس لیے جب نوجوان نے آخرکار گفتگو ختم کی اور اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا (ایک ایسی حرکت جس نے میرے دل کو پھر پہلے جیسے ملے جلے جذبات سے بھر دیا، کیوں کہ یہ اس قدر غیر متوقع تھی)، تب میں نے بانے لور کو فون کیا، کیوں کہ اس وقت مجھے یہی شخص سوجھ سکتا تھا جس سے میں کوئی ضروری، کارآمد بات پوچھتی۔

ایگور سے ملنے میں مجھے دیر ہو گئی۔ ہم کھانا کھانے کے لیے ایک چینی ریستوراں میں گئے۔ کھانا آنے تک، باتیں کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میں بے چین ہوں، غائب دماغ ہو رہی ہوں، میری نگاہیں بھٹک رہی ہیں۔ مجھے لگا جیسے میرے وجود پر کُہرے کی باریک تہہ ایسے جم گئی ہے جیسے سردیوں میں عینک کے شیشوں پر جم جاتی ہے۔ تبھی کسی لمحے مجھے اُس موسیقی کا احساس ہوا جو وہاں بج رہی تھی، کوئی کوریائی یا چینی پاپ گیت، حُزن آلود نرم دُھن، کوئی عشقیہ نغمہ! اچانک بارش برسنے لگی اور ایگور کی پُشت پر کھڑکی کے شیشے پر ڈھل ڈھل پانی بہنے لگا۔ آخرکار میرے ضبط کے بند ٹوٹ گئے، جیسے کوئی شکنجہ ٹوٹ جائے، اور نہ جانے کہاں سے اُچھلتا ہوا گرم آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔۔۔

"ایگور، یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" میں نے ایگور سے تقریباً معافی مانگنے کے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے،" اس نے مجھے تسلی دی۔ "میں سمجھتا ہوں! میں خود جہاں کا ہوں

وہاں ٹینگو کا کلچر ہے،" میرے روسی یہودی دوست نے کہا جو چرنووتسا کا ہے اور وطن بدر ہے۔

***

دائرے کی طلسمی خصوصیات

" کبھی میں خود بھی دائرے کے رقص میں شریک تھا،" چیک ادیب اور برسوں سے جلاوطن میلان کنڈیرا نے اپنے مذکورہ بالا ناول "خندہ اور فراموشی کی کتاب" میں اعتراف کیا ہے۔ " یہ ۱۹۴۸ کے موسم بہار کا ذکر ہے۔ کمیونسٹوں نے میرے ملک میں تازہ تازہ اقتدار سنبھالا تھا۔ سوشلسٹ اور کرسچیئن ڈیموکریٹ وزیر ملک سے فرار ہو گئے تھے، اور میں نے دوسرے کمیونسٹ طلبا کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر، ان کے کندھوں پر بازو رکھ کر، ایک قدم آگے، ایک قدم پیچھے رکھ کر، باری باری دایاں اور بایاں پیر اٹھا کر، دائرے میں رقص کیا تھا۔ اور ایسا رقص ہم ہر مہینے کیا کرتے تھے کیوں کہ ہمیشہ ہی کسی نہ کسی چیز کا جشن منایا جا رہا ہوتا تھا، کوئی یادگاری دن، کوئی خاص واقعہ۔ پرانی غلطیاں درست کی گئیں، نئی غلطیوں کی بنا ڈالی گئی۔۔ فیکٹریوں کو قومیایا گیا، ہزاروں لوگوں کو جیل میں ڈالا گیا، علاج معالجہ مفت دستیاب ہونے لگا، چھوٹے دکان دار اپنی دکانیں گنوا بیٹھے، معمر مزدوروں کو زندگی میں پہلی بار ضبط کیے ہوئے عالیشان دیہی محلوں میں چھٹیاں گزارنے کا موقع ملا۔۔ اور ہم سب کے چہروں پر مسرت بھری مسکراہٹ قائم رہی۔ تب ایک دن میرے منھ سے ایک ایسی بات نکل گئی جو مجھے نہیں کہنی چاہیے تھی۔ مجھے پارٹی سے اور رقص کے دائرے سے خارج کر دیا گیا۔ تب اچانک مجھے دائرے کی طلسمی خصوصیات کا احساس ہوا۔ سیدھی قطار سے باہر نکل کر اس میں دوبارہ شامل ہوا جا سکتا ہے، کیوں کہ قطار ایک کھلی ہوئی ترتیب ہوتی ہے۔ لیکن دائرہ ایک بار بند ہو جائے تو اس میں داخل ہونا ناممکن ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ سیارے دائرہ وار گردش کرتے ہیں اور ان سے جدا ہونے والا پتھر مرکز گریز قوت کے زور پر ان سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ کسی سیارے سے الگ ہونے والے شہابِ ثاقب کی طرح میں بھی دائرے سے باہر نکل گیا اور اب تک نیچے ہی نیچے گرتا چلا جا رہا ہوں۔"

***

دائرے کا رقص

۱۹۹۳ کے موسم خزاں میں میونخ میں میری ایک دوست فریڈل نے مجھ سے درخواست کی کہ ماؤں اور بچوں کے یوگوسلاو مرکز میں اپنی کچھ چیزیں پڑھ کر سناؤں۔ اس اجتماع میں، اس کے مقام کی مناسبت سے، مردوں سے زیادہ عورتیں شریک تھیں اور وہ سب سابق یوگوسلاویا کے مختلف حصّوں کی رہنے والی تھیں۔

جلسہ دیر سے شروع ہوا کیوں کہ ہمیں سب شرکا کے آ پہنچنے کا انتظار کرنا تھا۔ "لوگ کام پر گئے ہوئے ہیں، آپ تو جانتی ہی ہیں،" جلسے کی مہربان منتظم نے وضاحت کی۔ عورتیں اپنے ہاتھوں میں ٹرے اور ڈشیں اٹھائے ہوئے پہنچیں۔ ہر ایک نے کھانے کی کوئی نہ کوئی چیز تیار کی تھی: کیک، گوشت، سلاد، گھر کی بنی روٹیاں۔۔۔

جلسہ بالکل کسی دیہاتی میلے جیسا لگتا تھا۔ ایک نوجوان گٹار سنبھالے میرے قریب بیٹھا تھا۔ میں ایک اقتباس پڑھتی اور وہ گٹار کے تاروں کو غمناک انداز میں ہولے ہولے چھیڑتا۔ سامنے بیٹھی عورتوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ پھر ایک عورت نے اپنی نظم سنائی جس میں اُن قاتلوں کی مذمت کی گئی تھی جنھوں نے اس کے وطن کو تباہ کیا۔ پھر اس نے ایک اور نظم سنائی جو اس کے آبائی گاؤں کے بارے میں تھی، اس کی ماں اور اس کے چھوٹے سے پُرحرارت گھر کے بارے میں جہاں وہ اب کبھی لوٹ کر نہیں جا سکے گی۔ نوجوان گٹار بجاتا رہا، مگر اس کے سُر اب اتنے غم انگیز نہیں تھے۔ آخر میں منتظم نے مجھے گلدستہ پیش کیا۔ عورتوں نے تالیاں بجائیں اور اپنی آنکھیں پونچھیں۔

کوئی مجھے ذرا دیر کو برابر کے کمرے میں لے گیا جہاں خدا جانے کون شخص مجھ سے خدا جانے کس موضوع پر بات کرنا چاہتا تھا۔ جب میں واپس آئی تو جلسے کا کمرہ۔۔ جہاں لمحہ بھر پہلے تک حاضرین کی کرسیاں اور وہ میز رکھی تھی جس کے پاس میں بیٹھی تھی۔۔ اب بالکل منقلب ہو چکا تھا۔ اس چھوٹے سے ہال میں اب موسیقی کا راج تھا۔ گٹار والے نوجوان کے علاوہ دو اور لوگ اکارڈین اور تمبورہ لے کر کہیں سے آ گئے تھے۔ عورتیں (جو ابھی ایک لمحہ پہلے اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں) اور کچھ مرد دائرے کے رقص "کولو" میں مشغول تھے۔ میں نے ان کے مسکراتے چہروں پر نگاہ ڈالی، ان کے پیر زور زور سے زمین پر پڑ رہے تھے، ٹھوڑیاں کپکپا رہی تھیں، بازو ایک دوسرے میں مضبوطی سے پیوست تھے جیسے انھیں ڈر ہو کہ ان میں سے کوئی مسرّت کے دائرے سے نکل کر باہر نہ لڑھک جائے۔ جہاں تک میں سمجھ سکتی تھی، یہ ایک سربیائی رقص تھا، لیکن رومانیائی، بلغاروی، مقدونیائی، کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ قومی دھُنوں کا انتخاب (جو سربیائی، سلووینی، سلووینی اور

مقدونیائی دھنیں تھیں) ابھی نامکمل تھا اور "یوگوسلاو اصول" کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اس فہرست سے دالماشیا، مونتے نیگرو، کوسووو، زاگورییے، لیکا اور بوسنیا کی دھنوں کا اخراج "قومی سُر" (گزرے دنوں کی موسیقی کا ایک مقبول فقرہ!) کی بنیاد پر نہیں بلکہ تال کے اصول کی بنیاد پر کیا گیا تھا۔ اس لیے کہ ان سب دھنوں کی تال بہت سُست تھی۔ صرف "کولو" کی تیز دھن اس قابل تھی کہ ناچنے والوں کی آنکھوں میں وہ، ہر چیز سے عاری، خودرفتگی پیدا کر سکے جو جسمانی تسکین کا نتیجہ ہوتی ہے۔

میرے ہم وطن زمین پر پیر مار مار کر کس شے کو دور بھگانے کی کوشش کر رہے تھے؟ میں نہیں جانتی۔ ممکن ہے وہ یوں ہی بس زمین پر پیر مار رہے ہوں۔ یہ متحرک رقص قوموں اور تفریقوں سے بالاتر تھا۔ جیسا کہ میرے ایک دوست "ک" کا کہنا ہے، یہ "تیز تال کے بھائی چارے" کا مظاہرہ تھا۔ میرے ہم وطن اس تال کے ذریعے ہر معنی اور ہر سرحد کو مٹا ڈالنا چاہتے تھے، ہر قومی اور جذباتی سرحد کو (جو اصل خوفزدہ کر دینے والی بات تھی)۔ اس متحرک رقص میں شریک ہونے والوں کے چہروں پر کسی خاص جذبے کا تاثر نہ تھا، اس رقص کی تال کسی بھی لمحے کسی بھی ایسے جذبے میں ڈھل سکتی تھی جسے باقاعدہ کوئی نام دیا جا سکے (مثلاً شرمندگی، مسرت، رقت، ہنسی، مایوسی، نفرت، محبت۔۔۔) یا کسی بھی عمل میں صورت پذیر ہو سکتی تھی جسے کوئی نام دیا جا سکے (مثلاً بغل گیری، قتل، بوسہ، زنا بالجبر۔۔۔)

جلسے سے واپسی پر میری دوست فریڈل نے مجھ سے کہا، "تمھیں پتا ہے، یہ لوگ رقص کے جلسے بہت جلدی جلدی منعقد کرنے لگے ہیں۔ کئی بار تو یہ صرف رقص کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ انھیں اسی چیز کی ضرورت بار بار محسوس ہونے لگی ہے۔ لگتا ہے یہی وہ چیز ہے جس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور یہی چیز ناقابلِ فہم ہے۔" اس نے اپنی بات پوری کی اور ہم نے "اس چیز" کے بارے میں پھر کوئی بات نہ کی۔

***

کومل سُر

"ہمارے جنوبی علاقوں کے لوگ دھیمے سُروں میں گاتے ہیں، اور ہر موقعے پر، خوشی کے اظہار میں بھی، ان کے سُر ایک جیسے دھیمے رہتے ہیں۔ چاہے وہ کولو ناچ رہے ہوں یا اچھلنے والا رقص کر رہے ہوں یا تیز حرکات پر مبنی شادی بیاہ کے ناچ میں مشغول ہوں، یہ کومل سُر، جیسا کہ علم

موسیقی کا کوئی ماہر کہے گا، کبھی پوری طرح غائب نہیں ہوتا۔ یہ بات کسی بھی حساس کن رَس سے چھپی نہیں رہ سکتی کہ ان علاقوں کی موسیقی کی گہرائی میں ایک بھاری پن، ایک طرح کی سست روی موجود رہتی ہے۔ چاہے غم کا موقع نہ ہو، پھر بھی ایک طرح کی غمناکی جھلک دکھائی رہتی ہے؛ خواہ وہ کوئی نوحہ نہ گا رہے ہوں، پھر بھی نوحے کی ہلکی سی گونج محسوس کی جا سکتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ وہ کیا چیز ہے جسے یہ لوگ، لاشعوری طور پر سہی، متواتر بسر کر رہے ہیں؟ ---اور اس بات کی شہادت کہ یوگوسلاو عوام کا یہ گہرا تجربہ دراصل لاشعوری ہے، اس حقیقت میں ملتی ہے کہ یہ تجربہ کولو رقص کے تال میں، گویا اس رقص کی جسمانی حرکات میں، گھُلا ہوا ہے، اور مے خواری کے انتہائی ہیجان انگیز گیتوں میں بھی--- ناچنے گانے والے خواہ اور تھوڈوکس ہوں، مسلمان ہوں یا کیتھولک، یہ کومل سُر ہر جگہ، ہر وقت موجود رہتا ہے، اپنی اکتا دینے والی یک آہنگی اور تسلسل کے ساتھ، وہی ایک سُر جس کا خاتمہ ہمیشہ آنسوؤں پر ہوتا ہے۔"

(ولادیمیر دوور نیکووِچ: The Psychology of Yugoslav Melancholy، ۱۹۱۷)

***

ہتھیاروں کا چھیلنا

فرینکفرٹ سے حال ہی میں نکلنے والا بوسنیائی اخبار Exile ویرن ہائم کے جرمن قصبے میں واقع مہاجر کیمپ میں رہنے والے بوسنیائی وطن بدر بچوں کی لکھی ہوئی مختصر تحریریں شائع کرتا ہے۔ اس میں امیرہ عثمانووِچ نامی ایک ننھی لڑکی کی ایک نظم شائع ہوئی جس کا عنوان ہے: "میرا وطن بوسنیا ہرزگووینا"۔ اس نظم کا آخری ٹکڑا یہ ہے:

اور بوسنیا کے زخم ابھی تک ہرے ہیں
کیوں کہ ہتھیار اسے اب بھی چھیل رہے ہیں
ہتھیار اُسے چھیلتے ہیں، اس کے دل کو کھرچتے ہیں
اور بوسنیا کراہتا ہے، دھماکے سے اس کا سینہ پھٹ گیا ہے

***

Scanned with CamScanner

ہرڈی گرڈی اور ڈھول

روسی ادیب ایوان بونین نے ایک نظم لکھی تھی: "ایک بندر کے ساتھ"۔ یہ نظم ہرڈی گرڈی ساز بجانے والے ایک شخص اور اس کے بندر کے بارے میں تھی، اور نظم میں بیان کیے گئے چھوٹے سے قصے کا محلِ وقوع گرمیوں کے دنوں کا اودیسا چوک تھا۔ بونین کی نظم کا ہرڈی گرڈی بجانے والا، نہ معلوم کیوں، ایک کروٹ ہے۔ اس کے بارے میں ہم جو بھی تھوڑا بہت جانتے ہیں (کیوں کہ بونین کی دل چسپی بندر میں زیادہ ہے)، وہ یہ ہے کہ وہ "دبلا اور کمزور، اپنی پیاس سے مخمور" ہے۔ کروٹ پانی مانگتا ہے اور اپنے بندر کو پلا دیتا ہے۔ (اتفاق کی بات یہ ہے کہ بونین کی نظم میں کروٹ کا قافیہ جس لفظ سے جوڑا گیا ہے اس کا مطلب ہے جسم کا پچھلا حصہ، ظاہر ہے کہ بندر کے جسم کا!) جب بندر "بھنویں اُٹھائے" پانی پینے میں مشغول ہے، کروٹ "سوکھی سفید روٹی چبا" رہا ہے اور آہستہ آہستہ میدان میں لگے ایک درخت کے سائے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ۱۹۰۶-۷ میں لکھی ہوئی اس نظم کا خاتمہ بونین نے اس سطر پر کیا ہے: "اے زگرب، تو بہت دُور ہے!"

۱۹۱۸ میں ایک اور روسی شاعر ہوداشےوِچ نے اس سے ملتے جلتے عنوان ("بندر") کی ایک اور نظم لکھی جو ۱۹۱۹ میں مکمل ہوئی۔ وہی چھوٹا سا منظر جو بونین کی نظم میں تھا، اس نظم میں ذرا اور شمال کی جانب، ماسکو کے قریب، تومیلینو کے مقام پر پیش آتا ہے۔ گرمی اتنی ہی شدید ہے جتنی بونین کی نظم میں۔ اس نظم کا راوی باہر صحن میں نکل کر آتا ہے تو اسے اپنے سامنے "ایک آوارہ گرد سرب، دُبلا اور سانولا"، باڑھ سے ٹیک لگائے اونگھتا دکھائی دیتا ہے۔ راوی کو اس کے ننگے سینے پر ایک بھاری صلیب لٹکی دکھائی دیتی ہے جس پر پسینے کے قطرے رینگ رہے ہیں۔ آوارہ گرد کے پاس ایک بندر بیٹھا ہے، وہی پرانا سُرخ اسکرٹ پہنے۔ بونین کی نظم والے کروٹ کی طرح، یہ سرب بھی پانی مانگتا ہے اور خود پینے کے بجائے اپنے بندر کو پلا دیتا ہے۔ ہوداشےوِچ کو بندر کی شبیہ بونین سے بھی زیادہ متاثر کرتی ہے۔ اس کی نظم کا بندر شکریے کے اظہار کے طور پر اپنا "چکنوں بھرا، پسینے سے ٹھنڈا" سیاہ ہاتھ آگے بڑھاتا ہے اور راوی، ہوداشےوِچ، جو حسین عورتوں سے، شاعروں اور سیاسی رہنماؤں سے ہاتھ ملا چکا ہے، اس ہاتھ کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گا، کیوں کہ کسی اور ہاتھ کا لمس اُسے اس قدر "برادرانہ" محسوس نہیں ہوا تھا۔ ہوداشےوِچ کی نظم کا آوارہ گرد سرب، گلے میں پڑا ڈھول بجاتا، وہاں سے چل دیتا ہے۔ بندر اس کے کاندھے پر یوں بیٹھا ہے جیسے کوئی "ہندوستانی مہاراجا ہاتھی پر بیٹھا جا رہا ہو" - اور ہوداشےوِچ اپنی نظم کو اس سادہ

Scanned with CamScanner

سی سطر پر ختم کرتا ہے: "یہ وہی دن تھا جب جنگ چھڑ گئی"۔
بونین نے اپنی نظم کے ہرڈی گرڈی بجانے والے کو کروٹ کیوں بتایا اور ہوداشےوچ کو اپنے اس کھُلے سرقے کی پردہ پوشی کے لیے اسے سرب کیوں بنانا پڑا؟ میں نہیں جانتی، اور مجھے یہاں اس بات سے بحث بھی نہیں ہے۔ اس صدی کے آخری حصے میں مَیں دو روسی شاعروں کی اس صدی کے شروع میں لکھی یہ دونوں نظمیں اپنے طریقے سے پڑھتی ہوں۔ میرے ہم وطن "دبلے اور سانولے"، اپنے حقیر اثاثے (ایک ہرڈی گرڈی اور ایک ڈھول!) کے ساتھ، "اپنی پیاس سے مخمور"، اپنے مالک، یعنی بندر، کی خدمت گزاری میں مشغول ہیں؛ انسان کے اس جارح اور طنز آمیز تمثیل کی خدمت، جس کے چہرے پر چالاکی اور فریب کی مسکراہٹ ہے، انسانی کپڑے پہنے ایک جانور جو "اپنے جسم کا پچھلا حصہ مضحک انداز میں اُبھارتا ہے" (بونین)؛ میرے دونوں ہم وطن ایک ایسے مالک کی خدمت میں ہیں جو اُن پر جھومتے ہوئے سواری کرتا ہے جیسے کوئی "ہندوستانی مہاراجا ہاتھی پر بیٹھا جا رہا ہو" (ہوداشےوچ)۔ (۴)۔

***

موسیقی کا جھاگ

"کیا آپ کے پاس بستر پر لیٹ کر پڑھنے کی کوئی ایسی کہانی نہیں ہے جو سابق یوگوسلاویا کے بارے میں نہ ہو؟" بستر میں لیٹے ہوئے کم عمر لڑکے نے پوچھا۔ اس کے سرہانے بیٹھی عورت اسے اخبار میں سے کچھ پڑھ کر سنا رہی تھی۔ یہ کارٹون ۲۲ نومبر ۱۹۹۳ کے "نیویارکر" میں شائع ہوا تھا۔

ہم اپنا راستا طے کر آئے ہیں، ستم رسیدوں کے مقام سے اتر کر بستر پر لیٹ کر پڑھی جانے والی کہانیوں کے کردار بن چکے ہیں، ایک بے حس دنیا کے تماشاگر، ہرڈی گرڈی اور ڈھول بجانے والے، سانولے مکّار آوارہ گرد بن چکے ہیں، ہم دنیا بھر میں اپنی بد قسمتی کو، پورنوگرافی کے تھوک فروشوں کی مدد سے، اخلاقی اور جذباتی خودلذتی کے آلات کی صورت میں بیچتے پھر رہے ہیں۔ ہم صرف آلات بیچتے ہیں۔ بس ایک بات ہے جو ہمارے ذہن سے اوجھل ہو گئی ہے، اور وہ یہ کہ ان آلات کی بیٹریاں ختم ہو رہی ہیں۔۔۔

صرف تین برس کے عرصے میں ہم نئے زمانے کے گلیڈی ایٹر بن کر رہ گئے ہیں، بیسویں صدی کے اختتام پر ہم اچانک اُچھل کر ٹیکنولوجی کو آگے بڑھانے کے لیے نمودار ہو گئے ہیں،

Scanned with CamScanner

ہمیں دیکھنے کے لیے محض ٹی وی کھولنا یا اخبار خرید لینا کافی ہے۔ اسکرین پر "دبلے، سانولے" لوگ باہر اُبلے پڑ رہے ہیں، اپنی بد قسمتی کی نمائش کرتے ہوئے۔ اور ذرا دیکھیے، وہ ایک لمحے کو بھی نہیں رکتے، اُن کے ماتھے پر پسینے کی ایک بوند تک نہیں ہے، ان میں اتنی توانائی کہاں سے آ گئی؟ ہم اپنی بد قسمتی کا ڈھول مسلسل بجا رہے ہیں، اپنے مصائب کے بڑی گردی کے دستے کو متواتر، رکے بغیر، گردش دے رہے ہیں۔ پہلے پہل لوگ ہمیں دیکھ کر رکتے ہیں، پھر بور ہو کر آگے چل دیتے ہیں۔ کیا کیا جا سکتا ہے، تکرار نے تاثیر کو زائل کر دیا ہے، موسیقی وہی پرانی ہے اور بندر مسلسل پانی پیے جا رہا ہے۔۔۔

ہم تھکی ہوئی دنیا کے دل کو سہلاتے ہیں، اسے دوا کی بڑھائی ہوئی خوراکیں دے دے کر جگانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر اس کی دھڑکن بحال نہیں ہوتی۔ اخباروں کے صفحہ اول پر ہماری تصویریں ہیں، ہم ٹی وی کی اسکرینوں میں گھسے ہوئے ہیں، ہمارے وڈیو کیسٹ زندہ ناچ گانے کی طرح فروخت کیے جاتے ہیں: ریپ بالکل اصلی ہیں، آنسو نمکین ہیں، قتل تازہ بتازہ ہیں! ہم دنیا کو قتل ہونے کے فن میں اپنی مہارت سے واقف کرانے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے۔ گنٹر گراس کے کسی ناول کے ہیرو کی طرح، ہماری آوازیں ہماری اپنی اور دوسروں کی کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیتی ہیں۔ دنیا کا دل، تھکن سے بھرا ایک تھیلا، ساحل پر پڑی ویل کی طرح دھیرے دھیرے بلتا ہے۔ اور ہماری موت جتنی زیادہ حقیقی، جتنی زیادہ مکمل ہو، دنیا کو اُتنا ہی یقین ہوتا جاتا ہے کہ یہ ایک علاقائی منظر ہے۔ ہماری تکلیف جتنی زیادہ بڑی ہو، دنیا اسے اُتنا ہی زیادہ دیہاتی واقعہ سمجھنے لگتی ہے۔ ہم میں سے جتنے زیادہ لوگ مرتے جاتے ہیں، ہماری تکرار اُتنی ہی اکتا دینے والی ہوتی جاتی ہے۔ اب ہم پر لطیفے بنائے جانے لگے ہیں، ہم ذرائع ابلاغ کا "مٹیریل" بن گئے ہیں، لیکن ہم نے بلند ترین اعزاز حاصل کر لیا ہے: "نیویارکر" کے صفحات تک بار پانے کا اعزاز! ہمارے عروج کا بلند ترین نقطہ "نیویارکر" کے موجودہ زوال کے پست ترین نقطے کے برابر آ پہنچا ہے۔ بیسویں صدی کے اختتام پر ہم سڑک کے کنارے تماشا دکھانے والوں میں تبدیل ہو گئے ہیں، لیکن بیسویں صدی بھی تو ہمارے اسٹیج کی طرح خاتمے کے قریب آ رہی ہے۔ یہ فنی شکست دو طرفہ ہے: ہماری بھی اور ہمارے تماشائیوں کی بھی۔

مگر وہ، تماشا دیکھنے والے، منطق کے عین مطابق، باقی رہ جائیں گے، جب کہ ہم غائب ہو چکے ہوں گے۔ کیوں کہ وہ بہرے ہو چکے ہیں، جب کہ ہماری سماعت بالکل برقرار ہے۔ جو کچھ پیش آیا وہ آخر کیا ہے اور (اگر انسانی انصاف نہیں تو) فنی انصاف کا وجود کہاں ہے؟ شاید ہم واقعی (کارٹون کے کرداروں کی طرح!) کسی اور سمت میں آگے نکل گئے ہیں، شاید چوتھی دنیا کی

Scanned with CamScanner

سمت میں۔ شاید ہم زندہ نہیں رہے، جیسا کہ ہمیں خود بھی مسلسل محسوس ہوتا رہتا ہے، شاید ہم بھوتوں میں بدل چکے ہیں، جو اچانک جنیوا، پیرس، لندن، نیویارک کے چوراہوں پر اچانک نمودار ہو جاتے ہیں اور اپنے "قومی جوہر" کی نمائش کرنے لگتے ہیں، اپنے ساز کے آخری سلامت تار کو چھیڑتے ہوئے، اپنے قدیمی نوحے کو اکتارے، پائپ یا تمبورے کی آواز میں اُنڈیلتے ہوئے۔۔۔ شاید ہم سب "تیز تال کے بھائی چارے" کا حصہ ہیں، ہاں، آواز اور تال کے بھائی چارے کا حصہ، کیوں کہ ہمیں بس یہی آتا ہے۔۔۔ ہم دنیا کے کونے کونے میں سانپ کے دانتوں کی طرح اچانک دکھائی دے جاتے ہیں۔ ہم "دبلے اور سانولے" لوگ پرچھائیوں کا دائرہ رقص کرتے ہیں، ہمارے زمین پر پڑتے ہوئے پیر نوعِ انسانی کے تسلسل کی توانائی کا اظہار کرتے ہیں، لیکن ایسے کسی تسلسل کا وجود نہیں ہے۔ ہم اپنی آوازوں کے سگنل بھیجے جا رہے ہیں لیکن کسی کان کو ہمارا پیغام سمجھ میں نہیں آتا۔ ہمارے پیچھے جھاگ کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔ اور یہ موسیقی کا جھاگ ہے۔

***

یہ گیت اذیت دیتے ہیں۔۔۔

"یہ اس قسم کے گیت ہیں جو اپنے لمس سے اذیت دیتے ہیں۔ اور جوں جوں ہم ان گیتوں کے لمس کے آگے ہتھیار ڈالتے جاتے ہیں، اس اذیت سے جدا ہونا اتنا ہی مشکل ہوتا جاتا ہے۔ تیز دھار اور اندر اترتی جاتی ہے: بالکل آہنی زنجیروں کی طرح، جنھیں توڑنے کے لیے جس قدر زور لگایا جائے وہ اُتنی ہی شدت سے گوشت میں گڑتی جاتی ہیں۔۔۔ ان گیتوں کا خاتمہ دراصل آغاز ہے، یہ کبھی مکمل نہیں ہوتے، ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ بڑھ کر لامحدود میں گم ہو جاتے ہیں۔ اپنی ابتدائی ترتیب کے لحاظ سے یہ گیت کبھی "ختم" ہو ہی نہیں سکتے، اور سننے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ انھیں ختم نہیں ہونا چاہیے اور اپنی مکمل صورت تک پہنچنا چاہیے۔ گیتوں کی یہ ایک ایسی قسم ہے جو ایک مخصوص تاثر دیتی ہے: یعنی یہ کہ اس کے ختم ہونے کے بعد کچھ نہیں رہے گا، زندگی اس کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گی۔۔۔ اس تاثر کو اظہار اور تفصیلی بیان کی گرفت میں لانا محال ہے۔ اپنی یک آہنگی اور مسلسل اندرونی یکسانی کے باعث، انھیں گہرائیوں کو سدا ناپتے رہنے کے باعث، یہ گیت اور زیادہ طاقت ور، اور زیادہ عمیق، اور زیادہ پُرزور ہوتے جاتے ہیں۔ تکمیل کا فقدان ہی دراصل ان کا جوہر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انھیں سننے کے بعد اس احساس کا اسیر رہ جانا ناگزیر ہے کہ کچھ نہ کچھ باقی رہ گیا ہے۔ اس احساس کا شعور کی سطح پر تجربہ کرنا ناممکن ہے لیکن اس کے باوجود

Scanned with CamScanner

یہ احساس لازماً باقی رہ جاتا ہے۔"

(ولادیمیر دوور نیکووِچ: The Psychology of Yugoslav Melancholy، ۱۹۱۷)

***

بلقان کے اُداس گیت (استھائی)

بلغاروی شاعر بورس "ح" نے مجھے ایک بلغاروی لوک گیت سکھایا تھا۔ مجھے لوک گیتوں سے نفرت ہے، لیکن وہ گیت میری یادداشت میں موسیقی کی ایک جھنکار کی طرح اٹک گیا ہے اور کسی طرح میری جان نہیں چھوڑتا۔۔۔

کبھی کبھی میں لحاف سے منہ ڈھک کر تاریکی میں وہی چھوٹی چھوٹی تانیں لگاتی ہوں (ہُواُواُو، اِی اِی اِی)، میں اپنی بے نام پریشانی کو سُلانے کی کوشش کرتی ہوں اور وہی ٹکڑے گاتی ہوں (ہائے رے رے رے! ہائے رے رے رے!) میں اپنے بلقان کے اُداس گیتوں کی سسکیاں بھرتی ہوں، اپنا بلقان کا بخار، بلقانیوں کا بخار، بھگانے کے لیے، موسیقی کے سُروں سے اپنا اضطراب دور کرنے کے لیے، میرا اضطراب جو موسیقی کی دھُنوں سے پیدا ہوتا ہے، میں اپنے خوف کا علاج تال سے کرنے کی کوشش کرتی ہوں، میرا خوف جو تال سے جنم لیتا ہے۔۔۔ کبھی کبھی مجھے اپنے کندھے پر بندر کے سرد، پسینے سے بھیگے ہنجے کا لمس محسوس ہوتا ہے۔ اور تب "دہشت مجھے کسی لہر کی طرح ڈھانپ لیتی ہے۔۔۔"

**

(۱) سربیائی عوام میں قومی اتحاد پیدا کرنے کے اہم کام میں (جسے بڑی حد تک ان قومی مظاہروں کے ذریعے سرانجام دیا گیا جنھیں "جلسے" کہا جاتا ہے) سیاسی چابک دستوں کے ہاتھوں سے بہرے بھی محفوظ نہیں رہے۔ ایک پلے کارڈ پر لکھا تھا: "قوم کی آواز بہرے بھی سن سکتے ہیں!" (مصنف)۔

(۲) "گوزلے" (gusle) یا اکتارا، ایک تار کا ساز ہے جسے لوک گلوکار سورماؤں کے گیت اور رزمیے گاتے وقت سنگت کے لیے بجاتے ہیں۔ (انگریزی مترجم)۔

(۳) رادووان کراجک کے لیے اس سے زیادہ مناسب ساز اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ جن علاقوں میں گوزلے (اکتارے) کو "عوام کے دل" کی علامت کا درجہ حاصل ہے، خصوصاً سربیا اور مونٹے نیگرو میں، وہاں کراجِک استعاراتی طور پر اکتارا بجانے والا ہی ہے جس کے ہاتھ میں "عوام کا دل" ہے۔

Scanned with CamScanner

اکتارا نوازی، جس کی آوازوں کا رخ سدا سے ان پڑھ عوام ہی کی جانب رہا ہے، آج "اکتارے کی صحافت" کے روپ میں معاصر واقعات کے نغمے گاتی ہے اور انھیں عظیم جنگجو اسلاف کی یاد سے جوڑتی ہے جن کے ساتھ نئے انسان کا اٹوٹ مرگ دوست رشتہ قائم ہے۔ عظیم جنگجو اسلاف کی حقیقت بلاشبہ موسیقی کی اسطورہ سازی کے سوا کچھ نہیں ہے، جو گویا "کالے دھن کو سفید کرنے والی مشین" کا کام کرتی ہے۔ سربیا کے معاصر جنگی مجرم جب اکتارے کی اس مشین سے دھل دھلا کر نکلتے ہیں تو ان کے سارے داغ دھبے دور ہو چکے ہوتے ہیں اور وہ قومی سورماؤں کی طرح چمک اٹھتے ہیں!

اکتارے کی دھلائی کا یہ عمل -- یعنی قاتل کو سورما میں تبدیل کرنے کا عمل -- خود رادووان کراجک کے بارے میں گائے جانے والے گیتوں میں سب سے زیادہ واضح صورت میں سامنے آتا ہے۔ کراجک کو "مردِ آہن" کا خطاب دیا جاتا ہے ("اے کراجک، اے مردِ آہن، کارادورجے کے بعد ہمارے پہلے قائد!") جس نے قوم کی "آزادی اور ایمان کی حفاظت کی ہے" ("تُو نے ہماری آزادی اور ایمان کی حفاظت کی")۔ لیکن کہاں؟ یہاں اس کارنامے کا محلِ وقوع تبدیل کر دیا جاتا ہے، آزادی اور ایمان کی حفاظت کا یہ عظیم کام "کوسووو کے میدانِ جنگ" کے بجائے "جنیوا کی جھیل کے کنارے" انجام پاتا ہے! (مصنّف)۔

(۴) بونین اور ہوداشےوچ کی نظموں، اور ان نظموں کے نفسِ مضمون کی مماثلت، کی جانب میری توجہ روسی شاعر اور مضمون نگار ایگور پومورانتسیف (Igor Pomorantsev) نے مبذول کرائی۔ (مصنّف)۔

Scanned with CamScanner

زلاتکو درزدارے وِچ

ترجمہ: زینت حسام

تنہائی کے ایک ہزار دن

سرائیوو میں سردی کا موسم ہے، اور لوگوں کو بھوک پھر ستانے لگی ہے۔ گرمیوں میں، جب باہر کی دنیا کو جانے والا راستا دو ماہ تک کھُلا رہا تو ہمیں یہ گمان ہو چلا تھا کہ شاید اب حالات بدل جائیں گے۔ تب، کم از کم، کچھ امید باقی تھی۔ لیکن اب تمام امیدیں دفن ہو چکی ہیں۔ لوگ یہ کہتے ہیں کہ سرائیوو تنہا رہ گیا ہے، سرائیوو کو سب بھُلا بیٹھے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو لوگ ایسا کہتے ہیں اُنھیں حقیقت کا ذرا بھی اندازہ نہیں ہے۔ دنیا۔۔ کم از کم دنیا کا وہ حصّہ جو فیصلے صادر کرتا ہے۔۔ کبھی بھی سرائیوو یا بوسنیا کے ساتھ نہیں تھی۔ یہ کہنا کہ اب ہمیں تنہا چھوڑ دیا گیا ہے، زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے۔ پہلی جنوری کو سرائیوو کی محصوری کے ایک ہزار دن پورے ہو جائیں گے۔۔ تنہائی کے ایک ہزار دن۔ کوئی یہ بات کس طرح کہہ سکتا ہے کہ ہمیں اب تنہا چھوڑا گیا ہے؟

شاید کچھ لوگوں کو اُس سات سالہ لڑکے کی تصویر یاد ہو جس کا چہرہ ایک اسنائپر کی گولی کا نشانہ بنا تھا جب وہ اپنی ماں کا ہاتھ تھامے، سرائیوو کے مرکز میں، اقوامِ متحدہ کی بکتر بند گاڑی کے پاس سے، تیز تیز قدم اٹھاتا گزر رہا تھا۔ دم توڑتے وقت وہ لڑکا منھ کے بل کولتار کی سڑک پر پڑا تھا اور اُس کا بایاں ہاتھ، اس کے اپنے خون سے تر، سر کی جانب اٹھا ہوا تھا۔ اُس کا نام نرمین دیوووِچ (Nermin Divovic) تھا۔ وہ اچانک آ گرنے والے کسی شیل کی زد میں نہیں آیا تھا۔ وہ ایک سرب اسنائپر کا دانستہ شکار تھا جو دور سے اُس کو اپنی بندوق کی دوربین میں دیکھ رہا تھا اور جس نے لڑکے کے چہرے کو نشانہ بنا کر لبلبی دبائی تھی۔ پھر اُسی اسنائپر نے نرمین کی ماں کے پیٹ پر گولی ماری تھی تاکہ وہ مرنے سے پہلے اپنے بیٹے کو دم توڑتا ہوا دیکھے۔

یہ ہے حقیقت سرائیوو کی، بوسنیا ہرزگووینا کی؛ اُس مقام کی جہاں، اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل بطروس غالی کے بقول، "فریق الف اور فریق ب" کے درمیان جنگ ہو رہی ہے۔ سرائیوو کے باسی بطرس غالی کو پچھلے ہفتے یہ بتانا چاہتے تھے کہ نرمین دیوووِچ، جس کا ایک بندوق

سے شکار کیا گیا، جس کے چہرے کو گولی سے اُڑا دیا گیا، وہ "فریق الف" نہیں ہے، بالکل اُسی طرح جیسے وہ مخلوق جس نے زمین کا شکار کیا، "فریق ب" نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرائیوو کے رہنے والوں نے بطرس غالی کے حالیہ دورے کے آغاز پر اس کا توہین اور استہزا کے آوازوں کے ساتھ استقبال کیا جو اس سے پہلے کبھی اس شہر میں نہیں سُنے گئے تھے۔ دو پلے کارڈ نمایاں نظر آ رہے تھے۔ ایک پلے کارڈ پر، جو شاید کسی امدادی ڈبے کو پھاڑ کر بنایا گیا تھا، صرف اتنا لکھا تھا: "غالی ہٹلر"، اور دوسرے پر یہ کہ "غالی مرد نہیں۔" پہلا پلے کارڈ شہر کے لوگوں کی سیاسی رائے کا لبِ لباب تھا، یعنی یہ کہ فاشزم کے بھاری بُوٹ بوسنیا کے شہریوں کو روندتے ہوئے یوروپ میں داخل ہو گئے ہیں اور ایک نئے ہٹلرازم کو کمک اور اعانت پہنچا رہے ہیں۔ دوسرا نعرہ سرائیوو شہر کی جانب سے، اس کے مخصوص انداز میں، اقوامِ متحدہ کے لیے حقارت کا اظہار تھا۔ شاید غالی اس بات سے ناواقف تھا کہ تین الفاظ کا یہ نعرہ سرائیوو میں کھیلوں کے روایتی شیدائیوں کی طرف سے کیا جا سکنے والا انتہائی پست وار ہے۔ گزرے ہوئے سہانے دنوں میں جوشیلے تماشائی اسی نعرے سے بے ایمان ریفریوں کو بے عزت کیا کرتے تھے: "ریفری مرد نہیں!" اس نعرے کا سامنا کرنے والے ایک ریفری نے بعد میں کہا تھا: "میں خود کو بہت ذلیل محسوس کر رہا ہوں۔ یہ مردانگی کا سوال نہیں۔ دراصل وہ کہہ رہے ہیں کہ میں کچھ نہیں ہوں، کچھ بھی نہیں، محض صفر!" غالباً وہ اس نعرے کے اصل معنی سمجھ گیا تھا۔

کیا بطرس غالی اس بات کو سمجھ پایا؟ شاید۔ اس کا یہ فیصلہ کہ اسے اپنے پشمینے کے اوور کوٹ کو بدل کر بلٹ پروف واسکٹ لینے کی ضرورت نہیں، بالکل اعتبار سے درست نکلا۔ اس شہر میں کوئی اس پر گولی نہ چلاتا، کیوں کہ وہ ایک ایسی تنظیم کی نمائندگی کرتا ہے جس کے لیے سرائیوو کے باسی نفرت نہیں بلکہ حقارت محسوس کرتے ہیں۔ اگر تم اُن لڑکیوں کے چہرے قریب سے دیکھ پاتے جو غالی کے منہ پر پلے کارڈ لہرا رہی تھیں، تو تم دیکھ سکتے تھے کہ وہ اس کا مذاق اُڑا رہی ہیں۔ سرائیوو کے سخت جان تماشائی، جو "ریفری مرد نہیں!" کے نعرے لگاتے تھے، وہی نیلی ہلمٹ والے سپاہیوں کو شہر سے باہر نکلنے کا راستا بتائیں گے، گو کہ اقوامِ متحدہ کی فوج کے کمانڈر یہ انتباہ کرتے ہیں کہ یہ ایک مشکل اور پیچیدہ آپریشن ہوگا۔ میدانِ جنگ سے ایک گولی چلائے بغیر نکلنا ہمیشہ ہی مشکل اور پیچیدہ مرحلہ ثابت ہوتا ہے۔

خوش قسمتی سے یہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو میدانِ جنگ میں موجود رہیں گے۔ جیسے میرا پڑوسی حامد۔ ناٹو کے ہوابازوں کے برخلاف (جو اندھیرے یا کہرے میں پرواز نہیں کر سکتے اور نہ اُس وقت جب ان کے ہدف جنگلوں میں روپوش ہو جاتے ہیں) وہ اب تک پندرہ سرب ٹینکوں کو

سر کر چکا ہے۔ بوسنیا ہرزگووینا کی فوج نے مندرجہ ذیل اشیا عامر کو فراہم کی ہیں: آدھی یونیفارم، ایک کمبل، ایک درجن کھانے کے ڈبے، ایک شناختی نشان۔ باقی چیزیں عامر کی ماں نے مہیا کی ہیں: ایک قمیص، موزوں کے دو جوڑے اور ایک سویٹر۔ یہ ہے فریق الف اور فریق ب کی حقیقت۔ ہمارے خطّے میں باپوں، یعنی مردوں، کا فرض ہے: اپنے سات سالہ بچوں کی حفاظت کرنا۔ اسے ایک قدرتی فرض سمجھا جاتا ہے۔ یہاں ایسا شخص جو یہ فرض انجام دے سکتا ہے، کیوں کہ اس کے پاس میزائل، راکٹ اور جہاز ہیں، لیکن انجام نہیں دیتا، اُسے مرد نہیں سمجھا جاتا۔ سرائیوو کے جیالوں نے وہی کہا جو کہنا چاہیے تھا، خواہ تب، کھیل کے میدان میں، یا پچھلے ہفتے، بطرس غالی اور اقوامِ متحدہ سے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ کھیل نہیں ہے۔ یہ انسانی المیہ ہے، اور ابھی حساب شروع بھی نہیں ہوا ہے۔ جب تک یہ حساب بے باق ہو، زندہ بچنا اور بچوں کو دیکھتے رہنا، اور جیتنا -- یہی زندگی کا حاصل ہے۔ اس کے سوا کوئی راستا نہیں۔

**

Scanned with CamScanner

ماخذات

1. V P Gagnon Jr., *Serbia's Road to War*, *Journal of Democracy*, April 1994.
2. Noel Malcolm, *Bosnia: A Short History*, London, Macmillan, 1994.
3. *Cultural Genocide in Bosnia*, *The Muslim*, Islamabad, 1 October 1993.
4. Kemal Kurspahic, *Bosnia's Beacon of Hope*, *Journal of Democracy*, January 1994.
5. Kemal Kurspahic, *The Saddest City*, *Dawn*, Karachi, 15 February 1994.
6. Kemal Kurspahic, *Dead-end for Peace Process*, *The Frontier Post*, Lahore, 30 November 1994.
7. Zlatko Dizdarevic, *Remember Sarajevo?*, *Time*, 3 October 1994.
8. Zlatko Dizdarevic, *For Bosnia UN is no more*, *Dawn*, Karachi, 26 October 1994.
9. Zlata Filipovic, *Zlata's Diary*, London, Viking Penguin, 1994.
10. Hans Moleman, *Killers focus on a photograher*, *The Friday Times*, Lahore, 13-19 May 1993.
11. John Mullin, *Massacre leaves streets awash with blood*, *The Guardian Weekly*, Week ending 13 February 1994.
12. Louise McCorkindale, *Women of Sarajevo speak*, *Index on Censorship*, 7/1993.
13. Maja Fish, *Bush Diary*, *BBC Worldwide*, September 1994.
14. Natka Buturovic, *Out of the depths*, *Index on Censorship*, 7/1993.
15. Marc Ponthus, *Requiem for Sarajevo*, *The Frontier Post*, Lahore, 10 January 1994.
16. Eqbal Ahmad, *UN: an obituary*, *Dawn*, Karachi, 1994.

Scanned with CamScanner

17. Robert Fisk, *Objectively, Karl Marx was right after all*, *The News*, Karachi, 8 February 1994.
18. Zoran Filipovic, *A season of hell*, *Index on Censorship*, 4/5 (September/ October) 1994.
19. Slavenka Drakulic, *Close-up of death*, *Index on Censorship*, 7/1993.
20. Boro Todorovic, Statement made to the independent television station YUTEL,Belgrade, included as Preface in Misha Glenny, *The Fall of Yugoslavia*, London, Penguin Books, 1992.
21. Susan Sontag, *Godot Comes to Sarajevo*, *The New York Review of Books*, 21 October 1993.
22. Nedzad Ibrisimovic, *Dobrinja*, *Granta* 42, Winter 1992.
23. Irfan Horozovic, *The Bosnian Bull*, *Index on Censorship*, 4/5 (September/ October) 1994.
24. A S Byatt, *Dragon's breath*, *Index on Censorship*, 4/5 (September/ October) 1994.
25. Julian Barnes, *Hamlet in the Wild West*, *Index on Censorship*, 4/5 (September/ October) 1994.
26. Claudio Magris, *The mistake*, *Index on Censorship*, 4/5 (September/ October) 1994.
27. Bora Cosic, *Reading Hamsun*, *Index on Censorship*, 4/5 (September/ October) 1994.
28. Slobodan Blagojevic, *Here I am!*, *Storm 6: Out of Yugoslavia*, 1994.
29. Drago Jancar, *Augsburg*, *Storm 6: Out of Yugoslavia*, 1994.
30. Jean Hatzfeld, *The Fall of Vukovar*, *Granta* 47, Spring 1994.
31. Bogdan Bogdanovic, *The City and Death*, *Storm 6: Out of Yugoslavia*, 1994.
32. Dzevad Karahasan, *Sarajevo: Portrait of an Inward City*, *Storm 6: Out of Yugoslavia*, 1994.
33. Goran Stefanovski, *Sarajevo: Tales from a City (a play)*, *Storm 6: Out of Yugoslavia*, 1994.

Scanned with CamScanner

34. Dubravka Ugresic, *The culture of lies*, *Index on Censorship*, 1/2 (January/ February) 1994.
35. Dubravka Ugresic, *Zagreb, Autumn 1992*, *Granta* 42, Winter 1992.
36. Dubravka Ugresic, *Goodnight, Croatian writers*, *Index on Censorship*, 5&6/1993.
37. Dubravka Ugresic, *Balkan Blues*, *Storm 6: Out of Yugoslavia*, 1994.
38. Zlatko Dizdarevic, *One Thousand Days of Solitude*, *Time*, 12 December 1994.

***

Scanned with CamScanner

معذرت

ہمیں افسوس ہے کہ اعلان کے مطابق شمارہ خزاں ۱۹۹۴ ہندی کہانیوں پر مشتمل خصوصی شمارے کے طور پر شائع نہیں کیا جا سکا۔ ہندی کہانیوں کا انتخاب شمارہ ۱۸ (سرما ۱۹۹۵) میں شائع کیا جائے گا۔

Scanned with CamScanner

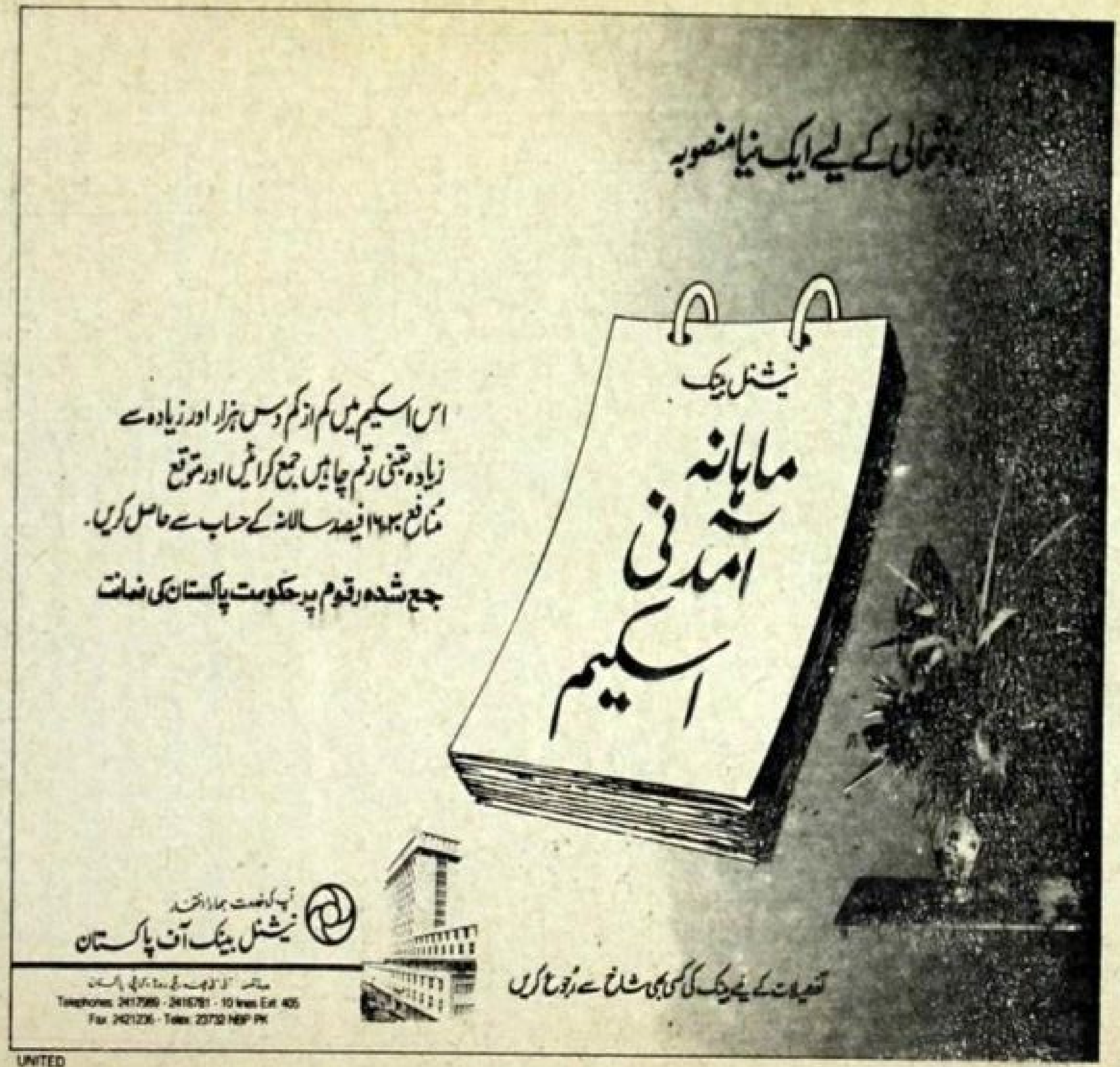

خوشحالی کے لیے ایک نیا منصوبہ
نیشنل بینک
ماہانہ آمدنی اسکیم
اس اسکیم میں کم از کم دس ہزار اور زیادہ سے زیادہ جتنی رقم چاہیں جمع کرائیں اور متوقع منافع
فیصد سالانہ کے حساب سے حاصل کریں۔
جمع شدہ رقوم پر حکومت پاکستان کی ضمانت
تفصیلات کے لیے بینک کی کسی بھی شاخ سے رجوع کریں
آپ کی خدمت ہمارا مقصد
نیشنل بینک آف پاکستان
Telephones: 2417989 · 2416781 · 10 lines Ext 405
Fax 2421236 · Telex 23732 NBP PK
UNITED
PID-I-32/94

لاطینی امریکا کے ملک کولومبیا سے تعلق رکھنے والے نوبیل انعام یافتہ ادیب

گابرئیل گارسیا مارکیز

کی تحریروں کا ایک جامع انتخاب

دو مکمل ناول

"کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" اور "ایک پیش گفتہ موت کی روداد"

تیرہ منتخب کہانیاں

دو ناولوں "تنہائی کے سو سال" اور "وبا کے دنوں میں محبت" کے منتخب ابواب

مارکیز کی نوبیل انعام پیش کیے جانے کے موقعے کی تقریر اور ایک اہم مضمون

مارکیز کے فن پر دو مغربی نقادوں کے مضامین

اپنی زندگی، فن اور خیالات پر مارکیز کی ایک طویل گفتگو

مارکیز کی شخصیت اور حالاتِ زندگی کے بارے میں

ان کے ایک ہم وطن دوست ادیب کی ایک طویل تحریر

قیمت: ۲۰۰ روپے

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

۱۷

قیمت: سو روپے

آج کی کتابیں،
بی ۔ ۱۴۰، سیکٹر ۱۱ بی، نارتھ کراچی ٹاؤن شپ، کراچی ۷۵۸۵۰

تقسیم کار
مک[illegible]انیال، صدر، کراچی
ٹا[illegible]ڈ ٹاس بک [illegible]یلرز، صدر، کراچی
[illegible]یلب، شاہراہِ قائدِ اعظم، لاہور
[illegible]تان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، لوئر مال، لاہور